داماد رسولؐ فاتح خیبر، خلیفہ راشد

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تابناک سیرت کا مستند تذکرہ

سیدنا علی رضی اللہ عنہ

ڈاکٹر علی محمد الصلابی

دارالسلام

کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

خلیفۂ راشد، دامادِ رسول، فاتح خیبر
سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تابناک سیرت کا مستند تذکرہ

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پرنس عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الرّیاض: 11416 سعودی عرب

فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com

Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الرّیاض • العُلیا فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 • الملز فون: 4735220 1 00966 فیکس: 4735221

• سویدی فون: 4286641 1 00966 • سویلم فون/فیکس: 2860422 1 00966

جدّہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس: 8151121 04

الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966

ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ • نیویارک فون: 5925 625 718 001 • ہوسٹن: 0419 722 713 001 کینیڈا • نصیرالدین الخطاب فون: 4186619 416 001

لندن • دارالسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لمیٹڈ فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 • دارکمہ انٹرنیشنل: 7739309 0121 0044

متحدہ عرب امارات • شارجہ فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 3

انڈیا • دارالسلام انڈیا فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 • اسلامک بکس انٹرنیشنل فون: 4180 2373 22 091 003

• ہدی بک ڈسٹری بیوٹرز فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 • ایم ایس براک انٹرپرائزز فون: 42157847 44 91 0

سری لنکا • دارالکتاب فون: 358712 115 0094 • دارالایمان ٹرسٹ فون: 2669197 114 0094 00

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 00 4 32 372, 24 400 372, 34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042

www.darussalampk.com

اُردو بازار: غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042

ڈیفنس: Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

گلبرگ: دُکان نمبر 2، گراؤنڈ فلور، بگ سٹی پلازہ لبرٹی گول چکر، گلبرگ III لاہور فون: 042-35773850

ٹاؤن شپ: پیکو روڈ ٹاؤن شپ، نزد اکبر چوک لاہور فون: 230 24 351 042

کراچی مین طارق روڈ، ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دُوسری گلی، کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، ایوب مارکیٹ، شاہ ویز سنٹر: 13 815 22 51 0092 islamabad@darussalampk.com

خلیفۂ راشد، دامادِ رسول، فاتح خیبر
سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تابناک سیرت کا مستند تذکرہ
سیدنا علی رضی اللہ عنہ
تالیف: دکتور علی محمد محمد الصلابی
ترجمہ: پروفیسر عبدالغفور مدنی
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)
اختصار: پروفیسر محمد ذوالفقار
DARUSSALAM

اللہ کے نام سے (شروع) جونہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
الصلابي، علي محمد
سيدنا علي رضي الله عنه باللغة الأردية / علي محمد الصلابي
الرياض، ١٤٣٥هـ
ص:٧٢٧،مقاس ١٤ x ٢١ سم
ردمك: ١-٢٨٥-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨
١-علي بن ابي طالب بن عبدالمطلب، ت ٤٠ هـ ٢-الخلفاء الراشدون أ-العنوان
ديوي ٢٣٩.٩ ٣٤٠٨/ ١٤٣٥
رقم الإيداع: ٣٤٠٨/ ١٤٣٥
ردمك: ١-٢٨٥-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨

فہرست

عرض ناشر

معزز و محترم قارئین کرام!

اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ عصر حاضر میں خلفائے راشدین پر سب سے عمدہ اور اعلیٰ درجے کی کتب کس مؤلف کی ہیں؟ تو میں ایک لمحہ تأمل کیے بغیر اسے جواب دوں گا: ڈاکٹر علی محمد محمد صلابی کی کتب یہ مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے جس عمدہ انداز میں خلفائے راشدین پر کتب تالیف کی ہیں اس کا کوئی جواب نہیں۔ کسی بھی مؤلف کے کام کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ جو بات بھی تحریر کرے باحوالہ صحیح اور درست تحریر کرے۔ اس کے کام میں ادھر ادھر کی باتیں اور رطب و یابس جمع نہ کیا گیا ہو۔ اس کا اسلوب اور انداز بیان بہت واضح ہو۔ زبان ایسی آسان استعمال کی گئی ہو کہ عام آدمی بھی اسے پڑھ اور سمجھ سکے اور فلسفیانہ انداز سے ہٹ کر اس انداز میں لکھا گیا ہو کہ اس کی بات پڑھنے والے کے دل و دماغ کی گہرائی تک اتر جائے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی تالیفات میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

زیر نظر کتاب کے مؤلف نہ صرف میرے بلکہ لاکھوں افراد کے پسندیدہ مؤلف ہیں۔ میں واقعی ان کا بہت بڑا مداح ہوں۔ ان کا آبائی وطن لیبیا ہے، مگر وہ عرصہ دراز سے قطر میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مدینہ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم یہ اپنے ساتھیوں میں سب سے نمایاں تھے۔ اگر میرا حافظہ خطا نہیں کر رہا تو انھوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔ میں نے آج

سے آٹھ سال قبل عربی زبان میں سیرت پاک پر ان کی کتاب کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ اس قدر عمدہ تالیف تھی کہ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اللہ نے چاہا تو ہم اسے انگلش اور اردو میں ضرور شائع کریں گے۔ انھوں نے خلفائے راشدین پر بھی عربی زبان میں بہت شاندار اور خوبصورت کتب تالیف کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں شکر ہے کہ اس نے میری آرزو پوری کی اور ہم نے بڑی شان و شوکت سے سیرت النبی ﷺ پر ان کی کتاب کا انگلش اور اردو ترجمہ شائع کیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں ڈاکٹر محمد صلابی سے ملنے کے لیے قطر بھی گیا۔ میں نے انھیں فون کیا: میں آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں، آپ کی لائبریری دیکھنا چاہتا ہوں اور آپ کی وہ کرسی دیکھنا چاہتا ہوں جس پر بیٹھ کر آپ نے اس قدر خوبصورت کتب تالیف کی ہیں۔ انھوں نے بھی کمال محبت سے گھر آنے کی دعوت دی، ضیافت کی اور اپنی لائبریری میں لے گئے۔ لائبریری میری توقع سے چھوٹی تھی، مگر چاروں طرف کتب بڑے سلیقے اور قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ان کی میز اور کرسی رکھی تھی۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی کرسی پر بٹھا دیا۔ میں چند لمحے بیٹھا رہا اور پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے خالص فوجی انداز میں انھیں سیلوٹ مار کر کہا: یہ سیلوٹ اہل پاکستان کی طرف سے اور دنیا بھر میں بسنے والے اہل حدیثوں کی طرف سے آپ کے لیے ہے؛ کیونکہ آپ نے جو کام کیا ہے جس محنت اور لگن سے ان کتب کی تالیف کی ہے اس پر آپ پوری امت اسلامیہ کی طرف سے اور بطور خاص اہل حدیثوں کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ میرے اس سیلوٹ سے وہ خاصے خوش اور محظوظ بھی ہوئے۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے وہ اپنے تجربات، احساسات اور حالات زندگی بیان کرتے رہے۔ میں بڑی توجہ اور انہماک سے ان کی سنتا رہا اور اپنی سناتا رہا۔ عمر میں وہ مجھ سے چھوٹے ہیں، مگر اپنے کام اور علم و عمل کے لحاظ سے کہیں بڑے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بلا کے ذہین ہیں۔ مجھے اپنی زندگی میں جن غیر

معمولی ذہین وفطین لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، ڈاکٹر صاحب ان میں سے ایک ہیں۔ ایک خوبی جو میں نے ان میں محسوس کی وہ یہ تھی کہ جتنے وہ بڑے آدمی ہیں اتنے ہی زیادہ متواضع بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کواور ان کی کتب کو عصر حاضر میں بے پناہ مقبولیت سے نوازا ہے۔ اس کا سبب ان کا اپنے عقیدے اور منہج پر پختہ یقین، اخلاص اور بھر پور محنت ہے۔

دارالسلام اس سے پہلے سیرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور سیرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اردو زبان میں کتب شائع کر چکا ہے۔ الحمدللہ اب اس سلسلہ کی چوتھی کتاب سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سیرت پر ہے، جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

محترم قارئین کرام!

خلفائے راشدین کی سیرت امت کے لیے ایک عظیم خزانہ ہے۔ اس میں بڑے لوگوں کے تجربات ہیں، مشاہدات ہیں، خبریں ہیں، امت کے عروج اور غلبے کی تاریخ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں یہ دیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ کن کن مواقع پر اہل حق کو عروج وترقی ملی۔ اس کے اسباب کو جانچنے اور جاننے کا موقع ملتا ہے۔ جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آتا ہے اور یہ جاننے کا موقع ملتا ہے کہ کب کب امت مسلمہ پستی، زوال اور تنزل کا شکار ہوئی، کب اسے سیاسی، سماجی اور معاشی میدانوں میں پسپا ہونا پڑا۔ اس پستی اور ذلت کے اسباب کو جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر ہم نے اپنی تاریخ کو فراموش کر دیا اور اس سے سبق سیکھنے کی کوشش نہ کی تو لاشعوری طور پر وہی غلطیاں دہرائیں گے جن کی وجہ سے پہلے یہ امت پستی اور ذلت کا شکار ہوچکی ہے؛ اس لیے کہ تاریخ عجب انداز میں خود کو دہراتی ہے۔

ہمیں اپنی عظمت رفتہ کے حصول اور تنزل وادبار کی گہرائیوں سے نکلنے کے لیے قرون اولیٰ کی تاریخ کو حرز جاں بنانے کی ضرورت ہے۔ اس دور کی تمام اصلاحات اور مہمات ہمارے

دل و دماغ پر نقش ہونی چاہئیں، کیونکہ انھی میں ہمارے دکھوں کا مداوا ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر دارالسلام نے مختلف زبانوں میں سیرت کے موضوع پر درجنوں کتابیں شائع کی ہیں۔

اب اسی سنہری سلسلے کی ایک اہم کڑی سیرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ شائع کر رہے ہیں۔ موجودہ پر آشوب اور پر فتن دور میں جب تشدد، انتہا پسندی اور فرقہ پرستی کا عفریت ہماری ہر چیز تباہ کرنے پر تلا بیٹھا ہے، اس موضوع کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ خصوصاً ایک ایسی متوازن کتاب کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس میں اہل بیت کا مقام و مرتبہ بھی بیان کیا گیا ہو کیونکہ اہل بیت کی محبت ہمارے ایمان کا بنیادی عنصر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُبْغِضُنَا أَهْلَ الْبَيْتِ أَحَدٌ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ»

''اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جو شخص بھی ہم اہل بیت سے بغض رکھے گا اللہ تعالی اسے جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔''

(سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث:2295)

ہمارا ایمان ہے کہ ہر مؤمن کے دل میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی گہری محبت کی موجودگی لازم ہے۔ آپ سے بغض رکھنے والا شخص کوئی منافق ہی ہوسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی کو مخاطب کر کے فرمایا:

«إِنَّهُ لَا يُحِبُّكَ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُكَ إِلَّا مُنَافِقٌ»

''بلا شبہ صرف مؤمن ہی تجھ سے محبت رکھیں گے اور صرف منافق ہی تجھ سے بغض رکھیں گے۔'' (حديث صحيح، جامع الترمذي، حديث:3736)

زیر نظر کتاب میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مکمل سوانح اور آپ کی سیرت انتہائی احسن انداز میں بیان کی گئی ہے۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں، تاریخ کے اس نازک دور میں کچھ ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے۔ مشاجرات صحابہ پر لکھنا ایک تنے ہوئے

رسے پر چلنے کے مترادف ہے جس میں زبردست توازن کے ساتھ ایک ایک قدم سنبھل کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی انسان کو کسی گہری کھائی میں گرا سکتی ہے۔ اس کتاب کے مایہ ناز مؤلف ڈاکٹر علی محمد محمد صلابی اس امتحان میں بھی سرخرو ٹھہرے ہیں۔ انھوں نے اس وادی میں پھونک پھونک کر قدم رکھے ہیں۔

دارالسلام اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کتاب کو بھی انتہائی دیدہ زیب، جاذب نظر اور دلفریب انداز میں پیش کر رہا ہے۔ آخر میں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اس کتاب کو قارئین کے لیے مفید اور ہمارے لیے توشہ آخرت بنائے۔ آمین!

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

اپریل 2014ء

مقدمہ

إن الحمد لله، نحمده ونستعينه ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادي له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله.

فرمان ربانی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ ﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، تم کو موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○ ﴾

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو، اللہ تمھارے اعمال درست

[1] آل عمران 3:102۔

کر دے گا اور تمھارے گناہ معاف فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، تو یقیناً اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔'' [1]

یا رب! میں تیری تعریف کرتا ہوں جیسے تیری ذات کی جلالتِ شان اور عظیم سلطنت کے لائق ہے۔ ہر دم تیری ہی تعریف ہے یہاں تک کہ تو راضی ہوجائے۔ اور جب تو راضی ہوجائے تو پھر بھی تو ہی تعریف کے لائق ہے اور تیری خوشنودی کے بعد ہر دم تیری ہی تعریف ہے۔

خلافتِ راشدہ کے ادوار کے مطالعہ کے سلسلے میں یہ چوتھی کتاب ہے۔ اس سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذوالنورین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں کتب شائع ہوچکی ہیں۔

میں نے اس کتاب کو ''امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سیرت کے اعلیٰ مباحث'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ کتاب امیر المومنین کے بارے میں پیدائش سے لے کر آپ کی شہادت تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

سب سے پہلے آپ کا اسم گرامی، حسب ونسب، لقب، ولادت، خاندان، قبیلہ، اسلام اور مکہ میں آپ کے اہم کارناموں اور ہجرت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں قرآن کے سائے میں آپ کا زندگی بسر کرنا اور زندگی پر اس کے اثرات کی تفصیلات بتائی گئی ہیں۔

پھر یہ بیان کیا کہ ان کی نظر میں قرآن حکیم کا کیا مقام ہے اور ان کے بارے میں قرآن میں کیا نازل ہوا؟ اس کتاب میں وہ بنیادی اصول بھی بیان ہوئے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قرآن کریم سے شرعی احکام کے استنباط اور اس کے معانی کے فہم کا اسلوب کیا ہے؟ اور بعض قرآنی آیاتِ مبارکہ کی انھوں نے کیا تفسیر پیش فرمائی ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ امیر المومنین کو بچپن ہی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا شرف حاصل رہا۔

[1] الأحزاب 33:70-71.

آپ کو مقامِ نبوت اور اس کے ساتھ تعامل کی گہری معرفت حاصل رہی۔ آپ نے راہِ نبوت کے نشان اپنے اقوال و افعال سے اجاگر کیے۔ لوگوں کی تعلیم و تربیت کی جانب خصوصی توجہ دی، انھیں رسول اکرم ﷺ کے فرمودات، اعمال و افکار اور سنت کی پیروی کرنے کی ہر دم ترغیب دی اور نبی اکرم ﷺ کی لازمی اطاعت، سنت کی حفاظت اور التزام کی تلقین فرمائی۔

قاری کو اس کتاب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سنت کی پیروی کے بہترین عملی نمونے نظر آئیں گے۔ صحابہ و تابعین اور اہل بیت رضی اللہ عنہم میں سے جن لوگوں نے بھی ان سے احادیث روایت کی ہیں، ان کا تذکرہ ملے گا۔ یہ کتاب قاری کو عہدِ نبوی میں مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے بھی روشناس کراتی ہے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ذکر ملے گا۔ اس نکاح میں حق مہر، جہیز، شبِ زفاف، معیشت، زاہدانہ زندگی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لہجے کی سچائی اور دنیا و آخرت میں ان کی عظمت و سعادت کے حوالے سے ہمارے لیے بے شمار اسباق چمک رہے ہیں۔

میں نے زیرِ نظر کتاب میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے مختصر حالاتِ زندگی بھی بیان کیے ہیں۔ ان کے بارے میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں، ان کی بنا پر ان کا مرتبہ اور فضیلت بتائی ہے۔ علمائے اہل سنت کی نظر میں اہل بیت کا مقام و منزلت، ان سے متعلقہ احکام، مثلاً: ان پر زکاۃ کی حرمت اور یہ کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی جانب سے مال کے وارث نہیں ہوں گے اور فَے، مالِ غنیمت اور خمس میں ان کے حق کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

غزوۂ بدر، احد، خندق، غزوۂ بنی قریظہ، صلح حدیبیہ، غزوۂ خیبر اور فتح مکہ کے مختلف مواقع پر علی رضی اللہ عنہ کا موقف بیان کیا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کا غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں جانشین بنانا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا امیر حج ہونا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ابلاغی کردار، نجران کے عیسائیوں کا وفد، آیتِ مباہلہ، آپ ﷺ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی اور داعی بنا کر بھیجنا، ملک یمن میں علی رضی اللہ عنہ کے عدالتی فیصلے، حجۃ الوداع پر آپ کا موقف اور اس

تحریر کی داستان جو آپ ﷺ نے مرضِ وفات میں لکھوانے کا ارادہ فرمایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دیگر خلفائے راشدین کے ساتھ تعلقات اور خلافت راشدہ میں آپ رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبہ کے ساتھ ساتھ میں نے اس موضوع پر بھی بات کی ہے کہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کی اور مرتدین کے خلاف جنگوں میں ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مقدم اور صاحبِ فضیلت قرار دیا، ان کی اقتدا میں نمازیں ادا کرتے رہے، ان سے تحائف بھی قبول فرمائے۔ مزید برآں میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے درمیان حسنِ تعلق کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

مزید برآں سیدنا ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے عہد میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کردار کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نیز مدلّل انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ اُن کے پہلے تینوں خلفاء سے مثالی تعلقات تھے اور باہمی محبت اور مروّت کا رشتہ قائم تھا۔

اس سے پہلے کہ میں ان مصادر و مراجع کا ذکر کروں جن سے میری وابستگی رہی ہے، یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ یہ کوشش اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہ تھی۔ بعد ازاں علمائے اہل سنت کی کوششوں اور ان طالبان علم کی سعی و جہد سے آگہی کے بغیر جو ان کے منہج پر چلے، میں اس گہرے سمندر کو عبور نہیں کرسکتا تھا، لہٰذا میں اقرار کرتا ہوں کہ مطلوبہ معلومات کے حصول، طریق کار اور روایات پر حکم لگانے اور تاریخی مصادر سے رجوع کرتے ہوئے میں نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام علمی رسائل سے استفادہ کیا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر احباب کی کوششوں سے فائدہ اٹھا کر خوب سے خوب تر کی راہ پر گامزن ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں، موصوف نے اس سلسلے میں بہت سے رسائل کی طرف رہنمائی بھی فرمائی اور ان پر بحث و تمحیص بھی کی۔ میں نے ان کی کتب «السيرة النبوية الصحيحة» اور «عصر الخلافة الراشدة» سے استفادہ بھی کیا ہے۔

اب میں ان رسائل اور تحقیقی مقالہ جات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جن کی انھوں نے نشاندہی فرمائی، وہ یہ ہیں: ڈاکٹر یحییٰ الیحییٰ کا تحقیقی مقالہ الخلافة الراشدة والدولة الأموية من فتح الباري جمعا وتوثيقا، اور پروفیسر عبدالعزیز مقبل کا تحقیقی مقالہ خلافة أبي بكر الصديق رضی اللہ عنہ سنت و تاریخ کی روشنی میں لکھا گیا ہے جس میں روایات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز بن محمد الفریح کا تحقیقی مقالہ جو یوسف بن حسن بن عبدالہادی الدمشقی الصالحی الحنبلی کی کتاب «محض الصواب في فضائل امير المؤمنين عمر بن الخطاب» پر شاندار تحقیقی کاوش ہے۔ اسی طرح عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور فتنے کے بارے میں ڈاکٹر محمد بن عبداللہ الغبان کا مقالہ فتنہ مقتل عثمان بن عفان اور پروفیسر عبدالحمید علی ناصر کا تحقیقی مقالہ جو خلافت علی کے بارے میں ہے۔

علاوہ ازیں میں نے یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالہ جات سے بھی استفادہ کیا ہے جن کے نگران دیگر اساتذہ ہیں، جیسے ڈاکٹر محمد المحزون کا مقالہ تحقيق مواقف الصحابة في الفتنة جو امام طبری اور دیگر محدثین کی فتنہ کے بارے روایات سے متعلق صحابہ کے موقف کی تحقیق پر مبنی ہے۔ عبدالله بن سبأ و أثره في أحداث الفتنة في صدر الاسلام، یعنی اسلام کے ابتدائی دور میں فتنے کے واقعات میں عبداللہ بن سبا کے اثرات، کے عنوان سے سلیمان العودہ کا تحقیقی مقالہ اور دورالمرأة السياسي في عهد النبي ﷺ والخلفاء الراشدين، یعنی ''دور نبوی و خلفائے راشدین میں عورت کا سیاسی کردار'' کے عنوان سے پروفیسر اسماء محمد احمد زیادہ کا تحقیقی مقالہ وغیرہ۔

اس تحریری سفر میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا، پھر میرے اساتذہ اور میرے وہ بھائی جنھوں نے میرے لیے راہ ہموار کی، میں ان کی غیر موجودگی میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور یہ نیکیاں اس دن ان کے میزان میں تولی جائیں جس روز مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد! سوائے اس کے کہ کوئی شخص

قلب سلیم لے کر حاضر ہو۔ اس تحقیقی کام کی تیاری میں خلافت راشدہ کے دور سے متعلقہ مصادر و مراجع کی فہرست یہ ہے:

کتب حدیث

صحاح ستہ، یعنی صحیحین بخاری و مسلم اور سنن ابی داود، جامع ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ سے ابتدا کی ہے، پھر مؤطا امام مالک اور مسند احمد کو پیش نظر رکھا ہے۔ میں نے خلافت راشدہ کے دور سے متعلق تاریخی معلومات ان کتب سے اخذ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ بعد ازاں مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مستدرک حاکم، سنن کبریٰ بیہقی، سنن سعید بن منصور، مسند حمیدی، مسند طیالسی، مجمع الزوائد، کشف الأستار عن زوائد البزار اور موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان جیسی کتب سے تاریخی معلومات مہیا کی ہیں۔
میں نے معجم کبیر طبرانی اور سنن دارقطنی سے بھی بے گانگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ روایات کی صحت پر حکم لگانے میں مذکورہ کتب حدیث کے محققین کی کوششوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

کتبِ شروحاتِ حدیث

ان میں اہم ترین امام ابن حجر رحمہ اللہ کی فتح الباری اور امام نووی رحمہ اللہ کی صحیح مسلم پر لکھی گئی شرح ہے۔ ان کا تاریخی سرمایہ بے وقعت نہیں ہے۔ بعض تاریخی واقعات پر تو ابن حجر اور امام نووی کا تبصرہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

کتب تفسیر

ان میں سے اہم ترین تفسیر طبری، تفسیر قرطبی اور ابن کثیر ہیں۔ میں نے ان کی نقل کردہ روایات سے زیادہ ان کے تبصروں کو اہمیت دی ہے کیونکہ ان میں سے اکثر روایات، حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

کتبِ عقائد

ان میں اہم ترین کتاب امام ابن تیمیہ کی «منهاج السنة النبوية» ہے۔ اس کتاب سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ شرح عقیدہ طحاویہ «الإبانة فی اصول الديانة»، امام بیہقی کی «الاعتقاد» اورآجری کی «الشريعة» اور دیگر کتب عقائد۔ ان کتب میں سے میں نے سلف کے وہ اقوال نقل کیے ہیں جو خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مقام ومرتبے سے آگاہی عطا کرتے ہیں۔

کتبِ فقہ

ان میں سے اہم ترین «المغنی لابن قدامة»، امام نووی کی «المجموع» اور ابن رشد کی «بداية المجتهد» وغیرہ کے علاوہ دیگر کتب شامل ہیں۔ ان کتب سے فقہی مسائل کے علاوہ ان عدالتی فیصلوں سے استفادہ کیا ہے جن میں خلفائے راشدین نے اجتہاد کیا ہے۔

کتبِ ادب

ان میں سے اہم کتب ابن قتیبہ کی «عيون الأخبار» اور نایف معروف کی «الأدب الإسلامی فی عهد النبوة» ہیں۔

زُہد اور نرم خوئی کے عنوان پر کتب

ان کتب میں سے میں نے مذکورہ عنوان کے حوالے سے خلفائے راشدین کے اقوال اخذ کیے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین کتب ابن قیم کی «عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين» اور «مدارج السالكين» کے علاوہ امام مقدسی کی «مختصر منهاج القاصدين» وغیرہ ہیں۔

فِرَق و مذاہب کی کتب

ان میں سے اہم کتب امام ابن حزم ظاہری کی «الفصل فی الملل والأهواء والنحل» اور

ڈاکٹر ناصر القفاری کی «أصول مذهب الشيعة الامامیه الاثنا عشرية» ہیں۔

نظامِ حکمرانی سے متعلق کتب

ان میں سے اہم کتب، کتانی کی کتاب «نظام الحكومة الإسلاميه» ہے جسے انھوں نے «التراتيب الإدارية» کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور ظافر قاسمی کی «نظام الحكم فی الشريعة والتاريخ الإسلامی» ہے۔

سیرت اور حالات زندگی

ان میں سے اہم کتب امام ذہبی کی «سير أعلام النبلاء»، عبدالحی حنبلی کی «شذرات الذهب فی اخبار من ذهب»، ابن اثیر کی «أُسد الغابة» اور ابو القاسم اصفہانی کی «سير السلف» ہیں۔

کتب جرح وتعدیل

ان میں سے اہم کتب حافظ مزّی کی «تهذيب الكمال فی أسماء الرجال»، ابن ابی حاتم کی «الجرح والتعديل»، ابن حبان کی «الثقات» اور ابن عدی کی «الكامل فی ضعفاء الرجال» وغیرہ ہیں۔

کتب تاریخ

ان میں سے اہم ترین کتاب تاریخ طبری ہے۔ اس کتاب میں سند کے ساتھ صحیح، ضعیف اور موضوع روایات نقل کی گئی ہیں۔ عقیدہ، شرعی احکام اور وہ واقعات جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق ہیں، ان کے بارے میں نہایت ضروری ہے کہ ان روایات کو پوری جرح وتعدیل کے ساتھ جانچا جائے۔ اسی طرح رافضی شیعوں، کذاب اور مجہول راویوں کی بیان کردہ

روایات کا ذکر بھی کیا ہے۔اس سلسلے میں خالد الغیث کی مرتب کردہ کتاب استشهاد عثمان ووقعة الجمل فی مرویات سیف بن عمر فی تاریخ الطبري، اسی طرح دکتور یحییٰ ابراہیم الیحییٰ کی کتاب مرویات أبی مخنف فی تاریخ الطبری اور دکتور عبدالعزیز نور ولی کی کتاب «أثر التشیع علی الروایات التاریخیة» وغیرہ شامل ہیں۔ان میں سے اہم ترین کتاب ابن کثیر کی «البدایة والنهایة» ہے۔

یہ وہ اہم مصادر ہیں جن کی طرف میں نے رجوع کیا ہے۔ ان میں جدید اور مختلف اقسام کے مراجع زیادہ ہیں۔ میں نے عقائد، احکام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق روایات اوران کے صحیح ہونے کی جانچ پڑتال بہت احتیاط اور سختی سے کی ہے۔اس سلسلے میں میں تو محض ماہرین علماء کے اقوال نقل کرنے والا ہوں،فضیلت تو اللہ کے لیے اور پھران کے لیے ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تاریخی روایات کی تصویر کشی صحیح روایات کے ذریعے کروں۔ اوران میں سے بھی انھی کو ترجیح دی ہے جو زیادہ اچھی ہیں۔ میں نے ضعیف روایات کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا بلکہ انھیں خوب جانچ پرکھ کر کچھ نہ کچھ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے،یعنی جہاں اچھی اور صحیح روایات کی بنیاد پر مکمل اور صحیح تصویر پیش کرنے سے قاصر رہا ہوں، وہاں زیر مطالعہ دور کی روح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان ضعیف روایات سے بھی محتاط انداز میں فائدہ اٹھایا ہے،لیکن یہ طریقہ وہیں اختیار کیا ہے جہاں عقیدہ اور شریعت زیر بحث نہیں تھے۔ میں نے خلفائے راشدین کے دور سے متعلق رافضیوں، مستشرقین اور بعض جدید مصنفین کی افترا پردازیوں اور شبہات پر بحث کرتے ہوئے اور خاص طور پر حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دور سے متعلق ان شبہات کو رد کرتے ہوئے اہل سنت کے مسلک کو تفصیلی انداز میں بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔خلافت راشدہ کے دور کے حوالے سے میری اس تحقیقی کوشش کے بارے میں بعض پیارے بھائیوں کی طرف سے اچھے افکار سامنے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔اس مقدس اور روشن و تاباں دور کے مطابق اللہ تعالیٰ کے حکم

سے خوب سے خوب تر کی راہ پر گامزن ہونے کا عزم جاری وساری ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بہتری اور توفیق کا طلب گار ہوں۔

اس کے بعد میں نے پانچویں خلیفۂ راشد حضرت حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما کے بارے میں خاص طور پر اپنا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے کیونکہ سیاست شرعیہ اور مصالح ومفاسد کی فقہ میں ان کے اجتہادات کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ اصلاحی سوچ کے مالک تھے۔ اس کا اندازہ ان کی اس عظمت سے ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوگئے۔ اگرچہ اس فیصلے کے نفاذ کی راہ میں انھیں رکاوٹوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بہت ممتاز اور منفرد شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے اصلاحی منصوبہ تیار کیا اور ان کی طرف سے اس کے نفاذ کا عزم وحدتِ امت کا سبب بنا۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک سچ کر دکھایا: «إِبْنِي هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُّصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ» ''میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے۔''[1]

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما خلافت سے دستبردار ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیتے ہیں اور اسی کے ساتھ ہی خلافتِ نبوت کا وہ دورانیہ ختم ہو جاتا ہے جس کی مدت تیس سال ہے۔ اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات گرامی ہیں:

«خِلَافَةُ النُّبُوَّةِ ثَلَاثُونَ سَنَةً ثُمَّ يُؤْتِي اللّٰهُ الْمُلْكَ أَوْ مُلْكَهُ مَنْ يَّشَاءُ»

نبوت کی خلافت تیس سال رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ اپنا ملک جسے چاہے گا عنایت کر دے گا۔[2]

«اَلْخِلَافَةُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ سَنَةً ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذٰلِكَ».

میری امت میں خلافت تیس سال تک رہے گی، پھر بادشاہت آجائے گی۔[3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 3746. [2] سنن أبي داود، حديث: 4646. [3] جامع الترمذي، حديث: 2226.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ساتھ ہی تیس سال مکمل ہو گئے۔ وہ ربیع الاول، 41ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہاں تک تیس سال مکمل ہو جاتے ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سن 11 ہجری کو ربیع الاول میں ہوئی۔ یہ بات آپ کی نبوت کے دلائل میں سے ہے۔'' [1]

میں نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زندگی امت کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ وہ ان عظیم قائدین میں سے ہیں جن کی سیرت، اقوال اور اعمال کی پیروی کی جاتی ہے۔

اس کتاب کی تکمیل بروز ہفتہ بوقت دوپہر بارہ بج کر پچپن منٹ بتاریخ 17 ربیع الثانی 1424ھ بمطابق 7 جون 2003 عیسوی کو ہوئی۔ اول و آخر بس اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم مقصود و مطلوب ہے۔ میں اسی پاک ذات سے اس کے اچھے اچھے ناموں اور اعلیٰ صفات کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ وہ میری یہ عاجزانہ محنت خاص اپنے لیے قبول فرمالے۔ اور اپنے کرم سے اسے اپنے بندوں کے لیے نفع بخش بنا دے۔ رب ذوالجلال سے التجا ہے کہ وہ میرے لکھے گئے ہر حرف کو میری نیکیوں کے پلڑے میں ڈال دے۔ اور میرے ان تمام بھائیوں کے لیے اجر و ثواب لکھ دے جنھوں نے اس عاجزانہ کوشش کی تکمیل کی خاطر میری مدد فرمائی۔

میں اپنے رب کی مغفرت، رحمت اور عفو کا بہت محتاج ہوں اور اس کتاب کے ہر قاری سے اس دعا کی التجا کرتا ہوں کہ میں اس قرآنی دعا کا مصداق بن جاؤں:

﴿ وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وٰلِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صٰلِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ ﴾

[1] البداية والنهاية: 8/17.

”اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر بجا لاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں نیک عمل کروں جسے تو پسند کرے جن سے تو خوش رہے اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما۔“ [1]

ارشاد ربانی ہے:

﴿ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾

”جو کچھ اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے رحمت میں سے کھول دے تو اس کو کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں اور وہی سب پر غالب کمال حکمت والا ہے۔“ [2]

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَسَلَّمَ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ.

اپنے رب کے عفو و مغفرت اور رحمت و رضا کا محتاج

علی محمد محمد الصلابی

[1] النمل 19:27. [2] فاطر 2:35.

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا نام ونسب اور خاندان

نام ونسب

علی بن ابی طالب (ابو طالب کا نام عبد مناف ہے) بن عبد المطلب (عبد المطلب کو شیبۃ الحمد کا نام بھی دیا گیا ہے) بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ [1]

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں۔ نسب میں ان کے جد اول عبد المطلب بن ہاشم کے ساتھ جا ملتے ہیں۔ ان کے والد ابو طالب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد حضرت عبد اللہ کے حقیقی بھائی ہیں۔ ولادت کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام اسد تھا۔ یہ نام ان کی والدہ نے اپنے والد اسد بن ہاشم کے نام پر رکھا تھا۔ اس کی دلیل غزوۂ خیبر کے موقع پر ان کے رجزیہ شعر میں ملتی ہے۔ انھوں نے فرمایا:

«أَنَا الَّذِي سَمَّتْنِی أُمِّی حَیْدَرَہْ کَلَیْثِ غَابَاتٍ کَرِیہِ الْمَنْظَرَہ»

”میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے جنگل کے اس شیر کی مانند جو خوفناک منظر کا حامل ہو۔“ [2]

---

[1] الطبقات الکبری: 19/3، وصفة الصفوة: 308/1، والبدایة والنهایة: 333/7، والإصابة: 507/1. [2] الریاض النضرة في مناقب العشرة، ص: 617. حیدر: شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

ان کی ولادت کے وقت حضرت ابو طالب موجود نہیں تھے، جب وہ آئے تو انھیں یہ نام اچھا نہیں لگا، انھوں نے ان کا نام علی رکھ دیا۔ [1]

کنیت

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ان کی کنیت ابوالحسن ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی والدہ فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوتراب بھی بیان کی جاتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرحمت فرمائی تھی۔ جب انھیں اس کنیت سے پکارا جاتا تو بہت خوش ہوتے تھے۔ اس کا سبب یہ بنا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے۔ علی رضی اللہ عنہ کو گھر میں نہ پایا۔ پوچھا: ''تمھارے چچا کے بیٹے کہاں ہیں؟'' وہ فرمانے لگیں، میرے اور ان کے درمیان کچھ ان بن ہوئی تھی، ناراض ہو کر چلے گئے ہیں، انھوں نے گھر میں قیلولہ بھی نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا: ''دیکھو! وہ کہاں ہیں؟'' اس نے واپس آ کر بتایا: اللہ کے رسول! وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ لیٹے ہوئے ہیں۔ اوڑھنے والی چادر ایک جانب سے گری ہوئی ہے اور جسم پر مٹی لگی ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جسم سے مٹی پونچھتے ہوئے فرمایا: «قُمْ أَبَا تُرَابٍ، قُمْ أَبَا تُرَابٍ» ''اٹھو اٹھو، اے ابوتراب!'' صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ان کی یہ کنیت رکھی تھی۔ [2] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دیگر کنیتوں میں ابوالحسن کے علاوہ ابوالحسین، ابوالقاسم الھاشمی [3] اور ابوالسبطین بھی شامل ہیں۔

لقب

آپ کا لقب امیر المومنین ہے اور آپ چوتھے خلیفۂ راشد ہیں۔ [4]

[1] غريب الحديث للخطابي: 170/2، وخلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد بن علي فقيهي، ص: 18. [2] صحيح البخاري، حديث: 441، 3703. [3] البداية والنهاية: 223/7. [4] تاريخ الإسلام للذهبي، ص: 376، والبداية والنهاية: 223/7، وخلاصة تهذيب الكمال: 250/2.

پیدائش

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تاریخ پیدائش کے تعین میں متعدد اور مختلف روایات ملتی ہیں۔[1] حسن بصری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت بعثت سے پندرہ یا سولہ سال پہلے ہوئی۔ ابن اسحاق کا قول ہے کہ ان کی ولادت بعثت سے دس سال پہلے ہوئی۔[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انھی کی رائے کو ترجیح دی ہے۔[3]

محمد بن علی الباقر سے اس بارے میں دو قول نقل کیے گئے ہیں:

- ایک قول تو وہی ہے جس کا ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے اور ابن حجر نے اسے قابل ترجیح قرار دیا ہے، یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت بعثت سے دس سال قبل ہوئی۔[4]
- دوسرے قول کے مطابق ان کی ولادت باسعادت بعثت سے پانچ سال پہلے ہوئی۔[5]

تاہم میرا میلان ابن اسحاق اور ابن حجر رحمہ اللہ کی رائے کی طرف ہے، لہٰذا مبنی بر تحقیق بات، بعثت سے دس سال پہلے ہی کی ہے۔[6]

''اخبار مکہ'' کے مؤلف علامہ فاکہی کا کہنا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ بنو ہاشم میں سے تھے۔ وہ کعبہ کے اندر پیدا ہونے والی پہلی شخصیت ہیں۔[7] امام حاکم کے بقول یہ روایات تواتر سے ملتی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیدائش کعبہ کے اندر ہوئی۔[8]

قبیلہ قریش

تمام عرب نے قریش کے حسب نسب کی رفعت، قیادت کی اہلیت، زبان کی فصاحت،

---

[1] المعجم الكبير للطبراني: 95/1، حديث: 163. [2] السيرة النبوية: 262/1، بلا سند کے مذکور ہے۔
[3] الإصابة: 591/2. [4] المعجم الكبير للطبراني: 96/1، حديث: 160. [5] المعجم الكبير للطبراني: 96/1، حديث: 166، محمد الباقر تک اس کی سند صحیح ہے۔ [6] فتح الباري: 174/7، والإصابة: 507/2.
[7] أخبار مكه للفاكهي: 226/3، سندہ ضعیف۔ [8] المستدرك للحاكم: 483/3، یہ قول بلا سند اور ضعیف ہے۔

کریمانہ اخلاق اور بہادری و جوانمردی کے اوصاف تسلیم کیے ہیں جس میں کسی بحث و اختلاف کی گنجائش نہیں۔ وہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی شریعت کے بڑے حصے پر کاربند اور باہمی الفت و محبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ ان بدوؤں کی طرح نہیں تھے جنھیں نہ دین نے باوقار بنایا نہ وہ آدابِ زندگی سے مزین ہوئے۔

قریش اپنی اولاد سے محبت کرتے تھے، بیت اللہ کا حج کرتے تھے، مناسکِ حج قائم کرتے تھے، اپنے مردوں کو کفن پہناتے تھے، حالتِ جنابت میں غسل کرتے تھے، پروہتوں اور ظالم سرداروں سے بیزار تھے۔ مجوسیت سے دور تھے۔ غیرت کے باعث، بیٹی، نواسی، ہمشیرہ اور بھانجی سے نکاح سے پرہیز کرتے تھے۔ قرآن نازل ہوا تو اس نے ان کے اس اچھے کردار اور عمدہ آداب کو صحیح قرار دیا۔ وہ حق مہر اور گواہوں کی بنیاد پر شادی کرتے تھے اور طلاقیں دیا کرتے تھے۔[1] ان کے ہاں شرف و اعزاز کی بات یہ تھی کہ وہ کسی بھی قبیلہ سے رشتۂ ازدواج اختیار کرنے سے پہلے یہ شرط لگاتے تھے کہ وہ اپنے دین پر پختہ کار ہو۔ ان کے لیے یہی بڑا شرف و اعزاز تھا کہ ان کی بات کو تسلیم کر لیا جائے۔

بنو ہاشم

رہے بنو ہاشم تو وہ قریش میں ربط و تعلق کی بنیاد تھے۔ جب ہم تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں ان کے واقعات اور اقوال پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کریمانہ انسانی جذبات و احساسات والے تھے۔ ہر چیز میں اعتدال پر قائم رہتے تھے، عقل و بصیرت میں دوسروں سے برتر اور ایمانی قوت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس گھرانے کا بڑا مقام تھا، وہ ظلم سے نفرت کرتے تھے اور حق کی مخالفت سے بہت دور تھے۔ بڑے عالی ہمت تھے، ضعیف و مظلوم پر شفقت و مہربانی کرتے تھے، سخاوت اور شجاعت کے پتلے تھے۔

[1] المرتضى للندوي، ص: 22، و بلوغ الإرب في معرفة أحوال العرب: 243/1.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد کی سیرت بڑی فضیلت والی تھی۔ ان کے محاسن اعلیٰ اخلاق کی طرف دعوت دیتے تھے۔ انھوں نے زمانۂ فترت، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیانی وقفے میں زندگی بسر کی، اس لیے ان کے عقائد وعبادات اس دور کے مروجہ عقیدوں سے مختلف نہیں تھے۔[1] معاشرہ میں بنو ہاشم کے اس مقام ومنزلت کی وجہ قربانی، ایثار اور انسانیت کی خدمت کی درخشاں صفات تھیں۔

عبدالمطلب بن ہاشم

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دادا جناب عبدالمطلب، اپنے چچا مطلب کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے اور مہمان نوازی کی نگرانی پر مامور ہوئے۔ آپ نے ان دونوں امور کی ذمہ داری نہایت خوش اسلوبی سے انجام دی۔ آپ نے اپنے آباء واجداد کی راہ پر چلتے ہوئے اپنی قوم کو بھی برقرار رکھنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ اپنی قوم کی طرف سے آپ کو جو شرف واعزاز ملا، آپ کے آباء میں سے کوئی اس مقام پر نہ پہنچ سکا۔ ان کی قوم نے ان سے گہری محبت کا رویہ اختیار کیا جس سے ان کی شان بہت بلند ہوگئی۔[2]

عبدالمطلب قریش کے ممتاز سردار ضرور تھے مگر وہ کوئی امیر آدمی نہیں تھے۔ وہ قصیٔ کی طرح مکہ کے ہمہ مقتدر سردار بھی نہیں تھے۔ مکہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو مال ودولت اور طاقت میں ان سے بڑھ کر تھے، لیکن معزز وہی قرار پائے کیونکہ پانی پلانے، حاجیوں کی مہمان نوازی اور زمزم کے کنویں کی نگرانی انھی کے حصے میں آئی۔ ان کا یہ اعزاز بیت اللہ کی نسبت سے وابستہ تھا۔ آپ کے دادا عبدالمطلب کا ایمان اس وقت روشن صورت اختیار کر گیا جب انھوں نے کہا کہ دنیا کے بت کدوں میں یہ پہلا گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں عظیم مرتبے کا حامل ہے اور میں اس کا حامی اور محافظ ہوں۔[3]

---

[1] بلوغ الإرب في معرفة أحوال العرب: 243/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 142/1.
[3] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام لجواد علي: 78/4، والمرتضى، ص: 22.

عبدالمطلب اور یمن میں نجاشی کے گورنر ابرہہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بھی قریش کے اس سردار کی اعلیٰ نفسیات اور مضبوط شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب ابرہہ مکہ پر چڑھ دوڑا اور بیت اللہ کی توہین ہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت ہی ختم کرنے کا ناپاک ارادہ کرلیا۔ ساتھ ہی اس نے عبدالمطلب کے دوسو اونٹ پکڑ لیے۔ وہ ابرہہ سے ملنے گئے۔ اس نے ان کی تعظیم کی، اپنے تخت سے نیچے اترا۔ انھیں اپنے ساتھ بٹھایا اور ان سے ان کا مسئلہ دریافت کیا۔ انھوں نے کہا: میرا مسئلہ صرف یہ ہے کہ مجھے میرے دوسو اونٹ لوٹا دیے جائیں۔ جب انھوں نے یہ کہا تو ابرہہ نے ان اونٹوں سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور انھیں واپس کرنے کی حامی بھرلی۔ اس بات کو معمولی سمجھتے ہوئے اس نے کہا: آپ مجھ سے ان دوسو اونٹوں کی بات کررہے ہیں مگر آپ کو اس گھر کی کوئی فکر نہیں ہے جس پر آپ کے اور آپ کے آباء واجداد کے دین کی بنیاد ہے۔ میں اسے ڈھانے آیا ہوں، کیا اس کے بارے میں آپ مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے؟ جناب عبدالمطلب نے فرمایا: میں تو بس اپنے اونٹوں کا مالک ہوں۔ جبکہ اس گھر کا مالک خود ہی اس کی حفاظت فرمائے گا۔ ابرہہ نے کہا: وہ مجھے نہیں روک سکتا۔ انھوں نے جواب دیا: تم جانو اور تمھارا کام۔[1]

وہی ہوا جو جناب عبدالمطلب نے کہا تھا۔ مالک حقیقی نے اپنے گھر کی حفاظت کی اور ابرہہ اور اس کا لشکر ناکام ونامراد ہوا۔

جناب عبدالمطلب اپنی اولاد کو ظلم اور سرکشی سے باز رہنے کا حکم دیتے تھے۔ انھیں مکارم اخلاق کی تلقین فرماتے تھے۔ انھیں خسیس اور گھٹیا کاموں سے روکتے۔[2]

اسّی سال سے زیادہ عمر پا کر وہ وفات پا گئے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ سال کے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی وفات سن پانچ سو اٹھتر (578) عیسوی میں ہوئی۔[3] کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات پر فضا سوگوار ہوگئی۔ مکہ کے بازار اور میلے بہت دن تک بند رہے۔[4]

[1] السيرة النبوية لابن هشام:49/1، والمرتضى، ص: 23. [2] بلوغ الإرب:324/1. [3] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:78/4. [4] أنساب الأشراف للبلاذري:78/1.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد جناب ابو طالب

جناب ابو طالب بے مال وزر تھے۔ اپنے بھتیجے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ کہیں بھی ان کے آنے جانے میں ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ دادا کے بعد آپ کے سرپرست جناب ابو طالب ہی بنے اور ہمیشہ انھی کے ساتھ رہے۔[1] جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی اور کھلم کھلا اعلانِ حق کیا تو ابو طالب آپ کی حمایت میں ڈٹ کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے آپ کی نصرت کرنے اور کسی بھی حالت میں آپ ﷺ کی مدد سے دستبردار نہ ہونے کا اعلان کیا۔ اس بات سے اہل قریش بھڑک اٹھے۔ ان کے غم و غصے، حسد اور مکر و فریب میں شدت آگئی۔ رسول اللہ ﷺ سے جناب ابو طالب کی شیفتگی اور رواداری کی بڑی حیران کن باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ جناب ابو طالب نے اپنے انجام کو اپنے مقدس بھتیجے کے انجام سے وابستہ کردیا تھا۔ انھوں نے بنی ہاشم کے سردار ہونے کا یہ فائدہ اٹھایا کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کے مسلمانوں اور مشرکوں کو موت وحیات کے وقت ایک ہی معاہدے میں منسلک کردیا۔[2] انھوں نے اپنے بھتیجے حضرت محمد ﷺ کو ڈنکے کی چوٹ پر ایسی کھلم کھلا پناہ دی جس میں پسپائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔

جناب ابو طالب نے اپنے بھتیجے کی مدد جاری رکھی اور اپنے ولولہ انگیز اشعار و افکار سے پورے قریشی معاشرے کو ہلا ڈالا۔ جب بعض قبائل کے افراد کے دلوں میں اسلام کی حقانیت ٹھاٹھیں مارنے لگی تو قریش جمع ہوئے۔ انھوں نے سازش کی کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کے خلاف باہم مل کر ایک معاہدہ کیا جائے کہ نہ تو ان کے ساتھ شادی بیاہ کریں گے، نہ ان سے خرید و فروخت کا کوئی تعلق رکھیں گے اور نہ کسی قسم کا کوئی لین دین کریں گے۔ انھوں نے اس معاہدے کی ایک تحریر لکھی اور کعبۃ اللہ کے درمیان لٹکا دی اور پھر اس پر جمے رہے۔

[1] المرتضی، ص: 24، والسیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 179/1. [2] فقہ السیرۃ النبویۃ للغضبان، ص: 184.

بنو ہاشم اور بنو مطلب، سب ابو طالب کی حمایت میں شعب ابی طالب میں چلے گئے۔ یہ نبوت کے ساتویں سال ماہ محرم کا واقعہ ہے۔ بنو ہاشم تقریباً تین سال تک محبوس رہے۔ ان کے پاس خفیہ طور پر ہی کوئی چیز پہنچ پاتی تھی۔ آخر کار اس تحریر کو دیمک نے چاٹ لیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کو اس تحریر کی بوسیدگی، پراگندگی اور بے وقعت ہو جانے کی خبر دی۔[1]

جناب ابو طالب نے نبوت کے دسویں سال 15 شوال کو وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر اسّی (80) سال سے کچھ اوپر تھی۔ انھوں نے اسلام بھی قبول نہیں کیا۔ اسی سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا فوت ہوئیں۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلسل آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا، اسی لیے اس سال کو عام الحزن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ

جلیل القدر صحابیہ سیدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔ وہ پہلی ہاشمی خاتون ہیں جنھوں نے ہاشمی بیٹے کو جنم دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب ابو طالب نے اپنے والد عبد المطلب کی وصیت کے مطابق آپ کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دوران میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بہت خیال رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کی وفات کے بعد یہی عظیم خاتون آپ کی والدہ کے درجے میں تھیں۔ وہ آپ کے تمام کام انجام دیتی تھیں اور آپ کی تمام ضروریات کا بھرپور خیال رکھتی تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے زیر سایہ بسر کیا اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے اس دعوت پر لبیک کہا اور قبول اسلام کے لیے سبقت لے جانے والی اولین شخصیات شمار ہوئیں۔ آپ ان خواتین اسلام میں بہت ممتاز

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/373-377، والمرتضى، ص: 26. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 1/415-416، والمرتضى، ص: 26.

تھیں جنھوں نے فضیلت کے میدان میں بلند مقام حاصل کیا۔ آپ نے سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے معاملہ میں بھی نہایت شفقت ومہربانی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ اور ان کے عزت مآب والد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے مثال حسن سلوک کا برتاؤ کیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے اپنی والدہ سے کہا: میں فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پانی کا انتظام کرنے اور ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوں اور وہ آپ کے لیے آٹا پیسنے اور گوندھنے کے لیے کافی ہیں۔[2]

حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا کے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق خاطر نے ان کی شخصیت میں حفظ حدیث اور روایت حدیث کے امتیازی اعزاز کا اضافہ کر دیا۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مجموعۂ حدیث روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں آپ کا درجہ بہت اونچا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں خاص طور پر تحائف پیش فرماتے تھے۔ امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب «ابن ماجہ» میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک حُلّہ (چادروں کا جوڑا) ہدیے کے طور پر پیش کیا گیا جس کا تانا بانا ریشم سے بنا ہوا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حلہ میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اسے کیا کروں؟ کیا میں اسے پہن سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، اس سے فاطماؤں کے لیے اوڑھنیاں بنا دو۔''[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمدہ ریشم بطور ہدیہ مجھے بھجوایا اور فرمایا میں نے اسے کاٹ کر چار حصے کر لیے۔ ایک اوڑھنی فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، ایک اپنی والدہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا کو اور ایک فاطمہ بنت حمزہ رضی اللہ عنہا کو دے دی۔ (راوی کا کہنا ہے کہ) انھوں نے چوتھی خاتون کا ذکر نہیں کیا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ وہ چوتھی عورت حضرت علی کے بھائی عقیل کی بیوی فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ ہے۔[4]

---

[1] نسب قریش، ص: 40، وفضائل الصحابة: 685/2. [2] مجمع الزوائد: 356/9، اس حدیث کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔ [3] سنن ابن ماجه، حديث: 3596. [4] الإصابة: 27/8، رقم: 11593.

سیدہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا اپنی زندگی میں بھی اور وفات کے وقت بھی بابرکت قرار پائیں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ان کی وفات ہوئی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر ان کی بہت عزت وتکریم فرمائی۔ ان کی تدفین کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جو روایت مروی ہے، وہ انتہائی ضعیف ہے۔ وہ جن جن سندوں سے روایت ہوئی ہے وہ تمام ضعیف ہیں۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی

جناب ابو طالب کے چار بیٹے تھے، ان کے نام طالب، عقیل، جعفر اور علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو بیٹیاں ام ہانی اور جُمانہ تھیں۔ یہ سب اولاد حضرت فاطمہ بنت اسد سے تھی۔ ان میں سے ہر بھائی کے درمیان دس سال کا فرق تھا۔ طالب، عقیل سے دس سال بڑے تھے اور جعفر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دس سال بڑے تھے۔ [2]

طالب بن ابی طالب

غزوۂ بدر کے بعد طالب، شرک کی حالت میں فوت ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کہیں چلے گئے اور پھر واپس نہیں آئے، بعد میں ان کا کوئی پتہ ہی نہیں چل سکا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت کرتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کے مدحیہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ مجبوری کی حالت میں بدر کی جانب نکلے۔ ان کے اور قریشیوں کے درمیان اس موقع پر مکالمہ بھی ہوا، قریشی کہنے لگے: اے بنی ہاشم! اللہ کی قسم! ہم جانتے ہیں، اگرچہ تم ہمارے ساتھ نکلے ہو لیکن تمھارے دل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہیں۔ بعد ازاں طالب دیگر لوگوں کے ساتھ واپس مکہ چلے آئے، وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں قصیدہ کہا اور اصحابِ قلیب بدر پر آنسو بہائے۔ [3]

---

[1] أمير المؤمنين علی بن أبي طالب لأحمد السيد، ص:24. [2] البداية والنهاية: 223/7، والمرتضی للندوی، ص: 26. [3] الجوهرة في نسب النبی و أصحابه، والمرتضی للندوي، ص: 23.

عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

ان کی کنیت ابو یزید ہے، وہ فتح مکہ کے سال ایمان لائے، کہا جاتا ہے کہ وہ حدیبیہ کے واقعہ کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تھے، انھوں نے سن آٹھ ہجری کو ہجرت کی، بدر کے موقع پر قیدی بنے تو ان کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کو آزادی دلائی۔ صحیح احادیث میں مختلف مقامات پر ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ غزوۂ موتہ میں شریک ہوئے، فتح مکہ اور غزوہ حنین میں ان کا ذکر نہیں ملتا شاید ان مواقع پر وہ بیمار تھے، ابن سعد نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن زبیر بن بکار نے اپنی سند کے ساتھ حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عقیل، غزوۂ حنین کے موقع پر ثابت قدم رہے۔ ان کی وفات خلافت معاویہ کے دوران ہوئی۔ امام بخاری نے التاریخ الصغیر میں صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انھوں نے حَرّہ کے واقعہ سے پہلے خلافت یزید کے ابتدائی دور میں وفات پائی۔[1] اس وقت ان کی عمر چھیانوے (96) سال تھی۔[2]

جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

وہ اسلام قبول کرنے والوں میں سابقین میں سے ہیں، مساکین سے بڑی محبت کرتے تھے، ان کے ساتھ بیٹھتے تھے، ان کی خدمت کرتے تھے اور ان سے خوب گفت وشنید کیا کرتے تھے۔ انھوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کی، نجاشی اور اس کے پیروکاروں نے انھی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ میں نے ان کے متعلق اپنی کتاب ''السیرۃ النبویۃ'' میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ شام کی سرزمین میں موتہ کے مقام پر دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔[3]

---

[1] الإصابة فی تمییز الصحابة: 2/494. [2] المرتضی للندوی، ص: 24. [3] المرتضی للندوی، ص: 25.

ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد ہیں، ان کا نام فاختہ بتایا جاتا ہے، بعض نے ان کا نام فاطمہ اور بعض نے ہند بتایا ہے۔ پہلا نام ہی زیادہ مشہور ہے۔ وہ ہبیرہ بن عمرو بن عائذ مخزومی کی زوجہ تھیں، ان سے ان کا بیٹا عمرو ہے اور اسی سے ان کی کنیت معروف ہوئی۔ فتح مکہ کے موقع پر ام ہانی نے بنی مخزوم کے دو آدمیوں کو پناہ دی۔ ام ہانی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بھی کی ہے۔ ان سے مروی احادیث صحاح ستہ اور دیگر کتب میں پائی جاتی ہیں۔[1] امام ترمذی اور دیگر علمائے کبار کا کہنا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد تک زندہ رہیں۔[2]

جمانہ بنت ابی طالب

وہ ام عبداللہ بن ابی سفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہیں۔ ابن سعد نے، ان کی والدہ فاطمہ بنت اسد کے حالات زندگی میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہنوں کے باب میں ان کا الگ حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ ابوسفیان بن حارث سے ان کی ایک بیٹی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے مال میں سے ان کو تیس (30) وسق عطا فرمائے۔[3]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ازواج واولاد

فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ اور دو صاحبزادیاں زینب کبریٰ اور ام کلثوم کبریٰ پیدا ہوئیں۔ سیدہ فاطمہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سب سے پہلی بیوی ہیں، ان کی وفات تک انھوں نے کسی سے شادی نہ کی۔ خولہ بنت جعفر بن قیس بن مسلمہ سے محمد بن الحنفیہ پیدا ہوئے۔ لیلیٰ بنت مسعود بن خالد سے عبیداللہ اور ابوبکر پیدا ہوئے۔ ام البنین بنت حزام سے عباس اکبر، عثمان، جعفر اکبر اور عبداللہ پیدا ہوئے۔ اسماء بنت عمیس

[1] المرتضی للندوی، ص: 27. [2] الإصابة: 9/318,317. [3] الإصابة: 4/259-260، والمرتضی، ص: 27.

سے یحییٰ اور عون[1] پیدا ہوئے۔ صھباء[2] سے عمر اکبر کے علاوہ رقیہ پیدا ہوئیں۔ امامہ[3] بنت العاص سے محمد الأوسط اور ام سعید بنت عروہ ام الحسن اور رملۃ الکبری پیدا ہوئیں۔ اور امہات الاولاد سے محمد الاصغر، ام ہانی، میمونہ، زینب صغری، رملہ صغری، ام کلثوم صغری، فاطمہ، امامہ، خدیجہ، ام الکرام، ام سلمہ، ام جعفر، جمانہ اور نفیسہ پیدا ہوئیں اور مُحیاۃ بنت امرء القیس سے ایک ہی بیٹی پیدا ہوئی۔

ابن سعد کہتے ہیں: مذکورہ اولاد کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کے حوالے سے اور کوئی صحیح بات ثابت نہیں ہے۔[4] ان کی صلبی اولاد میں سے چودہ (14) بیٹے اور انیس (19) بیٹیاں ہیں۔ بعض نے سترہ بیٹیاں کہا ہے۔ ان کی اولاد میں سے پانچ صاحبزادوں سے نسل آگے چلی۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: الحسن، الحسین، محمد بن الحنفیہ، العباس بن الکلابیہ اور عمر بن التغلبیہ۔[5] سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد کے بارے میں تفصیل آگے آرہی ہے۔

شکل وشباہت

ابن عبدالبر کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ میانہ قد تھے، آنکھوں کی سیاہی انتہائی سیاہ اور سفیدی انتہائی سفید تھی۔ چودھویں کے چاند کی طرح خوبصورت تھے۔ پیٹ بڑا تھا، کندھے چوڑے تھے، ہتھیلیاں مضبوط لیکن نرم ونازک تھیں۔ ان کی گردن چاندی کی صراحی جیسی تھی، سر پر بال صرف پچھلی جانب تھے، ڈاڑھی مبارک بڑی تھی، کندھے اوپر کو نکلے ہوئے، بازو کلائی سے الگ واضح نہ تھے، گویا ایک دوسرے سے پیوستہ تھے۔ جب چلتے تو خود اعتمادی سے چلتے تھے۔ کسی کا بازو پکڑتے تو اپنا سانس روک لیتے تھے۔ جسم کا وزن زیادہ تھا۔ کلائیاں اور ہاتھ مضبوط تھے، جنگ کی طرف رواں دواں ہوتے تو چلنے اور دوڑنے کے بین بین حالت وکیفیت اختیار فرماتے تھے۔ دل کے بہت مضبوط، طاقتور اور بہادر تھے۔[6]

[1] البداية والنهاية: 332/7. [2] وہ ام حبیب بنت ربیعہ ہیں، صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں عین التمر کے قیدیوں میں سے ہیں۔ [3] ان کی والدہ زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ [4] الطبقات الكبرى: 7/331-333.
[5] الطبقات: 3/19-20. [6] الإستيعاب في معرفة الأصحاب: 3/1123.

قبول اسلام سے ہجرت تک
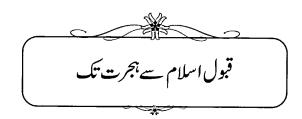
حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا کرم اور احسان ہوا کہ اللہ نے ان کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ کرلیا تھا۔ قریش پر مشکل اوقات آتے رہے۔ ابو طالب عیال دار تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متمول چچا عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: اے عباس! آپ کے بھائی ابو طالب کثیر العیال ہیں۔ آپ کو معاشی مشکلات کا اندازہ بھی ہے۔ آؤ چلیں! ان کے عیال کا کچھ بوجھ کم کریں، ایک بچہ میں لے لیتا ہوں، ایک آپ لے لیں، ہم ان کی کفالت کریں گے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حامی بھرلی۔ دونوں جناب ابو طالب کے پاس آئے اور اپنی رائے پیش کی۔ انھوں نے کہا: عقیل کو میرے لیے چھوڑ دو، باقی جیسے مناسب سمجھو کرلو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو اپنے دامن سے چمٹا لیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جعفر کو لے لیا۔ علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی رہے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مبعوث فرمایا تو علی رضی اللہ عنہ نے ان کی پیروی کی، ان کی نبوت کا اقرار کیا اور ان کی تصدیق کی۔ جعفر رضی اللہ عنہ، عباس رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، تا آنکہ انھوں نے اسلام قبول کیا، پھر ان سے مستغنی ہو گئے۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دادا عبدالمطلب کی وفات کے بعد چچا ابو طالب کی جانب سے ان کی سرپرستی، کفالت اور حسن سلوک کا ان کو اچھا بدلہ دیا۔ یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بہت بڑی نعمت اور احسان عظیم بن گئی۔ ان کے مربی اور ادب

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 246/1.

سکھانے والے حضرت محمد ﷺ وہ شخصیت تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ادب سکھایا، ان کی حفاظت کی اور ان کا خاص خیال رکھا۔ حضرت محمد ﷺ کے اخلاق و اوصاف سراپا قرآن تھے، یہ قرآنی اخلاق حضرت علی رضی اللہ عنہ پر منعکس ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے لیے یہی مبارک بات کافی ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کے زیر سایہ اسلام کے گھر میں پرورش پائی اور زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اسرارِ اسلام سے واقف ہو گئے۔ یہ اس وقت ہوا جب اسلام کی دعوت نے ابھی تک خانۂ نبوت سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ اسلام کو ایسے اعوان و انصار کی تلاش تھی جو اس کا ہاتھ مضبوط کریں اور اسے لوگوں کی دنیا میں لے چلیں تاکہ وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قبول اسلام کے بعد، اسلام قبول کرنے والی اولین شخصیت کون سی تھی؟ کیا وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں یا حضرت علی رضی اللہ عنہ؟ میرا میلان اس طرف ہے کہ آزاد مردوں میں اولین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ عورتوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں اور غلاموں میں سے زید بن حارثہ ہیں۔[1] لیکن بالاِطلاق قبولِ اسلام میں اولین شخصیت سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شمار بچوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں ہوتا ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مسلمان ہونے کے بعد نبی ﷺ کے پاس آئے تو ان دونوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا، اے محمد! (ﷺ) یہ کیا عمل ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''یہ اللہ کا وہ دین ہے جسے اس نے اپنے لیے منتخب فرمایا ہے اور یہی دین رسولوں کو عطا کر کے مبعوث

[1] البداية والنهاية:3/26-28.

فرمایا ہے، میں تمھیں بھی ایک اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا ہوں۔ اب تمھیں لات وعزی کا انکار کرنا ہوگا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یہ ایسی بات ہے جو میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی۔ جب تک میں اپنے والد ماجد ابو طالب کو نہ بتادوں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے کہ واضح طور پر اعلان اسلام سے پہلے یہ راز کھل جائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے علی! جب تک تم اسلام قبول نہیں کرتے، اسے ظاہر نہ کرنا۔'' چنانچہ علی رضی اللہ عنہ اس رات رک گئے اور انتظار کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی۔ صبح ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے مجھ سے کیا بات کہی تھی؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم یہ گواہی دو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اور لات وعزی کا انکار کرو اور اللہ تعالیٰ کے مدمقابل سے بیزاری کا اظہار کرو۔'' یہ ارشاد عالی سنتے ہی حضرت علی نے فوراً اسلام قبول کرلیا اور وہی کیا جو انھیں کہا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے والد جناب ابو طالب کے خوف سے کچھ عرصے تک اپنے اسلام کو ظاہر نہیں کیا۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابو طالب کے مابین مکالمہ

ابن اسحاق کہتے ہیں: بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ جب بھی نماز کا وقت ہوتا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی گھاٹیوں کی طرف چلے جاتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے والد، چچاؤں اور دیگر لوگوں سے چھپ کر آپ کے ساتھ روانہ ہوجاتے تھے۔ وہاں نمازیں ادا کرتے تھے، جب شام ہوجاتی تو واپس آجاتے تھے۔ مشیت الٰہی کے مطابق وہ اسی طرح کرتے رہے۔ ایک دن ابو طالب نے ان دونوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

[1] البداية والنهاية: 3/4.

پوچھا: میرے بھتیجے! یہ کون سا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: ''چچا جان! یہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور ہمارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے بندوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ چچا جان! آپ میری خیر خواہی اور نصیحت کے زیادہ مستحق ہیں۔ ہدایت کی دعوت قبول کرنے اور اس بارے میں میری مدد کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔''

ابو طالب نے کہا: میرے بھتیجے! میں اس راستے اور دین کو نہیں چھوڑ سکتا جس پر میرے آباء و اجداد چلتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن میں جب تک زندہ ہوں تمھیں کسی تکلیف اور پریشانی کی زد میں نہیں آنے دوں گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ پھر انھوں نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: بیٹے! یہ کیا دین ہے جسے تم نے اختیار کر رکھا ہے؟ انھوں نے کہا: ابا جان! میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکا ہوں اور جو دین وہ لے کر آئے ہیں میں نے اس کی تصدیق کی ہے۔ ان کے ساتھ نماز ادا کی ہے اور ان کی پیروی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے علی رضی اللہ عنہ کو کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں خیر و بھلائی ہی کی دعوت دے رہے ہیں، ان کا ساتھ دو![1]

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو طالب کی تدفین کی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ ابو طالب فوت ہو گئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حکم دیا: جاؤ اور انھیں دفن کر دو۔ علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: انھوں نے تو شرک کی حالت میں وفات پائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: جاؤ اور انھیں دفن کر دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب میں تدفین سے فارغ ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آیا تو آپ نے فرمایا: ''غسل کر لو۔''[2]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 246/1، والمرتضى، ص: 35. [2] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حدیث: 759، اس کی سند ضعیف ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جاؤ غسل کرو، پھر سیدھے میرے پاس آؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں غسل کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے میرے لیے دعائیں فرمائیں۔ اس پر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ اگر ان کی جگہ مجھے سیاہ و سرخ اونٹ دے دیے جاتے تب بھی میں اتنا خوش نہ ہوتا۔ راوی حدیث عبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ جب بھی کسی میت کو غسل دیتے تھے، بعد میں غسل فرمالیا کرتے تھے۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ابوذر کی رہنمائی

مکی دور کی اہم خصوصیات میں سے ایک نمایاں بات راز داری ہے، حتی کہ قریبی لوگوں سے بھی اسلام کے بارے میں راز داری برتی جاتی تھی۔ حفاظت کو یقینی بنانے کے احکام رسول اللہ ﷺ کی جانب سے بڑے واضح اور قطعی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو دربار نبوی تک پہنچانے میں بہت احتیاط سے اہم کردار ادا کیا۔

ابوذر رضی اللہ عنہ جاہلیت کی رسموں اور بتوں کی پوجا سے بیزار تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والوں کو منع کرتے تھے۔ وہ اسلام لانے سے پہلے تین سال تک قبلہ رخ ہونے کا اہتمام کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے حضور بندگی پیش کرتے رہے۔ وہ فرماتے تھے: میں تو ملت حنیفی پر ہوں۔

جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے بارے میں سنا تو مکہ تشریف لائے۔ انھوں نے آپ کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنا مناسب خیال نہ کیا، رات ہوگئی۔ آرام کی خاطر لیٹ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا اور پہچان لیا کہ وہ اجنبی ہیں۔ وہ انھیں ساتھ لے گئے اور مہمان نوازی فرمائی۔ ان سے کسی بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا۔ صبح ہوگئی۔ ابوذر رضی اللہ عنہ مسجد حرام کی طرف روانہ ہوگئے، شام تک وہیں رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا تو

---

[1] الصحيح المسند في فضائل الصحابة، ص: 118، مصطفیٰ عدوی کہتے ہیں اگر اس حدیث کی تمام سندوں کو یکجا کیا جائے تو یہ حسن قرار پاتی ہے اور انھوں نے اس حدیث کے دیگر شواہد بھی بیان کیے ہیں۔

دوسری رات بھی ان کی مہمان نوازی کی۔ تیسری رات بھی یہی ماجرا گزرا۔ اب انھوں نے ان سے مکہ میں آمد کا سبب پوچھا۔ جب ابوذر رضی اللہ عنہ کو پورا اعتماد ہوگیا تو انھوں نے بتایا کہ میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرنے کا آرزومند ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں۔ جب صبح ہو تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ اگر مجھے کہیں خطرہ محسوس ہوا تو میں رک جاؤں گا۔ پیشاب کے بہانے ٹھہروں گا۔ اگر میں چلتا رہا تو بدستور میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ بالآخر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے، ان سے ملاقات کی۔ بڑی توجہ سے آپ کی باتیں سنیں اور فوراً اسلام قبول کرلیا۔ نبی اکرم ﷺ نے انھیں فرمایا: اپنی قوم کے لوگوں کے پاس چلے جاؤ۔ انھیں میری باتیں بتاؤ تاآنکہ میرا آئندہ حکم آپ تک پہنچے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس اللہ کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میں مشرکین مکہ کو ببانگ دہل آپ کے ارشادات بتاؤں گا۔ آپ وہاں سے نکلے، مسجد حرام میں آئے اور بلند آواز سے کہا: أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله۔ یہ سن کر لوگ بھڑک اٹھے اور انھیں زمین پر گرا دیا، اسی دوران حضرت عباس رضی اللہ عنہ آ گئے، انھوں نے لوگوں کو قبیلہ غِفار کے انتقام اور تجارتی قافلوں کے لیے ان کی طرف سے رکاوٹ ڈالنے کے انجام سے ڈرایا کیونکہ شام کی طرف آنے جانے والے تجارتی قافلے قبیلہ غِفار کی بستیوں سے ہو کر جاتے تھے، اس طرح حضرت عباس نے اہل مکہ سے ان کی جان بچائی۔[1]

ابوذر رضی اللہ عنہ نے مکہ آنے سے پہلے اپنے بھائی کو بھیجا تھا تاکہ وہ نبی ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کریں، ان کی باتیں سنیں اور واپسی پر انھیں مطلع کریں۔ ان کے بھائی مکہ گئے وہاں کے احوال معلوم کیے، پھر واپس آئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو ساری تفصیل بتائی۔ انھوں نے کہا: میں نے حضرت محمد ﷺ کو دیکھا، وہ اچھے اخلاق کا حکم دیتے ہیں، ان کی گفتگو کو شاعری نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سن کر ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمھاری بات سے میرا مقصد پورا نہیں

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري: 173/7، و صحيح مسلم، حديث: 2473.

ہوا۔ مجھے پوری تسلی نہیں ہوئی۔ اب میں بذات خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جاؤں گا۔ ان کے بھائی نے کہا: اہل مکہ سے محتاط رہنا وہ رسول اللہ ﷺ سے بغض وعناد رکھتے ہیں۔

اس واقعہ کے اسباق وفوائد
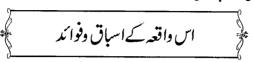
معلومات کے حصول کے لیے مناسب وقت کا انتظار

ابوذر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ قریش ہر اس شخص کو ناپسند جانتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے ملنے آتا ہے، لہٰذا انھوں نے انتظار اور تحمل کی راہ اختیار کی، یہ بات احتیاط اور حفاظتی نقطۂ نگاہ سے ان کے شعور کی عکاس ہے، اگر وہ مکہ آتے ہی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے تو قریش کو معلوم ہو جاتا کہ یہ حضرت محمد ﷺ سے متأثر ہو کر آئے ہیں، اس لیے وہ ان کو اذیت دیتے اور مکہ سے بھگا دیتے، یوں وہ اپنا اصل مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہتے جس کی خاطر انھوں نے طویل سفر کی مشقت اور مشکلات برداشت کی تھیں۔

معلومات کے حصول میں احتیاط

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ان کے بارے میں مکہ آنے کی وجہ پوچھی تو تین دن کی مہمان نوازی کے باوجود نہ وہ بے تکلف ہوئے، نہ انھوں نے احتیاط کا دامن چھوڑا، انھیں کچھ نہیں بتایا، جب یقین واعتماد ہو گیا تو ان پر شرط لگائی کہ وہ ان کا معاملہ رازداری میں رکھیں اور اصل مقصد کے لیے ان کی رہنمائی بھی کریں۔ یہ انتہائی احتیاط کا پہلو ہے۔ محتاط رہنے کے باعث حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔

خفیہ نقل وحرکت

حضرت علی اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما کے درمیان ایک مخصوص اشارے یا معین حرکت پر اتفاق

کرنا، گویا کہ وہ اپنا جوتا ٹھیک کر رہے ہیں یا پیشاب کے لیے بیٹھے ہیں۔ مبادا کوئی ان دونوں کی نگرانی کر رہا ہو یا گھات لگائے بیٹھا ہو۔ مطلوبہ مقام (دارارقم) کی طرف نقل وحرکت کی یہ ایک حکمت عملی تھی۔ مزید برآں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فاصلے پر چل رہے تھے۔ اس صورت کو بھی احتیاط اور ایسے متوقع خطرہ سے بچنے کی کوشش کہا جا سکتا ہے جو شاید نقل وحرکت کے دوران پیش آ جائے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی دانش مندی اور بیدار مغزی

صحابہ کرام کے ہاں حفاظتی شعور کی یہ حالت عام تھی، ان کی شخصیت میں موجزن یہ جذبات، ان کے عمومی و خصوصی تمام تصرفات میں امتیازی علامت بن چکے تھے۔ ان کی نقل وحرکت سوچی سمجھی اور منظّم ہوتی تھی۔ صحابہ کرام میں پائے جانے والے اس شعور سے مزیّن ہونے کی آج ہمیں اشد ضرورت ہے۔

آج کے اس دور میں ملکوں اور تہذیبوں کے زوال وبقاء، قوموں، امتوں، جماعتوں، تنظیموں اور مختلف اداروں کی قوت وکمزوری میں ضروری معلومات کی زبردست اہمیت ہے۔ اس مقصد کے لیے تعلیم وتربیت کے خصوصی ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ نت نئی ترقی یافتہ تکنیک اور خوب سے خوب تر وسائل واسباب، مستقل اہم ساز وسامان کے ساتھ ساتھ بہت بڑے بڑے بجٹ بنائے جا رہے ہیں۔ اب معلومات عام ہو چکی ہیں، خاص طور پر حفاظتی امور کی معلومات مہنگے داموں فروخت ہو رہی ہیں۔ بوقتِ ضرورت ان کے حصول میں جان کی بازی بھی لگا دی جاتی ہے، لہٰذا مسلمانوں کو بھی اپنی بقا اور حفاظت کے لیے حفاظتی منصوبوں کی اہمیت کا ادراک کرنا چاہیے تاکہ ہمارے اہم اسرار و رموز ہمارے دشمنوں کی دست برد سے بچ سکیں۔ [1]

[1] دروس فی الکتمان لمحمود شیت خطاب، ص: 9 اور مؤلف کی کتاب السیرۃ النبویۃ عرض وقائع و تحلیل أحداث: 171/1.

دعوت دین کے لیے رسول اللہ ﷺ کے دوش بدوش

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھ سے بیان فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ عرب قبائل کو اسلام کی دعوت دیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور میں آپ ﷺ کے ساتھ منی کی جانب نکل کھڑے ہوئے اور عربوں کے اجتماعات میں سے ایک اجتماع میں پہنچے، ابوبکر آگے بڑھے اور انھیں سلام کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خیر و بھلائی کے ہر کام میں ہمیشہ آگے آگے رہتے تھے۔ وہ شجرہ ہائے نسب کے ماہر تھے۔ پھر روایت مختصر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا: پھر ہم لوگوں کے ایک اور اجتماع میں پہنچے۔ اس پر سکینت اور وقار چھایا ہوا تھا۔ ابوبکر آگے بڑھے، انھیں سلام کیا اور کہا: آپ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا: شیبان بن ثعلبہ۔ اسی دوران ابوبکر رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ان لوگوں کا شمار شرفاء میں ہوتا ہے۔ ان میں ایک شخص مفروق ہے جو زبان دانی اور حسن و جمال میں لوگوں سے برتر ہے۔ اس کی پیشانی کے دونوں طرف کے بال سینے پر گرے ہوئے تھے۔ اور وہ دوسرے لوگوں کی نسبت مجلس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تم لوگوں کی تعداد کتنی ہے؟ مفروق نے کہا: ہم ایک ہزار سے زیادہ تعداد میں ہیں اور یہ تعداد قلت کے باعث ہرگز مغلوب نہیں ہوسکتی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تمھاری قوت و طاقت کا کیا حال ہے؟ مفروق نے کہا: ہم اس وقت شدید غضبناک ہوتے ہیں جب میدانِ کارزار میں ہوں اور جب ہم غضبناک ہوتے ہیں تو گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ ہم اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کو اولاد پر اور ہتھیاروں کو حاملہ اونٹنیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی امید رکھتے ہیں۔ کبھی ہم فتح یاب ہوتے ہیں اور کبھی ہمارا دشمن۔

پھر مفروق نے کہا: شاید تم قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہو؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر تم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رسول ﷺ مبعوث فرمایا ہے تو وہ یہ ہیں۔ مفروق نے

دریافت کیا: قریشی بھائی! آپ کی دعوت کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کسی اور کے معبود حقیقی نہ ہونے کی گواہی دو، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اللہ کا بندہ اوراس کا رسول ہوں، میرا ساتھ دو میری نصرت کرو! قبیلۂ قریش اللہ تعالیٰ کے خلاف ہم آواز ہوگیا ہے اوراس کے رسول کو جھٹلا دیا ہے، وہ حق کی پروا نہیں کرتا، باطل کا ساتھ دیتا ہے۔ حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ ہی بے پروا اورتعریف کے لائق ہستی ہے۔''

مفروق نے کہا: اس کے علاوہ اورکیا بات ہے جس کی آپ دعوت دیتے ہیں؟ اللہ کی قسم! میں نے آپ کی اس گفتگو سے زیادہ اچھی بات کبھی نہیں سنی۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو! اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو! ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اورانھیں بھی دیں گے اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے، ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ، یہ وہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔''[1]

[1] الأنعام 151:6.

مفروق نے کہا: اللہ کی قسم! آپ نے تو فضائل و اخلاق اور نیک اعمال کی دعوت دی ہے۔ آپ کا انکار کرنے والوں اور آپ کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرنے والوں نے آپ پر جھوٹ باندھا ہے۔ اسی گفتگو کے دوران مفروق نے اس معاملے کا رخ ہانی بن قبیصہ کی طرف پھیر دیا اور کہا: یہ ہمارے بزرگ ہانی ہیں۔ ہمارے ہی دین پر ہیں۔ ہانی نے کہا: قریشی بھائی! میں نے آپ کی بات سن لی ہے۔ جلد بازی اچھی بات نہیں۔ ہم انجام پر غور کیے بغیر ایک ہی نشست میں اپنا دین چھوڑ دیں اور آپ کے دین کی پیروی کریں تو یہ ایک غلط اور کوتاہ نظری کی بات ہوگی۔ ہم اپنے بھائی بندوں پر اپنا فیصلہ ٹھونسنا پسند نہیں کرتے۔ ہم واپس جاتے ہیں آپ بھی واپس چلے جائیے۔ ہم اس مسئلہ پر غور کریں گے۔

پھر اس نے اپنی گفتگو میں مثنی بن حارثہ کو بھی شامل کر لیا، کہنے لگا: یہ مثنی ہیں، ہمارے انتہائی محترم شخص ہیں۔ جنگ کے ماہر ہیں۔ مثنی نے کہا: (جنھوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا) قریشی بھائی! ہم نے آپ کی بات سن لی ہے، اس کا جواب وہی ہے جو ہانی بن قبیصہ نے دیا ہے۔ ہم اس وقت دو پانیوں کے درمیان ہیں، ان میں ایک یمامہ اور دوسرا سمامہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ دو پانی کیا چیز ہیں؟ اس نے کہا: ایک تو کسریٰ کے دریا ہیں اور دوسرا عربوں کا پانی ہے۔ کسریٰ کے دریاؤں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس کے بادشاہ کا قصور وار ہونا، قابل معافی نہیں ہے، اس کے ہاں عذر نا قابل قبول ہے۔ کسریٰ نے ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ ہم کوئی نئی چیز نہ لائیں نہ نئی بات پیش کرنے والے کو پناہ دیں، قریشی بھائی! یہ معاملہ جس کی طرف آپ نے ہمیں دعوت دی ہے، بادشاہ اسے ناپسند کرتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کا ساتھ دیں اور آپ کی نصرت کریں تو عرب کے پانیوں کے ساتھ رہ کر ایسا ممکن ہے۔ [1]

---

[1] البداية والنهاية: 3/142-145، ودلائل النبوة للبيهقي، اس روایت کی سند صحیح ہے۔ ابن کثیر نے بھی ان سے نقل کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے کوئی منفی جواب نہیں دیا۔ تم نے سچ کہا ہے، اللہ کے دین کا مددگار وہی ہوگا جو اس دین میں پورا پورا داخل ہو اور تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے۔ دیکھو! تھوڑے عرصے بعد، اللہ تعالیٰ تمھیں کسریٰ کی زمینوں اور ان کے گھروں کا وارث بنا دے گا، ان کی عورتیں تمھارے زیر نگیں ہوں گی، کیا تم اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرو گے۔''

نعمان بن شریک نے کہا: اے اللہ! تسبیح و تقدیس تیرے ہی لیے ہے۔

جان قربان کرنے کی پیشکش

جب قریش کے لوگ دارالندوہ میں جمع ہوئے اور (نعوذ باللہ) آپ ﷺ سے گلوخلاصی پانے اور آپ کو شہید کرنے پر متفق ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو یہ بات بتادی۔ نبی ﷺ سب لوگوں سے زیادہ دانا تھے۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ آپ کے بستر پر کوئی ایسا شخص موجود رہے جسے ارادۂ قتل سے آنے والے دیکھیں اور اس کے باہر نکلنے کا انتظار کریں، آپ نے اس رات حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا۔ بھلا کون رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سونے کی ہمت کر سکتا تھا جبکہ دشمنوں نے آپ کے گھر کا گھیراؤ کر لیا تھا اور آپ کو شہید کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ کون ان کے گھر میں رہ سکتا تھا جبکہ دشمن آپ کے بستر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین کوئی امتیاز بھی نہیں کر پائے تھے۔ یہ کام وہی انجام دے سکتا تھا جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے انتہائی بہادر ہو۔ [1]

نبی ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ وہ کچھ روز مکہ میں قیام کریں تاکہ آپ دشمنوں کی امانتوں کو بغیر کسی کمی کے پوری طرح ادا کرسکیں اور ان وصیتوں کو پورا کرسکیں، یہ عدل و انصاف اور ادائے امانت کا ایسا واقعہ ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ [2]

ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں فرمایا: میرے بستر پر میری حضرمی

[1] الحكمة في الدعوة إلى الله للقحطاني، ص: 235. [2] الطبقات الكبرى: 22/3، وتاريخ الخلفاء للسيوطي، ص: 166.

چادر اوڑھ کر سو جاؤ، تمھیں دشمنوں کی جانب سے کوئی ناگوار بات پیش نہیں آئے گی۔ [1]

امام ابن حجر کہتے ہیں: موسیٰ بن عقبہ کی ابن شہاب سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سو گئے۔ قریشی باہمی اختلاف کرتے اور سازشوں کا جال بنتے رہے کہ ان میں سے کون بستر والے پر حملہ آور ہو؟ اور انھیں باندھ کر لے آئے، اسی دوران صبح ہوگئی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ تو علی رضی اللہ عنہ تھے۔ ان سے پوچھ گچھ کی، انھوں نے بتایا کہ انھیں کوئی علم نہیں، اس طرح وہ جان گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے گئے ہیں۔ [2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس رات اپنے آپ کو (اللہ تعالیٰ کے ہاتھ) بیچ دیا تھا، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس پہنا اور ان کی جگہ سو گئے۔ [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام جن کے پیش نظر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی خوشنودی اور دار آخرت تھی، کی نسبت یہ ارشاد ربانی نازل ہوا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾

”اور انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو رضاء الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔“ [4]

اسباق وفوائد

❀ ہجرت کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منصوبہ بندی کی، اس کا تقاضا تھا کہ ان کی جگہ گھر میں کوئی آدمی ہو، تاکہ محاصرہ کرنے والوں کی نگاہیں گھر کے اندر نقل وحرکت محسوس کرتی رہیں اور کچھ وقت کے لیے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلے جانے کا پتہ نہ چل سکے تاکہ وہ اور ان کے رفیقِ سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ خطرے کی حدود سے آگے نکل جائیں۔ [5]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 91/2. [2] فتح الباري: 236/7. [3] فضائل الصحابة، حديث: 1168، اس کی سند حسن ہے۔ [4] البقرة 207:2. [5] خلفاء الرسول لخالد محمد، ص: 396.

❁ نبی ﷺ کے حکم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لبیک کہنا، ایک ایسے سچے فدائی کی مثال ہے جو دعوت اسلام کے لیے نہایت مخلص ہے، انھوں نے اپنے قائد کی زندگی کی حفاظت کے لیے قربانی دی کیونکہ قائد کی سلامتی میں دعوتِ دین کی سلامتی تھی اور ان کا شہید ہونا دعوت کی پسپائی ہوتی۔ ہجرت کی رات حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے بستر پر رات بسر کرنا ایک بہت بڑی قربانی تھی کیونکہ اس بات کا زبردست امکان تھا کہ قریشیوں کے نوجوانوں کی تلواریں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر پر چمکتیں اور ان کا کام تمام کر دیتیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس خطرے کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کی۔ ان کی آرزو صرف یہ تھی کہ دعوتِ دین کے قائد حضرت محمد ﷺ سلامت رہیں۔[1]

❁ قریشِ مکہ کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ، پھر ان کے لیے قتل کے منصوبے تیار کرنے کے باوجود انھی کے پاس امانتیں رکھوانا، واضح طور پر ان کے عجیب وغریب تضاد پر دلالت کرتا ہے۔ جب وہ انھیں جھٹلا رہے تھے اور آپ کے ساحر اور مجنون ہونے کا واویلا کر رہے تھے انھیں اپنے اردگرد کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو صدق وامانت میں محمد رسول اللہ ﷺ سے بہتر ہو۔ وہ اپنا سامانِ زندگی اور وہ قیمتی مال جس کے ضائع ہونے کا ڈر ہوتا تھا، انھی کے پاس رکھواتے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کفر، آپ ﷺ کی سچائی میں شک کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ ان کے تکبر اور حق وصداقت کے مقابلے میں اپنی بڑائی اور سرداری کے چھن جانے کے خوف سے تھا۔ اس میں ان کی سرکشی بھی شامل تھی۔[2]

رب کائنات نے سچ فرمایا ہے:

﴿ قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ ۖ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴾

[1] السيرة النبوية للسباعي، ص: 45. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 153.

''(اے نبی!) ہمیں معلوم ہے یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں ان سے تمھیں رنج ہوتا ہے لیکن یہ لوگ تمھیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ اس اضطرابی حالت میں ان کے لیے یہی لازم تھا کہ وہ اپنے تحفظ اور ہجرت کے عظیم پروگرام کی کامیابی ہی پر پوری توجہ مبذول فرماتے لیکن اتنی نازک اور ہیجان انگیز حالت میں بھی انھوں نے ادائے امانت کا فریضہ فراموش نہیں کیا جبکہ ایسی حالت میں انسان خود اپنے آپ ہی کو بھول جاتا ہے۔ یہ احساس فرض ایمانداری اور راست بازی کی ایسی منفرد نظیر ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔[2]

گویا رسول اللہ ﷺ نے امانت میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا، چاہے وہ امانت ایسے دشمن کی ہو جو ان کے قتل کی کارروائی پر تلا بیٹھا ہو، اس کی وجہ یہ تھی کہ امانت میں خیانت کرنا منافقین کی صفت ہے اور مومن تو اس سے اجتناب کرتے ہیں۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہجرت

صبح ہوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے بستر سے اٹھے۔ لوگوں نے انھیں پہچان لیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ جان بچا کر چلے گئے ہیں۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تمھارے ساتھی کہاں ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے کیا معلوم، کیا میں ان پر نگران مقرر ہوا تھا؟ تم نے یہاں سے نکل جانے کو کہا، لہٰذا وہ چلے گئے ہوں گے۔ دشمنوں کو اس جرأت مندانہ جواب پر بڑی مایوسی ہوئی۔ انھیں رسول اللہ ﷺ کے چلے جانے پر بہت غصہ تھا، وہ اپنے دل میں کہہ رہے تھے کہ کیا ہم اندھے ہو گئے تھے کہ انھیں دیکھ بھی نہ سکے۔ انھوں نے حضرت علی کو برا بھلا کہا، مارا پیٹا اور کھینچ کر مسجد کی طرف لے گئے، کچھ دیر کے لیے انھیں قید کر دیا، پھر چھوڑ دیا۔[4]

---

[1] الأنعام 33:6. [2] الهجرة في القرآن الكريم، ص: 364. [3] جولة تاريخية في عصر الخلفاء الراشدين، ص: 423. [4] تاريخ الطبري: 374/2.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ کی راہ میں یہ سب کچھ برداشت کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچ نکلنے پر ان کی خوشی کے مقابلے میں ان پر نازل ہونے والی تمام مصیبتیں ہیچ تھیں۔ ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی تھی، انھوں نے کسی قسم کی کمزوری نہیں دکھائی اور دشمن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کیا۔ وہ مکہ کی سڑکوں پر ان اہل امانت کو تلاش کرتے رہے جن کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ انھوں نے تمام امانتیں مالکوں کو واپس دے دیں۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمے عائد ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گئے۔

انھوں نے تین راتیں مکہ میں بسر کرنے کے بعد، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملنے کی تیاری کی۔[1] ہجرت کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ دن کے وقت چھپ جاتے تھے۔ جب رات ہوتی تو چلتے رہتے تھے، تا آنکہ وہ مدینہ پہنچ گئے، اس دوران آپ کے پاؤں شدید زخمی ہو گئے۔[2] انھوں نے ہجرت کے سفر میں بہت سختیاں برداشت کیں، ان کے پاس سواری نہیں تھی، سخت گرمی تھی۔ دن کو سفر نہیں کرتے تھے، رات کو کرتے تھے۔ رات کے سفر میں انھیں شدید اندھیرے اور پریشان کن تنہائی کا سامنا تھا۔ غور کریں، انھوں نے یہ سارا سفر پیدل طے کیا، کوئی ہم سفر نہ تھا، اس طرح راستے کی سختیاں دو چند ہو گئی تھیں۔ اس اعتبار سے دشوار گزار سفر اور تنہائی کی شدید تکالیف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ان مصائب و آلام اور دشوار گزار گھاٹیوں کو آپ کے شعور نے آسان کر دیا۔ کیونکہ یہ سب مصائب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر جھیلے جا رہے تھے۔ وہ بھی اس عزم و شوق کے ساتھ کہ آخر کار وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملیں گے، ان کی مصاحبت نصیب ہو گی اور مدینہ میں اطمینان سے زندگی بسر کریں گے۔ سفر جاری رہا، بالآخر وہ مدینہ کے قریب قبیلہ بنی عوف کے مساکن میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کیا تھا جا پہنچے۔[3] اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] تاریخ الطبری: 382/2، والبدایة والنھایة: 335/7. [2] الکامل: 106/2. [3] الطبقات الکبریٰ: 22/3، والسیرة النبویة لابن ھشام: 129/2. ابن اسحاق نے اس روایت کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے۔

کی ہجرت قربانی، برداشت، صبر واستقامت، بہادری اور رسول اللہ ﷺ پر فدا ہو جانے کے مبارک جذبے کی عکاس ہے۔

قباء میں قیام کے دوران سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان عورت کو دیکھا۔ اس کا خاوند نہیں تھا ایک آدمی نے آدھی رات کو اس عورت کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا، وہ باہر نکل آئی تھی۔ آدمی اسے کچھ چیزیں دیتا، وہ لے لیتی اور دروازہ بند کر لیتی تھی۔ آیئے! یہ واقعہ انھی کی زبانی سنتے ہیں:

''میں نے اس کی ٹوہ لگائی، ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا۔ اے اللہ کی بندی! یہ کون شخص ہے جو ہر رات تمھارا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، تم باہر نکلتی ہو، وہ تمھیں کچھ دیتا ہے، معلوم نہیں وہ کیا دیتا ہے؟ تم مسلمان عورت ہو اور تمھارا شوہر بھی نہیں ہے۔ وہ کہنے لگی: یہ شخص سھل بن حنیف بن وھب ہے۔ اسے معلوم ہوا کہ میرا کوئی نہیں تو جوں ہی رات ہوتی ہے وہ اپنی قوم کے بتوں کو توڑتا ہے، پھر میرے پاس لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ انھیں ایندھن بنالو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، سھل بن حنیف سے متعلق یہ بات نقل کرتے رہے تا آنکہ وہ عراق میں وفات پا گئے۔''[1]

اس واقعہ سے ہمیں ان کی بیدار مغزی اور اپنے گرد و پیش سے آگاہ رہنے کا اندازہ ہوتا ہے، ہر مسلمان کو اس خوبی سے آراستہ ہونا چاہیے اور اپنے آس پاس رونما ہونے والے مسائل سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

[1] محمد رسول اللّٰہ لصادق عرجون: 421/2.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں قرآن مجید کا کردار
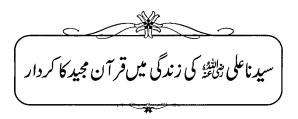
امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی پوری زندگی قرآن ہی کی معیت میں بسر کر دی۔ وہ نہایت عقیدت و محبت سے کلام الٰہی کی تلاوت کرتے تھے، اس پاک کتاب کو حفظ کرتے تھے، اس کے گراں قدر الفاظ و معانی پر غور و فکر کرتے تھے اور اس پر اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں سے عمل کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: جس نے قرآن پڑھا، پھر فوت ہونے کے بعد جہنم کا مستحق قرار پایا، وہ دراصل ان لوگوں میں سے تھا جو اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑاتا تھا۔[1] وہ فرمایا کرتے تھے: ان لوگوں کو مبارک ہو، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں سے زیادہ محبوب تھے۔[2]

فرماتے تھے: میں کسی ایسے عقلمند کو نہیں جانتا کہ وہ رات کو سورہ بقرہ کی آخری تین آیتیں پڑھے بغیر سو گیا ہو۔[3]

قرآن کریم کی قدر و منزلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

یہ عظیم کتاب ہے۔ اس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے اور تمھارے بعد آنے والے لوگوں کی خبر ہے۔ اس میں تمھارے درمیان موجود لوگوں کے لیے احکام ہیں، یہ فیصلہ کن کتاب ہے، کوئی مذاق نہیں ہے۔ کسی سرکش نے اس سے بے رخی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ اسے نیست و نابود کر دے گا۔ جو شخص اس کی بجائے کہیں اور ہدایت تلاش کرے گا، اللہ اسے گمراہ

---

[1] المستطرف: 29/1، وفرائد الكلام، ص: 375. [2] التبيان في آداب حملة القرآن، ص: 146.
[3] التبيان في آداب حملة القرآن، ص: 266.

کردے گا، یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ حکمت و دانائی پر مبنی یاد دہانی ہے۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ اس کی بدولت خواہشات میں کبھی کجی نہیں آتی، زبانوں میں کبھی ابہام پیدا نہیں ہوتا، اس کے عجائبات لامحدود ہیں، یہ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

علمائے کرام اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے، جس نے قرآن کی بات کی اس نے سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا وہ اجر کا مستحق ہوگیا۔ جس نے اس کے مطابق فیصلہ دیا اس نے انصاف کیا۔ جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے سچے اور سیدھے راستے کی طرف رہبری کی۔ [1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن کریم کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے اس سے بہت کچھ سیکھا اور اس کے لافانی علوم حاصل کیے۔ وہ فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم! قرآن کی جو آیت بھی نازل ہوئی مجھے معلوم ہے کہ وہ کس بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ یقیناً میرے پروردگار نے مجھے باشعور دل اور سچ بولنے والی زبان عطا کی ہے۔'' [2]

وہ اکثر فرماتے تھے: ''مجھ سے کتاب اللہ کے مطالب و مفاہیم پوچھو، جو آیت بھی نازل ہوئی، مجھے معلوم ہے کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑوں میں۔'' [3]

ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآن کریم جمع کرلیا تھا۔ [4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی مبارک زندگی کے آخری دنوں میں عراق میں قیام فرما تھے۔ ان دنوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بڑے بڑے اجل علماء بقید حیات تھے۔ اس ہجوم نجوم میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اس سے پہلے کہ میں تمھارے مابین موجود نہ رہوں، مجھ سے قرآن کریم کے مطالب و مفاہیم معلوم کرلو۔''

[1] فضائل القرآن لابن کثیر، ص: 15، وموقف علي أمير المؤمنين (علی). [2] الطبقات الکبری لابن سعد: 338/2 وتاریخ الخلفاء للسیوطی، ص: 152. [3] الصواعق المحرقة: 375/2، والطبقات الکبریٰ: 338/2. [4] الإستیعاب: 1130/3.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مبارک سیرت کا سب سے گرانقدر پہلو یہ تھا کہ آپ جہالت زدہ افراد اور احکام دین سے یکسر نا آشنا لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم، سیرت نبوی کی تدریس اور حق و صداقت کی طرف ان کی رہبری کے لیے بڑے بے قرار رہتے تھے۔ یقیناً سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے اور علمائے ربانی کا یہی طریق کار ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو بھلائی کی تعلیم و تربیت دینے پر ہمیشہ حریص رہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہونے والی آیاتِ مقدسہ

قرآن کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس نبوی معاشرہ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ قرآن کبھی کسی کام پر لوگوں کی تعریف کرتا تھا اور کبھی بعض کاموں سے بچنے کی تلقین اور بعض غلطیوں کی نشان دہی کرتا تھا، چنانچہ بعض ایسی آیات بھی نازل ہوئیں جن کی بدولت امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کے عظیم کارناموں کو بقائے دوام کی سند مل گئی۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے:

﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۖ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ⑳ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ ﴾

''یہ دو فریق ہیں۔ ان کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان کے لیے آگ کے لباس تیار کیے جا چکے ہیں۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا، اس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے بھی گل جائیں گے اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے، جب بھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے، پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے کہ اب جلنے کی سزا کا مزا چکھو۔ (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ان کو اللہ ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، انھیں وہاں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا اور ان کے لباس ریشم کے ہوں گے۔'' [1]

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انھوں نے فرمایا: قیامت کے دن مدمقابل کے خلاف دلیل پیش کرنے والا میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو رحمان کے حضور گھٹنوں کے بل پیش ہوگا۔ قیس بن عبادہ کہتے ہیں یہ آیات مقدسہ جن کے بارے میں نازل ہوئیں وہ جنگ بدر میں شامل وہ لوگ تھے جو ایک دوسرے کے مدمقابل آئے، حمزہ، علی، ابوعبیدہ بن حارث اور (دوسری طرف) شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ۔ [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں یہ آیات مقدسہ نازل ہوئیں۔

﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ ﴾

''یہ علم آجانے کے بعد ان میں سے جو بھی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو

[1] الحج22:19-23. [2] صحيح البخاري، حديث:3965.

(اے نبی!) اس سے کہو کہ آؤ! بذات خود ہم بھی اور تم بھی آ جائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لے آئیں اور اللہ سے دعا کریں کہ جو بھی جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔“ [1]

یہ بات وفد نجران کے بارے میں ہے۔ اس وفد نے نبی ﷺ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مباحثہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں یہ حقیقت سمجھائی کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں، اس کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جو ان کی پاکباز والدہ پر اتارا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس لغویات کی تردید بھی فرمائی کہ عیسیٰ اللہ ہے یا اس کا بیٹا ہے یا وہ تین میں سے ایک ہے۔ نبی ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انھیں مباہلہ کی دعوت دی۔ عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: جب مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا: اے اللہ! یہ میرے اہل خاندان ہیں۔ [2]

جہاد کی افضلیت

صحیح احادیث میں ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اگر میں اسلام لانے کے بعد مسجد حرام کی تعمیر کے سوا اور کوئی بھی عمل نہ کروں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد اس سے بہت افضل ہے۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: منبر رسول ﷺ کے پاس اپنی آوازیں بلند نہ کرو، جب نماز ہو جائے تو اس بارے میں پوچھ لو۔ انھوں نے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

[1] آل عمران 61:3. [2] صحیح مسلم، حدیث: 2404.

﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ ﴾

"کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو اللہ اور روز آخر پر ایمان لایا اور جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا، اللہ کے ہاں تو انھی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا، وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لیے دائمی عیش کے سامان ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یقیناً اللہ کے پاس (خدمات کا) صلہ دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔"[1]

جیسا کہ حضرت علی نے فرمایا تھا قرآن کریم نے بھی وہی حقیقت واضح فرمائی، یعنی کہ ایمان اور جہاد، مسجد حرام کی تعمیر، حج و عمرہ، طواف اور حجاج کے ساتھ حسن سلوک سے بھی زیادہ افضل ہے۔[2]

امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر شفقت و محبت

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

[1] التوبة 9:19-22. [2] الفتاوی: 8/166.

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو۔''[1]

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا: لوگوں کو حکم دو کہ وہ صدقہ کریں۔ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کتنا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دینار۔ میں نے عرض کیا: لوگ اتنی استطاعت نہیں رکھتے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا پھر نصف دینار۔ میں نے کہا: وہ اتنی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: پھر کتنا؟ میں نے کہا: ایک جو کے برابر سونا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم تو تھوڑے ہی پر قناعت کرنے والے ہو۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾

''کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ تخلیے میں گفتگو کرنے سے پہلے تمھیں صدقات دینے ہوں گے۔ اچھا، اگر تم ایسا نہ کرو اور اللہ نے تمھیں اس سے معاف کر دیا تو نماز قائم کرتے رہو اور زکاۃ دیتے رہو۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ نے اس امت پر یہ تخفیف میری وجہ سے فرمائی تھی۔[3]

قرآن کریم کی تفسیر و تشریح

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تفسیر سے استفادہ کیا اور ان سے جو کچھ سیکھا اسے لوگوں تک پہنچایا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ربانی ہے:

[1] المجادلة 12:58. [2] المجادلة 13:58. [3] جامع الترمذي، حديث:3300، امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور غریب ہے، شیخ البانی نے اپنی کتاب «ضعيف موارد الظمآن الى زوائد ابن حبان» میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

﴿ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ ﴾

''اور اس نعمت میں تم نے اپنا حصہ یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو۔'' [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرمایا:

''تمھارا شکر کرنے کا اسلوب یہ ہے کہ تم اسے جھٹلاتے ہو (اور اللہ کی طرف نسبت دینے کی بجائے یہ کہتے ہو) کہ فلاں اور فلاں ستارے کے طلوع و غروب کے نتیجے میں ہم پر بارش نازل ہوئی۔'' [2]

ہر انسان کے لیے وہ کام آسان کر دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم بقیع الغرقد قبرستان میں ایک جنازے میں شریک تھے۔ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور بیٹھ گئے۔ ہم بھی ان کے گرد بیٹھ گئے۔ آپ کے پاس ایک لاٹھی تھی، آپ نے اسے الٹا کر دیا اور اس کی نوک سے زمین کریدنے لگے، پھر فرمایا: تم میں سے کوئی نہیں، کوئی سانس لینے والا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ میں اس کا مقام لکھ دیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ بدقسمت ہے یا نیک بخت۔ ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا اب ہم اسی لکھے ہوئے فیصلے پر بھروسہ نہ کر لیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں، جو نیک بختوں میں سے ہے وہ نیک بختوں والے اعمال کرے گا اور جو اہل شقاوت میں سے ہے وہ اسی قسم کے افعال انجام دے گا؟ آپ نے فرمایا: عمل کرو! ہر فرد کے لیے وہ راستہ آسان کر دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ بنا ہے۔ اہل سعادت، نیک بختی والے اعمال کی راہ اختیار کریں گے اور اہلِ شقاوت اسی قسم کے

[1] الواقعہ 82:56. [2] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حديث: 849 یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔

افعال کی طرف چلتے چلے جائیں گے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھیں:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ ﴾

"جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور متقی ہو گیا اور بھلائی کو سچ مانا، اسے ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا، اسے ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے۔"[1]

قرآن کریم سے استنباط اور استفادے کے لیے حضرت علی کے اصول

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن کریم اور اس سے متعلقہ علوم عالیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کامل یقین کے ساتھ سمجھتے تھے کہ قرآن کریم میں واضح اور ضمنی طور پر تمام شرعی احکام موجود ہیں، وہ فرمایا کرتے تھے: "یقیناً اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے۔" یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر قرآن پاک ہی سے استدلال کرتے تھے اور شرعی حکم کے لیے جس آیت کا حوالہ دیتے، اس کی تلاوت فرماتے تھے، ان کا طریقِ استنباط درج ذیل ہے۔[2]

قرآن حکیم کے ظواہر کا التزام

مثلاً وہ فرمایا کرتے تھے کہ بڑی عمر والے بچے کو دودھ پلانا حرمتِ نکاح کا باعث نہیں، انھوں نے اس بارے میں اس آیت کا حوالہ دیا:

﴿ وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾

"جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں۔"[3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 1362. [2] مصنف عبدالرزاق، حديث: 1744. [3] البقرة 2:233.

انھوں نے فرمایا: شرعی رضاعت دو سال ہے۔ ان دو برسوں میں اگر دودھ پیا ہے تو وہ حرمت کا باعث ہے اور جو دودھ دو سال کے بعد پیا جائے وہ حرمتِ نکاح کا باعث نہیں ہے۔[1] ایک اور جگہ بھی قرآن کے ظاہری الفاظ کو ظاہر ہی پر محمول کیا ہے۔ انھوں نے اس عورت کی بریت کا حکم صادر فرمایا جس پر زنا کی تہمت اس لیے لگا دی گئی تھی کہ خاوند کے ہاں آنے کے چھ ماہ بعد ہی اس کے ہاں ولادت ہوگئی تھی۔

انھوں نے ذیل کی دونوں آیتوں میں جمع کی صورت پیدا کی:

﴿ وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾

''مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔''

﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾

''اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔''[2]

انھوں نے فرمایا: چھ ماہ حمل کے اور 24 ماہ، یعنی دو سال ہونے پر دودھ چھڑائی۔ انھوں نے رضاعت کی مدت کو جو دو سال ہے، مدت رضاعت وحمل کی مجموعی مدت، یعنی تیس ماہ سے منہا کر دیا، اس طرح چھ ماہ باقی رہ گئے۔ انھوں نے دونوں آیتوں کے ظاہری الفاظ یکجا کر کے دونوں آیتوں پر مبنی حکم جاری فرما دیا۔[3]

مجمل محمول بر مفسر

مجمل سے مراد ایسی بات ہے جس کا مطلب مخفی ہو اور اس کی وضاحت کے لیے مزید بیان مطلوب ہو جبکہ مفسر بات کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور وہ کسی تفصیلی بیان کی متقاضی نہیں ہوتی۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس ارشاد ربانی کے مجمل مفہوم کو دیگر مقامات میں مفسر باور کیا ہے:

[1] المجموع للنووی: 213/8. [2] الأحقاف 15:46. [3] مصنف عبدالرزاق، حدیث: 12443، وفقه الإمام علی: 1/41-46. [4] مرآة الأصول فی شرح مرقاة الوصول، ص: 197.

﴿ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ ﴾

''قربانی (نذرانہ) کعبہ پہنچائی جائے گی۔''[1]

ایک روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت علی سے ''ھدی'' کے بارے میں وضاحت چاہی کہ وہ کس جانور سے ہوگی؟ انھوں نے فرمایا: آٹھ قسم کے جوڑوں سے۔ اس نے شک کا اظہار کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے دریافت فرمایا: کیا آپ قرآن پڑھتے ہیں؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۬ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ ﴾

''اے ایمان والو! بندشوں کی پوری پابندی کرو، تمھارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کر دیے گئے ہیں۔''[2]

اس نے کہا: جی ہاں! تو آپ نے فرمایا، کیا تم نے یہ فرمان الٰہی بھی سنا ہے؟

﴿ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾

''اور چند معلوم دنوں میں ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔''[3]

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:

﴿ وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۬ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ﴾

''اور مویشیوں میں سے ایسے جانور بھی پیدا کیے جن سے سواری اور بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور ایسے بھی جو زمین سے لگے ہوئے (پست قد)، ان چیزوں میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمھیں بخشی ہیں۔''[4]

پھر فرمایا: کیا تم نے یہ بھی سنا ہے:

[1] المائدة 5:95. [2] المائدة 5:1. [3] الحج 22:28. [4] الأنعام 6:142.

﴿ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِّنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ..........﴾

''یہ آٹھ قسمیں (نر و مادہ) ہیں دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا اس نے دونوں نر حرام کیے یا دونوں مادہ؟ یا وہ بچے جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہیں؟ مجھے کسی علم کے ساتھ بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے اور دو گائے کی قسم سے۔''[1]

اس نے کہا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: کیا یہ فرمان الٰہی بھی سنا ہے؟

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾

''اے ایمان والو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو اور اگر تم میں کوئی جانے بوجھے ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو، اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا۔ اس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ تک پہنچایا جائے گا۔''[2]

اس آدمی نے کہا: جی ہاں! میں نے یہ فرمانِ ربانی بھی سنا ہے، پھر وہ کہنے لگا: میں نے ایک ہرن مار دیا ہے، میرے ذمہ کیا حکم ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

﴿هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾

''نذرانہ کعبہ تک پہنچانا ہوگا۔''[3]

مطلق کو مقید پر محمول کرنا

مطلق سے مراد: جو بلا قید ماہیت پر دلالت کرے اور مقید سے مراد وہ ہے جو لفظی طور پر کسی بھی قید سے مقید ہو۔[4]

[1] الأنعام 6:143-144. [2] المائدہ 5:95. [3] الدرالمنثور للسیوطی: 3/193. [4] جمع الجوامع بشرح المحلی: 2/79.

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شرعی حکم کے استنباط میں قرآن کے مطلق کو مقید پر محمول کیا ہے۔ انھوں نے آیت سرقہ میں قطع (کاٹنے) کے مطلق حکم کو آیت محاربہ میں مقید پر محمول کیا ہے کہ دو مرتبہ سے زیادہ قطع نہیں کرنا چاہیے اور سرقہ کے بار بار ارتکاب پر ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ سے زیادہ قطع کرنے کی صورت نہ ہوگی، یعنی جب کوئی ایک بار چوری کرے تو دایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ اگر پھر چوری کرے تو بائیں ٹانگ کاٹی جائے۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق) اگر یہ چور تیسری اور چوتھی بار بھی چوری کرے تو اس سے زیادہ نہیں کاٹا جائے گا اور قطع کی بجائے تعزیر نافذ کی جائے گی۔ کیونکہ انھوں نے ارشاد خداوندی:

﴿ وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ﴾

''اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔''[1]

کو اس آیت محاربہ پر محمول کیا ہے:

﴿ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ ﴾

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں۔''[2]

ان کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت محاربہ میں ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کاٹنے سے زیادہ کا حکم نہیں دیا۔ ایسی صورتِ حال میں وہ مجرم کو قید کرنے کا حکم دیتے تھے۔[3]

امام شعبی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کے علاوہ عضو بدن قطع نہیں فرماتے تھے، اگر کوئی اس کے بعد بھی چوری کا مرتکب ہو، تو جیل میں ڈال دیتے تھے یا کوئی اور عبرت ناک سزا دیتے تھے اور فرماتے تھے: ''مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی

[1] المائدۃ 38:5. [2] المائدۃ 33:5. [3] فقہ الإمام علی: 47/1، ومصنف عبدالرزاق، حدیث: 21874.

ہے کہ میں اس کا کوئی ہاتھ بھی باقی نہ چھوڑوں، جس سے وہ کھانا کھائے اور استنجا کر سکے۔'' [1]

ناسخ ومنسوخ کا حکم

نسخ سے مراد بعد میں آنے والے حکم کے باعث پہلے حکم شرعی کو منسوخ قرار دینا ہے۔ زرکشی کہتے ہیں: ائمہ کا کہنا ہے کہ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ ناسخ ومنسوخ کے علم کی معرفت کے بغیر کتاب اللہ کی تفسیر کرے۔ [2] یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تاکیداً بیان فرمائی ہے کہ انھوں نے ایک قصہ گو شخص سے پوچھا کہ کیا تم ناسخ ومنسوخ کی پہچان رکھتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! تو آپ نے فرمایا: تم خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کے لیے باعث ہلاکت بنے۔ [3]

لغت عرب پر نگاہ

قرآن کریم کے فہم کے حوالے سے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منہج لغت عرب پر نگاہ رکھنا تھا جیسا کہ انھوں نے اس فرمان الٰہی میں ''اقراء'' سے حیض مراد لیا ہے:

﴿ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ﴾

''جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین مرتبہ ایام ماہواری آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔'' [4]

اور فرمایا کہ ان کی عدت تیسرے حیض سے پاک ہونے پر مکمل ہوگی۔ [5]

اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مطلقہ عورت کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ بصورت رجوع اپنے شوہر کے لیے تیسرے حیض کے بعد ہی حلال ہوگی۔ [6]

[1] مصنف عبدالرزاق، حدیث: 18764، وفقه الإمام علی: 818/2. [2] فقه الإمام علی: 48/1، والبرھان فی علوم القران: 29/2. [3] کتاب العلم لأبی خیثمه، ص: 31، مع تحقیق شیخ البانی۔ انھوں نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [4] البقرة 228:2. [5] تفسیر ابن کثیر: 271/1. [6] الدرالمنثور للسیوطی: 234/1.

عرب کے کلام میں قروء، قرء کی جمع ہے اوراس سے مراد حیض ہے جبکہ قرء کا معنی طہر بھی لیا جاتا ہے۔عرب کہتے ہیں: اقرء ت المرءة، یعنی اس عورت کو حیض آیا اور اقرء ت کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ طہر کی حالت میں آ گئی۔ [1]

ایک نص کی روشنی میں دوسری نص کو سمجھنا

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ ﴾

''اللہ نے کافروں کے لیے مومنوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔'' [2]

سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے اور وہ اسی آیت میں مذکور ہے۔ جب ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قریب ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن تمھارے اوران کے معاملے کا فیصلہ کرے گا۔ اس فیصلے میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی کوئی سبیل ہی نہیں رکھی۔ [3]

ایک نص سے دوسری نص کو ملا کر سمجھنے کی ایک اور مثال یہ ہے:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ ﴾

''اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، خصوصاً صلاۃ وسطیٰ (درمیانی نماز) کی اور اللہ کے آگے اس طرح کھڑے رہو جیسے تابع فرمان غلام!'' [4]

صلاۃ وسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے، اس میں انھوں نے احزاب کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ حدیث کی نص سے استدلال کیا ہے کہ ''انھوں نے ہمیں صلاۃ وسطیٰ یعنی صلاۃ عصر سے غافل کر دیا، اللہ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔'' [5]

---

[1] الصحاح للجوھری:64/1 مادہ قرء. [2] النساء 4:141. [3] تفسیر ابن جریر:327/9، اس کی سند صحیح ہے۔ [4] البقرۃ2:238. [5] صحیح مسلم، حدیث:627.

قرآن کے بارے اشکالات پر سوال

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فہمِ قرآن کے حوالے سے ایک اسلوب یہ ہے کہ جس قرآنی مسئلے میں اشکال ہو اس کے بارے میں سوال کیا جائے، مثلاً حج اکبر کے حوالہ سے درج ذیل قرآنی آیت سے متعلقہ ان کا ایک سوال ہے۔

﴿ وَ اَذٰنٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ ﴾

''اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حج اکبر کے دن۔''[1]

اس سلسلے میں انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ حج اکبر کا دن کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: یوم النحر (یعنی قربانی کا دن)۔[2]

نزولِ آیات کے اسباب کا علم

جس پس منظر میں آیات نازل ہوئیں، ان کے اسباب جاننا اور ان سے حکم اخذ کرنا، قرآن کا مفہوم سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ کیونکہ سببِ نزول کا بیان کتاب الٰہی کا مفہوم سمجھنے کا صحیح اور مستحکم طریقہ ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ آیات کے بارے میں اسباب نزول کے علم میں اتنے بلند رتبے پر فائز تھے کہ وہ کتاب الٰہی کے حوالے سے سوال کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور فرماتے تھے: مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو اور سوال کرو! اللہ کی قسم! کوئی بھی آیت ہو، میں جانتا ہوں کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو۔[3] ایک اور روایت میں ہے کہ کوئی بھی آیت ہو، میں جانتا ہوں کہ وہ کس بارے میں نازل ہوئی۔[4]

عربوں کی عادتوں اور رسوم ورواج کی پہچان

نزولِ قرآن کے وقت، عرب اور ان کے گرد رہنے والے یہودو نصاری کے مزاج و

[1] التوبة 3:9. [2] جامع الترمذي، حديث: 970، شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [3] منهج علي بن أبي طالب، ص: 79، والإصابة: 509/2. [4] الطبقات: 338/2.

عادات کی پہچان کا قرآن کریم کے فہم میں بڑا کردار ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی زمانے میں زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ ان کی بہت سی ان عادات اور رسوم و رواج کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے جن سے قرآن کریم نے روکا ہے یا انھیں صحیح قرار دیا ہے۔

فہم قرآن کے حوالے سے ایک مثال وہ روایت ہے جسے ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں: جب ابن وائل اور ابو الفرزدق کے درمیان اپنے حسب و نسب پر اظہارِ فخر کا مقابلہ ہوا تو ان دونوں نے ایک ایک سو اونٹ ذبح کر دیے۔ اس واقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید خچر پر سوار ہو کر فوراً باہر نکل آئے۔ آپ بلند آواز سے اعلان کر رہے تھے: اے لوگو! ان (اونٹوں) کا گوشت نہ کھانا، ان پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہے۔ دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر عرب کی عادات کو سمجھ لیا کہ اس قسم کی مقابلہ آرائی اللہ کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ شیطان کی خاطر ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے ذیل کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے لوگوں کو ان اونٹوں کا گوشت کھانے سے منع کیا۔[1]

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾

''تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔''[2]

قوت فہم اور وسعت ادراک

قوت فہم اور وسعت ادراک، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بڑی مشہور امتیازی خوبیاں تھیں۔ ان خوبیوں کی تصدیق بہت سی مثالوں سے ہوتی ہے۔ یہاں ہم ابن جریر کی روایت نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: خوارج میں سے ایک شخص نے حضرت علی کے سامنے فجر کی نماز شروع کرتے وقت یہ آیت پڑھی جس سے اس کا مقصد اپنے انتہا پسندانہ خیالات کی تائید تھا:

[1] تفسیر علی بن أبی طالب: 3/1 (فهد بن عبدالعزیز کا غیر مطبوعہ مقالہ)۔ [2] المائدة 3:5.

﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ ﴾

''تمھاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا عمل ضائع ہوجائے گا اور تم خسارے میں رہو گے۔''[1]

اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کے دوران ہی جواباً یہ آیت پڑھی:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ○ ﴾

''پس صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور تمھیں وہ لوگ ہرگز ہلکا نہ پائیں جو یقین نہیں رکھتے۔''[2]

یہ وہ چند بنیادی اصول ہیں جنھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن حکیم سے احکام کے استنباط اور فہم معانی میں بروئے کار لاتے رہے، کتاب اللہ کے مطابق عمل کرنے کی کیفیت سمجھنے کے لیے ان سے محبت رکھنے والوں اور مخلص مسلمانوں کے لیے ان میں رہنمائی کی روشنی موجود ہے۔
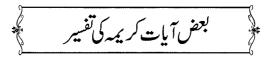
بعض آیات کریمہ کی تفسیر

سورۃ الذاریات

ابن الکواء بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آیت ﴿ وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ﴾ کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا: ہوائیں۔ ﴿ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ﴾ کے بارے میں فرمایا: بادل اور ﴿ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ﴾ کے بارے میں فرمایا: فرشتے۔[3]

امام حاکم نے، ابوطفیل کے حوالے سے ایک اور سند سے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ طبری نے اس حدیث کی مختلف اسناد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچایا ہے۔[4] اور عبدالرزاق نے

---

[1] الزمر 39:65. [2] الروم 30:60. [3] الخلافۃ الراشدۃ لیحییٰ الیحییٰ، ص: 486. [4] الدرالمنثور: 7/614، والمستدرک: 2/467، وتفسیر الطبری: 26/185-188.

ایک اور سند سے ابوطفیل سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور کہہ رہے تھے: مجھ سے پوچھ لو، اللہ کی کتاب کے بارے میں مجھ سے پوچھ لو، اللہ کی قسم! میں ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔ ابن الکواء نے کہا کہ میں ان کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان تھا اور وہ میرے پیچھے تھے، انھوں نے پوچھا: ﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا﴾ سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے وہی جواب روایت کیا اور اس بارے میں فرمایا: اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے، سیکھنے کے لیے پوچھو، کسی کی لغزش ڈھونڈنے کے لیے مت پوچھو۔ اس میں اس کے علاوہ اور سوالات بھی تھے۔[1]

پلٹنے والے ستاروں کی قسم

ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ﴾

''پس میں قسم نہیں کھاتا، پلٹنے والے تاروں کی۔''[2]

سعید بن منصور نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انھوں نے فرمایا: اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو رات کو چھپ جاتے ہیں اور دن کو چلتے رہتے ہیں تو نظر نہیں آتے۔ اس روایت کی سند حسن درجے کی ہے۔[3]

زمین کا نیک بندے پر رونا

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب کوئی نیک بندہ فوت ہوتا ہے تو زمین پر اس کی نماز پڑھنے والی جگہ، اس کے نیک اعمال والی زمین اور آسمان تک پہنچنے والے اعمال کی جگہ روتی

[1] الخلافة الراشدہ لیحییٰ الیحییٰ، ص: 486. [2] التکویر 15:81. [3] الخلافة الراشدہ لیحییٰ الیحییٰ، ص: 487.

ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ ﴾

''(مجرم لوگوں کے بارے میں فرمایا) پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین۔''[1]

خشوع کا مفہوم

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سورۃ المومنون کی اس آیت دوم کے بارے میں وضاحت چاہی گئی:

﴿ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ ﴾

''جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

انھوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا: خشوع دل میں ہوتا ہے، نیز یہ کہ تم دوسرے مسلمان کے لیے اپنا پہلو نرم رکھو اور نماز میں ادھر ادھر متوجہ نہ ہو۔[2]

دو مومن اور دو کافر دوست

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے درج ذیل آیت کے حوالے سے سوال کیا گیا:

﴿ الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ۝ ﴾

''وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔''[3]

اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا: یہ دو مومن دوستوں اور دو کافر دوستوں کی داستان ہے۔ ان دونوں مومنوں میں سے ایک فوت ہوگیا، اسے جنت کی بشارت ملی تو اسے اپنا مومن دوست یاد آیا، وہ کہنے لگا: اے میرے رب! میرا فلاں دوست مجھے ہمیشہ خیر و بھلائی کا

[1] الدخان 29:44. [2] الزهد لابن المبارك، ص:403، حديث: 1148. [3] الزخرف 67:43.

حکم دیتا اور برائی سے منع کرتا تھا، وہ مجھے تیری اور تیرے رسول ﷺ کی اطاعت اختیار کرنے کی تاکید کرتا تھا۔ وہ مجھے بتاتا تھا کہ میری تم سے ملاقات ہوگی۔ اے میرے رب! میرے بعد اسے گمراہ نہ کر دینا۔ اسے اسی طرح ہدایت سے سرفراز کرنا جیسے اس نے مجھے راہ دکھائی، اس کو عزت عطا فرمانا جس طرح اس نے مجھے عزت دی۔ پس جب یہ (دوسرا مومن) فوت ہوا تو ان دونوں دوستوں کو جنت میں اکٹھا کر دیا گیا اور دونوں سے کہا گیا: تم دونوں ایک دوسرے کی تعریف کرو۔ اس پر وہ کہنے لگا: اے اللہ! یہ مجھے بھلائی کا حکم دیتا تھا، برائی سے روکتا تھا، مجھے تیری اور تیرے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا کہ میں تجھ سے آملوں گا، کتنا بہترین بھائی، دوست اور ساتھی ہے۔

یہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے حضرت علی نے فرمایا: پھر کافر دوستوں میں سے ایک فوت ہو جائے گا، اسے جہنم کی سزا ملے گی، اسے اپنا دوست یاد آئے گا۔ وہ کہے گا: اے اللہ! میرا فلاں دوست مجھے برائی کا حکم دیتا تھا، بھلائی سے روکتا تھا، مجھے تیری اور تیرے رسول ﷺ کی نافرمانی کا حکم دیتا تھا اور کہتا تھا کہ میری تم سے ملاقات نہیں ہوگی۔ اے اللہ! اسے گمراہ کر دے جیسا کہ اس نے مجھے گمراہ کیا، جب وہ (دوسرا دوست) مرجائے گا تو ان دونوں کو جہنم میں اکٹھا کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تم میں سے ہر ایک دوسرے کی تعریف کرے تو وہ کہے گا: اے اللہ! یہ مجھے برائی پر اکساتا تھا۔ بھلائی سے روکتا تھا۔ مجھے تیری اور رسول ﷺ کی نافرمانی کا حکم دیتا تھا اور کہتا کہ میری تم سے ملاقات نہیں ہوگی۔ یہ کتنا برا بھائی، دوست اور ساتھی ہے۔[1]

زہد، قرآن کے دو کلمات میں ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تمام تر زہد، قرآن کے ان دو کلمات میں ہے جن میں

[1] الزهد لابن المبارك، ص:368.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ○﴾

"تمھیں جو نقصان پہنچے اس کا غم نہ کرو اور جو کچھ اللہ تمھیں عطا فرمائے اس پر مت اتراؤ۔ اور (یاد رکھو کہ) اللہ اکڑنے والے اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا: جو ماضی سے مایوس نہیں ہوتا اور مستقبل پر اتراتا نہیں اس نے یقیناً پورے زہد کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔[2]

[1] الحدید 23:57. [2] رسالۃ المسترشدین، ص: 224، وفرائد الکلام، ص: 376.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ سے وابستگی اور فہم حدیث

حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کے اُمّی معاشرے کی ان ممتاز شخصیتوں میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ بچپن سے ہی علم سے ان کی محبت اور شغف کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ لطف وکرم ان کے لیے بچپن ہی سے مقدر فرما دیا کہ وہ کاشانۂ نبوت ہی میں رسول اللہ ﷺ کے زیر سایہ زندگی بسر کریں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر رسول اللہ ﷺ کی عنایات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس طرح ان کی شخصیت پر رسالت مآب ﷺ کی بے مثل شخصیت کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ اسی وجہ سے ان کی صلاحیتیں بیدار ہوتی چلی گئیں۔ ان کا قلب نہایت پاکیزہ ہوگیا۔ ان کی عقل منور ہوگئی۔ ان میں اعلیٰ درجے کی روحانی بصیرت پیدا ہوگئی اور وہ دینی تہذیب کا درخشاں نمونہ اور نمائندہ بن گئے۔

مکہ اور مدینہ دونوں جگہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گہری وابستگی قائم و دائم رکھی۔ وہ آپ ﷺ کے زیر سایہ زانوئے تلمذ تہ کرنے پر ہر دم تیار رہتے تھے۔ جب آپ ﷺ قرآن حکیم کی روشنی میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت فرما رہے تھے، ان دنوں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے علوم خوب سیکھے اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے تہذیب و تربیت حاصل کی۔

نبی اکرم ﷺ کو جو حالات و واقعات پیش آئے، ان کی مناسبت سے بتدریج آیات نازل ہوتی تھیں اور آپ اپنے اصحاب کو سناتے تھے۔ آپ ﷺ ان کے معنی و مفہوم سے

گہری واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ ان کے بنیادی اصولوں سے بڑے گہرے اثرات قبول کرتے تھے۔ قرآن کریم کا ان کے نفوس، ان کی روحانی کیفیت اور ان کی عقل اور دل پر بڑا زبردست اثر تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آپ ﷺ کے زیر سایہ قرآنی تربیت کا نہایت گہرا اثر قبول کیا اور رسالت مآب ﷺ کی تعلیماتِ عالیہ کو اپنے دل میں جگہ دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام کو گلے لگانے کے بعد قرآن کریم کے حفظ، اس کے فہم، غور و فکر اور تدبر کا خاص اہتمام کیا۔ آپ نے رسول اکرم ﷺ سے اپنی وابستگی کو اس قدر پختہ کرلیا کہ آپ نازل ہونے والی ہر آیت اور سورت بخوبی سیکھتے اور سمجھتے چلے گئے۔ اس طرح آپ نے تمام آیات اور سورتیں حفظ کرلیں۔

رسول اکرم ﷺ کی صحبت اور تربیت کی برکت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خیر و بھلائی کے نہایت بیش قیمت اثاثے حاصل کر لیے، بعد میں جب آپ خلیفۂ راشد کے اہم منصب پر فائز ہوئے تو امن اور جنگ دونوں قسم کے حالات میں آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سنت مطہرہ کے وسیع علم و معرفت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے دین کے عظیم مقاصد ہمیشہ پیشِ نظر رکھے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان محبت و شیفتگی کا تعلق انتہائی مضبوط تھا۔ محبت ہی وہ چیز ہے جو استاد اور شاگرد کے درمیان تعلیم و تربیت کی بہترین فضا پیدا کرتی ہے۔ محبت نہایت اہم علمی اور ثقافتی نتائج پیدا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کے اعلیٰ جذبے کے نتیجے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام کی دعوت اور نشر و اشاعت کی راہ میں انتہائی عظیم قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اطاعت رسول ﷺ اور التزام سنت

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے اطاعت رسول ﷺ کی بہترین تربیت پائی، انھوں نے یہ آیت پڑھی، یاد کی اور اسے خوب سمجھا:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾

"جو رسول (ﷺ) کی اطاعت کرے اس نے اللہ تعالیٰ ہی کی فرمانبرداری کی۔"[1]

یہ آیت، اس سلسلہ آیات میں سے ہے جن میں اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ باہم مربوط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کو ایک ہی چیز قرار دیا ہے اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کے حکم کو اپنی اطاعت کے حکم کے تحت درج کیا ہے۔ اس میں بندوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت بے معنی ہے۔ اس مفہوم کی آیات بہت سی ہیں۔[2]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے زیر سایہ سنت کی اتباع کرنے کی تربیت پائی۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے بڑی گراں قدر رہنمائی اور روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس پر عمل کے نتیجے میں دارین کی سعادت اور فوز و فلاح یقینی ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں احادیث مبارکہ اپنی کثرت، متنوع عبارات اور مختلف اسالیب کی بدولت امتیازی شان رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض احادیث ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ عبارات کے اختلاف اور اسالیب کے مختلف ہونے کے باوجود ایک ہی مقصود اور مفہوم کو روشن اور واضح کرتی ہیں۔ مزید برآں ان کی مخالفت کو گناہ عظیم قرار دیا گیا اور اس پر شدید وعید بیان ہوئی ہے۔[3]

ان احادیث میں سے چند احادیث یہ ہیں۔ ارشاد نبوی ہے:

"میری ساری امت جنت میں داخل ہوگی ان کے سوا جنھوں نے انکار کیا۔ صحابہ نے عرض کیا: کون انکار کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی تو (گویا) اس نے انکار کیا۔"[4]

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا مطلب ان کی سنت پر عمل اور اس کی پیروی ہے۔ اور

---

[1] النساء 4:80. [2] حقوق النبي ﷺ على أمته: 174/1. [3] حقوق النبي ﷺ على أمته: 174/1.
[4] صحيح البخاري، حديث: 7280.

مختلف حیلوں بہانوں اور تاویلات کی بنیاد پر سنت سے روگردانی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔[1]

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ اطاعت رسول ﷺ کا انتہائی اہتمام کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا: "میں کسی کے کہنے پر سنت نبوی کو نہیں چھوڑ سکتا۔"[2]

مزید فرمایا: سنو! میں نبی ہوں نہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن میں حتی الامکان اللہ کی کتاب اور محمد ﷺ کی سنت پر عمل کرتا ہوں، سنت کو مضبوطی سے تھامنے، اس کے التزام اور اس کی دعوت کا یہی بہترین نمونہ ہے۔[3]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال و اعمال، اطاعتِ رسول ﷺ اور اتباعِ سنت کے اسی واضح تصوّر پر مبنی ہیں۔ آپ سنت کا اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ احادیث کی روایت کو تحقیق و ثبوت کے بغیر صحیح نہ سمجھتے۔ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا: "جب میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرتا ہوں تو مجھے ان پر جھوٹ باندھنے سے زیادہ یہ پسند ہے کہ میں آسمان سے گر پڑوں۔[4]

ایک اور موقع پر فرمایا: "جب میں جناب رسول اللہ ﷺ سے خود کوئی حدیث سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے مفید و نافع بنا دیتا تھا۔ اور اگر کوئی اور مجھے کوئی حدیث سناتا تھا تو میں اس سے حلف لیتا تھا، اگر وہ قسم اٹھاتا تھا تو میں اس کی تصدیق کرتا تھا۔"[5]

دلائل نبوت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی احادیث

(ا) رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیمار ہوگئے۔ نبی ﷺ ان کے پاس آئے۔ اس وقت حضرت

[1] صحیح ابن حبان: 153/1. [2] فتح الباري: 421/3. [3] الشفاء للقاضی عیاض: 556/2. [4] فتح الباري: 158/6. [5] سنن ابن ماجه، حدیث: 1395.

علی رضی اللہ عنہ کہہ رہے تھے: اے اللہ! اگر میری اجل آگئی ہے تو مجھے راحت سے ہمکنار فرما۔ اگر میری اجل میں کچھ دیر ہے تو مجھے سربلند کردے اور اگر یہ بیماری آزمائش ہے تو مجھے صبر کی توفیق عطا فرما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: تم نے کیا کہا ہے؟ انھوں نے وہی الفاظ دہرائے جو اللہ تعالیٰ سے عرض کیے تھے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اے اللہ! انھیں شفا عطا فرما! اے اللہ! انھیں عافیت سے نواز دے! پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اٹھو، کھڑے ہو جاؤ! وہ کہتے ہیں: میں اسی وقت کھڑا ہو گیا اور جس تکلیف میں مبتلا تھا وہ بعدازاں مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ [1]

(ب) اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض غیبی امور کی اطلاع

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر لوگوں سے فرمایا: جس وقت میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتا ہوں تو ان پر جھوٹ باندھنے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ میں آسمان سے گر پڑوں اور جب میرے اور تمھارے درمیان کوئی بات ہو تو جنگ ایک تدبیر اور حیلے کا نام ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، وہ فرماتے تھے: آخری زمانے میں کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو نوعمر اور بیوقوف ہوں گے، تمام مخلوقات سے زیادہ بہترین (چکنی چپڑی) بات کریں گے اور دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے، ان کا ایمان ان کے گلے سے نیچے نہیں اترے گا، تم انھیں جہاں پاؤ قتل کر دو، ان کے قاتل کو قیامت کے روز اجر ملے گا۔ ان سے مراد خوارج ہیں۔ [2]

(ج) رعب کے ذریعہ مدد

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دلائل نبوت کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس میں وہ

[1] مسند أحمد: 151/2، مع تحقیق أحمد شاکر، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [2] منهج علي في الدعوة إلى الله، ص: 117، وفتح الباري: 158/6، وصحيح البخاري، كتاب المناقب، حديث: 3611.

رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا: مجھے وہ کچھ عطا کیا گیا ہے جو دوسرے انبیاء میں کسی کو نہیں دیا گیا۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی ہے۔ زمین کے خزانوں کی چابیاں مجھے دے دی گئی ہیں، میرا نام احمد رکھا گیا ہے، روئے زمین کی مٹی میرے لیے پاک بنا دی گئی ہے اور میری امت کو بہترین امت قرار دیا گیا ہے۔ [1]

(د) مہر نبوت

رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر واضح ترین حِسّی دلائل بیان کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہے۔'' [2] یہ علامت اہل کتاب پہلے سے جانتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کے بائیں کندھے کے پاس سرخ رنگ کی ابھری ہوئی چیز تھی، چھوٹا کر کے دیکھا جائے تو کبوتری کے انڈے کے برابر تھی۔ بڑا کر کے دیکھا جائے تو ہاتھ کی مٹھی کے برابر تھی۔ [3]

(ہ) نبی ﷺ کو پہاڑوں کا سلام

حضرت علی رضی اللہ عنہ دلائل نبوت کے سلسلے میں یہ بھی فرماتے تھے کہ میں مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ ہم مکہ کے نواح کی طرف نکلے، جو پہاڑ اور درخت بھی آپ کے سامنے آیا وہ کہہ رہا تھا: السلام علیك یا رسول اللّٰہ! اے اللہ کے رسول! آپ پر سلام ہو! [4]

سیرت نبوی پر چلنے کی ترغیب

حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو نبی ﷺ کی سیرت پر عمل کرنے کی خوب ترغیب دیتے

[1] صحيح البخاري، حديث: 335. [2] مصنف ابن أبي شيبة: 513/11، وصحيح البخاري، كتاب المناقب، حديث: 3541. [3] فتح الباري: 6/561-563. [4] جامع الترمذي، كتاب المناقب، حديث: 3626، والمستدرك: 620/2، اس کی سند صحیح ہے۔

تھے۔ ربذہ[1] کے مقام پر اپنے ایک خطبے میں فرمایا:

''دین پر قائم رہو۔ اپنے نبی ﷺ کی سیرت پر عمل کرو، ان کی سنت کی اتباع کرو! قرآن حکیم میں جہاں اشکال اور اشتباہ ہو، اس سے اعراض کرو۔ قرآن جسے معروف کہے اسے لازم پکڑو، جسے منکر قرار دے اسے مسترد کر دو۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے ساتھ جنگ سے واپسی پر نہایت فصیح و بلیغ اور موثر خطاب فرمایا۔ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے اسلوبِ زندگی کے التزام و اہتمام اور اسی کی ترغیب پر مشتمل ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اپنے نبی ﷺ کے طریقِ زندگی کی پیروی کرو، وہی سب سے افضل طریقہ اور راستہ ہے، انھی کی سنت پر عمل کرو، وہی بہترین سنت ہے۔[3]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جو داخلی فتنے پیدا ہوئے، ان کی وجہ سے آپ کے لیے اپنے ساتھیوں کو خیر و بھلائی کی دعوت دینے، برائی سے روکنے اور بدعات سے بچانے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔[4] اس بارے میں فرماتے ہیں: مستحکم اور پختہ امور پر گامزن ہونا افضل ہے۔ دین میں ترمیم و اضافہ باعث شر ہے، دین میں ہر نئی بات بدعت ہے، دین میں نئی بات پیش کرنے والا بدعتی ہے۔ بدعتی جب بھی دین میں کوئی نئی بات لے کر آتا ہے۔ تو وہ اپنے اس فعل سے ترکِ سنت کا مرتکب ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے حقوق

(ا) رسول اللہ ﷺ سے سچائی نقل کرنا اور جھوٹ سے اجتناب

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھنے سے بڑی سختی سے منع کیا ہے۔

[1] ربذہ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک بستی ہے، معجم البلدان: 24/3. [2] البدایة والنهایة: 246/7، وتاریخ الطبری. [3] البدایة والنهایة: 319/7. [4] البدایة والنهایة: 319/7.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے مجھ سے کوئی حدیث بیان کی اور وہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ شخص جھوٹوں میں شمار ہوگا۔[1] ایک روایت کے مطابق وہ ضرور جہنم میں داخل ہوگا۔

(ب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے اسباب سے دور رہنا

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے اسباب سے بھی دور رہنے کی تلقین فرمائی، انھوں نے ایسی احادیث بیان کرنے کی ممانعت کی جو عام لوگوں کی عقل سے بالا ہوں۔ انھوں نے فرمایا: لوگوں کو وہ حدیث سناؤ جسے وہ سمجھ سکیں، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی جائے۔[2]

(ج) حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حسن ظن

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب تمھارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کی جائے، تو اس کے متعلق حسن ظن سے کام لیتے ہوئے وہ مفہوم مراد لو جو زیادہ سے زیادہ ہدایت اور تقویٰ پر مبنی ہو۔[3]

(د) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝﴾

"اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 38، شیخ البانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [2] صحيح البخاري، كتاب العلم، قبل الحديث: 127. [3] مسند أحمد: 211/2، تحقیق احمد شاکر، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

ان پر اچھی طرح درود وسلام بھیجتے رہو۔''[1]

اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور اپنے نبی ﷺ کا مرتبہ و مقام بتایا ہے کہ وہ اپنے مقرب فرشتوں سے نبی ﷺ کی تعریف فرماتا ہے۔ اور فرشتے ان کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لوگوں کو ان پر درود وسلام بھیجنے کا حکم دیا تاکہ نبی ﷺ کے حق میں آسمان پر مقرب فرشتوں اور زمین پر انسانوں سب کی تعریف یکجا ہو جائے۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امت مسلمہ پر رسول اللہ ﷺ کے اس حق کو بیان کرتے ہوئے اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے ذکر جمیل پر آپ کے لیے درود وسلام نہیں پڑھتا اسے بخیل کے عنوان سے یاد کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''وہ شخص بخیل ہے کہ جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔''[2]

(۶) رسول اللہ ﷺ سے محبت

ارشاد ربانی ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۠ ﴾

''آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے کنبے قبیلے اور تمھارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنھیں تم پسند کرتے ہو، اگر یہ تمھیں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو تم اللہ کے حکم سے

[1] الأحزاب 56:33. [2] جامع الترمذي، حديث: 3546، یہ حدیث صحیح ہے۔

عذاب کے آنے کا انتظار کرو، اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔''[1]

یہ آیت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے واجب ہونے پر نص قطعی ہے اور اس محبت کو دیگر تمام قسم کی محبتوں پر غالب ہونا چاہیے۔ اس پر امت کے مابین قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ محبت معرفت کا پھل ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور قدر ومنزلت کو اچھی طرح جانتے تھے، آپ کی ذاتِ بابرکات سے ان کی محبت کی کوئی حد نہیں تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: وہ ہمیں ہمارے مال، ہماری اولاد، ہمارے ماں باپ اور شدید پیاس کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب تھے۔[3] یہ مطلق خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اور کسی کے لیے نہیں ہوسکتی۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت

خاندانی تعلق، قرابت داری کی طویل معاشرت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے مکارم اخلاق، شخصی میلانات و رجحانات، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی گہری معرفت اور ان کی صفات حمیدہ کی جان پہچان کے باعث حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصی صلاحیت حاصل ہوگئی کہ آپ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت واخلاق کے باریک پہلو لوگوں کے روبرو بیان کردیتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ان احادیث سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آجاتی ہے جن میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک، آپ کے اخلاق اور آپ کا عظیم الشان کردار بیان کرتے ہیں۔[4]

---

[1] التوبة 9:24. [2] تفسیر القرطبی: 8/95. [3] حقوق النبي ﷺ علی أمته: 1/314، والشفاء للقاضی عیاض: 2/568. [4] المرتضی، ص: 39-43.

(ا) رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رسول اکرم ﷺ نہ طویل القامت تھے نہ ہی پستہ قد تھے۔ آپ ﷺ کی دونوں ہتھیلیاں اور پاؤں پُر گوشت تھے، چہرہ مبارک کا رنگ سفید سرخی مائل تھا، اعضاء کے جوڑوں کی ہڈیاں بڑی اور مضبوط تھیں، جب آپ چلتے تھے تو مضبوطی سے قدم اٹھا کر چلتے تھے گویا آپ نشیب کی طرف نیچے اتر رہے ہوں۔ میں نے نبیِ کریم ﷺ جیسا جمال اور کمال نہ ان سے پہلے دیکھا، نہ بعد میں۔ [1]

محمد بن علی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک بڑا تھا مگر اعتدال کے ساتھ، آنکھوں کے خانے لمبے تھے، پتلیاں سیاہ تھیں اور سفید حصے میں سرخ ڈورے تھے۔ حضرت حسن کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی پلکیں دراز تھیں۔ [2]

(ب) رسول اکرم ﷺ کے اخلاق عالیہ

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں بیان کرتے ہیں: آپ ﷺ تمام لوگوں سے بڑھ کر سخی تھے، آپ کا دل فراخ تھا، لہجے میں سچائی تھی، نرم خو تھے۔ حسن معاشرت میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے، جو آپ کو اچانک دیکھتا، اس پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی مگر جوں جوں اس کا آپ سے تعلق بڑھتا تھا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا تھا۔ میں نے ان جیسا نہ پہلے کبھی دیکھا، نہ بعد میں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی بہادری اور طاقت کا حال بھی بیان کیا۔ اس کا تذکرہ

---

[1] مسند أحمد، تحقيق أحمد شاكر: 107/2، اس کی سند صحیح ہے، جامع الترمذی میں البانی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ [2] اس حدیث کے راوی حسن بن موسیٰ ہیں جنھوں نے حماد سے انھوں نے عبداللہ بن محمد بن عقیل سے اور انھوں نے محمد بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ریش مبارک کے بال بھر پور گنجان تھے، رنگت سفید چمکدار مگر ملاحت دار، سرخی مائل، ہتھیلیاں اور پاؤں پُر گوشت، چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے تھے، جب کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورے چہرہ مبارک کے ساتھ متوجہ ہوتے۔

مغازی سے متعلق احادیث میں ملتا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ جب گھمسان کا رن پڑتا تھا، صحابہ رسالت مآب ﷺ کے پاس آکر پناہ لیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یوں محسوس ہورہا ہے جیسے میں اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ بدر کے دن ہم رسول اللہ ﷺ کے قریب پناہ لے رہے تھے۔ وہ ہم سے آگے اور دشمن کے زیادہ قریب تھے۔ اس دن آپ ﷺ نے بڑی بہادری کا مظاہرہ فرمایا۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: آپ ﷺ لوگوں پر سب سے زیادہ رحم فرمانے والے، یتیم کے لیے شفیق باپ کی مانند اور بیوہ کے لیے کریمانہ مدد فرمانے والے تھے، آپ بہادر ترین شخصیت تھے۔ نہایت سخی تھے۔ چہرہ مبارک روشن تھا، عباء زیب تن فرماتے تھے، کھانا جو کی روٹی اور دودھ تھا، تکیہ چمڑے کا تھا جو کھجور کے پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ آپ کی چارپائی کیکر کے درخت کی تھی۔ آپ کے دو عمامے تھے ایک کو سحاب اور دوسرے کو عقاب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ آپ ﷺ کی تلوار ذوالفقار تھی۔ آپ ﷺ کا جھنڈا سفید اور چمکدار تھا۔ آپ کی اونٹنی عضباء تھی، خچر دلدل تھا، گدھا یعفور تھا، گھوڑا مرتجز تھا اور برکہ نام کی ایک بکری تھی۔ ایک باریک کھونٹی، اور ایک جھنڈا تھا اسے الحمد کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اونٹ کو باندھ کر رکھتے تھے اور اسے چارہ ڈالتے تھے۔ کپڑے کو پیوند لگا لیتے تھے اور جوتا بھی خود گانٹھ لیتے تھے۔ [2]

ذوق اتباع سنت کی چند جھلکیاں

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شب و روز میں نبی اکرم ﷺ کی اقتدا و اتباع کی حقیقی تصویر جھلکتی تھی۔ ان کی عملی زندگی اس کی روشن دلیل ہے۔ ہم یہاں ان کے ذوقِ اتباع سنت کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی یا بڑی بات کی اہمیت میں

[1] مسند أحمد: 64/2، تحقیق احمد شاکر، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] الرياض النضرة في مناقب العشرة: 163/2.

کبھی کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

سوار ہونے کی دعا

عبدالرزاق سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: یہ بات مجھے ایک ایسے شخص نے بتائی ہے جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سواری پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ جب انھوں نے رکاب میں پاؤں رکھا تو بسم اللہ پڑھی، جب برابر ہو کر بیٹھ گئے تو الحمد للہ کہا، پھر یہ دعا پڑھی:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ○ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ○ ﴾

”پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انھیں قابو میں لانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور ایک دن ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔“[1]

پھر تین بار الحمد للہ اور تین بار اللہ اکبر پڑھا، پھر کہا:

«اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرلِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ»

”اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، مجھے بخش دے، تیرے سوا کوئی گناہ نہیں بخشتا۔“

پھر ہنس پڑے۔ عرض کیا گیا: امیر المؤمنین! آپ کے ہنسنے کا سبب کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو بالکل ایسا ہی کرتے دیکھا ہے جیسا کہ میں نے کیا ہے اور ایسا ہی کہتے سنا جیسا کہ میں نے کہا ہے، پھر آپ ﷺ ہنس پڑے تھے تو میں نے بھی یہی عرض کیا تھا کہ اے اللہ کے نبی! آپ کے ہنسنے کا سبب کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس بندے پر تعجب ہوتا ہے جو اللہ سے کہہ رہا ہوتا ہے:

[1] الزخرف 43:13،14.

''(اے اللہ!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں،......کوئی گناہ معاف کرنے والا نہیں ہے۔ گویا بندہ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ ہی گناہ معاف کرنے والا ہے۔''[1]

کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر پینا

عطاء بن سائب سے روایت ہے وہ زاذان سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر پانی پیا، لوگوں نے انھیں تعجب سے دیکھا تو انھوں نے فرمایا: کیا دیکھ رہے ہو؟ اگر میں کھڑے ہو کر پیتا ہوں تو اس لیے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہو کر بھی پیتے دیکھا ہے اور اگر میں بیٹھ کر پیتا ہوں تو اس لیے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹھ کر پیتے بھی دیکھا ہے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے وضو کی تعلیم

عبد خیر سے روایت ہے کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا طریقہ سکھایا۔ ایک نوجوان نے ان کے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈالا اور انھیں صاف کیا، پھر انھوں نے اپنا ہاتھ پانی کے برتن میں ڈال کر نکالا، کلی کی، ناک میں پانی ڈالا اور اپنا چہرہ تین بار دھویا اور اپنے بازو دونوں کہنیوں تک تین بار دھوئے، پھر برتن میں ہاتھ ڈالا، مسح کے لیے پانی لیا اور دونوں ہاتھوں سے ایک بار اپنے سر کا مسح کیا، بعد ازاں اپنے دونوں پاؤں دونوں ٹخنوں تک تین بار دھوئے۔

پھر اپنی ہتھیلی سے تھوڑا سا پانی لیا اور اسے پی لیا، پھر فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح وضو فرماتے تھے۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بعض امور کی ممانعت

عبداللہ بن حنین اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حديث: 930، یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔ [2] مسند أحمد، حديث: 1128، اس کی سند حسن ہے۔ [3] مسند أحمد، حديث: 876.

کو یہ کہتے ہوئے سنا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے سونے کی انگوٹھی، ریشم کا لباس اور زرد رنگ کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا۔ رکوع کی حالت میں قرآن پڑھنے سے بھی منع کیا۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے مجھے ریشم کی دھاری دار چادر عطا فرمائی، میں یہ چادر اوڑھ کر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علی! میں نے یہ تمھیں اس لیے نہیں دی تھی کہ تم خود اوڑھو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں وہ چادر اپنے گھر میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس لے آیا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ وہ کہنے لگیں: اے ابن ابی طالب! اللہ آپ کا بھلا کرے، یہ آپ نے کیا کیا؟ میں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اسے اوڑھنے سے منع فرمایا ہے، اب ایک حصہ تم اوڑھ لو اور دوسرا کسی اور خاتون کو دے دو۔[1]

گناہوں کی بخشش

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے دنیا میں کوئی گناہ کیا اور اسے اس کی سزا مل گئی تو اللہ تعالیٰ بڑا عادل و منصف ہے اسے دوبارہ سزا نہیں دے گا اور جس نے دنیا میں کسی گناہ کا ارتکاب کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی فرمائی اور اسے معاف کر دیا، تو اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ معافی کے بعد اسے اس گناہ کی پھر سزا دے۔''[2]

معروف میں اطاعت

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر روانہ کیا اور ایک آدمی کو لشکر کا امیر بنا دیا۔ اس نے آگ جلائی اور کہا: اس میں داخل ہو جاؤ، کچھ لوگوں نے اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا اور بعض لوگ بولے: ہم تو آگ سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں،

---

[1] مسند أحمد، حدیث: 710. [2] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حدیث: 1365، اس کی سند حسن ہے۔

اب ہم آگ میں نہیں گھسیں گے۔ جب یہ بات رسول اللہ ﷺ کے علم میں لائی گئی تو آگ میں داخل ہونے کا ارادہ کرنے والوں سے فرمایا: ''اگر تم اس میں داخل ہو جاتے تو قیامت تک اسی میں رہتے۔'' اور دوسروں کے بارے میں اچھے الفاظ کہے اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے کام میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، اطاعت صرف معروف میں ہے۔''[1]

اہل مدینہ کے لیے برکت کی دعا

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (سفر کو) نکلے۔ سعد بن ابی وقاص کے چشمہ پر پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وضو کے لیے پانی لاؤ۔'' جب آپ وضو سے فارغ ہوئے تو قبلہ رو ہو کر کھڑے ہوئے، اللہ کی کبریائی کا اعلان کیا اور یہ دعا کی:

''اے اللہ! ابراہیم (علیہ السلام) تیرے بندے اور تیرے خلیل تھے، انھوں نے اہل مکہ کے لیے برکت کی دعا کی اور میں محمد تیرا بندہ اور تیرا رسول ہوں، میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ اہل مدینہ کے لیے ان کے مد اور صاع میں اسی طرح برکت عطا فرما جس طرح تو نے اہل مکہ کے لیے برکت فرمائی، ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں۔''[2]

کرب کے لمحات میں دعا

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ سکھایا کہ جب کبھی کوئی کرب اور مصیبت لاحق ہو تو یہ دعا کروں:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ»

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، وہ حلم والا کریم ہے، اللہ پاک ہے اور عرش

[1] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حديث: 724، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [2] مسند أحمد، حديث: 936، اس کی سند صحیح ہے۔

عظیم کا مالک اللہ بابرکت ذات ہے، اور ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔''﴿1﴾

رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کوئی خفیہ بات نہیں کی

ابو طفیل سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتائیے جو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے چھپا کر آپ سے کی ہو۔ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے چھپا کر مجھ سے کوئی بات نہیں کی، البتہ میں نے ایک موقع پر ان کا یہ ارشاد سنا، وہ فرمارہے تھے:

''اللہ اس پر لعنت کرے جس نے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا۔ اللہ اس پر لعنت کرے جس نے بدعتی کو پناہ دی۔ اللہ اس پر لعنت کرے جو اپنے والدین کو لعن طعن کرتا ہے اور اللہ اسے بھی لعنت کرے جو زمین کے نشانات (یعنی سرحدیں) اور حد بندیاں تبدیل کردے۔''﴿2﴾

آپ ﷺ کے فرمان «لَعَنَ اللّٰهُ» کا مطلب اللہ کی رحمت سے دور کردیا جانا ہے۔ اور غیر اللہ کے لیے ذبح سے مراد، اللہ کے سوا جو بھی ہے چاہے وہ نبی کے لیے ہو، کسی بادشاہ کے لیے، جنات یا کسی اور کے لیے۔

اگر یہ معاملات، اللہ کے دین میں معمولی ہوتے تو ان کا مرتکب رسول اللہ ﷺ کی جانب سے لعنت کا مستحق نہ ٹھہرتا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور روایت حدیث

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دور میں تمام صحابہ کرام سے زیادہ سنت کا علم رکھنے والے تھے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا: صحابہ میں

﴿1﴾ مسند أحمد، حدیث: 701، یہ حدیث صحیح ہے۔ ﴿2﴾ مسند أحمد، حدیث: 855، اس کی سند قوی ہے۔

سے جو آج موجود ہیں، علی ان سب سے زیادہ سنت کا علم رکھنے والے ہیں۔[1] بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سو چھیاسی احادیث روایت کی ہیں۔[2]

دیگر بعض صحابہ نے جو احادیث روایت کی ہیں یہ تعداد ان سے کم ہے۔ اس کی وجوہ یہ ہیں:

- قضاء، حکومت اور جنگوں کے معاملات میں آپ بہت مصروف رہے، مشغولیت کے باعث آپ فتوی دینے اور درس و تدریس کے ایسے حلقے قائم کرنے کے لیے فراغت نہ پا سکے جو حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانب سے علم کی نشر و اشاعت کا سبب بنے۔
- بندگانِ بدعت و اغراض و بدعات کا ظہور اور ان کی طرف سے افراط و تفریط، ان کی طرف منسوب جھوٹی روایات کا باعث بنے، لہٰذا علمائے کرام نے بڑی زبردست کوشش کی کہ ان تک پہنچنے والی سندوں کی صحت جانچ لی جائے۔
- ان کے دور میں فتنوں کی بہتات ہوگئی اور بعض لوگوں کی اس طرف توجہ ہو جانے کے نتیجہ میں روایت نقل کرنے والوں پر اعتماد نہ رہا۔ ان سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ''میرے پاس علم موجود ہے۔ کاش! اس کے لیے صحیح حاملین موجود ہوں۔''[3]

روایت قبول کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منہج

- نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے سے اجتناب، کیونکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں سمجھے۔''[4]
- حضرت علی رضی اللہ عنہ راوی سے حلف لیا کرتے۔ ان سے روایت ہے کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سنتا ہوں تو اس سے پوری طرح مستفید ہونے کی کوشش کرتا ہوں

[1] الطبقات: 338/2. [2] تاريخ الخلفاء، ص: 171. [3] فقه الإمام علي: 3/1، بروايت أعلام الموقعين.
[4] صحيح البخاري، حديث: 106.

اور جب کوئی اور حدیث بیان کرے اس سے حلف لیتا ہوں، جب وہ حلف اٹھائے تو اس کی تصدیق کرتا ہوں۔[1]

- حضرت علی رضی اللہ عنہ منکر اور شاذ قسم کی احادیث روایت نہیں کرتے تھے، ان سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''لوگوں کے روبرو وہ باتیں بیان کرو جو وہ سمجھ سکتے ہوں اور جو ان کے لیے اجنبی اور منکر ہوں انھیں چھوڑ دو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلایا جائے؟''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ اور اپنی زوجہ مکرمہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بھی احادیث بیان کی ہیں۔

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 1395، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] صحيح البخاري، كتاب العلم، قبل الحديث: 127.

مدنی زندگی کا آغاز

مدینہ کو مرکز بنانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ریاست کے ستونوں کو مضبوط بنانے کے لیے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ کا عمل شروع کیا، پھر مسجد کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہود کے ساتھ معاہدات کیے گئے، فوجی دستوں کی نقل و حرکت شروع ہوئی۔ نئے معاشرے میں تعلیمی، تربیتی اور اقتصادی امور کی بنیاد رکھی گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر قسم کے حالات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وابستہ رہے، آپ کے احکام نافذ کرتے رہے اور آپ کے دیے گئے طریقِ زندگی کو نہایت مضبوطی سے اپنائے رکھا۔

مدینہ میں مواخاۃ

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سہل بن حنیف کے درمیان مواخاۃ قائم کی۔ بعض علماء نے مکہ مکرمہ میں بھی مہاجرین کے درمیان مواخاۃ کا ذکر کیا ہے۔ بلاذری نے نشان دہی کی ہے کہ نبی ﷺ نے ہجرت سے پہلے حق اور مواسات (باہمی ہمدردی) پر مکہ میں مسلمانوں کے مابین مواخاۃ کا رشتہ قائم کیا تھا۔ آپ ﷺ نے حمزہ اور زید بن حارثہ کے درمیان، ابوبکر اور عمر کے درمیان، عثمان بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان، زبیر بن العوام اور عبداللہ بن مسعود کے درمیان، عبیدہ بن حارث اور بلال حبشی، مصعب بن عمیر اور سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن الجراح اور سالم مولی ابی حذیفہ، سعید بن زید اور طلحہ بن عبیداللہ اور

طلحہ اور علی رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخاۃ کا رشتہ قائم کیا۔[1] بلاذری سب سے پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے مکی مواخاۃ کا ذکر کیا ہے۔ ابن عبدالبر (متوفی 463ھ) نے بلاذری سے نقل کرنے کا اشارہ دیے بغیر اسی بات کا ذکر کیا ہے۔ ابن سید الناس نے بھی سابقہ دونوں کا حوالہ دیے بغیر یہی بات لکھی ہے۔[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مہاجرین کی (مکہ میں) باہمی مواخاۃ سے انکار کیا ہے۔ انھوں نے ان روایات کو غلط قرار دیا ہے جو اس بارے میں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک، نبی ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین مواخاۃ کی روایت ہے۔[3] ابن قیم کا یہ کہنا ہے کہ مکہ میں مواخات کا سلسلہ وقوع پذیر نہیں ہوا، وہ فرماتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ نبی ﷺ نے مہاجرین کے درمیان باہمی مواخاۃ قائم کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی قرار دیا۔ صرف مدینہ میں پہلی مواخاۃ (مہاجرین وانصار) کے مابین ثابت ہے۔ مہاجرین (مکہ میں) اخوت اسلام، اخوتِ دار، اخوت نسب وقرابت کے باعث مواخاۃ کے اس طرح محتاج نہ تھے جس طرح انصار ومہاجرین کے درمیان مدینہ منورہ میں مواخاۃ ہوئی۔[4]

نبی اکرم ﷺ نے مہاجرین وانصار کے مابین مواخاۃ کی حکمت عملی، ان کے مابین محبت اور مودت کے جذبات واحساسات کو پختہ کرنے کے لیے اختیار فرمائی، انھوں نے خود بھی اس کا اہتمام کیا اور نبی کریم ﷺ نے ان کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رکھا۔[5] صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نفاذِ مواخاۃ کی تدابیر میں مسابقت اختیار کرتے تھے۔ دنیا جہان کے محققین اور ادیب اپنی قوت بیان کی معراج پر پہنچ کر بھی اس ارشاد ربانی تک نہیں پہنچ سکتے جو انصار کے حق میں فرمایا گیا۔[6]

---

[1] أنساب الأشراف: 270/1. [2] السيرة النبوية الصحيحة: 40/1. [3] منهاج السنة: 71/5. [4] زاد المعاد: 79/2. [5] فصول من السيرة النبوية لعبد المنعم سيد، ص: 200. [6] هجرة الرسول وصحابته في القرآن والسنة للجمل، ص: 524.

لشکروں کی روانگی کی تحریک

رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مدینہ میں مسلمانوں کو جو استحکام نصیب ہوا، اس کے نتیجہ میں وہ تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے ریاست کی قوت و شوکت کا پھیلاؤ، بڑے غزوات کے لیے جنگی تیاریوں کی خاطر صحابہ کی ٹریننگ، فتوحات کے حصول اور قیادت تیار کرنے کی عملی تیاری تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لشکر کشی کے تمام مراحل میں شرکت کی، چاہے وہ لشکر غزوۂ بدر سے پہلے روانہ کیے گئے یا بعد میں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے غزوہ بدر سے پہلے جن جنگوں میں شریک رہے، وہ یہ ہیں:

غزوۃ العشیرہ[1]

اس غزوہ میں رسول اللہ ﷺ قریش کے خلاف جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ نے مدینہ میں ابوسلمہ بن عبدالاسد کو عامل بنایا۔ اس غزوہ کا نام غزوۃ العشیرہ رکھا گیا۔ اس غزوہ میں جمادی الاولی اور جمادی الثانیہ کے کچھ دنوں میں وہاں قیام کیا اور وہاں بنی مدلج اور بنی ضمرہ میں سے ان کے حلیفوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا، پھر مدینہ واپس آ گئے۔ کوئی مڈبھیڑ نہ ہوسکی، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ قافلہ جو اس مقصد کے لیے روانہ ہوا تھا، اس سے کچھ روز پہلے ہی شام کی طرف روانہ ہوا اور ساحل سمندر پر پڑاؤ ڈالا۔ قریشیوں کو اس کی اطلاع ملی تو وہ اسے روکنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ وہاں ان کا سامنا رسول اللہ ﷺ سے ہوا اور وہیں غزوہ بدر ہوا۔[2] عمار بن یاسر، رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس غزوہ میں شرکت کے بارے میں بتاتے ہیں۔

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: میں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ غزوۃ العشیرہ میں ساتھی تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور وہاں قیام کیا، ہم نے بنی مدلج کے

[1] مکہ اور مدینہ کے درمیان ینبع کے نواح میں ایک مقام کا نام ہے۔ [2] الطبقات لابن سعد: 2/10، 11.

کچھ لوگوں کو نخلستان میں کام کرتے دیکھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: آؤ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے کام کرتے ہیں؟ ہم وہاں پہنچے۔ ہم نے کچھ دیر ان کو دیکھا، پھر ہم پر نیند نے غلبہ کیا تو ہم کھجور کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے بنجر جگہ پر مٹی ہی پر سو گئے۔ ہم سوتے رہے، اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پاؤں سے ہلایا اور جگا دیا، اس بنجر جگہ پر ہم مٹی سے اٹ گئے تھے، اسی دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابوتراب کے لقب سے نوازا کیونکہ ان کے جسم پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں دو بدبخت لوگوں کے بارے میں بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک تو قوم ثمود کا اُحیمر نامی شخص جس نے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ دی تھیں اور دوسرا وہ شخص جس کی تم سے یہاں مڈبھیڑ ہوگی، وہ شخص تمھارے سر پر چوٹ لگائے گا، اس کی وجہ سے تمھاری ڈاڑھی خون سے تر ہو جائے گی۔[1] ابوتراب کے حوالہ سے ایک حدیث آگے آرہی ہے۔

غزوہ بدر اولیٰ

اس کی وجہ یہ بنی کہ کرز بن جابر الفہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور کچھ اونٹوں اور دیگر مویشیوں کو بھگا کر لے گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور بدر کی جانب ''صفوان'' نامی ایک وادی تک پہنچے لیکن کرز بن جابر کا کہیں پتہ نہ چل سکا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ تشریف لے آئے۔[2]

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا سفید جھنڈا عطا فرمایا۔ مختلف لشکروں کی روانگی کو اسلامی دعوت کے دشمنوں کے خلاف قتالی جہاد کی ابتدا قرار دیا جاتا ہے۔ ان لشکروں میں دیگر صحابہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شریک رہے۔ اس سنت کا غلبۂ دین کے ساتھ بڑا گہرا

[1] فضائل الصحابة: 855/2، حدیث: 1572، اس کی سند حسن ہے۔ [2] السيرة لابن هشام: 601/2.

اور مضبوط تعلق ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں یہی بات اس طرح بیان فرمائی ہے:

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾

''اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہے۔''[2]

غزوۂ بدر
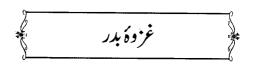
امام نووی کہتے ہیں: تمام اہل تواریخ متفق ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کے سوا، تمام غزوات و سرایا میں نہایت مستعدی کے ساتھ شریک ہوئے۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بہت سے مواقع پر جھنڈا عطا فرمایا۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان مجاہدین صحابہ میں نمایاں تھے جو غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ آیئے اس غزوہ کی سرگزشت خود انھی کی زبانی سنتے ہیں: حارثہ بن مضرب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے بارے میں حقیقت حال سے باخبر رہنے کی کوشش فرماتے رہے۔ جب یہ خبر ملی کہ مشرکین اس طرف قدم بڑھا رہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ کے ساتھ بدر کا رخ کیا۔ ہم بدر کے کنویں کی طرف مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔ ہمیں وہاں دو آدمی ملے۔ ایک قریش کا آدمی تھا اور دوسرا عقبہ بن ابی معیط کا غلام تھا۔ قریشی وہاں سے کھسک گیا اور عقبہ کے غلام کو ہم نے پکڑ لیا۔ ہم نے پوچھا: تمھاری قوم کے لوگ کتنی تعداد میں ہیں؟ وہ کہنے لگا: وہ بہت زیادہ ہیں اور بے حد طاقتور

[1] تاریخ الإسلام للذھبی: 48/2، وعلی بن أبی طالب للرفاعی، ص: 89. [2] البقرة 2:251. [3] تھذیب الأسماء واللغات: 245/1.

ہیں۔ یہ سن کر صحابہ کرام اسے نبی ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا: تم کتنی تعداد میں ہو؟ اس نے کہا: وہ بڑی تعداد میں ہیں اور بہت طاقتور ہیں۔ نبی ﷺ نے بہت کوشش کی کہ وہ صحیح تعداد بتائے لیکن وہ انکار کرتا رہا۔ آخر آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: وہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ اس نے کہا: روزانہ دس اونٹ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ایک ہزار ہیں۔ ایک اونٹ تقریباً سو افراد کے لیے کافی ہوتا ہے۔

بعد ازاں رات کو بارش برسنے لگی۔ ہم درختوں کے نیچے آگئے۔ اور رسول اللہ ﷺ رات بھر اپنے رب کے حضور دعا مانگتے رہے:

''اے اللہ! اگر تو نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر تیری بندگی کرنے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔''

صبح طلوع ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو نماز کے لیے پکارا۔ لوگ آگئے، رسول اللہ ﷺ نے ہم سب کو نماز پڑھائی۔ بعد ازاں لڑائی کے لیے ترغیب دی اور ہمارا حوصلہ بڑھایا، پھر فرمایا: قریشیوں کا گروہ اس چوڑے سرخ پہاڑ کے نیچے ہے۔ پھر جوں ہی دشمن ہمارے قریب ہوا، ہم نے ان کے خلاف صف بندی کر لی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی جو سرخ اونٹ پر تھا، دشمن کی صفوں میں چل رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علی! حمزہ کو بلاؤ! وہ مشرکین کی صفوں کے قریب تھے، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: یہ سرخ اونٹ والا کون ہے اور اپنے ساتھیوں کو کیا کہہ رہا ہے؟ پھر آپ ﷺ فرمانے لگے: یوں لگتا ہے کہ دشمن کی فوج میں یہ آدمی اپنے لوگوں سے کوئی خیر خواہی کی بات کر رہا ہے۔ حمزہ نے آکر بتایا کہ وہ عتبہ بن ربیعہ ہے۔ وہ اپنی قوم کو لڑائی سے منع کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے: میری قوم! میں بالمقابل ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے ہیں، آگے نہ بڑھو، اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ ممکن ہے تم یہ کہو کہ عتبہ بن ربیعہ بزدل ہو گیا ہے۔ تم خوب جانتے ہو، میں بزدل نہیں ہوں۔ ابوجہل نے جب اس کی یہ بات سنی تو کہا: ارے! تم یہ بات کہتے

ہو؟ اللہ کی قسم! کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اسے چبا ڈالتا، تم دشمن سے مرعوب ہو گئے ہو؟ عتبہ نے کہا: تم مجھے عار دلا رہے ہو؟ آج تم دیکھ لوگے ہم میں سے کون بزدل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عتبہ اور اس کے بھائی شیبہ نے للکارا اور ان کے بچاؤ کے لیے اس کا بیٹا ولید بھی سامنے آ گیا، پھر وہ سب کہنے لگے: آؤ! ہم سے مقابلے کے لیے کون تیار ہے؟ صحابہ کرام میں سے انصار کے چھ نوجوان سامنے آ گئے۔ عتبہ نے کہا: ہم ان کا مقابلہ نہیں کریں گے، ہمارے چچاؤں کی اولاد، عبدالمطلب کی اولاد میں سے کوئی آگے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی! اٹھ کھڑے ہو! حمزہ اٹھو! عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب اٹھو! اور ان کا مقابلہ کرو!

اللہ تعالیٰ نے ربیعہ کے دونوں بیٹوں عتبہ اور شیبہ اور ولید بن عتبہ کو ہلاک کر دیا، عبیدہ کچھ زخمی ہوئے۔ ہم نے ان کے ستر آدمیوں کو ہلاک کیا اور ستر کو قید کر لیا۔ انصار قبیلے کا ایک آدمی عباس بن عبدالمطلب کو گرفتار کر کے لے آیا۔ عباس نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس نے مجھے گرفتار نہیں کیا، مجھے تو ایک خوبصورت شخص نے قید کیا۔ وہ ایک سیاہ و سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ مجھے وہ شخص اب کہیں نظر نہیں آ رہا۔ انصاری نے کہا: انھیں میں نے قید کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خاموش رہو، اللہ تعالیٰ نے ایک معزز فرشتے کے ذریعے تمھاری مدد کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر ہم نے عبدالمطلب کی اولاد میں سے عباس، عقیل اور نوفل بن الحارث کو قیدی بنا لیا۔[1]

[1] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حديث: 948.

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شادی اور اہل بیت کی تفصیل

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا امام المتقین سید البشر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی والدہ حضرت خدیجہ بنت خویلد ہیں۔[1] بعثت سے پہلے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 35 سال تھی ان کی ولادت ہوئی۔[2] واقعہ بدر کے بعد سن دو ہجری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کردی۔ ان سے دو صاحبزادے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اور ایک صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے چھ ماہ بعد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی انتقال فرما گئیں۔[3]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر اور جہیز

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض حضرات نے سیدہ فاطمہ سے نکاح کی درخواست کی۔ میری ایک لونڈی نے مجھ سے کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے رشتے کی درخواست کی جارہی ہے۔ میں نے کہا: مجھے معلوم نہیں۔ وہ بولی: بھلا اس میں کون سا امر مانع ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جائیں۔ وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی کردیں گے۔ میں نے کہا: بھلا میرے پاس کیا ہے جس کی بنیاد پر میں شادی کرسکوں؟ وہ بولی: اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلے جائیں تو وہ یقیناً آپ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح کردیں گے۔ اللہ کی قسم! وہ مجھے بار بار امید دلاتی رہی۔ آخر کار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو ہی گیا۔

---

[1] أسد الغابة:5/525، والإصابة:4/365. [2] الطبقات لابن سعد:8/26. [3] حلية الأولياء:2/39,43.

میں آپ کی خدمت میں بیٹھ تو گیا مگر مجھے آپ سے مدعا عرض کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیبت وجلال کے باعث میں کچھ نہ کہہ سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ کیا کسی چیز کی ضرورت ہے؟ میں چپ چاپ ہی بیٹھا رہا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شاید تم فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا پیغام دینے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: تمھارے پاس ادائے حق مہر کے لیے کچھ ہے؟ میں نے عرض کیا: جی نہیں، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ زرہ کہاں ہے جو میں نے تمھیں دی تھی......؟ اس اللہ کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں علی کی جان ہے وہ ٹوٹی پھوٹی تھی، اس کی قیمت چار سو درہم سے زیادہ نہ ہوگی...... بہرحال میں نے رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: جی ہاں وہ زرہ میرے پاس موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اس کے بدلے تمھارا نکاح فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کر دیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق مہر بس یہی تھا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے ایک چادر، ایک مشکیزہ اور چمڑے کا ایک تکیہ جو اذخر بُوٹی سے بھر کر بنایا گیا تھا، مہیا فرمایا۔[2]

بعض شیعہ کتب میں اس روایت کی تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اپنی زرہ لی، بازار گیا اور اسے عثمان ابن عفان کے ہاتھ 400 درہم میں بیچ دیا۔ جب میں نے دراہم اپنے قبضہ میں اور انھوں نے زرہ اپنے قبضہ میں لے لی تو کہا: اے ابو الحسن! کیا اب میں زرہ کا زیادہ حقدار اور آپ مجھ سے زیادہ دراہم کے حق دار نہیں ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں کیوں نہیں۔ اس پر انھوں نے کہا: اب یہ زرہ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ میں نے زرہ اور دراہم دونوں چیزیں ہاتھ میں لیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گیا۔ زرہ اور دراہم ان کے آگے رکھ دیے اور میرے اور عثمان کے درمیان جو واقعہ

[1] دلائل النبوة للبیهقي: 160/3، اس کی سند حسن ہے۔ [2] صحیح السيرة النبوية، ص: 667، ومسند فاطمة الزهراء وما ورد فضلها للسيوطي تحقيق فؤاد أحمد زمرلي، ص: 189.

پیش آیا تھا، وہ بھی عرض کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے خیر و بھلائی کی دعا فرمائی۔ [1]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی

اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصتی کے معاملات میں شریک تھی۔ صبح ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دروازے کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: اے ام ایمن! میرے بھائی کو میرے پاس بلا لاؤ۔ میں نے کہا: وہ آپ کے بھائی ہیں اور آپ نے ان کا نکاح کر دیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ام ایمن! وہ کہتی ہیں کہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ آ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر پانی ڈالا اور ان کے لیے دعا کی، پھر فرمایا: فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میرے پاس بلاؤ، وہ لجاتی شرماتی ہوئی آئیں، آپ نے ان سے فرمایا: میں نے اپنے اہل خانہ میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ شخصیت سے تمھارا نکاح کر دیا ہے۔ ام ایمن کہتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر بھی پانی ڈالا اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ وہ کہتی ہیں: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس چلے تو اپنے سامنے کسی کا سایہ محسوس کیا۔ دریافت فرمایا: کون ہے؟ میں نے عرض کیا: میں ہوں، فرمایا: اسماء ہیں، میں نے کہا: جی ہاں! فرمایا: اسماء بنت عمیس ہیں۔ میں نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایا: آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کی رخصتی کے سلسلے میں ان کی عزت افزائی کے لیے آئی ہیں؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! وہ کہتی ہیں کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے بھی دعا فرمائی۔ [2]

ولیمہ

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شادی پر ولیمہ ضروری ہے۔ حضرت سعد

[1] كشف الغمة للأربلي: 359/1، وبحار الأنوار للمجلس، ص: 39. [2] فضائل الصحابة: 955/2، حدیث: 342، اس کی سند صحیح ہے۔

نے فوراً کہا: میرے ذمہ ایک مینڈھا ہے۔ انصار کے کچھ لوگ مکئی کا آٹا لے آئے۔ جب شادی کی رات آئی تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا، اس سے وضو کیا، پھر باقی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوپر انڈیل دیا اور فرمایا: اے اللہ! ان دونوں کے حق میں برکت عطا فرما اور ان کے بچوں میں بھی برکت عطا فرما۔[1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عائلی زندگی

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں انھیں دیگر مہاجرین کی طرح انتہائی تنگی اور عسرت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ حضرت علی نے فرمایا: ہم نے کچھ دن اس طرح گزارے کہ ہمارے پاس کوئی چیز تھی، نہ نبی ﷺ کے پاس کچھ تھا۔ میں گھر سے باہر نکلا۔ راستے میں ایک دینار پڑا نظر آیا۔ میں ایک لمحے کے لیے رکا، اسے اٹھانے یا نہ اٹھانے کے بارے میں سوچا، پھر میں نے حالات کی تنگی کے باعث اٹھا لیا۔ بار برداری والوں سے آٹا خریدا اور حضرت فاطمہ کے پاس لے آیا۔ میں نے کہا: اسے گوندھ کر روٹی پکا لو۔ وہ گوندھنے لگیں جبکہ وہ کمزوری اور تکلیف میں مبتلا تھیں۔ ان کے سر کے بال لٹک رہے تھے اور برتن کے کنارے پر لگ رہے تھے۔ انھوں نے روٹی پکائی۔ میں نبی ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور انھیں یہ ساری سرگزشت سنائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کھاؤ! یہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمھیں کھلایا۔[2]

امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی سے شادی کی۔ ہمارے پاس صرف ایک مینڈھے کی کھال تھی۔ اس کے سوا کوئی بستر نہیں تھا۔ رات کو ہم اسی پر سوتے تھے اور دن کو اسی پر چارہ ڈال کر اپنے جانوروں کو چارا کھلا دیتے تھے۔ ہمارے پاس کوئی خدمت گار بھی نہیں تھا۔[3]

[1] المعجم الكبير للطبراني، حديث: 1153. [2] كنز العمال: 328/7، والمرتضى للندوی، ص:41.
[3] كنز العمال: 133/7، والمرتضى للندوي، ص:41.

امام مجاہد کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں ایک دفعہ مدینہ میں سخت بھوک کا شکار ہوا۔ کسی مزدوری کی تلاش میں مضافات میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک عورت نے خشک مٹی جمع کر رکھی ہے۔ وہ اس کا گارا بنانا چاہتی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچا۔ مٹی پر پانی کا ایک ڈول ڈالنے پر ایک کھجور کا معاوضہ طے ہوا۔ میں سولہ ڈول کھینچ کر لایا۔ میرے دونوں ہاتھ سوج گئے، پھر میں اس کے پاس گیا اور دونوں ہتھیلیاں ملا کر سامنے کر دیں۔ اس نے گن کر سولہ کھجوریں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ میں واپس آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور انھیں یہ واقعہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی میرے ساتھ ان میں سے کچھ کھجوریں تناول فرمائیں۔ [1]

اس واقعہ میں ان سخت حالات کا ذکر ہے جن کا سامنا امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ مدینہ میں کرتے رہے۔ اس سے ہمیں یہ زریں سبق حاصل ہوتا ہے کہ تنگی کے حالات میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا اور اپنے ہاتھوں سے محنت مزدوری کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اور لوگوں کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی سخاوت یا عطا و بخشش کا انتظار نہیں کیا۔ انھوں نے سخت بھوک کی حالت میں محنت مشقت کے عوض کھجوریں حاصل کیں۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے محبوب عزیزوں اور ساتھیوں کو نہیں بھولے۔ انھوں نے مزدوری کی کھجوروں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شریک کیا اور انھیں اپنے ساتھ کھجوریں کھلائیں۔ [2]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا زہد اور صبر

سیدہ کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ ان کے مقدس گھر میں عیش و عشرت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ زندگی بڑی تنگی اور عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ ذرا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مشکل حالات زندگی

[1] صفة الصفوة:320/1، والموسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حديث: 1135، حدیث ضعیف اور منقطع ہے۔ [2] التاريخ الإسلامي للحميدي:19/49-50.

کا آئینہ دیکھیے۔ انھوں نے گھر کے بھاری کام کاج کے نتیجے میں شدید تھکاوٹ کی وجہ سے ایک دن قیدیوں میں سے ایک خادم مانگا۔ اس واقعے کا پس منظر یہ ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دن سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: میں بیمار ہوں۔ سینے میں تکلیف محسوس کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے والد گرامی کی کی خدمت میں کچھ قیدی بھیج دیے ہیں۔ تم ان کی خدمت میں جاؤ اور ان سے ایک خادم ہی مانگ لاؤ۔ وہ کہنے لگیں: اللہ کی قسم! چکی پیستے پیستے میرے دونوں ہاتھ سوج گئے ہیں، میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی آپ نے دریافت فرمایا: کیسے آئی ہو بیٹی؟ میں نے عرض کیا: میں آپ کو سلام کرنے آئی ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا ہوا؟ انھوں نے بتایا کہ مجھے ابا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگتے ہوئے بڑی شرم آئی۔ پھر ہم دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکھٹے پہنچے۔ علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں بیمار رہتا ہوں سینے میں تکلیف ہے...... پھر میں نے عرض کیا: چکی پینے کے نتیجے میں میرے ہاتھوں پر ورم آگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کچھ قیدیوں اور فراخی سے نوازا ہے۔ ہمیں بھی ایک خادم عطا کر دیجیے! [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں تمھیں کچھ نہیں دے سکتا۔ کیا میں اہل صفہ کو بھوکا چھوڑ دوں؟ ان پر خرچ کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں قیدی فروخت کر کے ان کی آمدنی اہل صفہ پر خرچ کروں گا۔ وہ دونوں واپس چلے آئے۔ بعد ازاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر ان کے پاس تشریف لائے۔ حضرت علی اور سیدہ فاطمہ اپنے اوپر چادر لیے ہوئے تھے اور حالت یہ تھی کہ اگر وہ اپنا سر ڈھانپتے تھے تو دونوں کے پاؤں ننگے ہوجاتے تھے اور پاؤں ڈھانپتے تھے تو دونوں کے سر ننگے ہوجاتے تھے۔ وہ دونوں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام میں اٹھنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی جگہ رہو۔ پھر فرمایا: تم نے مجھ سے جو کچھ مانگا ہے کیا تمھیں اس سے زیادہ بہتر چیز نہ بتاؤں؟ دونوں نے عرض کیا: جی ہاں! کیوں نہیں۔

[1] السيرة النبوية للصلابي: 2/99، وصحيح مسلم، حديث: 2727، وصحيح البخاري، حديث: 3705.

ضرور ارشاد فرمائیے! آپ نے فرمایا: کچھ کلمات ہیں جو مجھے جبریل نے سکھائے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہر نماز کے بعد دس بار سبحان اللہ، دس بار الحمدللہ اور دس بار اللہ اکبر پڑھو، اور جب سوتے وقت بستر پر آؤ تو 33 بار سبحان اللہ، 33 بار الحمدللہ اور 34 بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ [1]

رسالت مآب ﷺ کی اس تربیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بہت گہرا اثر لیا۔ نوجوان علی رضی اللہ عنہ آزمائش کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد کندن بن گئے، جب وہ خلیفۃ المسلمین بنے تو اس تربیت کے آثار درخشاں نظر آنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں زمین کے خزانے تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو دنیا اور اس کی رنگینیوں سے ہمیشہ بالاتر رکھا کیونکہ ان کا دل اللہ کی یاد سے معمور تھا اور ان کا وجود ذکر الٰہی کے انوار سے سرشار رہتا تھا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی وصیت کو ہمیشہ یاد رکھا اور ہمیں بھی اس سے روشناس کرایا۔ وہ فرماتے ہیں: جب سے رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ مبارک کلمات سکھائے، میں نے انھیں پڑھنا نہیں چھوڑا۔ ہمیشہ اور ہر حال میں پڑھتا رہا۔ ایک صحابی نے ان سے پوچھا: کیا صفین کی رات بھی نہیں چھوڑا۔ انھوں نے فرمایا: ہاں! صفین کی رات بھی پڑھنا نہیں چھوڑا۔ [2]

ہمارے نفوس اللہ کے ہاتھ میں ہیں

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ رات کے وقت میرے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔ آپ نے ہمیں نماز کے لیے جگایا، پھر اپنے گھر واپس تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے رات کا کچھ حصہ نماز پڑھی اور پھر ہمارے بیدار نہ ہونے کا احساس ہوا تو ہمارے پاس پھر تشریف لے آئے، ہمیں بیدار کیا اور فرمایا: دونوں اٹھو! نماز پڑھو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں ملنے لگا، پھر میں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم وہی نماز پڑھیں گے جو فرض ہے۔ ہمارے نفوس اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں وہ جب چاہتا ہے ہمیں اٹھا دیتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے جا رہے ہیں،

[1] صحيح البخاري، حديث: 3705، وصحيح مسلم، حديث: 2727,2728. [2] صحيح مسلم: 2727.

آپ اپنا دستِ مبارک اپنی ران پر مارتے جاتے تھے اور یہ فرماتے جاتے تھے: ''ہم وہی نماز پڑھیں گے جو ہم فرض ہے...... ہم وہی نماز پڑھیں گے جو ہم پر فرض ہے۔'' اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ قرآن کی یہ آیت بھی پڑھ رہے تھے:

﴿ وَكَانَ الْإِنْسٰنُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ ﴾

''انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔'' [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ ساری بات بے تکلف بیان کر دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ حق بات واضح طور پر بیان کرتے تھے اور علم کی نشر و اشاعت کے آرزومند رہتے تھے، چاہے کوئی بات خود ان ہی کے بارے میں ہو۔ وہ سچائی کے اظہار و اعلان میں بے باک تھے۔ یہ نہایت قیمتی رہنمائی ہے۔ مسلمان، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ نہایت قیمتی سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو اس بات کو چھپا لیتے کیونکہ رات کی نماز فرض نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حضرت فاطمہ سے محبت

رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ یا سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے مسجد میں آتے دو رکعت نماز ادا فرماتے، پھر حضرت فاطمہ کے ہاں تشریف لے جاتے، بعدازاں اپنی ازواج مطہرات کے ہاں آتے۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت بھی سب سے آخر میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملتے۔ [2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے اٹھنے بیٹھنے رہن سہن اور آداب و اخلاق میں فاطمہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کسی اور کو رسول اللہ ﷺ کے مشابہ نہیں پایا۔ وہ آپ ﷺ کے ہاں آتی تھیں تو آپ ان سے کھڑے ہو کر ملتے تھے، بوسہ دیتے تھے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ اور جب نبی ﷺ ان کے ہاں تشریف لے جاتے تو وہ کھڑی ہو جاتی تھیں، آپ کو بوسہ دیتی تھیں

[1] الکھف 18:54. [2] مسند أحمد: 275/5، والإستيعاب: 376/4، اس کی سند میں ابو فروہ الرھاوی ضعیف راوی ہیں۔

اور آپ کو اپنی جگہ پر بٹھاتی تھیں۔[1] ایک روایت میں ہے کہ وہ آپ ﷺ کے دست مبارک کو بوسہ دیتی تھیں۔[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان حقیقی محبت تھی۔ اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے میرے گھر والوں میں سب سے زیادہ محبوب فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں ابوجہل کی بیٹی سے شادی کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جس نے اسے ناراض کیا، اس نے مجھے ناراض کیا۔[4]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی کا ذکر کیا، یہ بات نبی ﷺ تک پہنچ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فاطمہ میرے جسم کا حصہ ہے، اس کی تکلیف میری تکلیف ہے اور اس کی پریشانی میری پریشانی ہے۔[5]

رسول اللہ ﷺ کا اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تکلیف کو اپنی تکلیف کہنا اور ان کے لیے سر عام انتہائی محبت اور قدر و منزلت کے جذبات ظاہر فرمانا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وقار اور عزت و احترام کی سب سے معتبر دلیل ہے۔[6]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعض مناقب امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی نظر میں تمام خواتین میں پسندیدہ ترین شخصیت حضرت فاطمہ اور تمام مردوں میں پسندیدہ ترین فرد حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس حدیث کو عمرو بن العاص کی اس حدیث سے متعارض نہ سمجھا جائے جو صحیح بخاری میں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ کی نظر میں سب سے محبوب شخصیت کون ہے؟

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 2450، وسنن أبي داود، حديث: 5217. [2] سنن أبي داود، حديث: 5217. [3] مسند الطيالسي: 25/2، یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ [4] صحيح البخاري، حديث: 4173. [5] فضائل الصحابة: 756/2، حديث: 1327، اس کی سند صحیح ہے۔ [6] الدوحة النبوية الشريفة، ص: 57.

آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ۔ انھوں نے سوال کیا کہ آپ کو مردوں میں سے سب سے زیادہ کون محبوب ہے؟ فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا کے والد رضی اللہ عنہ۔ (1)

اللہ تعالیٰ زیادہ بہتر جانتا ہے۔ بظاہر مذکورہ حدیث سے مراد یہ ہوگا کہ ان کے اپنے گھر والوں میں سے عورتوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ شخصیت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور مردوں میں سے حضرت علی ہیں۔ اس سلسلے میں ابن العربی فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کی نظر میں لوگوں میں سے پسندیدہ ترین ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور ازواج مطہرات میں سے محبوب ترین عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں جبکہ اپنے گھر والوں میں سے فاطمہ رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھے، اس طرح دونوں احادیث میں تعارض کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ (2)

سچائی

امام حاکم نے اپنی سند سے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ جب بھی ان کے سامنے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر آتا تو فرماتی تھیں کہ میں نے ان سے زیادہ سچے لہجے کا کوئی فرد نہیں دیکھا۔ ہاں ان کے والد گرامی ﷺ بھی اسی طرح مجسم صداقت تھے۔ (3)

یہ بات انتہائی عظیم الشان اعزاز کا باعث ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت فاطمہ کو صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے مشابہ قرار دیتی ہیں۔ (4)

دنیا و آخرت میں سیادت

صادق و مصدوق حضرت محمد ﷺ سے ایسی احادیث روایت ہوئی ہیں جو دنیا و آخرت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سیادت کی خبر دیتی ہیں۔ امام ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ انس

(1) صحيح البخاري، حديث: 4385. (2) عارضة الأحوذي: 13/247-248، والعقيدة فی أهل البيت، ص: 137. (3) المستدرك: 3/160، امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح حدیث ہے۔ امام ذہبی نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ (4) العقيدة في أهل البيت، ص: 136.

بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا بھر کی تمام عورتوں میں یہ چار خواتین نہایت عزت و افتخار کا درجہ رکھتی ہیں: مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آسیہ زوجہ فرعون۔﴿1﴾ امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مریم بنت عمران کے استثناء کے ساتھ فاطمہ رضی اللہ عنہا اہل جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔﴿2﴾ اور امام بخاری حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خصائل شریفہ کے باب میں روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ رضی اللہ عنہا خواتینِ اہل جنت کی سردار ہیں۔﴿3﴾

حسن اور حسین رضی اللہ عنہما

حسن بن علی بن ابی طالب الھاشمی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور دنیا میں ان کے لیے نہایت خوشبودار پودے کی مانند اور اہل جنت کے جوانوں کے سرداروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ہیں۔ سن 3 ہجری کو رمضان المبارک اور بعض روایات کے مطابق شعبان میں اور بعض دیگر روایات کے مطابق چار یا پانچ ہجری میں ولادت ہوئی۔﴿4﴾ اور سن 50 ہجری میں وفات پائی، میں نے اپنی تالیف ''السیرة النبویة'' میں ترجیحاً ذکر کیا ہے کہ ان کی ولادت سن چار ہجری میں ہوئی تھی۔﴿5﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام حسن رکھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب حسن کی ولادت ہوئی، میں نے اس کا نام حرب رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، فرمایا: میرا بیٹا مجھے دکھاؤ۔ تم نے اس کا نام کیا رکھا ہے؟ میں نے کہا: حرب۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، اس کا نام حسن ہے۔﴿6﴾ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تند و تیز نام کو نہایت خوبصورت نام سے

﴿1﴾ فضائل الصحابة: 755/2، حدیث: 1325، والمشکاة: 745/3، البانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔﴿2﴾ فضائل الصحابة، حدیث: 1332، اس کی سند حسن لغیرہ ہے۔﴿3﴾ صحیح البخاري، حدیث: 3767، 3624. ﴿4﴾ فضائل الصحابة: 960/2، وحلیة الأولیاء: 35/2. ﴿5﴾ السیرة النبویة للصلابی: 199/2، وشذرات الذهب: 10/1. ﴿6﴾ الأدب المفرد، حدیث: 823 (ضعیف).

بدل دیا، جو دلوں میں شادمانی پیدا کرنے کا باعث ہے۔ اس خوبصورت نام والے نومولود کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں میں اٹھایا اور اسے بوسہ دیا۔ ابو رافع ہم کو تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ انھوں نے نومولود حسن رضی اللہ عنہ کے دونوں کانوں میں نماز والی اذان پڑھی۔ (1)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بارے میں احادیث

❁ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو نبی ﷺ کی گردن مبارک پر دیکھا، آپ فرما رہے تھے: ''اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما۔'' (2)

❁ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے نبی اکرم ﷺ کو منبر پر اس عالم میں دیکھا کہ حسن رضی اللہ عنہ بھی آپ کے پہلو میں بیٹھے تھے، میں نے دیکھا آپ ایک بار حسن کو اور ایک بار لوگوں کو دیکھتے، اس وقت آپ یہ فرما رہے تھے: ''میرا یہ بیٹا سردار ہوگا اور ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے۔'' (3)

نبی ﷺ کا یہ فرمان کہ حسن سردار ہوگا، ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور حضرت حسن کے لیے ایک امتیازی شان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے نانا کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں مسلمانوں کو آپس میں خون بہانے سے محفوظ رکھا۔ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے، یہ واقعہ سن 41 ہجری میں پیش آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ صرف چھ ماہ تک خلافت پر متمکن رہے اور یہ سال جماعت یعنی اجتماعیت کا سال کہلایا۔

یہ وہی بات ہے جو رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا مصداق ہے: ''ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے دو عظیم گروہوں کے درمیان اصلاح فرمائے گا۔'' (4)

---

(1) سنن أبي داود، حديث: 5105. (2) صحيح البخاري، حديث: 3749. (3) صحيح البخاري، حديث: 3746. (4) البداية والنهاية: 20/8، وسير أعلام النبلاء: 145,144/3.

❁ سعید بن المقبری[1] سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: ہم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما تشریف لائے، انھوں نے سلام کیا، ہم نے سلام کا جواب دیا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو پتہ ہی نہ چلا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں۔ ہم نے انھیں متوجہ کیا اور بتایا کہ یہ دیکھیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں اور انھوں نے سلام کیا ہے۔ وہ آگاہ ہوکر فوراً متوجہ ہوئے اور کہا: میرے آقا وعلیك السلام! اور پھر فرمایا: یہ سردار ہیں۔[2]

❁ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک سے مشابہت کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھنے والا کوئی نہ تھا۔''[3]

❁ امام بخاری ہی نے عقبہ بن حارث تک اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت ابوبکر کو دیکھا وہ حسن کو اٹھائے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے: میرے والد آپ پر قربان! یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہیں۔ حضرت ابوبکر کی یہ بات سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہنس رہے تھے۔[4] اپنے نانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت حسن کی ہیئت وصورت کی مشابہت، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا اعزاز اور واضح فضیلت کی علامت ہے۔[5]

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما

حضرت حسین، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے، آپ کے گلشن کے گل سرسبد اور بہت محبوب ہستی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] وہ کیسان المدنی، ام شریک کے آزاد کردہ غلام ہیں اور ثقہ راوی ہیں۔ تقریب التهذیب: 463
[2] المستدرك، کتاب معرفة الصحابة: 169/3، اس کی سند صحیح ہے، ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔
[3] صحیح البخاري، کتاب الفضائل، حدیث: 3752. [4] صحیح البخاري، حدیث: 3750.
[5] العقیدة في أهل البیت، ص: 147.

صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لخت جگر ہیں۔ سن چار ہجری میں ولادت ہوئی، سن 61 ہجری میں 10 محرم کو سرزمین عراق میں کربلا کے مقام پر شہادت سے سرخرو ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور انھیں راضی کر دے۔ [1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مناقب وفضائل کے بارے میں احادیث

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ یعلی العامری سے روایت کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ضیافت میں گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس تشریف فرما ہوئے اور حسین رضی اللہ عنہ بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ساتھ لینا چاہا لیکن وہ ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہنسی ہنسی میں انھیں گود میں اٹھالیا، پھر ان کا ایک ہاتھ اپنی گردن مبارک کے پیچھے اور دوسرا ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیا، پھر انھیں بوسہ دیا اور فرمایا: حسین (رضی اللہ عنہ) مجھ سے ہے اور میں حسین (رضی اللہ عنہ) سے ہوں، اے اللہ! جو حسین سے محبت کرے تو اس سے محبت فرما، حسین میرا نواسہ ہے۔ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں واضح طور پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے نہایت فخر و اعزاز کا مقام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے محبت کی ترغیب دی ہے، گویا انھوں نے وہ معاملہ وحی کی روشنی میں دیکھ لیا تھا جو آئندہ ان کے ساتھ پیش آنے والا ہے، لہٰذا آپ نے ان کے ساتھ محبت کی تاکید فرمائی اور ان کے درپے ہونے اور ان کے خلاف جنگ کرنے کی حرمت بیان فرماتے ہوئے کہا: جس نے حسین سے محبت کی، اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا کیونکہ ان کی محبت، محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب لے جانے والی ہے اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ

[1] البداية والنهاية: 152/8، والإصابة: 334,331/1. [2] فضائل الصحابة، حديث: 1361، اس کی سند حسن ہے۔

کی محبت تک پہنچانے والی ہے۔ ⁽¹⁾

حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے مشترکہ مناقب کی احادیث
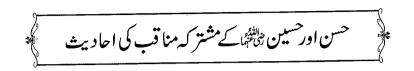
امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان سے عراق کے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ کیا حالتِ احرام میں مکھی کو ہلاک کرنا جائز ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ اہل عراق مکھی کے بارے میں سوال کرتے ہیں جبکہ انھوں نے بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کو شہید کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ (حسن اور حسین رضی اللہ عنہما) دونوں دنیا میں میرے لیے خوشبو کا محور و مرکز ہیں۔ ⁽²⁾

ابن حجر کہتے ہیں: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے ذریعے اللہ نے مجھے اعزاز و اکرام اور محبت سے نوازا ہے کیونکہ اولاد کو گلے لگایا اور بوسہ دیا جاتا ہے، گویا وہ منجملہ دیگر خوشبو دینے والی اشیاء کی مانند ہیں۔ ⁽³⁾

❁ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ان دونوں سے محبت کی تو یقیناً اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان دونوں سے بغض رکھا، اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ یہ دونوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما ہیں۔ ⁽⁴⁾

❁ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اہل جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ ⁽⁵⁾

⁽¹⁾ تحفة الأحوذي: 279/10 ⁽²⁾ صحيح البخاري، حديث: 3753. ⁽³⁾ فتح الباري: 427/10.
⁽⁴⁾ سنن أبي داود: 29/2، وفضائل الصحابة، حديث: 1359. ⁽⁵⁾ مجمع الزوائد: 184/9. البانی نے اپنی کتاب «الأحاديث الصحيحة» میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

❁ عبداللہ بن بریدہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد بریدہ رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرما رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اس دوران حسن اور حسین رضی اللہ عنہما آ گئے، وہ دونوں سرخ قمیصیں پہنے ہوئے تھے اور چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ منبر سے نیچے اترے اور ان دونوں کو اٹھا لیا اور اپنے آگے بٹھا دیا، پھر فرمایا: اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا ہے اور یہ آیت پڑھی:

﴿ اِنَّمَآ اَمۡوٰلُكُمۡ وَاَوۡلٰدُكُمۡ فِتۡنَةٌ ﴾

''تمھارے مال اور اولاد تو سراسر تمھاری آزمائش ہیں۔''[1]

میں نے ان دونوں کو دیکھا کہ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ میں صبر نہیں کر سکا۔ میں نے اپنی بات روک کر انھیں اوپر اٹھا لیا۔[2]

حدیث کساء اور اہل بیت کا مفہوم

کساء (چادر) والی حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا[3] نے روایت کیا ہے وہ کہتی ہیں: ایک دن نبی ﷺ صبح کے وقت گھر سے نکلے، ان کے بدن اطہر پر نقش و نگار والی ایک چادر (کساء) تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو اس چادر سے ڈھانپ لیا، پھر یہ آیت پڑھی:

﴿ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيۡرًا ۝ ﴾

''اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ وہ تم سے ہر قسم کی لغو بات کو دور کر دے اور تمھیں خوب صاف کر دے۔''[4]

---

[1] التغابن 15:64. [2] فضائل الصحابة، حديث: 1358، اس کی سند صحیح ہے۔ [3] صحیح مسلم، حديث: 2408، كتاب فضائل الصحابة. [4] الأحزاب 33:33، صحيح مسلم، حديث: 2167، كتاب الزكاة.

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں جو صحابۂ کرام پر فضائل علی رضی اللہ عنہ کو چھپانے کا الزام لگاتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن کے بارے میں بعض لوگ یہ لغو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے (نعوذ باللہ) بغض رکھتی ہیں، حالانکہ وہی ہیں جو مذکورہ حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت روایت کر رہی ہیں۔ [1]

ان تمام آیات کریمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو خطاب کیا گیا ہے اور انھی کے ذکر سے ان آیات کی ابتدا ہوئی اور انھی کے ذکر پر یہ ختم ہوئی۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ○ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ○ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ ۚ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ○ ﴾

”اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا دوں اور تمھیں خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو یقین رکھو کہ تم میں سے خوبی کے ساتھ نباہ کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجرِ عظیم تیار کر رکھا

[1] حقبة من التاريخ، ص: 187.

ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی بداخلاقی کرے گی اس کے لیے دو چند عذاب ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان ہے۔ اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں بردار بنی رہیں گی اور نیک کام کریں گی، ہم انھیں دہرا اجر دیں گے، اور ہم نے ان کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو، اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو تو نرم لہجے میں بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور یہ بات معروف قاعدے کے مطابق کرو اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور سابقہ جاہلیت کے سے انداز اختیار نہ کرو، اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اے نبی کی گھر والیو! اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ وہ تم سے وہ ہر قسم کی لغویات کو دور کر دے اور تمھیں خوب پاک کر دے۔'' [1]

ان آیات مبارکہ میں ازواج مطہرات سے خطاب کیا گیا ہے، اس میں امر، نہی، وعدہ اور وعید بھی ہیں اور واضح ہو گیا کہ یہ آیات ازواج مطہرات اور دیگر تمام اہل بیت کے لیے مفید معنی و مفہوم رکھتی ہیں۔ تطہیر کا لفظ مذکر کی ضمیر کے ساتھ آیا ہے کیونکہ جب حکم مذکر و مونث دونوں کے لیے ہو تو صیغہ مذکر کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور اہل بیت میں، علی و فاطمہ، حسن و حسین رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حدیث کساء میں) دعا کے لیے ان چاروں کو مخصوص کیا۔ حضرت زید بن ارقم سے پوچھا گیا کہ کیا ان کی ازواج ان کے اہل بیت میں سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: (ہاں) ان کی ازواج ان کے اہل بیت میں سے ہیں لیکن ان کے وہ اہل بیت جن کے لیے صدقہ لینا حرام ہے۔ وہ آل علی رضی اللہ عنہ، آل جعفر رضی اللہ عنہ، آل عقیل رضی اللہ عنہ اور آل عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔ [2]

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت رضی اللہ عنہم کا وسیع مفہوم پیش نظر ہو تو اس میں مذکورہ آیت کی دلیل کے مطابق آپ کی ازواج مطہرات اور ان کے علاوہ علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم بھی

[1] الأحزاب 33:28-33. [2] صحیح مسلم، حدیث: 2408.

شامل ہیں جیسا کہ حدیث کساء اور زید بن ارقم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آل عباس رضی اللہ عنہ، آل عقیل رضی اللہ عنہ، آل جعفر رضی اللہ عنہ اور آل حارث بن عبدالمطلب [1] بھی زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق شامل ہیں۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، حدیث: 1072.

غزوۂ احد سے فتح مکہ تک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کردار
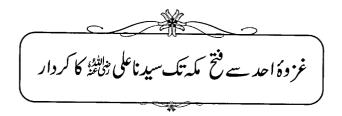
غزوۂ اُحد میں لڑائی کی ابتدا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور طلحہ بن عثمان کے درمیان مقابلہ آرائی سے ہوئی، ثانی الذکر کے ہاتھ میں مشرکین کا جھنڈا تھا۔ وہ بار بار للکار رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے آئے اور فرمایا: اس اللہ کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، یا تو میری تلوار تمھیں فوراً جہنم رسید کرے گی یا تمھاری تلوار مجھے فوراً جنت پہنچا دے گی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے تلوار ماری، اس کی ٹانگ کٹ گئی، وہ زمین پر گر پڑا۔ اسی دوران اس کا ستر کھل گیا۔ وہ کہنے لگا: اے میرے چچا کے بیٹے! میں تمھیں رشتہ داری کا واسطہ دیتا ہوں۔ اس کی فریاد سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض ساتھیوں نے ان سے پوچھا: آپ نے اس کا کام تمام کیوں نہیں کیا؟ علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: میرے چچا کے بیٹے نے مجھے رشتہ داری کا واسطہ دیا، مزید برآں اس کا ستر کھل گیا، میں نے اس سے بڑی شرم محسوس کی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ لشکر کے دائیں جانب گھمسان کے رن میں تھے۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کے بعد انھوں نے جھنڈا تھام لیا اور اس معرکے میں مشرکین کی بہت بڑی تعداد کو واصل جہنم کیا۔ اس غزوہ میں مسلمان بڑے سخت حالات کا شکار بھی رہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر تھی۔[2] اسی غزوے میں جب

---

[1] السیرة الحلبیة: 2/497,498. [2] البدایة والنہایة: 7/224.

رسالت مآب ﷺ کھائی میں گر پڑے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نے آگے بڑھ کر آپ کا دستِ مبارک تھاما۔[1] اس غزوہ میں مہاجرین وانصار میں سے عظیم صحابہ کرام بڑی تعداد میں شہید ہوئے جس کا رسول ﷺ کو بہت غم تھا۔ دشمن نے آپ ﷺ کو بہت نقصان پہنچایا اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی کر دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی مرہم پٹی کی، آپ کے چہرے اور ڈاڑھی مبارک پر بہنے والے خون کو بند کرنے کا انتظام کیا۔[2]

اس معرکہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور بہادری واضح ہوگئی۔ جب یہ خبر مشہور ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیا گیا ہے تو حضرت علی نے آپ کو بہت ڈھونڈا اور جب آپ ﷺ کو نہ پایا تو یہ خیال کیا کہ اب آپ کے بعد زندگی بیکار ہے۔ انھوں نے اپنی تلوار کی نیام توڑ دی اور لوگوں کی طرف لپکے، جب غبار چھٹ گیا تو اللہ کے فضل و کرم سے رسول اللہ ﷺ بخیر و عافیت نظر آئے۔[3] انھوں نے نہایت ثابت قدمی اور بہادری سے آپ ﷺ کا دفاع کیا۔ اس روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سولہ زخم لگے۔

جس جگہ پر معرکہ ہوا، مشرکین کے وہاں سے پیچھے ہٹ جانے کے بعد، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ دشمن کے بارے میں یہ معلوم کریں کہ وہ کس طرف کا رخ کرنے والا ہے؟ آپ نے ان سے فرمایا: ان کے پیچھے جاؤ۔ یہ دیکھو کہ وہ کیا کیا کر رہے ہیں اور آگے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ گھوڑے چھوڑ چکے اور اونٹوں پر سوار ہو گئے ہیں تو ان کا مکہ جانے کا ارادہ ہے اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوں اور اونٹوں کو ہانک رہے ہوں تو پھر ان کا مدینہ جانے کا ارادہ ہے۔ اس اللہ کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر انھوں نے مدینہ کا رخ کیا تو میں ان کے مقابلے کے لیے نکلوں گا۔ علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں ان کے پیچھے گیا تا کہ دیکھوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ گھوڑوں کو چھوڑ کر اونٹوں پر

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 89/3. [2] صحيح البخاري، حديث: 4075. [3] صحيح مسلم مع شرح النووي: 148/12.

سوار ہو گئے ہیں اور مکہ کا رخ کر چکے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ واپس آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان لوگوں کے بارے میں پوری رپورٹ پیش کی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ حمراء الاسد میں

یہ غزوہ اُحد کی تکمیل کا غزوہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان سن تین ہجری میں شوال کی پندرہ تاریخ کو ہفتے کی شام غزوہ احد سے واپس آئے، اگلی صبح لوگ فجر کی نماز کے لیے نکلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرایا کہ دشمن پر حملے کے لیے فوراً تیاری کی جائے اور صرف وہی جنگ کے لیے نکلے جو احد میں بھی شریک ہو چکا ہو۔ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک کہا، حالانکہ وہ زخموں سے چور تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب مجاہدین سے آگے تھے۔ اس مشن پر، عبداللہ بن ابی کو جانے کی اجازت نہیں دی گئی اور جو شخص احد میں پہلے شریک نہیں ہوا تھا، اسے بھی اجازت نہیں ملی، صرف جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اجازت ملی۔ ان کے والد، غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے انھیں بدر اور احد میں شرکت کے لیے اس لیے نہ جانے دیا تاکہ وہ اپنی بہنوں کے پاس رہیں اور ان کی خبر گیری کریں۔ لشکر نکل کھڑا ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے تھے، جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اٹھائے ہوئے تھے، انھوں نے احد میں بھی جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔

مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں حمراء الاسد تک پہنچے۔ یہ علاقہ مدینہ سے تیرہ میل دور ہے، یہاں انھوں نے پڑاؤ ڈالا۔ یہودیوں اور منافقوں نے مسلمانوں کے لشکر کی یہ جرأت مندانہ پیش قدمی دیکھی تو وہ دہشت زدہ رہ گئے۔ مسلمانوں کو پورا یقین ہو گیا کہ معنوی طاقت اور روحانی جذبے کا یہی بلند مرتبہ اور مقام ہے، اس کے بغیر وہ قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حمراء الاسد کی طرف جو خروج کیا، اس سے بھی دشمن کے

---

[1] البداية والنهاية: 4/41.

خلاف نفسیاتی جنگ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمراء الاسد میں تین راتیں قیام فرمایا۔ اور آگ کے الاؤ جلانے کا حکم دیا۔ الاؤ بھڑکنے کی وجہ سے اردگرد کا پورا علاقہ اس قدر روشن ہو گیا کہ دور دور تک نظر آنے لگا۔ قریش کو خیال ہوا کہ مسلمان تو بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ اب ان کی طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے وہ مرعوب ہو کر واپس چلے گئے۔ [1]

ابن سعد کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر آئے، لشکر نے حمراء الاسد میں پڑاؤ ڈالا۔ مسلمان رات کو پانچ سو مقامات پر آگ جلاتے تھے جسے دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ آگ کے شعلے اور لشکر کے نعروں کی گونج ہر طرف پہنچی، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو رسوا کیا۔ [2]

قرآن کریم نے اس سرد جنگ کی طرف اشارہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

"جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا باوجود یہ کہ وہ (جنگ احد کے) زخم کھا چکے تھے، (یاد رکھو) ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں یقیناً ان کے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بعض آدمی کہتے تھے: تم سے

[1] علی بن أبي طالب لأحمد السيد الرفاعی، ص: 1-10، وتاريخ الإسلام للذهبي، المغازی، ص: 226، وغزوة أحد لأبی فارس، ص: 51. [2] الطبقات الكبرىٰ: 2/49.

جنگ کرنے کے لیے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ اکٹھا کرلیا ہے، چاہیے کہ ان سے ڈرتے رہو (اور مقابلے کے لیے باہر نہ نکلو) لیکن (بجائے ڈرنے کے) ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہوگیا۔ وہ (بے خوف ہوکر) بول اٹھے: ہمارے لیے اللہ کا سہارا کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے، پھر یہ لوگ اللہ کی نعمت اور فضل سے شادکام ہوکر واپس آگئے۔ انھیں کوئی گزند چھو بھی نہ سکا اور وہ اللہ کی خوشنودی کی راہ میں گامزن ہوئے، اور اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ یہ خبر دینے والا شیطان ہی ہے جو اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا ہے۔ اگر تم ایمان رکھنے والے ہوتو ان کافروں سے نہ ڈرو بس اللہ ہی سے ڈرو۔'' [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ احزاب میں

غزوۂ احزاب میں امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف اور کردار انتہائی دلیرانہ تھا جو اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے راسخ العقیدہ ہونے اور اللہ کی راہ میں جان کی قربانی دینے کا عکاس ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: خندق کے ساتھ ایک درے سے مشرکین کے گھوڑے زبردستی اندر گھس آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً چند مسلمانوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ گھڑ سوار ان کی طرف دوڑے چلے آرہے تھے۔ عمرو بن عبدود جو بدر کی لڑائی میں شریک تھا اور زخموں سے نڈھال ہوگیا تھا اور غزوہ اُحد میں نہیں آسکا تھا، خندق والے دن وہ بڑا چنچل اور شوخ نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا روکا اور کہنے لگا: میرے مقابلے میں کون آئے گا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً اس کے سامنے آگئے اور فرمایا: اے عمرو! تم نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ قریش میں سے جو آدمی تمھیں دو خصلتوں میں سے کسی ایک کی طرف دعوت دے گا، تم اسے قبول کرلو گے۔ اس نے کہا: جی ہاں! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمھیں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور

[1] آل عمران 3:172-175.

اسلام کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس نے جواب دیا: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر میں تمھیں مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ بولا: میرے بھتیجے! میں تمھیں قتل نہیں کرنا چاہتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کڑک کر فرمایا: لیکن میں تمھیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات سن کر عمرو غصے کے مارے دیوانہ ہوگیا۔ وہ فوراً اپنے گھوڑے سے اترا اور اسے ذبح کر دیا، پھر اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ مارا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ آور ہوگیا۔ دونوں کا خوب مقابلہ ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر ڈالا۔ پھر ان کے دیگر شکست خوردہ گھڑ سوار خندق سے نکل بھاگے۔[1]

عمرو بن عبدود کے قتل ہونے کے بعد مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ ہم عمرو کی لاش، دس ہزار درہم میں خریدنے کو تیار ہیں، ہمیں اس کی لاش دے دیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کی لاش ان کے حوالے کردو۔ یہ لاش بھی ناپسندیدہ ہے اور ہمیں اس لاش کا معاوضہ بھی پسند نہیں۔ آپ نے ان سے کچھ نہیں لیا، حالانکہ اس وقت مسلمان انتہائی غربت کا شکار تھے۔ بہرحال حلال، حلال ہے اور حرام، حرام ہے، حلال وحرام میں اسلام کا یہی پیمانہ ہے۔ کتنے رنج وملال کی بات ہے کہ آج کے دور کے بعض مسلمان سود اور اس جیسی دیگر حرام اشیاء کے لیے جواز تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ بنی قریظہ میں

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا لہراتے ہوئے آگے آگے رواں دواں تھے۔ سعد بن معاذ نے (محاصرے میں) دشمن کے بارے میں فیصلہ سنا دیا۔ شروع میں تو انھوں نے یہ فیصلہ تسلیم نہیں کیا۔ ابن ہشام کہتے ہیں: بنی قریظہ محاصرے میں تھے کہ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بلند آواز میں کہا: اے لشکر ایمان! ...... پھر وہ آگے بڑھے اور زبیر بن عوام

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 248/3. [2] معين السيرة للشامي، ص: 94.

بھی آگے بڑھے...... پھر حضرت علی نے فرمایا: آج میں وہ مزہ چکھوں گا جو حمزہ رضی اللہ عنہ نے چکھا تھا یا میں ان کے قلعوں کے اندر گھس جاؤں گا۔ پھر انھوں نے فرمایا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم سعد بن معاذ کا فیصلہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دشمنان عقیدہ و دین کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیا۔ اور یہ سب کچھ حضرت علی جیسے تقی اور نقی رجل عظیم کے ذریعے ہوا جنھیں اللہ تعالیٰ نے بہادری اور دین کی سربلندی کے لیے موت سے محبت کا جذبہ عطا فرمایا تھا۔ انھوں نے اپنے لشکر کو بہترین نام کے ساتھ پکارا۔ وہ ایمان کی پکار تھی۔ اس کے نتیجے میں عقیدے کی سچائی، عمل کی بہتری اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت نمایاں ہوگئی۔ [1]

جب سعد بن معاذ نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ ان کے جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے، ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے اور ان کے مال تقسیم کر دیے جائیں۔ تو قتل کرنے کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے پوری کی۔ [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان میں

غزوہ حدیبیہ میں صلح سے پہلے کچھ غلام مکہ سے روانہ ہوئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، ان کے آقاؤں نے آپ کو لکھا کہ انھیں واپس کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں واپس کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: اے گروہ قریش! باز آجاؤ، ورنہ اللہ تمھارے لیے کسی ایسی شخصیت کو بھیج دے گا جو دین کی خاطر تمھاری گردنیں مار دے گا۔ اللہ تعالیٰ ایمان پر اس شخص کی آزمائش کر چکا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑے تجسس سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کون ہوگا؟ ہر ایک کی یہی تمنا تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق وہی قرار پائے...... جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: جوتا گانٹھنے والا!...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جوتا گانٹھنے کے لیے دیا تھا۔ [3]

[1] صحیح البخاري، حدیث: 1421، والسیرة النبویة لابن هشام: 263/3. [2] امتاع الأسماع للمقریزي: 247/1. [3] مرویات غزوة الحدیبیة لحافظ الحکمي، ص: 183، اس حدیث کی تمام روایات صحیح ہیں۔

جب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان صلح کا عمل مکمل ہوگیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فریقین کے مابین ایک تحریر لکھی تو اس پر درج فرمایا: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ مشرکین نے کہا: یہ الفاظ نہ لکھو، کیونکہ اگر ہم ان کو رسول اللہ مانتے تو قتال ہی نہ کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: یہ مٹا دو! انھوں نے کہا: میں تو یہ مقدس نام نہیں مٹا سکتا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہی ہاتھ سے مٹا دیا۔ اور ان سے اس امر پر صلح کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب تین دن کے لیے مکہ میں اس طرح داخل ہوں گے کہ ان کا اسلحہ اور تلواریں میانوں کے اندر ہوں گی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) مقدس الفاظ نہ مٹانا درحقیقت ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زبردست محبت اور تعظیم کا نتیجہ تھا۔[2]

غالی روافض نے حدیبیہ کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر کچھ اعتراضات کیے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صلح کے معاملے میں بار بار مراجعہ کیا، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شروع میں قربانی کرنے اور سر منڈانے سے گریز کیا۔ یہ بات حدیبیہ میں شریک کسی بھی صحابی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے قابل اعتراض نہیں ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ وہ مکہ میں داخل ہوگئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا۔ جب سب لوگوں نے حدیبیہ کے سال سفر اختیار کیا تو سب کو پکا یقین تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک خواب کی تعبیر اسی سال پوری ہوگی۔ لیکن جب حدیبیہ میں صلح کے معاملات طے ہونے لگے اور یہ شرط سامنے آئی کہ اس سال واپس جانا ہوگا اور آئندہ سال مکہ جانے کی اجازت ہوگی تو یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر بڑی شاق گزری۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جو حق کے معاملے میں نہایت پرجوش تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

[1] صحيح مسلم، حديث: 1783، وخصائص علي للإمام نسائي مع تحقيق أحمد البلوشي، ص: 203. [2] الإنتصار للصحب والآل للرحيلي، ص:262-274.

اپنے اشکال پوچھتے اور بار بار آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے کسی بھی سوال میں رسول اللہ ﷺ کی سچائی کے بارے میں شک کا قطعاً کوئی شائبہ نہ تھا۔ لیکن وہ اس تفصیل میں پڑ گئے کہ ازروئے خواب یہ طے تھا کہ وہ مکہ جائیں گے اور بیت اللہ کا طواف کریں گے۔ دراصل ان کا ارادہ فقط یہ تھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے کے لیے آمادہ کر سکیں اور طوافِ بیت اللہ کے بغیر مدینہ واپس نہ جانا پڑے تاکہ اللہ کے دین کی سربلندی ہو اور مشرکین کے عزائم خاک میں مل جائیں۔[1]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علماء کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سوال اور ان کی مذکورہ گفتگو کسی شک کی وجہ سے ہرگز نہیں تھی بلکہ اصل بات سمجھنے، کفار کو مطیع کرنے اور اسلام کے غلبے کے لیے تھی، اس لیے کہ ان کے مزاج میں باطل کو ذلت سے ہمکنار کرنے اور دین کی نصرت کا جذبہ بڑی شدت سے موجزن تھا۔[2] مزید برآں یہ کہ خود رسول اللہ ﷺ کی طرف سے انھیں یہ تربیت ملی تھی کہ وہ بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کریں اور مشورہ دیا کریں۔ یہ امر بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق تھا:

﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾

''ان کے قصور معاف کر دو اور (اللہ تعالیٰ سے) ان کے حق میں بخشش کی دعا کیا کرو اور (جنگ و امن کے معاملات اور دین کے) کام میں انھیں شریک مشورہ کرو!''[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دراصل قریش کا مقابلہ کرنے اور قتال کی رائے پر رسول اللہ ﷺ کی موافقت حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے رسالت مآب ﷺ اور پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے رجوع کیا، جب ان دونوں کو اپنی رائے سے متفق نہ پایا تو انھوں نے اپنی رائے ترک کر دی۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی ان کا عذر قبول فرما لیا۔ کیونکہ یہ سب کچھ صرف نیک نیتی کی

---

[1] البداية والنهاية: 170/4، وتاريخ الطبري: 635/2، والإنتصار للصحب والآل، ص: 264.

[2] شرح صحيح مسلم: 141/12. [3] آل عمران 159:3.

بنیاد پر تھا۔ البتہ صحابۂ کرام نے قربانی اور سر منڈانے سے توقف کیا اور بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قربانی ذبح کرنے اور سر منڈانے پر انھوں نے بھی آپ کی پیروی کی، ان کا یہ توقف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے زمرے میں نہیں آتا۔ علمائے کرام نے اس کی متعدد توجیہات بیان کی ہیں۔[1]

امام ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس لیے توقف کیا کہ انھیں اس بات کا احتمال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم استحباب کے لیے ہے یا وہ پر امید تھے کہ مذکورہ صلح کے خاتمہ کے لیے وحی نازل ہوگی یا خصوصی طور پر صرف انھیں مکہ میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ انھوں نے ایسا اس لیے بھی سوچا کہ ان دنوں نسخ کے احکام وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے دل میں یہ خیال ہو کہ عقیدے کی صداقت اور قوت و طاقت میں وہ اب کسی طور کم نہیں، لہٰذا وہ کسی صورت ذلت برداشت نہیں کریں گے یا پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اس لیے تاخیر سے کام لیا ہو کہ اس حکم پر فوراً عمل کرنا واجب نہیں اور ان تمام امور پر عمل مجموعی صورت حال دیکھنے کے بعد ہوگا۔[2]

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ فرماں برداری کا رویہ اختیار نہیں کر رہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہ کے پاس آئے اور ان سے اس معاملے کا ذکر کیا، وہ کہنے لگیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کچھ نہ کہیں۔ یہ خلاف توقع، صلح کا معاملہ اور بغیر فتح ان کا لوٹ جانا انھیں گراں گزر رہا ہے۔[3]

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ آپ باہر تشریف لے جائیں، کسی سے کوئی گفتگو نہ فرمائیں، قربانی ذبح کر دیں اور حجام کو بلا کر اپنا سر منڈوا لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر آئے، کسی سے کوئی بات نہ کی اور مذکورہ کام انجام دیا۔ صحابہ نے یہ معاملہ دیکھا تو فوراً اٹھے اور قربانی کے جانور ذبح کرنے لگے۔[4]

[1] الإنتصار للصحب والآل، ص: 266. [2] فتح الباری: 347/5. [3] فتح الباری: 347/5. [4] فتح الباری: 347/5.

امام ابن حجر کہتے ہیں: اس بات کا احتمال ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حلال ہونے کا حکم اپنے بارے میں بطور رخصت لیا ہو جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بارے میں راہِ عزیمت اختیار کرتے ہوئے حالتِ احرام پر باقی رہے ہوں، چنانچہ حضرت ام سلمہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ احرام کھول دیں تاکہ صحابہ کا یہ احتمال ختم ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مشورے کو صحیح سمجھتے ہوئے اس پر عمل کیا۔ ٹھیک اسی سے ملتا جلتا وہ واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو رمضان میں دن کے وقت ہی روزہ کھولنے کا حکم دیا۔ لیکن جب وہ روزہ نہ کھولنے پر قائم رہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک میں پیالہ لے لیا اور پانی پی لیا۔ جب لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو انھوں نے بھی پانی پی لیا۔ [1]

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی پرورش کا معاملہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

اسلام کی دعوت کے اثرات کے نتیجے میں نفوس انسانی اور ان کی عقول میں بہت بڑی انقلابی تبدیلی آئی۔ وہ بیٹی جسے عرب کی اشرافیہ عار سمجھتے تھے اور بعض قبائل میں تو اس عار سے فرار حاصل کرنے کی خاطر اس کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اب وہ نہایت محبوب اور پسندیدہ شخصیت قرار پائی اور مسلمانوں میں بیٹیوں کی تربیت اور پرورش کے لیے نہایت روح پرور مقابلے ہونے لگے۔ تمام مسلمان برابر تھے، کسی دوسرے پر ترجیح دی جاتی تو صرف کسی فضیلت یا حق کی بنیاد پر دی جاتی تھی۔ [2]

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے روانگی کا ارادہ فرمایا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی آپ کے پیچھے پیچھے آئی، وہ آپ کو پکار رہی تھی: میرے چچا، میرے چچا! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: اسے اپنے پاس رکھو، یہ تمھارے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ تینوں کے درمیان اس بچی کو اپنی پرورش میں لینے

[1] صحیح البخاري، کتاب الشروط، حدیث:2732. [2] صحیح البخاري، حدیث:4251.

پر تکرار ہوگئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اسے لے لیا ہے کیونکہ یہ میری چچا زاد ہے۔ جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: میری بھی تو چچا زاد ہے، مزید برآں اس کی خالہ میری بیوی ہے۔ زید نے کہا: یہ میری بھتیجی ہے۔ یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش ہوا تو آپ نے اس بچی کو اس کی خالہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ دے دیا اور فرمایا: ''خالہ ماں کے قائم مقام ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم خلقت اور اخلاق دونوں میں مجھ سے مشابہ ہو۔ اور زید سے فرمایا: تم ہمارے بھائی اور دوست ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ میری رضاعی بھتیجی ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوہ خیبر میں

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ غزوہ خیبر ہجرت کے ساتویں سال محرم میں ہوا۔[2] واقدی[3] نے لکھا ہے کہ یہ ہجرت کے ساتویں سال صفر یا ربیع الاول میں حدیبیہ سے واپسی پر پیش آیا۔ اور ابن سعد[4] کی رائے ہے کہ یہ ہجرت کے ساتویں سال جمادی الاولی میں ہوا۔ امام مالک اور امام زہری فرماتے ہیں کہ یہ ہجرت کے چھٹے سال محرم میں ہوا۔[5] امام ابن حجر نے واقدی کے قول پر ابن اسحاق کے قول کو ترجیح دی ہے۔[6] اس غزوہ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ان کا مقام و مرتبہ سب پر آشکارا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے زبردست فوجی اہمیت کی حامل اس یہودی بستی کو فتح کرنے کا اعزاز انھی کو عطا کیا۔

خیبر یہودیوں کی ایسی بستی تھی جو مضبوط قلعوں اور فوجی چھاؤنی پر مشتمل تھی۔ یہ بستی

[1] صحيح البخاري، حديث: 4251. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 455/3. [3] المغازي: 634/7.
[4] الطبقات لابن سعد: 106/2. [5] تاريخ دمشق: 33/1. [6] فتح الباري: 41/16، والسيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية، ص: 500.

جزیرۃ العرب میں ان کی آخری پناہ گاہ تھی۔ وہ زندگی اور زمانے کی گردشوں کا جائزہ لے رہے تھے اور مسلمانوں کے خلاف گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مدینہ اور بیرون مدینہ کے تمام یہودیوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے خلاف مدینہ پر یلغار کر دی جائے۔ اس مذموم ارادے کے لیے ان کی سازشیں عروج پر تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کے ارادوں سے بے خبر نہیں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ یہودیوں کے مسئلے کی طرف سے سکون اور یکسوئی حاصل ہو جائے۔

خیبر، مدینہ کے شمال مشرق میں تقریباً ستر 70 میل کے فاصلے پر تھا۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کا لشکر لے کر خیبر کی طرف بڑھے۔ یہ ایک ہزار چار سو افراد پر مشتمل لشکر تھا۔ سب سے پہلے خیبر کے قلعوں کی فتح یابی کے لیے جنگ کا اعلان ہوا اور ایک ایک کر کے تمام قلعے فتح ہوتے چلے گئے، البتہ غموص کا قلعہ فتح کرنے میں مشکل پیش آئی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ آشوب چشم کا شکار تھے۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل میں جھنڈا ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ اسی کے ہاتھوں فتح نصیب فرمائے گا۔ لوگوں نے یہ رات چہ میگوئیوں میں گزاری کہ دیکھیے جھنڈا کس خوش نصیب کو نصیب ہوگا۔ صبح ہوئی تمام مجاہدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہر شخص پر امید تھا کہ جھنڈا اسی کو ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: علی رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟ عرض کیا گیا، اے اللہ کے رسول! ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بلا بھیجا۔ وہ آگئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن ڈالا اور ان کے لیے دعا کی، وہ ایسے صحت یاب ہو گئے کہ گویا انھیں کبھی تکلیف تھی ہی نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا ان کے حوالے کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! جب تک وہ ہم جیسے نہ ہو جائیں میں ان سے جنگ کرتا

[1] المرتضی للندوی، ص: 52. [2] المرتضی للندوی، ص: 53.

رہوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آہستہ آہستہ جاؤ، جب ان کی حویلی میں پہنچو، انھیں اسلام کی دعوت دو اور انھیں ان کے بارے میں اللہ کا حق بتاؤ، اللہ کی قسم! تمھارے ذریعے اگر اللہ ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر ہے۔[1] وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں خیبر کی فتح نصیب فرمائی۔

یہودیوں کا سردار مرحب مقابلے کے لیے سامنے آیا۔ وہ کہہ رہا تھا: سارے خیبر کو معلوم ہے کہ میں مرحب ہوں۔ ہتھیاروں سے مسلح ہوں۔ تجربہ کار ہوں۔ بہادر ہوں، جب جنگوں میں مقابلہ ہو تو پھر شعلے ہی شعلے نظر آتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا: میں وہ شخص ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا، جنگل کے خوفناک شیر کی مانند، میں صاع کے ساتھ پورا وزن دیتا ہوں اور بڑے پیمانے پر قتل کیا کرتا ہوں...... پھر آپ رضی اللہ عنہ نے مرحب کے سر پر چوٹ لگائی اور اسے قتل کر دیا۔ یوں آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری دونوں آنکھوں میں اپنے مقدس دہن کا لعاب ڈالا ہے مجھے کبھی آشوب چشم کی تکلیف نہیں ہوئی۔[2]

مذکورہ حدیث اور امامت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان کوئی تعلق نہیں۔ روافض کی رائے ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ ہیں۔ یہ استدلال بہت سی ایسی احادیث سے کیا جاتا ہے جو ان کی فضیلت بیان کرتی ہیں لیکن وہ ان کی امامت پر دلیل نہیں ہیں۔ ان ہی میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے۔ انھوں نے اس حدیث میں کچھ غلط اضافے بھی کیے ہیں جو

[1] صحیح مسلم، حدیث:2406. [2] الموسوعة الحدیثیة (مسند أحمد)، حدیث:579، حدیث حسن ہے۔

محدثین کے ہاں صحیح طور پر ثابت نہیں۔ اسی طرح ان کا اللہ اور رسول سے محبت کرنا اور اللہ و رسول کے ان سے محبت کرنے میں ایسی کوئی دلیل نہیں جو ان کے لیے امامت بلا فصل کی بنیاد بن سکے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے محبت ثابت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دیگر حضرات کے بارے میں اس خصوصیت کی نفی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ﴾

''اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔'' [1]

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے حق میں فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○ ﴾

''بیشک اللہ کو وہ لوگ محبوب ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔'' [2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو اللہ کو محبوب ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی محبوب ہوتا ہے اور مومنوں میں سے جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی محبت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسجد قباء کے نمازیوں کے بارے میں فرمایا:

﴿ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ ﴾

''اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔'' [3]

---

[1] المائدة 5:54۔ [2] الصف 61:4۔ [3] التوبة 9:108۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فتح مکہ اور غزوۂ حنین میں

قریشیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا صلح کا معاہدہ توڑ دیا اور مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ کے خلاف بنی بکر کا ساتھ دیا اور گھوڑوں، اسلحہ کے علاوہ افرادی قوت کے ساتھ ان کی مدد کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو بن سالم! اللہ تعالیٰ تمھاری مدد کرے، اگر میں بنی کعب کی مدد نہ کروں تو اللہ تعالیٰ میری مدد نہ کرے۔ جب آسمان پر بادل کے آثار نظر آئے تو آپ نے فرمایا: یہ بادل بنی کعب کی مدد کو آرہا ہے۔[1]

عمرو بن سالم مدینہ پہنچا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشعار کی صورت میں اپنے اوپر ٹوٹنے والی مصیبت کے بارے میں بتایا۔

قریش نے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا تاکہ وہ معاہدہ صلح کو مزید پختہ کرے اور اس کی مدت میں اضافہ کرے۔ جب وہ مدینہ پہنچا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی بات پیش کرنے آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابہ سے مدد مانگی، تاکہ وہ اس کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطے کا کام دیں لیکن ان سب نے انکار کر دیا۔ ابوسفیان کوئی موافقت یا وعدہ حاصل کیے بغیر مکہ لوٹ آیا۔

قریش کے لیے جاسوسی کی کوشش میں ناکامی

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے، زبیر اور مقداد کو بھیجا اور فرمایا کہ جاؤ اور جب تم روضۂ خاخ کے پاس پہنچو، وہاں ایک مسافر عورت ہوگی، اس کے پاس ایک خط ہے، وہ خط اس سے لے لینا۔ ہم گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے چلے حتی کہ روضہ کے مقام پر پہنچ گئے، وہاں مطلوبہ مسافر خاتون موجود تھی۔ ہم نے کہا: خط نکالو! وہ کہنے لگی:

---

[1] البداية والنهاية: 278/4.

میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ ہم نے کہا: تم خط نکالو گی یا ہم تمھارے کپڑوں میں سے ڈھونڈ نکالیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آخر کار میں نے وہ خط اس کے سر کی مینڈھیوں میں سے نکال لیا، پھر ہم یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی جانب سے ہے۔ اور مشرکین مکہ میں سے کچھ لوگوں کے نام ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض معاملات کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بلوایا اور پوچھا: حاطب! یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: جلدی نہ کیجیے! میرا اصل مدعا سمجھ لیجیے۔ میں قریش کے لوگوں میں شمار ہوتا تھا لیکن حقیقتاً میں ان میں نہیں تھا۔ ہم مہاجرین میں سے کچھ لوگوں کی مکہ میں قرابت داریاں ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں ان پر کچھ احسان کروں تاکہ وہ میرے قرابت داروں کی حفاظت کریں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد کفر میرے لیے انتہائی ناگوار چیز ہے، میں نے جو کچھ کیا، کفر اور ارتداد سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس نے تمھیں سچ بتایا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں اس منافق کی گردن نہ اتار دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بدر میں شریک ہو چکا ہے، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو (محبت کی نگاہ سے) جھانک کر دیکھا اور فرمایا: ''تم جیسے چاہو عمل کرو، میں نے تمھاری بخشش کر دی ہے۔''[1]

ام ہانی! جن کو تم نے پناہ دی، ہم نے بھی پناہ دی

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ ام ہانی بنت ابی طالب کہتی ہیں: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے بالائی علاقے میں قیام فرمایا تو بنی مخزوم سے میرے سسرالی رشتہ داروں میں سے دو مفرور آدمی میرے پاس آئے۔ میں اس وقت ہبیرہ بن ابی وہب المخزومی کی زوجیت میں تھی۔ میرے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آ پہنچے اور کہنے لگے: اللہ کی قسم! میں ان کو قتل کر دوں

[1] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حديث: 600، اس کی سند صحیح ہے۔

گا۔ میں نے ان دونوں کو اپنے گھر میں چھپا کر دروازہ بند کر دیا، پھر میں مکہ کے بالائی علاقے کی طرف رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچی۔ اس وقت نبی کریم ﷺ ایک بڑے برتن میں پانی لے کر غسل فرما رہے تھے۔ اس برتن میں آٹے کے کچھ نشانات تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کپڑے تان کر آپ کے لیے پردہ کر رکھا تھا۔ جب آپ ﷺ غسل کر چکے تو لباس زیب تن فرمایا۔ کندھوں پر چادر ڈالی، پھر اشراق کی آٹھ رکعتیں ادا کیں، بعد ازاں میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے ام ہانی خوش آمدید! کہو کیسے آنا ہوا؟ میں نے دو آدمیوں کی پناہ اور علی کے ارادے کی بات بتائی۔ آپ ﷺ نے فوراً فرمایا: ہم نے اسے پناہ دی جنھیں تم نے پناہ دی۔ علی انھیں قتل نہ کریں۔ [1]

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی مسلمان کسی حربی کافر کو اس طرح امان اور پناہ دے دے جس سے مسلمانوں کو کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو دیگر مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ اس کے درپے ہو جائیں۔ فقہاء نے امن اور پناہ کے صحیح ہونے کی شرط یہ قرار دی ہے کہ امان دینے والا ہر قسم کی تہمت سے پاک ہونا چاہیے اور دی گئی امان اور پناہ ہر قسم کے فساد سے خالی ہو۔ یا پھر اس معاملے کو حاکم کے روبرو پیش کیا جائے اور اس کی رائے لی جائے۔ [2]

الحویرث بن نقیذ بن وہب کا قتل

اس فتح عظیم کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے امراء سے یہ وعدہ لیا تھا کہ جو ان سے لڑائی نہ کرے یہ بھی اس سے لڑائی نہ کریں لیکن آپ ﷺ نے کچھ لوگوں کی نشان دہی فرمائی اور ان کا قتل مباح قرار دیا اور فرمایا: کہ چاہے وہ کعبہ کے پردوں سے چمٹے ہوئے ہوں انھیں بہر حال کیفر کردار تک پہنچایا جائے ان میں سے ایک شخص حویرث بن نقیذ بن وہب تھا۔ یہ

[1] صحيح السيرة، ص: 527. [2] الجهاد و القتال في السياسة الشرعية: 1051/3.

مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیتا تھا۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ، سیدہ فاطمہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما کو اونٹ پر بٹھا کر لے جا رہے تھے تو حویرث نے اونٹ کو اس قدر بھڑکایا کہ دونوں محترم خواتین زمین پر گر پڑیں۔ اس وقت اس کا خون مباح قرار دے دیا گیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس شخص تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور اسے قتل کر دیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اصلاحی مہم پر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنی جذیمہ کی طرف بھیجا تاکہ اس غلطی کی تلافی کر سکیں جو خالد بن ولید کی طرف سے اس قبیلہ کے بعض لوگوں کو قتل کرنے کے حوالے سے ہوگئی تھی۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ہجرت کے آٹھویں سال خالد بن ولید کو بنی جُذیمہ کی طرف بھیجا اور تاکید فرمائی کہ انھیں اسلام کی دعوت دو۔ وہ تہذیب و تمدن سے عاری بدو لوگ تھے۔ انھوں نے اسلام کی دعوت قبول کر لی مگر وہ بے چارے اپنا مافی الضمیر بخوبی ظاہر کرنے پر قادر نہ تھے۔ وہ یہ تو نہ کہہ سکے کہ ہم نے اسلام قبول کیا، اس کی بجائے وہ کہنے لگے «صَبَأنا» اس لفظ سے بدوؤں کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے اپنا دین بدل لیا، یعنی اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ لیکن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ''صَبَأنا'' کا مطلب یہی سمجھے کہ ہم بے دین ہوگئے، چنانچہ انھوں نے ان میں سے کچھ کو قتل کیا اور بعض لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس اقدام کی خبر پہنچی تو آپ انتہائی رنجیدہ ہوئے، آپ نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور کہا: ''اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے بریٔ الذمہ ہوں۔'' یہ بات دو مرتبہ دہرائی۔[2] بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تاکہ وہ براہِ راست وہاں کی صورت حال کا جائزہ لیں، ساتھ ہی کچھ مال بھی مرحمت فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ ذمہ داری بخیر و خوبی پوری فرمائی۔ ان کے مقتولین کی

[1] فتح الباري: 11/8، والسيرة النبوية لابن هشام: 58/4. [2] صحيح البخاري، حديث: 4339.

دیت ادا کی۔ ان کے تمام جانی اور مالی نقصان کا معاوضہ ادا کیا۔ جب وہ اس ذمہ داری سے فارغ ہوگئے تو ان سے پوچھا کہ دیت کے حوالے سے آپ لوگوں کا کوئی اور حق بنتا ہو تو بتاؤ۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے پاس کچھ مال باقی بچ گیا ہے، وہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے احتیاطاً آپ ہی کو پیش کرتا ہوں۔

جب آپ رضی اللہ عنہ وہ مال تقسیم کر کے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچے تو ساری کارگزاری تفصیل سے سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے صحیح اور بہت اچھا کام کیا۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس عظیم مشن کے ذریعے شدید غم اور دل پر بوجھ کا ازالہ کیا جس کے باعث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے چین تھے۔ [2] اس حکمت پر مبنی طریقے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جذیمہ کے ساتھ غم خواری کا حق ادا کیا، اوران کے دلوں میں مایوسی اورغم کی جو کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس کا ازالہ فرمایا۔ [3] بنی جذیمہ کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا وہ حضرت خالد بن ولید کی اجتہادی غلطی کے باعث رونما ہوا، اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کو اس بات پر کوئی سزا دی [4] نہ معزول فرمایا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ حنین میں

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ جہادی اعمال جو ان کی بہادری کے عنوان سے موسوم ہیں اور میدانِ قتال میں ان کے ایک ماہر اور تجربہ کار جرنیل ہونے کی گواہی دیتے ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو ہجرت کے آٹھویں سال غزوہ حنین میں ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیگر مہاجرین وانصار کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں پوری ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ جیش ہوازن میں ایک شخص سرخ اونٹ پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں کالا جھنڈا تھا، وہ گھات

[1] السیرۃ النبویۃ لابن هشام: 73,72/4، اس کی سند ضعیف ہے اور دیگر شواہد موجود ہیں۔ [2] خلافة علي بن أبي طالب، ص: 46. [3] السیرۃ النبویۃ لأبي شهبة: 465/2. [4] السیرۃ النبویۃ في ضوء المصادر الأصلیة، ص: 579.

لگائے ہوا تھا۔ جونہی اس کا داؤ لگتا تھا وہ نیزہ مار دیتا تھا اور جب لوگوں تک رسائی نہ ہو پاتی تو وہ اپنا نیزہ بلند کرتا اور اس کے پیچھے والے اس عمل میں اس کی پیروی کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بصیرت، اعلیٰ حربی صلاحیت اور طویل تجربے کی بنا پر یہ حقیقت فوراً محسوس کر لی کہ ہوازن کی سخت جنگی حالت کا اصل موثر عامل یہی آدمی ہے، لہٰذا علی رضی اللہ عنہ فوراً ایک اور انصاری صحابی کے ساتھ اس آدمی کی طرف لپکے، اسے یک دم اونٹ سے نیچے گرا دیا اور قتل کر ڈالا، پھر چند لمحات ہی گزرے تھے کہ دشمن شکست کھا گیا۔ دشمن کے جرنیل اور عام فوجی سب پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ [1]

بت شکنی کا کارنامہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کو بتوں سے پاک کر دیا تھا۔ اب ضروری تھا کہ وہ مقامات جو قدیم زمانے سے جاہلیت کے نشان تھے، ان کا خاتمہ بھی کیا جائے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے جزیرہ عرب کے تمام علاقوں کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے فوجی دستے روانہ کیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طَی کے علاقے میں فلس نامی بت مسمار کرنے کا حکم ملا۔ ربیع الثانی کے مہینے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک فوجی دستہ لے کر طی کے فلس نامی بت کی طرف روانہ ہوئے۔ اس دستے میں ڈیڑھ سو انصاری مجاہدین شامل تھے، ایک سو مجاہدین اونٹوں پر اور پچاس مجاہدین گھوڑوں پر سوار تھے، ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بڑا جھنڈا اور سفید رنگ کا چھوٹا جھنڈا تھا، انھوں نے مشہور سخی حاتم طائی کی قوم پر فجر کے وقت حملہ کر دیا اور فلس نامی بت کے پرخچے اڑا دیے۔ بہت سے قیدی اور بھیڑ بکریاں ان کے ہاتھ لگیں، ان قیدیوں میں عدی بن حاتم کی بہن بھی تھی۔ عدی شام کی طرف بھاگ گیا۔ [2]

---

[1] مسند أبي يعلى: 388/3، اس کی سند حسن ہے، والصحیح المسند للعدوی، ص: 141. [2] تاریخ الإسلام للذهبي، ص: 624.

غزوہ تبوک سے رسول اللہ ﷺ کی وفات تک

ہجرت کے نویں سال رجب میں غزوہ تبوک پیش آیا۔ سیرت نبوی میں یہ غزوہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس سے وہ اہم مقاصد حاصل ہوئے جس کے عربوں اور عام مسلمانوں کے دلوں پر بڑے دور رس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ تاریخ اسلام کے حالات و حوادث کی ایک اہم گزرگاہ ہے۔[1] رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اپنے اہل خانہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنایا جبکہ اسی غزوہ کے موقع پر مدینہ کے والی محمد بن مسلمہ تھے۔ منافقین نے اپنی چھپی ہوئی منافقت اور بغض کی آگ کو بجھانے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نامناسب باتیں کرنے لگے۔ یہ بری باتیں ان کے نفاق کی واضح علامت تھیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس اللہ کی قسم! جس نے دانے کو پھاڑا اور ہر جاندار کو پیدا کیا، نبی امی ﷺ نے ایک مرتبہ مجھ سے نہایت محکم لہجے میں فرمایا تھا: مجھ سے محبت صرف وہی شخص کرے گا جو مومن ہوگا اور مجھ سے بغض وہی رکھے گا جو منافق ہوگا۔''[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ لشکر سے جا ملے اور اسلام کے دشمنوں سے مقابلے کے لیے بے تاب ہوگئے۔ انھوں نے جناب رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نہیں چاہتے کہ میرے ساتھ تمھارا وہی مرتبہ ہو جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ

---

[1] المرتضی للندوی، ص: 55. [2] صحیح مسلم، حدیث: 78.

ہارون کا مرتبہ تھا۔ ہاں البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔[1]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کردار

نبی ﷺ کے عہد میں معاشرے کی تربیت اور ریاست کی تعمیر کا عمل، عقیدہ، اقتصادیات، معاشرت، سیاست، عسکریت اور عبادت سمیت تمام شعبوں میں جاری رہا۔ پچھلے کئی برس سے فریضۂ حج ادا نہیں ہوسکا تھا۔ فتح مکہ کے بعد سن آٹھ ہجری کے حج کی ذمہ داری عتاب بن اسید پر آئی، اس وقت مسلمانوں اور مشرکین کے حج میں کوئی فرق نہیں تھا۔[2] سن نو ہجری میں موسم حج آیا تو نبی ﷺ نے بھی حج کا ارادہ کیا لیکن فرمایا: بیت اللہ میں مشرکین ننگے طواف کریں گے، میں اس مرتبہ حج پر جانا نہیں چاہتا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ صحابہ کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ حج پر روانہ ہوئے۔[3] اور اپنے ساتھ قربانی کے جانور بھی لے گئے۔[4] جب ابوبکر صدیق حجاج کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے تو سورۂ براء ت نازل ہوئی۔ نبی ﷺ نے حضرت علی کو بلایا اور ابوبکر صدیق سے جاملنے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی عضباء پر روانہ ہوئے اور ذوالحلیفہ کے مقام پر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جاملے۔ حضرت صدیق اکبر نے انھیں دیکھا تو فرمایا: کیا آپ امیر کی حیثیت سے آئے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں، امیر آپ ہی ہیں۔ پھر ان دونوں نے سفر جاری رکھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے لیے انھی مقامات کو قائم رکھا جو جاہلیت میں حج کے مقامات تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ترویہ سے پہلے، عرفہ کے دن اور قربانی کے دن خطبے ارشاد فرمائے۔

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 2404. [2] السیرۃ النبویۃ لأبی شھبۃ: 536/2، ودراسات في عھد النبوۃ، ص: 22. [3] نضرۃ النعیم: 98/1، والطبقات الکبری: 168/2. [4] فتح الباري: 82/8.

حاجیوں کے پہلے دن، حضرت ابوبکر صدیق لوگوں کو ان کے وقوف، اِفاضہ، قربانی اور جمرات کی رمی کے مناسک وغیرہ سکھا رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر مقام پر ان کے ساتھ تھے۔ وہ لوگوں کو سورۂ براءت کی ابتدائی آیات سنا رہے تھے، بعدازاں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے چار امور کا اعلان فرمایا۔

- جنت میں صرف مومن ہی داخل ہوگا۔
- آئندہ کوئی شخص برہنہ حالت میں بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکے گا۔
- نبی اکرم ﷺ کا اگر کسی سے کوئی معاہدہ ہے تو وہ مدت مکمل ہونے ہی پر ختم ہوگا۔
- اس سال کے بعد مشرکین اور مسلمان اکٹھے حج نہیں کریں گے۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو حضرت علی کے مقصد میں ان کی مدد کرنے کا حکم دیا۔[2] سورۃ براءت کی ابتدائی آیات کا نزول، بت پرستوں اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ فیصلہ کن جدائی کا اعلان ہے۔ ان کے ساتھ حج کی ممانعت کر دی گئی اور ان کے خلاف جنگ کا اعلان ہوا۔[3]

فرمان الٰہی ہے:

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ○ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ۚ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ ﴾

[1] السوسوعة الحديثية (مسند امام أحمد)، حديث: 594، یہ حدیث صحیح ہے۔ [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 537/2. [3] نضرة النعيم: 399/1.

”اعلان براءت ہے اللہ اوراس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے جن سے تم نے معاہدے کیے تھے، پس اب تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کے قابو سے باہر نہیں جاسکتے اور اللہ منکرین حق کو رسوا کر کے رہے گا۔ اللہ اوراس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں میں منادی ہے کہ اللہ اوراس کا رسول مشرکین سے بری الذمہ ہیں۔ اب اگر تم لوگ توبہ کرلو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر روگردانی کرو گے تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے اور اے نبی ﷺ! کافروں کو عذاب کی خبر پہنچا دو۔“ [1]

اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جن سے معاہدہ ہوا ہے، ان کے معاہدے کی مقررہ مدت پوری ہونے تک مہلت دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ ﴾

”وہ مشرکین اس سے مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے معاہدہ کیا اور پھر انھوں نے اس میں تم سے کوئی خیانت کی نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے معاہدے ان کی مقررہ مدت تک پورے کرو۔ بے شک اللہ (نقض عہد سے) بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“ [2]

اور مشرکین میں سے جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں تھا، انھیں بھی حرمت والے مہینوں کے ختم ہونے تک مہلت دی اور واضح کردیا کہ بعد میں وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ ہی میں ہوں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ ﴾

[1] التوبة 9:1-3. [2] التوبة 9:4.

''پھر جب حرمت کے مہینے گزر جائیں (تو جنگ کی حالت قائم ہوگئی) مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کردو اور جہاں بھی ملیں گرفتار کرلو۔ نیز ان کا محاصرہ کرو۔ ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کرلیں، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''[1]

نبی اکرم ﷺ نے موسم حج میں مشرکین کے سامنے معاہدے ختم کرنے کے اعلان کی ذمہ داری حضرت علی کو سونپی اور اس بات کا خیال رکھا گیا کہ عربوں کے ہاں معاہدے کرنے یا معاہدے توڑنے کے لیے یہی طریقہ متعارف تھا۔ یہ کام یا تو قبیلے کا سردار یا اس کے قبیلے کا کوئی ذمہ دار فرد انجام دے۔ یہ طریقہ اسلام کے منافی نہیں ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری دے کر بھیجا۔

اس سلسلے میں رافضی صاحبان کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس واقعہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابوبکر کی بجائے حضرت علی خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ابوشہبہ نے کہا ہے: میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ انھوں نے حضرت ابوبکر کے اس سوال پر کیوں توجہ نہیں دی کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلا سوال ہی یہ کیا تھا کہ آپ بطور امیر آئے ہیں یا بطور مامور؟ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ امیر آپ ہی ہیں میں مامور ہوں۔ مامور، امیر کے مقابلے میں خلافت کا زیادہ حق دار کیسے ہوسکتا ہے؟[2]

یہ حج، دراصل حجۃ الوداع کے لیے بطور تمہید تھا۔ حضرت ابوبکر کی قیادت میں حج میں یہ اعلان ہوا کہ اب بت پرستی کا دور ختم ہوا۔ اب نیا دور آگیا ہے اور زندگی کے نئے مراحل شروع ہوگئے ہیں۔ اب لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام ماننے ہوں گے اور شریعت کی آواز پر لبیک کہنا ہوگا۔ عرب قبائل میں جب اس اعلان کی گونج پھیل گئی تو انھیں یقین ہوگیا کہ اب

[1] التوبة 9:5. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 540/2، وصحيح السيرة، ص: 624.

معاملہ سنجیدگی کا تقاضا کر رہا ہے اور بت پرستی کا دور تاریخ کے کباڑ خانے میں جا پڑا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل نے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنے وفود بھیجنے شروع کیے اور وہ توحید اور اسلام کے دائرے میں داخل ہونے لگے۔ [1]

نجران کے عیسائیوں کا وفد، آیتِ مباہلہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

رسول اللہ ﷺ نے نجران کے راہب کو خط لکھا اور اما بعد کے بعد فرمایا: میں تمھیں بندوں کی پوجا کی بجائے اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا ہوں، میں تمھیں بندوں کی حکمرانی کی بجائے اللہ کی حکمرانی کی دعوت دیتا ہوں، اگر تمھیں اس دعوت پر انکار ہو تو جزیہ ادا کرنا ہوگا اور اگر ادائے جزیہ سے بھی انکار ہو تو پھر میں جنگ کے بارے میں خبردار کرتا ہوں، والسلام۔ [2]

جب عیسائی راہب کے پاس یہ مکتوب گرامی پہنچا، اس نے لوگوں کو جمع کیا۔ خط پڑھ کے سنایا اور ان کی رائے طلب کی۔ طے پایا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چودہ معززین کا ایک وفد بھیجا جائے۔ ایک روایت میں ساٹھ سواروں کا ذکر ہے کہ ان میں سے تین آدمی ذمہ دار ہوں گے۔ ایک عاقب ہوگا۔ وہی امیر ہوگا اور وہی صاحب مشورہ اور صاحب الرائے ہوگا۔ دوسرا سید، جو ان کے سفر کا منتظم ہوگا اور تیسرا ابو الحارث ان کا پادری، یعنی عیسائی عالم اور ان کے مذہبی مدرسوں کا ذمہ دار۔ نجران کے عیسائیوں کا یہ وفد جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریاب ہونے کے لیے مدینہ پہنچا تو ارکانِ وفد نے سفر کا لباس تبدیل کیا، اپنا مخصوص لباس اور سونے کی انگوٹھیاں پہنیں اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے انھیں سلام کیا، آپ ﷺ نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ انھوں نے آپ سے بات چیت کرنے کی بہت کوشش کی مگر آپ نے ان سے کوئی بات نہ کی، وہ مخصوص لباس اور سونے کی انگوٹھیاں

---

[1] قراءة سياسية للسيرة النبوية، ص: 283. [2] البداية والنهاية: 48/5.

سجائے بیٹھے رہے، پھر وہ عثمان بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوف کو ڈھونڈنے لگے، یہ دونوں حضرات انھیں جانتے تھے کیونکہ وہ دور جاہلیت میں تجارتی مقاصد کے لیے نجران جایا کرتے تھے اور وہاں سے گندم، پھل اور مکئی وغیرہ خرید کر لاتے تھے۔ وہ دونوں حضرات انصار کی ایک مجلس میں ملے۔ وفد نے کہا: اے عثمان! اور اے عبدالرحمٰن! تمھارے نبی ﷺ نے ہمیں خط لکھا، ہم اس کا جواب دینے آئے ہیں، ہم ان کے پاس گئے، انھیں سلام کیا لیکن انھوں نے سلام کا جواب نہیں دیا، ہم کافی دیر ان سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتے رہے، انھوں نے ہمیں تھکا دیا۔ مگر ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ آپ دونوں کی رائے کیا ہے؟ کیا ہم واپس چلے جائیں؟

ان دونوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا جو اس مجلس میں موجود تھے۔ ان سے عرض کیا: اے ابوالحسن! ان لوگوں کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا مخصوص لباس اور سونے کی انگوٹھیاں اتار دیں اور عام لباس میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جائیں۔ وفد نے یہ بات تسلیم کر لی اور لباس بدل کر انگوٹھیاں اتار دیں اور دوبارہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اب انھوں نے سلام کیا تو آپ نے سلام کا جواب دیا، پھر ان سے کچھ سوالات کیے۔ انھوں نے بھی چند استفسارات کیے اور معاملہ جوں کا توں رہا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ہم تو آپ سے پہلے ہی دین کے ماننے والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے اسلام قبول کرنے میں تین چیزیں مانع ہیں: * صلیب کی پوجا * خنزیر کھانا * تمھارا یہ دعویٰ کہ اللہ کی اولاد ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ اور ان کے درمیان یہ معاملہ چلتا رہا، آپ ﷺ انھیں قرآن سناتے رہے اور باطل کا مقابلہ دلیل سے کرتے رہے۔ ان میں سے بعض افراد نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ ہمارے نبی کو گالی دیتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

[1] زادالمعاد: 3/629-638.

جی ہاں! وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول اور اس کا وہ کلمہ ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے پاک دامن اور دنیا سے لاتعلق مریم کی طرف بھیجا...... یہ سن کر وہ لوگ بہت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے: کیا آپ نے بغیر باپ کے بھی کوئی انسان دیکھا ہے؟ اگر آپ سچے ہیں تو ہمیں بھی دکھائیں۔ اس پر رسالت مآب ﷺ نے وہ آیت پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ نے نصرانیوں کی بات رد کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ○ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ○ ﴾

’’اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہونا جو اس میں شک کرتے ہیں۔‘‘[1]

یہ مغلوب کر دینے والی دلیل تھی، جس میں آپ ﷺ نے نامانوس بات کو زیادہ نامانوس سے یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو آدم علیہ السلام سے تشبیہ دی۔[2] جب حکمت اور اچھے اسلوب کے باوجود وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو آپ ﷺ نے اس فرمان الٰہی کے مطابق انھیں مباہلے کی دعوت دی۔[3]

﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ ○ ﴾

’’یہ علم آ جانے کے بعد اب بھی کوئی اس معاملہ میں تم سے جھگڑا کرے تو اے نبی! اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آ جائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لے آئیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔‘‘[4]

[1] آل عمران 3:59,60. [2] زاد المعاد: 3/633. [3] السیرة النبویة لأبی شهبة: 2/547.
[4] آل عمران 3:61.

چنانچہ نبی اکرم ﷺ علی، حسن، حسین اور فاطمہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ باہر آ گئے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ نجران کے وفد نے آپس میں مشورہ کیا۔ انھیں اپنی ہلاکت کا خوف لاحق ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ محمد ﷺ سچے نبی ہیں اور جو بھی نبی ﷺ کے ساتھ مباہلہ کرتا ہے ہلاک ہو جاتا ہے، چنانچہ انھوں نے مباہلے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے، ہمارے بارے میں آپ جو فیصلہ کرنا چاہیں کریں! آپ ﷺ نے ان سے کپڑوں کے دو ہزار جوڑوں پر مصالحت کی۔ وفد کے ارکان نے وعدہ کیا کہ وہ ایک ہزار جوڑے رجب میں اور ایک ہزار صفر کے مہینے میں ادا کریں گے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بحیثیت داعی تقرر

فتح مکہ کے بعد جزیرہ عرب کے بہت سے قبائل نے اسلام کی آواز پر لبیک کہا اور جو قبائل اس طرف متوجہ نہیں ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف داعیانِ اسلام روانہ فرمائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن میں ہمدان کی طرف بھیجا۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن کی طرف جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہم یمن کے علاقوں کے قریب پہنچے۔ لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوگئی۔ وہ جمع ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ہم سب سیدھے ایک ہی صف میں بیٹھ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ انھوں نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی، پھر رسول اللہ ﷺ کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ ہمدان قبیلے کے تمام افراد ایک ہی دن میں مسلمان ہو گئے۔ حضرت علی نے اس صورت حال کی پوری رپورٹ ایک خط میں لکھ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ارسال کر دی۔ جب آپ ﷺ کو اس خط کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو اللہ کے حضور سجدے میں گر گئے اور دعا کی: ہمدان پر سلامتی ہو! ہمدان پر سلامتی ہو۔[2]

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 547/2. [2] زاد المعاد: 622/3، اس کی سند صحیح ہے۔

رسول اکرم ﷺ اسلامی ریاست کی جنوبی جانب کے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ یمن کے قبائل اسلام قبول کر لیں۔ اس عزم و اہتمام کا اندازہ اسلام کی دعوت کے حیران کن نتائج سے ہوا۔ یمن کے اطراف و اکناف سے کثیر تعداد میں وفود مدینہ چلے آرہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بھیجے ہوئے داعیان اسلام نہایت چاق چوبند، مستعد اور متحرک تھے اور ان کی دعوت و تبلیغ کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ آپ ﷺ کے بھیجے ہوئے داعی اس پرامن دعوتی تحریک کی بھرپور مدد کر رہے تھے۔ آپ نے خالد بن ولید کو بھیجا پھر علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ آپ ﷺ نے معاشرے کے موثر مراکز میں دعوت اسلام پر خاص طور پر زور دیا اور زندگی بھر اسی شعور کو عمل میں لاتے رہے۔[1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بحیثیت قاضی

مزید برآں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ یمن میں قاضی کی ذمہ داری بھی ادا کرو۔ اس کی سرگزشت خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن بھیجا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے ان لوگوں کے پاس بھیج رہے ہیں جو مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ میں تو ابھی نیا نیا ہوں، عدل و انصاف کے معاملات نہیں جانتا۔ میری یہ گزارش سن کر آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور یہ دعا پڑھی:

«اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ لِسَانَهٗ وَاهْدِ قَلْبَهٗ»

”اے اللہ ان کی زبان کو ثبات اور استقامت عطا فرما اور ان کے دل کو ہدایت سے نواز دے۔“

پھر فرمایا: اے علی رضی اللہ عنہ! جب تمھارے سامنے دو فریق پیش ہوں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرنا جب تک پہلے فریق کی بات سننے کے بعد دوسرے فریق کی بات نہ سن لو، اگر ایسا کرو

[1] السيرة النبوية للصلابي: 596/2، والفقه السياسى للوثائق، ص:231.

گے تو فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ کا ارشاد مبارک سننے کے بعد مجھے کبھی کسی بھی فیصلے میں کوئی پیچیدگی یا اشکال محسوس نہیں ہوا۔ [1]

چاروں طرف اسلام کی اشاعت کے بعد یمنیوں کو یہ ضرورت شدت سے محسوس ہوئی کہ کوئی انھیں امورِ دین کی تعلیم دینے اور ان کے مابین اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے دینے والا ہو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد صحابہ کو یمن کے اطراف و اکناف میں بھیجا۔ ان صحابہ میں معاذ بن جبل اور ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ ان تمام صحابہ میں افضل ترین شخصیت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ تاریخ، حدیث اور فقہ کی کتابوں کے اوراق نے ہمارے لیے وہ عدالتی فیصلے محفوظ کر دیے ہیں جو قیام یمن کے دوران حضرت علی نے صادر فرمائے تھے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

شیر کے ہاتھوں مرنے والوں کی دیت

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن بھیجا۔ ہم نے وہاں کچھ لوگوں کو دیکھا۔ انھوں نے شیر کے شکار کے لیے ایک گہرا گڑھا کھودا۔ شیر اس گڑھے میں جا پڑا۔ گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے لوگ کسی بات پر آپس میں لڑنے لگے، اچانک ایک آدمی گڑھے میں گر گیا وہ دوسرے آدمی کو تھام کر لٹک گیا۔ دوسرے آدمی نے تیسرے شخص کو پکڑ لیا۔ تیسرے نے چوتھے کو تھام لیا وہ بھی گڑھے میں لٹک گیا اس طرح چاروں آدمی گڑھے میں گر گئے۔ شیر نے انھیں شدید زخمی کر دیا۔ ایک شخص آگے بڑھا اس نے شیر کو نیزہ مار کر ہلاک کر دیا۔ بعد میں وہ چاروں افراد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوت ہو گئے۔ اب پہلے شخص کے ورثاء دوسرے شخص کے ورثاء کے پاس آئے۔ انھوں نے ہتھیار سنبھالے

[1] فضائل الصحابة: 871/2، حديث: 1995، اس کی سند حسن ہے۔

اور آپس میں لڑنے لگے۔ اچانک حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں آ پہنچے۔ انھوں نے فرمایا: کیا بات ہے؟ تم کیوں آپس میں لڑائی پر آمادہ ہو؟ جبکہ رسول اللہ ﷺ تمھارے درمیان زندہ سلامت جلوہ افروز ہیں۔ میں تمھارے درمیان فیصلہ کیے دیتا ہوں، اگر تم رضامند ہو گئے تو ٹھیک ورنہ تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جانا۔ وہ تمھارے مابین فیصلہ کر دیں گے۔ اگر اب بھی کسی نے زیادتی کی تو وہ حق مانگنے کا اہل نہ ہوگا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا۔ وہ قبائل جنھوں نے گڑھا کھودا ان سے چوتھائی دیت، تہائی دیت، نصف دیت اور کامل دیت کی رقم جمع کرو۔ پہلے شخص کے لیے چوتھائی دیت، کیونکہ اس نے اپنے اوپر والے کو ہلاک کیا، دوسرے کے لیے تہائی دیت، اور تیسرے کے لیے نصف دیت۔ وہ لوگ اس فیصلے پر راضی نہ ہوئے، وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے۔ اس وقت رسالت مآب ﷺ مقام ابراہیم کے پاس تشریف فرما تھے۔ ان لوگوں نے آپ کو پورا قصہ سنایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو صحیح قرار دیا۔[1]

یہ کس کا بیٹا ہے؟

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے۔ ان کی خدمت میں تین آدمی لائے گئے۔ یہ تینوں آدمی نادانی میں اپنی ایک مشترکہ لونڈی سے ہمبستری کر بیٹھے تھے۔ آپ نے دو افراد سے تیسرے کے بارے میں پوچھا کہ کیا تم ہونے والے بچے کو اس تیسرے آدمی کا بیٹا تسلیم کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ بعد ازاں انھوں نے ان سب سے باری باری پوچھا کہ کیا تم کسی دوسرے کو ہونے والے بچے کا باپ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو؟ ان سب نے کہا: نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے نام لکھ کر ان کے درمیان قرعہ اندازی

[1] فضائل الصحابة، حديث: 1239، اس کی سند صحیح ہے۔

کی، پھر جس کے نام کا قرعہ نکلا اسے بچے کا باپ قرار دے دیا اور اس کے ذمے دیت کا دو تہائی حصہ عائد کیا۔ راوی کہتا ہے کہ جب اس بات کا تذکرہ نبی ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپ ہنس پڑے۔ آپ ﷺ کو خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق سے نوازا ہے۔ اسی لیے آپ نے اس فیصلے کو برقرار رکھا۔[1] یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ اشخاص کے حوالے سے جو واقعہ پیش آیا وہ یقیناً ان لوگوں کے اسلام لانے سے پہلے کا واقعہ ہے کیونکہ ان کا یہ گھناؤنا فعل اللہ تعالیٰ کے دین میں حرام ہے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع میں

حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے 63 اونٹ اپنے مبارک ہاتھ سے ذبح کیے۔ یہ تعداد آپ کی عمر کے برسوں کی تعداد ہے، پھر آپ ﷺ رک گئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کل سو اونٹوں میں سے جتنے اونٹ باقی رہ گئے ہیں، ان کی قربانی کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حکم پر عمل کیا اور تعداد پوری کی۔ آپ ﷺ کے ساتھ اس حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض مناسک حج بیان فرمائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے عرفہ میں وقوف فرمایا۔ اسامہ بن زید آپ کے پیچھے سواری پر سوار تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وقوف کرنے کی جگہ ہے اور پورا عرفہ جائے وقوف ہے، پھر آپ ﷺ کی اونٹنی تیز چلنے لگی۔ لوگ دائیں بائیں چل رہے تھے اور آپ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرما رہے تھے: لوگو! آہستگی، سکون اور وقار کے ساتھ چلو۔ حتی کہ آپ مزدلفہ پہنچ گئے۔ یہاں دونوں نمازیں اکٹھی پڑھیں، پھر مزدلفہ میں وقوف کیا، بعد ازاں اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ فضل بن عباس رضی اللہ عنہ سواری پر آپ کے پیچھے بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''یہ موقف ہے اور سارا مزدلفہ جائے وقوف ہے، پھر آپ چل پڑے۔ سواری تیز رفتاری سے چلی

[1] سنن النسائی مع حاشیة السندی: 6/182. [2] منهج علی بن أبی طالب فی الدعوة إلی الله، ص: 87.

جارہی تھی۔ لوگ بھی آپ کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ آپ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے: اے لوگو! سکون و اطمینان کے ساتھ چلو! آپ وادی محسر میں آ گئے۔ یہاں اپنی سواری کو مزید تیز کیا۔ آپ کی اونٹنی تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ حتی کہ آپ وادی سے نکل آئے، اور اپنی سابقہ رفتار پر آ گئے۔ تا آنکہ جمرہ کی رمی کی، پھر قربان گاہ پہنچے۔ فرمایا: یہ قربان گاہ ہے اور سارا میدان منیٰ قربان گاہ ہے۔ اسی دوران قبیلہ بنی خثعم کی ایک نوجوان عورت سامنے آ گئی۔ کہنے لگی: میرے والد بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں، حج ان پر فرض بھی ہو چکا ہے مگر ان کے لیے حج ادا کرنا ممکن نہیں، کیا میں ان کی طرف سے حج ادا کر سکتی ہوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہاں! کر سکتی ہو! آپ ﷺ فضل بن عباس کا چہرہ دوسری طرف پھیرتے رہے۔ تا کہ وہ اجنبی عورتوں کی طرف نہ دیکھ سکیں، پھر ایک آدمی آیا، اس نے کہا: میں نے جمرہ کی رمی اور طواف افاضہ کر کے لباس بھی بدل لیا ہے مگر سر نہیں منڈایا، آپ ﷺ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، اب سر منڈالو، پھر آپ کی خدمت میں ایک اور آدمی آیا۔ اس نے کہا: میں نے رمی کر لی، حلال ہو کر لباس بھی بدل چکا ہوں مگر قربانی نہیں کی۔ آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں اب قربانی کر لو۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے طواف افاضہ فرمایا، پھر زمزم کا پانی منگوایا، اس میں سے کچھ پانی پیا اور باقی سے وضو کیا، پھر فرمایا: بنی عبدالمطلب! زمزم کے کنویں سے پانی نکالو، اگر وہاں زیادہ بھیڑ کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بھی تمھارے ساتھ پانی نکالنے میں شریک ہوتا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے دیکھا کہ آپ اپنے چچا زاد کا چہرہ ایک طرف سے دوسری طرف پھیر رہے تھے، اس کی کیا وجہ تھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے ایک نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ مجھے ان دونوں کے بارے میں شیطان کا ڈر محسوس ہوا۔ [1]

آپ ﷺ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو بھی حکم دیتے تھے وہ لوگوں میں اس کا اعلان کر دیتے تھے۔

[1] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد): 9/2، حديث: 564، اس کی سند حسن ہے۔

عمرو بن سلیم اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتی ہیں: منیٰ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اعلان فرما رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: یہ دن کھانے پینے کے ہیں۔ کوئی شخص ان ایام تشریق میں روزہ نہ رکھے۔ وہ اپنے اونٹ پر سوار تھے اور اونچی آواز میں یہ اعلان کر رہے تھے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کو غسل دینے کی سعادت

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فضل بن عباس رضی اللہ عنہ اور اسامہ بن زید کے ساتھ مل کر آپ ﷺ کو غسل دیا۔[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو غسل دیا، میں آپ کے مبارک بدن کو اس زاویے سے دیکھ رہا تھا کہ کیا فوت ہو جانے کے بعد آپ ﷺ کے مقدس جسم میں کوئی فرق واقع ہوا ہے؟ مجھے ذرہ بھر کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ آپ ﷺ اپنی زندگی کی طرح وفات کے بعد بھی نہایت طیب اور پاکیزہ نظر آئے۔[3] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا باپ آپ پر فدا ہو! آپ ﷺ زندگی میں بھی طیب تھے اور موت کے بعد بھی طیب ہی نظر آئے۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو حضرات قبر میں اترے اور تدفین کے عمل میں شریک ہوئے ان میں فضل بن عباس کے علاوہ قثم بن عباس اور رسول اللہ ﷺ کے غلام شقران بھی تھے۔[5] رسول اللہ ﷺ کی وفات کی الم انگیز خبر صحابۂ کرام پر بجلی بن کر گری۔ کیونکہ انھوں نے آپ ﷺ کے زیر سایہ زندگی بسر کی تھی اور آپ کی ذات بابرکات ان کے لیے ماں کی مہربان آغوش سے بھی زیادہ شفیق تھی۔ وہ آپ سے بے پایاں محبت اور فدویت کا تعلق رکھتے تھے۔ اہل بیت، ہاشمی خاندان اور ان میں سے بھی خاص طور

---

[1] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد): 9/2، حديث: 567، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] سنن أبي داود، حديث: 3209، شعبی سے مرسل روایت ہے، البانی نے احکام الجنائز، ص: 51 میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [3] سنن ابن ماجه، حديث: 1467، البانی نے احکام الجنائز، ص: 50 پر اسے صحیح کہا ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 321/4. [5] السيرة النبوية: 321/4.

پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو تو نبی ﷺ دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کی فطرت سلیمہ اور انتہائی قریبی قرابت داری بھی اس شیفتگی اور گرویدگی کا تقاضا کرتی تھی۔ ہر چند ان کا شعور، احساس، جذبات اور محبت کی بہتات نہایت اعلیٰ درجے کی تھی، اس کے باوجود انھوں نے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کیا۔[1]

بوقت وفات تحریر کا معاملہ

صحیحین اور دیگر کتب احادیث میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث ثابت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آیا اس وقت گھر میں چند آدمی موجود تھے، آپ نے فرمایا:

«هَلُمُّوا أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَّا تَضِلُّوا بَعْدَهُ»

''لاؤ میں تمھیں ایک تحریر لکھوا دوں تاکہ بعد میں کبھی گمراہ نہ ہونے پاؤ۔''

ان میں سے بعض حضرات نے کہا: آپ ﷺ پر بیماری کا غلبہ ہے، ہمارے پاس قرآن پاک موجود ہے۔ اور ہمیں ہدایت کے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اس پر اہل خانہ میں کچھ اختلاف پیدا ہوا، ان میں سے چند حضرات نے کہا: کوئی چیز لاؤ جناب رسول اللہ ﷺ تمھیں تحریر لکھوا دیں تاکہ ان کے بعد کبھی تم گمراہ نہ ہونے پاؤ۔ کچھ لوگ اس کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی کرنے لگے، جب ان کا شور بڑھا اور اختلاف میں اضافہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ پر یہ شور گراں گزرا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «قُومُوا» ''اٹھ جاؤ۔'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: یہ بڑے المیے کی بات ہے کہ ان کا اختلاف اور شور، رسول اللہ ﷺ اور ان کی تحریر کے مابین حائل ہو گئے۔''[2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور روایت اس طرح منقول ہے: انھوں نے فرمایا:

---

[1] المرتضی للندوی، ص: 59. [2] صحیح البخاري، حدیث:4432.

''جمعرات کا دن تھا۔ اور میں بتاتا ہوں کہ جمعرات کے دن کیا ہوا۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی بیماری اور تکلیف میں اضافہ ہوگیا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِئْتُونِي أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا»

''میرے پاس کوئی چیز لاؤ میں تمھیں ایسی تحریر لکھوا دیتا ہوں کہ اس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔''

اس وقت حاضرین کی آوازیں آپس میں گفتگو کی وجہ سے بلند ہوئیں، حالانکہ نبی ﷺ کے حضور آوازیں ہرگز بلند نہیں ہونی چاہئیں۔ حاضرین کہنے لگے جناب رسالت مآب ﷺ کو (نعوذ باللہ) ہذیان ہوگیا ہے۔ ان سے مزید وضاحت کرو پھر وہ آپ ﷺ پر بات دہرانے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«دَعُونِي، فَالَّذِي أَنَا فِيهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ»

''مجھے چھوڑ دو، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اس سے زیادہ بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے دعوت دے رہے ہو۔''

اور پھر انھیں تین باتوں کی وصیت کی۔ فرمایا:

«أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَأَجِيزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ أُجِيزُهُمْ»

''مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو، بیرونی وفود کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو میں کیا کرتا تھا۔''

اور تیسری بات پر جناب رسول اللہ ﷺ خاموش ہوگئے...... یا راوی نے کہا...... کہ اسے وہ بات بھول گئی ہے۔[1] اس حدیث میں اور اسی مفہوم کی دوسری صحیح روایات میں کہیں بھی کسی طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف کوئی قابل اعتراض پہلو نہیں نکلتا۔ اس سلسلے میں

[1] صحيح البخاري، حديث: 4431، یعنی راوی تیسری بات بھول گیا نہ کہ رسول اللہ ﷺ۔

روافض نے جن طعنوں کا ذکر کیا ہے وہ سب باطل اور جھوٹ ہیں۔ علمائے سلف نے ان میں سے بعض کا جواب بھی دیا ہے۔ ان میں سے بعض جوابات یہ ہیں:

صحابہ رضی اللہ عنہم کا باہمی اختلاف تو یقیناً ثابت ہے لیکن ان کے اختلاف کا اصل سبب رسول اللہ ﷺ کی بات سمجھنے کے بارے میں ہے۔ اس میں نبی ﷺ کے حکم کو نہ ماننے کا ہرگز کوئی شائبہ نہیں۔ یہ سب صحیح مقصد کو سمجھنے کے لیے ان کا اجتہاد تھا اور ہر مجتہد کے لیے صحیح نقطۂ نگاہ یا اس کے برعکس موقف کو اختیار کرنے کا بہرحال امکان ہے۔ مجتہد پر کوئی گناہ نہیں اس کے لیے اجر کا وعدہ ہے۔[1] پھر یہ بھی بتا دیا گیا کہ نبی ﷺ نے انھیں کوئی برا بھلا نہیں کہا نہ ان کی مذمت کی بلکہ سب کو مخاطب کر کے فرمایا: «دَعُونِي، فَالَّذِي أَنَا فِيهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ» ”مجھے چھوڑ دو میں جس رائے پر ہوں وہی زیادہ بہتر ہے۔“[2] یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جو غزوہ احزاب کے موقع پر پیش آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا: «لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ» ”تم میں سے ہر ایک عصر کی نماز بنی قریظہ میں ادا کرے۔“[3]

کچھ صحابہ کرام کو تاخیر کا ڈر لاحق ہوا، چنانچہ انھوں نے بنی قریظہ سے پہلے ہی بروقت نماز ادا کر لی اور دوسروں نے کہا کہ ہم تو وہیں جا کر نماز پڑھیں گے جہاں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے۔ اس بارے میں نبی ﷺ نے کسی بھی فریق کو غلط قرار نہیں دیا۔[4]

❁ روافض کا یہ دعویٰ کہ صحابہ کے اختلاف کے نتیجے میں رسول اکرم ﷺ تحریر نہ لکھ سکے۔

---

[1] المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم للقرطبي: 559/4، صحیح بخاری میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ» ”جب حاکم کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے کرے اور فیصلہ صحیح ہو تو اسے دہرا ثواب ملتا ہے اور جب وہ کسی فیصلے میں اجتہاد کرے اور غلطی کر جائے تو اسے ایک ثواب ملتا ہے۔“ صحيح البخاري، حديث: 7352. [2] صحيح البخاري، حديث: 4431.
[3] صحيح البخاري، حديث: 4119. [4] المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم للقرطبي: 559/4.

اس وجہ سے امت گمراہی سے محفوظ رہنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی۔ ان کی یہ رائے غلط ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گمراہی سے تحفظ کی تبلیغ کو ترک کر دیا اور محض اختلاف صحابہ کے نتیجے میں اپنے رب کی شریعت کا ابلاغ نہ فرما سکے اور اسی حالت میں رحلت فرما گئے۔ گویا (نعوذ باللہ) انھوں نے اس فرمان خداوندی کی مخالفت کی:

﴿ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ ﴾

''اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا، اور بلاشبہ اللہ کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1]

اس آیت کی رو سے رسول اللہ ﷺ مندرجہ بالا صورت حال سے بری الذمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے اور انھیں منزہ و مقدس ہستی قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝ ﴾

''(لوگو!) یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ وصف خود بیان کیا ہے کہ وہ امت کی ہدایت اور ان کے دنیوی اور اخروی فائدے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔[3]

[1] المائدة 67:5. [2] التوبة 128:9. [3] تفسير ابن كثير:404/2.

دین اسلام کی یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہے اور جس آدمی کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے اسے ہرگز کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو جو بھی حکم دیا وہ انھوں نے آگے پہنچا دیا، وہ اس کے لیے بہت فکر مند رہتے تھے۔ ان کا جہاد، ان کی قربانیاں اور حالات زندگی سب اسی حقیقت کی گواہی دیتے ہیں۔ اس بارے میں ہمیں جو یقینی علم حاصل ہے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ رافضیوں کا موقف یکسر غلط ہے۔ اگر رسالت مآب ﷺ قیامت تک امت کو اختلاف اور انتشار سے نکالنے کا کوئی طریقہ بتانا چاہتے تھے تو از روئے دین اور عقل آپ نے اس میں ہرگز کوئی تاخیر نہیں کی ہوگی۔[1]

کیا آپ ﷺ نے محض صحابہ کے اختلاف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم امت کو نہیں پہنچایا؟ نعوذ باللہ! ایسی بودی بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اس وقت تنازع کے باعث اسی میں مصلحت سمجھی کہ اسے موخر کر دیا جائے تو پھر کوئی بات مانع نہیں تھی کہ بعد میں آپ ﷺ اسے لکھوا دیتے اور یہ بات ثابت ہے کہ آپ اس واقعہ کے بعد کئی دن تک زندہ رہے۔ آپ ﷺ کی وفات...... جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بتایا گیا ہے......[2] پیر کے روز ہوئی اور تحریر والا واقعہ بالاتفاق جمعرات کے دن ظہور میں آیا۔[3] اہل سنت اور رافضیوں سے متفقہ طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے وفات کے وقت تک یہ تحریر نہیں لکھی اس بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تحریر، دین کا وہ لازمی حصہ نہیں تھی جس کی تبلیغ کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔ قرآن اس بات پر واضح دلیل پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان کی امت کے لیے بھی دین مکمل کر دیا۔

حجۃ الوداع سے پہلے یہ ارشاد ربانی نازل ہوا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا ﴾

---

[1] مختصر التحفة الإثنا عشرية، ص:251، والانتصار للصحب والآل للدكتور إبراهيم الرحيلي، ص:229,228. [2] صحيح البخاري، حديث:4448، وصحيح مسلم، حديث:419. [3] الانتصار للصحب والآل للدكتور إبراهيم الرحيلي، ص:229.

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔''[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''زیر بحث تحریر کا لکھنا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر واجب نہیں کیا۔ نہ اس وقت اس کا ابلاغ ضروری تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کو کیسے ترک کر سکتے تھے؟ لیکن آپ ﷺ نے خلافت ابوبکر کے بارے میں نزاع ختم کرنے کے لیے مصلحتاً یہ کام مناسب سمجھا تھا، تاہم آپ ﷺ کو اس بات کا یقین بھی تھا کہ اختلاف ضرور واقع ہوگا۔''[2]

ایک اور موضوع پر ایک تحریر میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''البتہ یہ واقعہ کہ رسول اللہ ﷺ ایک تحریر لکھنا چاہتے تھے، وہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل ہوا ہے۔ وہ کہتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیماری کے دوران مجھ سے فرمایا:

«أُدْعِي لِي أَبَابَكْرٍ أَبَاكِ وَأَخَاكِ حَتّٰى أَكْتُبَ كِتَابًا فَإِنِّي أَخَافُ أَنْ يَّتَمَنّٰى مُتَمَنٍّ وَّيَقُولُ قَائِلٌ: أَنَا أَوْلٰى وَيَأْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَّا أَبَا بَكْرٍ»

''اپنے والد اور بھائی کو میرے پاس بلاؤ تاکہ میں ایک تحریر لکھ دوں، مجھے ڈر ہے کل کوئی شخص یہ تمنا کرے اور کوئی کہنے والا یہ کہے کہ میں زیادہ حق دار ہوں، اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان صرف ابوبکر ہی کو چاہتے ہیں۔''[3]

❁ اب رہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول: ''اصل مصیبت وہ صورت حال تھی جو رسول اللہ ﷺ اور ان کے تحریر لکھنے کے مابین حائل ہوگئی۔'' ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس بارے میں کہتے ہیں کہ یہ قول اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حائل چیز ہی اصل مصیبت تھی اور وہ مصیبت خلافت صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں شک کرنے والے کے لیے ہے۔ اگر وہ

---

[1] المائدة 3:5. [2] منهاج السنة لابن تيمية: 316/6. [3] صحيح البخاري، حديث: 5666، وصحيح مسلم، حديث: 2387.

تحریر موجود ہوتی تو شک کرنے والے کا شک دور ہو جاتا، البتہ جس کو یقینی طور پر معلوم تھا کہ ان کی خلافت حق ہے، اس کے لیے الحمد للہ یہ کوئی مصیبت کی بات نہیں تھی۔ [1]

یہ بات اس طرح اور زیادہ وضاحت سے اجاگر ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ ساری باتیں خوارج اور روافض جیسے اہل اہواء و بدعت کے غلبے کے بعد فرمائی تھیں۔ [2] یہ حقیقت امام ابن تیمیہ اور امام ابن حجر [3] نے اپنی تحریروں میں وضاحت سے بیان کر دی ہے۔

❁ رہا ان کا یہ دعویٰ کہ نبی اکرم ﷺ کا اس تحریر سے مقصد یہ تھا کہ خلافت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق وضاحت سے بیان فرما دیں۔ بعض روافض کہتے ہیں کہ اس تشریح و توضیح کے علاوہ اور کوئی بات معقول نظر نہیں آتی، یہ دعویٰ غلط ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''جو شخص اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ یہ تحریر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سلسلے میں تھی، وہ علمائے اہل سنت اور شیعہ دونوں کے علماء کی نظر میں بالاتفاق گمراہ ہے، اہل سنت تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تفضیل اور تقدیم پر متفق ہیں اور شیعہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امامت کا مستحق سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں: ان کی امامت سے متعلق، اس سے پہلے ہی واضح اور معروف بات یہی تھی، لہٰذا اب کسی تحریر کی ضرورت نہ تھی۔ [4]

❁ روافض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف بات کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر یہ الزام لگایا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں انھیں اس کا ادراک نہیں ہے اور سیدنا عمر نے یہ بھی کہا: ''انھیں ہذیان ہو گیا ہے'' انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بات پر عمل کرنے کی بجائے کہا: ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے، ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ

[1] منهاج السنة لابن تيمية: 25/6. [2] منهاج السنة لابن تيمية: 316/6. [3] فتح الباري: 209/1.
[4] منهاج السنة لابن تيمية: 25/6، والانتصار للصحب والآل للدكتور إبراهيم الرحيلي، ص: 281-283.

باتیں ثابت ہی نہیں ہیں۔ اس موقع پر حاضرین میں سے بعض نے چند جملے کہے تھے۔ صحیحین میں وارد روایاتِ حدیث قائل کا تعین ہی نہیں کر رہیں۔ جو بات ثابت ہے وہ جمع کے صیغہ کے ساتھ یہ ہے کہ انھوں نے کہا: ''آپ ﷺ کو کیا ہوا؟ کیا انھیں ہذیان ہوگیا ہے؟'' لہٰذا بعض علماء نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گفتگو کا حصہ ہی نہیں ہیں۔[1]

امام ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ مجھے مختلف احتمالات میں سے یہ احتمال قابل ترجیح لگتا ہے، جسے امام قرطبی نے ذکر کیا ہے کہ اس بات کا قائل، اسلام میں نئے داخل ہونے والوں میں سے کوئی ہوگا اور وہ یہ سمجھتا ہوگا کہ بیماری یا تکلیف کی شدت کی وجہ سے وہ اپنے ارادے کے مطابق صحیح تحریر نہ کرسکیں گے۔[2] شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ بات کہاں سے ثابت ہوتی ہے کہ اس قول کے قائل حضرت عمر تھے؟ جبکہ اکثر روایات میں اس کے قائل کو جمع کے صیغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔''[3]

جو الفاظ صحیح طور پر ثابت ہیں وہ سوالیہ صیغہ کے ساتھ اس طرح ہیں: ''کیا انھیں ہذیان ہوگیا ہے؟''[4] (نعوذ باللہ) اور جو بغیر استفہام کے ہیں وہ محدثین اور شارحین حدیث کی نظر میں مرجوح ہیں، ان میں قاضی عیاض، قرطبی،[5] نووی[6] کے علاوہ ابن حجر رحمہ اللہ شامل ہیں۔[7]

ان سب حضرات نے بڑی وضاحت سے یہ بات کہی ہے کہ مذکورہ استفہام «لَا تَكْتُبُوا» یعنی نہ لکھو کے جواب میں استفہام انکاری ہے۔[8] امام قرطبی نے دعوت کے سلسلے میں نبی ﷺ کے معصوم عن الخطاء ہونے اور صحابہ کرام کے ہاں اس بات کے صحیح قرار پانے کے دلائل دینے کے بعد کہا ہے: ''ان باتوں کے پیش نظر یہ بات محال نظر آتی ہے کہ ''کیا انھیں ہذیان

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 4431. [2] فتح الباري: 133/8. [3] مختصر التحفة الإثنا عشرية، ص: 250. [4] الشفاء لأبي الفضل عياض بن موسى: 886/2. [5] المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم للقرطبي: 559/4. [6] شرح صحيح مسلم للنووي: 93/11. [7] فتح الباري: 133/8. [8] الانتصار للصحب والآل للدكتور إبراهيم الرحيلي، ص: 228.

ہوگیا ہے؟'' کے الفاظ بولے گئے ہوں، وہاں محض چند لوگوں نے کندھے کی چوڑی ہڈی برائے تحریر اور دوات لانے پر انکار اور توقف کیا، گویا دوسرا آدمی توقف کرنے والے سے کہہ رہا ہے: ''تمھیں توقف کیوں ہوا؟ کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کو ہذیان ہوا ہے؟ توقف کو چھوڑو اور تحریر کا سامان پیش کرو۔ آپ ﷺ حق بات ہی لکھیں گے نہ کہ ہذیان۔''

یہ سب سے اچھا احتمال ہے۔ اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم بالاتفاق رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہذیان کی بات کو محال سمجھتے تھے کیونکہ قائلین نے استفہام انکاری کے ساتھ اس جملے کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح روافض کے تمام دعوے بے حقیقت ثابت ہوجاتے ہیں۔[1]

❁ اب رہا ان کا دعویٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ: ''تمھارے پاس اللہ کی کتاب ہے، ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے'' کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی ہے۔ (نعوذ باللہ) اور رسول اللہ ﷺ کی جانب سے تحریر لکھے جانے کی خواہش پر ان کی بات نہیں مانی۔ اس کمزور شبہے کی تردید اس طرح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی رائے سے موافقت رکھنے والے صحابہ نے نبی ﷺ کی طرف سے تحریر لکھنے کے معاملے کو واجب نہیں سمجھا، بس انھوں نے یہی باور کیا کہ آپ کسی زیادہ بھلی بات کی طرف رہنمائی فرما رہے ہیں۔[2] قاضی عیاض، امام قرطبی،[3] امام نووی[4] اور امام ابن حجر[5] نے اسی طرف توجہ دلائی ہے۔ بعدازاں عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد اس طرح صحیح ثابت ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ نے تحریر لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔ اگر کوئی واجب امر ہوتا تو آپ ﷺ ان کے اختلاف کے باوجود اسے ترک نہ فرماتے کیونکہ کسی بھی مخالفت کرنے والے کی مخالفت کی بنیاد پر وہ تبلیغ کا فریضہ ہرگز ترک نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے اس واقعہ کو

[1] المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم للقرطبي:4/559. [2] الشفاء لأبي الفضل عياض بن موسىٰ:2/887. [3] المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم للقرطبي:2/559. [4] شرح صحيح مسلم للنووي: 11/91. [5] فتح الباري:1/209.

موافقات عمر میں شامل کیا ہے۔[1] اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا: ''ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔'' ان کے مخالفین کی تردید ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت۔ اس بات کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے: ''تمھارے پاس اللہ کی کتاب ہے۔'' آپ نے اس قول میں جمع مخاطب کا صیغہ بولا ہے۔ گویا آپ کے مخاطب وہ تھے جو آپ کی رائے کی مخالفت کررہے تھے۔ اگر مخاطب رسول اللہ ﷺ ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمع کا صیغہ نہ بولتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دور اندیش، صاحب بصیرت اور صائب الرائے شخص تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ ترک تحریر قابل ترجیح صورت ہے، اس لیے بھی کہ اس کا حکم واجب نہیں ہے۔ اور مرض کی شدت میں یہ مناسب بھی نہیں ہے۔ اس پر ان کا یہ قول شاہد ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر بیماری اور تکلیف کا غلبہ ہے اور یہ نامناسب ہے کہ رسول اللہ ﷺ مشقت اور بوجھ کی تکلیف اٹھائیں۔[2] انھیں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یاد تھا:

﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ﴾

''ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)۔''[3]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾

''(یہ کتاب) ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے۔''[4]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس موقع کی گفتگو کے حوالے سے اس حدیث کی تشریح میں تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت، ان کی بالغ نظری اور ان کے فقیہ ہونے پر دلیل ہے۔''[5]

[1] فتح الباري: 209/1. [2] الشفاء: 888/2. [3] الأنعام 38:6. [4] النحل 89:16. [5] شرح النووي على صحيح مسلم: 90/11، والإنتصار للصحب والآل للدكتور إبراهيم الرحيلي، ص: 289-292.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس موقف کے باعث مجتہد ہیں۔ اور مجتہد کا عذر بہر حال قبول ہوتا ہے بلکہ نبی ﷺ کے اس فرمان کے مطابق آپ کے لیے اجر جزیل بھی ہے کہ جب مجتہد اجتہاد کی بنیاد پر فیصلہ کرے اور وہ ٹھیک ہو تو اس کے لیے دگنا اجر ہے اور اگر درست نہ ہو تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد آپ ﷺ ہی کی موجودگی میں نمایاں ہوا۔ آپ نے ان کو گناہ کا مرتکب قرار دیا نہ ان کی مذمت کی بلکہ آپ نے ترک تحریر پر ان کی موافقت کر دی۔ اس واقعہ کے حوالے سے روافض کی صحابہ کرام پر طعن و تشنیع غلط اور بے بنیاد ثابت ہو جاتی ہے اور ان کے جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے۔ [1]

[1] الانتصار للصحب والآل للدكتور إبراهيم الرحيلي، ص: 295,294.
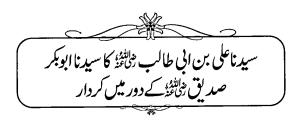
سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں کردار

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بیعت

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت تاخیر سے کی اس حوالے سے بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں۔ اسی طرح زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی بحث کی جاتی ہے۔ ایسی تمام باتیں غلط ہیں۔ وہ روایات جن کی سند صحیح ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ دونوں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت اولین مرحلے ہی میں کر لی تھی۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، انصار قبیلہ کے خطیب کھڑے ہوگئے...... اس میں انھوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ہونے والی بیعت کا ذکر کیا ہے،[1] پھر فرماتے ہیں: جب حضرت ابوبکر، منبر پر بیٹھے اور لوگوں پر نگاہ دوڑائی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نظر نہیں آئے۔ ان کے بارے میں پوچھا، انصار کے کچھ لوگ انھیں بلا لائے۔ حضرت ابوبکر نے کہا: ''اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور ان کے داماد! کیا آپ مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر کوئی ملامت نہیں، پھر انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ نظر دوڑائی تو آپ کو زبیر بن عوام بھی نظر نہیں

[1] مجمع الزوائد للهيثمي: 183/5، اس حدیث کے راوی کتب صحاح کے راوی ہیں۔ البداية والنهاية: 281/5، ابن کثیر نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور محفوظ کہا ہے۔

آئے، انھیں بلوایا، صحابہ انھیں لے آئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور حواری! کیا آپ وحدت امت کو خراب کرنا چاہتے ہیں؟ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے خلیفۂ رسول! کوئی ملامت کی بات نہیں ہے۔'' اس طرح انھوں نے بھی آپ کی بیعت کر لی۔ [1]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس صحیح حدیث کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ امام مسلم جن کی الجامع الصحیح صحیح بخاری کے بعد تمام کتب احادیث میں صحیح ترین سمجھی جاتی ہے، وہ اپنے شیخ محمد بن اسحاق ابن خزیمہ، صحیح ابن خزیمہ کے مولف کے پاس گئے۔ ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا، ابن خزیمہ نے ان کو یہ حدیث لکھ کر دی اور پڑھ کر بھی سنائی۔ امام مسلم اپنے استاذ امام ابن خزیمہ سے کہنے لگے: ''یہ حدیث، قربانی کے نہایت قیمتی جانور کے برابر ہے۔'' ابن خزیمہ نے کہا: ''یہ صرف قربانی کے قیمتی جانور کے مساوی نہیں بلکہ یہ تو بہت بڑے قیمتی خزانے سے بھی بڑھ کر گراں مایہ ہے۔''

امام ابن کثیر نے اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: اس حدیث کی سند صحیح اور محفوظ ہے۔ اس میں بڑے اہم نکات ہیں۔ وہ یہ کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پہلے یا دوسرے دن بیعت کر لی تھی۔ یہی بات حق اور سچ ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہوئے۔ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے اور کبھی پیچھے نہیں رہے۔ [2] حبیب بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں تھے، ان کے پاس ایک آدمی آیا۔ وہ کہنے لگا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ خلافت کی بیعت کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی قمیص ہی میں مسجد کی طرف چل دیے۔ چادر بھی نہیں اوڑھی وہ جلدی میں تھے مبادا بیعت کرنے میں دیر ہو جائے۔ وہ آئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، پھر بیٹھ گئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی چادر منگوائی اور اپنی قمیص کے اوپر ڈال

[1] المستدرك للحاكم: 76/3، والسنن الكبرى للبيهقي: 143/8، صحیح اسناد کے ساتھ۔ [2] البداية والنهاية: 239/5.

لی۔''[1] عمرو بن حریث نے سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت موجود تھے؟'' انھوں نے کہا: ''جی ہاں'' انھوں نے پوچھا: ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کب ہوئی؟ سعید کہتے ہیں: اسی دن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، مسلمانوں نے گوارا نہیں کیا کہ وہ دن کا کچھ حصہ بھی اجتماعیت کے بغیر رہیں۔ اس نے پوچھا: کیا کسی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت بھی کی تھی؟ سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں۔ کسی نے بھی مخالفت نہیں کی۔ ایسا تو وہی کرسکتا ہے جو مرتد ہو، یا مرتد ہونے کے قریب ہو۔ اللہ تعالی نے انصار قبیلے کو بھی مشکل سے نکالا، ان سب کو یکجا کر دیا۔ انھوں نے بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، انھوں نے پوچھا کہ کیا مہاجرین میں سے کوئی بیعت سے پیچھے رہا؟ سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: مہاجرین تو پے در پے ان کی بیعت کے لیے آتے رہے۔[2] بعدازاں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ بصرہ تشریف لائے تو ابن الکواء اور قیس بن عباد نے ان سے بیعت کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے فرمایا: اگر میرے پاس اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت یا عہد نامہ ہوتا تو بنی تیم بن مرہ کے بھائی اور عمر بن خطاب کو منبر پر کھڑا ہونے کے لیے نہ چھوڑتا۔ میں ان دونوں سے لڑائی کرتا' چاہے میرے پاس صرف یہ چادر ہی باقی رہ جاتی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچانک فوت نہیں ہوئے۔ وہ کچھ روز بیمار رہے۔ ان کے پاس مؤذن آتا تھا۔ انھیں نماز کے لیے مطلع کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے تھے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، حالانکہ میں ان کے سامنے موجود ہوتا تھا۔ ان کے گھر کی خواتین میں سے ایک خاتون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہٹانے کی کوشش بھی کی لیکن انھوں نے انکار کیا بلکہ ناراض ہوئے اور فرمایا: ''تم سب یوسف علیہ السلام کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کرنے والی عورتوں کی طرح ہو، ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو کہ وہی لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''

---

[1] تاریخ الطبری: 207/3، یہ مرسل حدیث ہے، اس کی سند میں سیف بن عمر، متروک راوی ہے۔ اور عبدالعزیز بن سیاہ راوی صدوق ہے اور شیعیت کی طرف مائل ہے، (تقریب: 357) [2] تاریخ الطبری: 207/3 اس روایت کی سند ضعیف ہے، دیکھیے: خلافة أبي بكر الصديق لعبدالعزيز سليمان، ص: 66.

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلا لیا، ہم نے اپنے امور پر غور کیا۔ ہم نے اپنی دنیا کے لیے بھی اس کو پسند کر لیا جسے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کے لیے پسند کیا تھا۔ نماز اسلام کی بنیاد ہے۔ یہ اہم ترین امور میں سے ہے اور دین کے قیام کا باعث ہے، ہم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی کیونکہ وہ اس کے اہل تھے۔ ہم میں سے دو افراد نے بھی ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ ہم میں سے کسی نے دوسرے کے خلاف گواہی نہیں دی۔ ہم نے ان سے براءت کا فیصلہ بھی نہیں کیا۔ میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کا حق دیا، ان کی اطاعت کی، ان کے ساتھ جنگوں میں شریک رہا۔ وہ مجھے جو کچھ دیتے تھے، میں لے لیتا تھا۔ جب مجھے کوئی کام سونپتے تھے، میں انجام دیتا تھا۔ میں ان کی موجودگی میں اپنے کوڑے سے حدود کی سزائیں دیتا رہا ہوں۔''[1]

انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

''تمام مسلمانوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت کے لیے بیعت کی۔ جناب عبدالمطلب کی اولاد میں سے اس پر سبقت لے جانے والوں میں سے سب سے پہلا شخص میں ہی تھا۔''[2]

کچھ ایسی روایات بھی ملی ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اولین مرحلے ہی میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی لیکن ان میں صراحت نہیں ہے۔

ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ موجود تھے..... ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ لوگوں سے خطاب کیا، اپنا عذر پیش کیا اور فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں کبھی ایک دن یا ایک رات کے لیے بھی حکمرانی

[1] تاريخ الإسلام، عهد الخلافة الراشدة: 641/3 اس کی سند ضعیف ہے، وخلافة أبي بكر الصديق لعبدالعزيز سليمان، ص: 65. [2] أسد الغابة: 167/4، 166، وخلافة أبي بكر الصديق لعبدالعزيز بن سليمان، ص: 66.

کا حریص نہیں ہوا، نہ مجھے اس کی رغبت تھی، نہ میں نے ظاہراً یا باطناً اللہ تعالیٰ سے اس کو طلب کیا لیکن میں فتنے سے ڈر رہا تھا۔ مجھے حکمرانی میں کوئی راحت نہیں ہے، مجھے ایک عظیم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ اور یہ صلاحیت لامحالہ تقویٰ ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، میری تمنا تھی کہ میری جگہ پر مجھ سے زیادہ قوی شخص موجود ہوتا۔''

مہاجرین نے ان کی ساری باتیں اور جو انھوں نے اپنی طرف سے عذر پیش کیا سب کچھ قبول کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ہم بالکل ناراض نہیں تھے۔ بس ایک معمولی سی شکایت صرف اس لیے تھی کہ انھوں نے ہم سے مشورہ کرنے میں تاخیر کردی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ حق دار ہیں، وہ غار کے ساتھی ہیں، ثانی اثنین ہیں، ہم ان کے اعزاز ان کی عظمت کو جانتے اور مانتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں انھیں نماز کے لوگوں کی امامت کا حکم دیا تھا۔'' [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا، انھیں چھوڑ کر کسی اور کے ساتھی نہیں بنے۔ ہر مشورے میں اور مسلمانوں کے تمام تدبیری امور میں ان کے ساتھ شریک رہے، امام ابن کثیر اور علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ کے بعد جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی، بیعت اولیٰ کی تجدید فرمائی۔ اس بیعت کے حوالے سے صحیح روایات ملتی ہیں۔ لیکن جب دوسری بیعت ہوئی تو بعض راویوں نے یہ سمجھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے پہلے بیعت نہیں کی تھی، یعنی انھوں نے پہلی بیعت کی نفی کی لیکن قاعدے کی رو سے مثبت کو منفی پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔ [2]

مرتدین کے خلاف جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معاونت

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے خیر خواہی کا مرقع تھے۔ وہ ہر چیز پر مسلمانوں

[1] البداية والنهاية: 341/6، اس کی سند جید ہے، وخلافة أبي بكر الصديق لعبدالعزيز بن سليمان، ص: 67. [2] البداية والنهاية: 49/5.

اور اسلام کے مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ان کے اخلاص، اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے خیر خواہی خلافت کی بقاء اور حفاظت کے لیے فکر مندی اور مسلمانوں کی اجتماعیت قائم رکھنے کے لیے بڑی دلیل وہ موقف ہے جو انھوں نے حضرت ابوبکر کے ساتھ اختیار فرمایا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بذات خود ذی القصہ کی طرف رخ کرنا مرتدین کے خلاف جنگ کا عزم، عسکری تحرکات کی قیادت بذات خود کرنے کا ارادہ اور (جنگی حکمت عملی کے حوالہ سے) اس میں اسلامی مملکت کے لیے خطرات[1] جیسے معاملات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکیمانہ کردار سامنے آتا ہے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ابوبکر رضی اللہ عنہ ذی القصہ کی جانب جانے کے لیے تیار ہوگئے اور اپنی سواری پر بیٹھ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سواری کی لگام پکڑ لی اور ان سے کہا: ''میں آپ سے وہی بات کہتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد کے دن کہی تھی: اپنی تلوار میان میں ڈال لیں، ہمیں غم میں مبتلا نہ کریں اور مدینہ لوٹ جائیں۔ آج اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو اسلام کا نظام ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مشورے پر ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس آگئے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دل اور سینہ، نعوذ باللہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے فراخ نہ ہوتا اور انھوں نے ان کی بیعت اپنے دل کی مرضی کے خلاف کی ہوتی تو آج یہ بڑا سنہری موقع تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے فائدہ اٹھاتے اور کہتے: ابوبکر! تم جانو اور تمھارا کام، (اور نعوذ باللہ یہ سوچتے) کہ انھیں کوئی حادثہ پیش آجائے گا تو ان سے جان چھوٹ جائے گی اور حالات میرے حق میں سازگار ہوجائیں گے۔ اگر ان کے دل میں (نعوذ باللہ) ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے نفرت اس سے بھی زیادہ ہوتی تو وہ ان سے جان چھڑانے کی کوشش میں لگ جاتے اور کسی آدمی کو برانگیختہ کرکے تیار کرتے کہ انھیں ہلاک کردے جیسا کہ آج کے دور میں سیاسی لوگ اپنے مدمقابل اور دشمنوں کے خلاف یہ حربے استعمال کرتے ہیں۔[3]

[1] المرتضی لأبی الحسن الندوي، ص: 97. [2] البدایة والنهایة: 6/314، 315. [3] المرتضی لأبي الحسن الندوي، ص: 97.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جچی تلی رائے تھی کہ مرتدین کے خلاف لڑائی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے اس بارے میں پوچھا: ''اے ابوالحسن! آپ کی کیا رائے ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے جو زکاۃ وصول کرتے تھے اگر آپ نے اس میں سے تھوڑا سا حصہ بھی چھوڑ دیا تو آپ کا عمل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہوگا۔'' اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا کہ اگر آپ کی یہ رائے ہے تو واللہ! انھوں نے زکاۃ میں ایک رسی بھی کم دی تو ان کے خلاف جنگ کروں گا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مقدم رکھنا

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور تقدیم کے حوالے سے تواتر کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ احادیث یہ ہیں:

- محمد بن الحنفیہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل کون ہیں انھوں نے فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ!'' میں نے عرض کیا: ان کے بعد کون؟ انھوں نے فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ۔'' اب مجھے اندازہ تھا کہ میں پوچھوں گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد افضل کون ہے تو وہ لازماً عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیں گے، اس لیے میں نے اپنے سوال کا اسلوب بدل دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام آنے کی نوبت ہی نہ آنے دی اور اچانک کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد یقیناً آپ ہی افضل ہیں؟ انھوں نے فوراً فرمایا: ''میں تو عام مسلمانوں ہی میں سے ایک فرد ہوں۔''[2]
- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ اس امت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر شخص کون ہیں؟ وہ ابوبکر ہیں۔'' پھر فرمایا: ''کیا میں نہ بتاؤں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے بہتر شخص کون ہیں؟ وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔''[3]

[1] المختصر من كتاب الموافقة بين أهل البيت والصحابة للزمخشري، ص: 48، والرياض النضرة لمحب الدين الطبري، ص: 670. [2] صحيح البخاري، حديث: 3671. [3] مسند أحمد: 127,110,106/1، احمد شاکر نے اس قسم کی اکثر احادیث کو صحیح کہا ہے۔

❁ ابو وائل شقیق بن سلمہ کہتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا آپ اپنے بعد کسی خلیفہ کا تعین نہیں کریں گے؟ انھوں نے فرمایا: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا تو میں کیوں بناؤں؟ اگر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے تو انھیں میرے بعد بھی خیر پر اکٹھا رکھے گا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انھیں خیر پر جمع کیا تھا۔'' [1]

❁ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کوئی مجھے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت نہ دے ورنہ میں اس پر تہمت کی حد لگاؤں گا۔'' [2]

❁ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ہم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا اہل پایا۔''

ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہما کے مابین قابل رشک خوشگوار تعلق

❁ عقبہ بن الحارث سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند دن بعد عصر کی نماز کے اختتام پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ باہر نکلا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پہلو میں چل رہے تھے، سامنے حسن بن علی رضی اللہ عنہما بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ کو کندھے پر اٹھا لیا۔ اور کہنے لگے: یہ برخوردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ ہے، علی رضی اللہ عنہ کے مشابہ نہیں ہے۔ راوی کہتے ہیں: یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہنس پڑے۔ [3]

❁ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا: جس نے ایک بالشت کے برابر بھی جماعت سے علیحدگی اختیار کی، اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے اتار دی۔'' اس حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کردار بہت روشن ہے وہ اختلاف کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اجتماعیت کے بے حد دلدادہ تھے۔ امام قرطبی کہتے ہیں: جو شخص بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والے اختلاف اور پھر اتفاق پر غور کرے گا وہ خوب جان لے گا کہ وہ

[1] المستدرك للحاكم: 79/3، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] فضائل الصحابة لإمام أحمد: 83/1، اس کی سند ضعیف ہے۔ [3] مسند أحمد: 170/1، مع تحقیق احمد شاکر، اس کی سند صحیح ہے۔

ایک دوسرے کی فضیلت کے معترف تھے ان کے دل باہمی احترام اور محبت سے لبریز تھے، اگرچہ بشری تقاضے بعض اوقات انسان پر غالب آ جاتے ہیں لیکن دین داری کا صحیح جذبہ ان باتوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اور توفیق اللہ کی جانب سے ہے۔[1]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ابوبکر کی بیعت کرنے میں تاخیر کے حوالہ سے جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ ایسی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نفی کرتی ہیں۔ ان کا بیعت کرنا تو اولین مراحل ہی میں ثابت ہے۔ یہ بات حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث میں گزر چکی ہے۔[2]

❁ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تواتر سے ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''اس امت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور پھر عمر رضی اللہ عنہ۔'' بہت سی مختلف اسناد کے ساتھ یہی حدیث ان سے روایت کی گئی ہے۔ ایک قول کے مطابق ان کی تعداد 80 کے لگ بھگ ہے۔ انھی سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ''جو شخص مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ پر فضیلت دے اگر اسے میرے پاس لایا گیا تو میں اس پر تہمت کی حد نافذ کروں گا۔'' انھوں نے یہ بھی فرمایا: ''میرے بارے میں کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ خلافت کا حق دار ہوں۔ نہ کسی نے کسی اور کے بارے میں کہا کہ فلاں، ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ خلافت کا حق دار ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ ولایت و خلافت کے زیادہ حق دار ہیں اس میں یا تو عربی جاہلیت ہے یا فارسی جاہلیت کیونکہ عرب اپنی جاہلیت کے دور میں اپنے ہی روساء کو مقدم رکھتے تھے اور اہل فارس اپنے بادشاہ کے اہل خانہ کو۔''[3]

---

[1] المصنف لابن أبي شيبة: 24/15، ابو طاق الازدی سے مرسل حدیث منقول ہے، وہ صدوق راوی ہے۔ اس کی سند کے راوی قابل اعتماد ہیں، وخلافة أبي بكر الصديق لعبدالعزيز سليمان، ص: 80.

[2] خلافة أبي بكر الصديق لعبدالعزيز سليمان، ص: 81. [3] منهاج السنة لابن تيمية: 162/3.

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مکارم پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی گواہی

یحییٰ بن حکیم بن سعد سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرما رہے تھے: ''اللہ کی قسم! ابوبکر رضی اللہ عنہ کا لقب، صدیق آسمان سے نازل ہوا۔''[1] اور صلہ بن زفر العبسی سے روایت ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روبرو جب بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوتا تو وہ فرماتے تھے: ''تم مسابقت کی بات کرتے ہو، اس اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ہم نے جب بھی خیر و بھلائی کے کسی کام میں مقابلہ کرنا چاہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم پر سبقت لے گئے۔''[2]
محمد بن عقیل بن ابی طالب سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہم سے خطاب کیا اور فرمایا: ''اے لوگو! سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟'' ہم نے کہا: ''اے امیر المومنین! آپ ہیں...... انھوں نے فرمایا: ''نہیں۔ ابوبکر صدیق سب سے زیادہ بہادر تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھپر جیسی جگہ بنائی، ہم نے کہا یہاں کون چوکیداری کے لیے تیار ہے تاکہ مشرکین میں سے کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نہ پھٹکنے پائے، یہ ذمہ داری صرف ابوبکر نے قبول کی، انھوں نے تلوار سونت لی اور چوکس کھڑے رہے تاکہ جوں ہی دشمن کا کوئی آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئے، وہ اس پر ٹوٹ پڑیں۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ کعبہ کے قریب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ بدبخت آپ کو زدوکوب کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے: اچھا تم ہو جو تمام معبودوں کو چھوڑ کر ایک معبود کی بات کرتے ہو۔ وہاں صرف ابوبکر ہی تھے جو آگے بڑھے اور مشرکین کے جتھے میں گھس گئے، انھوں نے اپنے بالوں کی دو لٹیں بنائی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کو مکا مار رہے تھے کسی کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے تمھارا برا ہو اور ہلاکت تمھارا مقدر بنے، تم اس انسان کو قتل کرنا چاہتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور

[1] المعجم الكبير للطبراني: 55/1. امام ابن حجر نے فتح الباری میں اس کے راویوں کو ثقہ بتایا ہے۔
[2] الطبراني في الأوسط: 208,207/7 اس کی سند کمزور ہے۔

تمھارے رب کی جانب سے تمھارے پاس واضح دلائل آچکے ہیں۔ اس دن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بالوں کی ایک لٹ کٹ گئی تھی۔ یہ واقعہ سنا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''میں تمھیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ ایک طرف آل فرعون کا مومن اور دوسری طرف ابوبکر رضی اللہ عنہ! بتاؤ ان دونوں میں سے کون افضل ہے''؟ لوگ خاموش رہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! ابوبکر رضی اللہ عنہ کا صرف ایک دن ہی آل فرعون کے مومن سے بہتر اور افضل ہے، آل فرعون کا مومن اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس پر اللہ نے اس کی تعریف بھی فرمائی لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا سب کچھ اپنی جان اور اپنا مال اللہ کی راہ میں پیش کر دیا۔'' [1]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں ادائے نماز

حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نہ صرف راضی تھے بلکہ ان کے ساتھ تمام معاملات اور فیصلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کی طرف سے ملنے والے تحائف قبول فرماتے تھے، ان کے پاس شکایات لے کر جاتے تھے، ان کی اقتدا میں نمازیں ادا کرتے تھے، ان سے محبت کرتے تھے اور ان سے بغض رکھنے والوں کے ساتھ بغض رکھتے تھے۔ [2] خلفائے راشدین، دیگر صحابۂ کرام، ان کے منہج پر چلنے والے تابعین عظام کے سخت مخالفین نے بھی اس بات کی گواہی دی ہے۔

غالی شیعہ، الیعقوبی اپنی ''تاریخ'' میں خلافت صدیق کے دور کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رومیوں کے خلاف جنگ کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو انھوں نے کچھ تامل کیا۔ جب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا تو انھوں نے مثبت

[1] المستدرك للحاكم: 67/3، امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح حدیث ہے، ذہبی نے بھی موافقت کی ہے۔ [2] الشيعة وأهل البيت للشيخ إحسان إلهي ظهير، ص: 69.

جواب دیا اور کہا کہ ان شاء اللہ آپ اس جنگ میں کامیاب ہوں گے۔ یہ سن کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ نے تو بھلائی کی بشارت دے دی ہے۔''

پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے خطاب کیا اور انھیں روم کی طرف جانے کی تیاری کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم پڑا کہ فتح و کامیابی ہمارا مقدر ہوگی؟ تو انھوں نے فرمایا: ''مجھے یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے معلوم ہوئی ہے کیونکہ میں نے انھیں یہ بشارت دیتے ہوئے سنا تھا۔'' یہ سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے ابوالحسن! آپ نے یہ بات سنا کر مجھے خوش کر دیا ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔'' یعقوبی کا یہ بھی کہنا ہے: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جن لوگوں کے اسلامی تفقہ سے استفادہ کیا جاتا تھا ان میں سیدنا علی، عمر، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم شامل تھے۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے تمام احکام کی تعمیل فرماتے تھے۔ کفار کا ایک وفد مدینہ میں آیا تو انھوں نے دیکھا کہ مسلمان کمزور اور تعداد میں بہت کم نظر آرہے ہیں۔ دراصل اس وقت بہت سے مسلمان جہاد کے لیے مختلف مقامات کی طرف گئے ہوئے تھے اور مرتدوں اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے برسرِ پیکار ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام اور مسلمانوں کے دارالخلافہ کو لاحق خطرے کو بھانپ لیا اور مدینہ کی حفاظت کے لیے محافظین مقرر کیے اور انھیں ہر طرف کان لگائے رکھنے اور لشکروں کے ساتھ رات بسر کرنے کا حکم دیا اور علی رضی اللہ عنہ، زبیر، طلحہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کو تاکید فرمائی کہ وہ ان محافظوں کی قیادت کریں۔ کچھ روز تک معاملہ اسی طرح چلتا رہا، پھر ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ کسی قسم کا کوئی خوف باقی نہ رہا۔ ان دونوں عالی قدر بزرگوں کے مابین معاملہ فہمی، محبت اور شیفتگی کا تعلق بڑا مضبوط اور مفاہمت کامل درجے کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سید اہل بیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] تاريخ اليعقوبي: 2/132,133 بحوالہ الشيعة وأهل البيت للشيخ إحسان الٰهی ظهير، ص: 69.

کے نواسوں کے والد تھے، وہ اخوت و محبت کی بنیاد پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھیجے ہوئے تحفے قبول کرتے تھے۔ انھوں نے صہباء نامی لونڈی کو قبول کر لیا تھا جو عین التمر کے معرکے میں بحیثیت قیدی لائی گئی تھی۔ اس کے بطن سے ان کا ایک بیٹا عمر اور ایک بیٹی رقیہ پیدا ہوئی۔ اسی طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انھیں خولہ بنت جعفر بن قیس نامی لونڈی عطا کی جو جنگ یمامہ میں مرتدین کے ہاں سے دیگر قیدیوں کے ساتھ لائی گئی تھی۔ حسنین رضی اللہ عنہما کے بعد افضل اولاد اسی کے بطن سے ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ خولہ ہی کے بطن سے تھے۔ [1]

امام جوینی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بارے میں کہتے ہیں: ''ان سب حضرات نے اول تا آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے ہر حکم کو توجہ سے سنتے تھے اور اس کی تعمیل فرماتے تھے۔ انھوں نے صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور حکم ملنے پر بنی حنیفہ پر فوراً حملہ کر دیا۔'' [2]

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مالی تحائف، خمس اور اموال فے بخوشی قبول کیے۔ بلکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مبارک دور میں تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ خمس اور مال فے کے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ یہ تمام اموال انھی کے ہاتھ میں تھے۔ وہی ان کی تقسیم اور حساب کتاب کے ذمہ دار تھے۔ ان کے بعد یہ نظام حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور بعد ازاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سونپا گیا، پھر حسن بن حسین اور پھر زید بن حسن تک یہ ذمہ داری منتقل ہوتی رہی۔ [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ پانچوں نمازیں مسجد میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی امامت میں ادا کرتے تھے۔ ان کی قیادت پر پورا اعتماد رکھتے تھے اور لوگوں کے سامنے اس ایمان افروز

[1] الطبقات لابن سعد: 20/3، والبداية والنهاية: 7/331-333. [2] الإرشاد للجويني، ص: 428 بحواله أصول مذهب الشيعة الإمامية الإثني عشرية للقفاري: 85/1. [3] الشيعة وأهل البيت لإحسان إلٰهي ظهير، ص: 72.

اتفاق واتحاد کو ظاہر بھی فرماتے تھے۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کچھ احادیث بھی روایت کی ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابۂ کرام کے مابین اختلاف ہوا، بعض نے کہا کہ انھیں مدینہ کے قبرستان بقیع الغرقد میں دفن کریں۔ بعض صحابہ نے کہا کہ تدفین جنازہ ہی کے مقام پر ہونی چاہیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ٹھہر جاؤ! اللہ کے نبی زندہ ہوں یا فوت شدہ حالت میں ہوں ان کے پاس بہرحال بلند آواز سے بولنا ہرگز مناسب نہیں۔'' یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو بات کہی وہ لائق تصدیق ہے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ نبی جس جگہ پر فوت ہوتے ہیں وہیں دفن کیے جاتے ہیں۔''[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے اس اقدام پر عظیم اجر کی گواہی بھی دی کہ انھوں نے قرآن مجید جمع کرنے کا اہتمام کیا۔ عبد خیر سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرما رہے تھے: مصاحف کے حوالہ سے عظیم ترین اجر کے حامل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے قرآن پاک کو ایک جلد میں جمع کیا۔[3]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور میراث نبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور عباس رضی اللہ عنہ دونوں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنا حق وراثت طلب کر رہے تھے، انھوں نے فدک کی زمین اور خیبر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ مانگا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

---

[1] الشيعة وأهل البيت للشيخ إحسان إلٰهي ظهير، ص: 72. [2] مسند أحمد: 8/1. احمد شاکر نے اس کی سند کو ضعیف اور ابن حجر نے فتح الباری (631/1) میں سند کو صحیح کہا ہے۔ [3] المختصر من كتاب الموافقة للزمخشري، ص: 44.

«لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ، إِنَّمَا يَأْكُلُ آلُ مُحَمَّدٍ مِنْ هٰذَا الْمَالِ»

''ہمارا ورثہ تقسیم نہیں ہوتا، ہم نے جو ترکہ چھوڑا ہے وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے۔ افادۂ عام کے اسی اثاثے سے آل محمد ﷺ بھی کھائے گی۔''[1]

ایک اور روایت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں ایسی کوئی چیز چھوڑنے کے لیے ہرگز تیار نہیں جس پر رسول اللہ ﷺ عمل فرماتے تھے۔ میں بھی اس پر لازماً عمل کروں گا کیونکہ اگر میں نے آپ ﷺ کے طریقے میں سے ادنیٰ سا حصہ بھی ترک کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ میں راہِ راست سے بھٹک جاؤں گا۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو ان کی ازواج مطہرات نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ ان سے نبی اکرم ﷺ کے ترکے سے اپنا حق وراثت طلب کریں، اسی دوران میں نے ان سے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا: ''ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں ہے۔ ہم جو ترکہ چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔''[2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے وارث آپس میں دینار تقسیم نہیں کریں گے۔ میں اپنی ازواج کے نان ونفقے اور اپنے عامل کے خرچے کے بعد جو کچھ چھوڑ جاؤں وہ صدقہ ہے۔''[3]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا۔ اسی لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جس طرح جو عمل سرانجام دے رہے تھے، میں بھی ٹھیک اسی طرح کروں گا اور اسے ہرگز ترک نہیں کروں گا۔[4] پھر فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے رسول اللہ ﷺ کو جو کچھ کرتے ہوئے

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 6726. [2] صحيح مسلم، حديث: 1759. [3] صحيح البخاري، حديث: 2776. [4] صحيح مسلم، حديث: 1758.

دیکھا ہے میں وہی کروں گا۔“ [1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب مذکورہ حدیث بطور دلیل پیش کی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس معاملے سے دستبردار ہوگئیں۔ اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو حق سمجھتے ہوئے بسروچشم قبول کرلیا۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے حوالے سے حضرت فاطمہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جو مطالبہ تھا اس سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جواب کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی شکایت نہیں رہی۔ کیونکہ وہ میراث کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آگاہ نہیں تھیں۔ انھیں محض یہ خیال ہوا کہ جس طرح ہر اولاد اپنے والدین کی وارث ہوتی ہے اسی طرح وہ بھی ہوں گی لیکن جب انھیں اصل حقیقت معلوم ہوگئی تو انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ تسلیم کرلیا۔ [2]

رافضیوں نے میراث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حق اور سچ سے روگردانی اختیار کی ہے اور بے حد غلو سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اس بارے میں وارد صحیح نصوص سے تجاہل عارفانہ کا رویہ اختیار کیا ہے اور ان باتوں کو اہل بیت اور صحابہ کرام کے درمیان اختلاف کی بنیاد تصور کرتے ہوئے انھیں امر خلافت تک کھینچ لاتے ہیں۔ انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ تہمت لگائی کہ انھوں نے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وستم ڈھائے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر خاص طور پر الزام لگایا ہے کہ ان دونوں نے اہل بیت سے خلافت چھینی ہے اور اس الزام پر مزید اضافہ یہ کیا کہ انھوں نے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی املاک اور ان کے مالی حقوق بھی غصب کیے۔ رافضی بزعم خویش فدک کے مسئلے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کی وراثت سے محروم کرنے کے معاملے کو ان اہم ترین مسائل میں شمار کرتے ہیں جن پر بقول ان کے صحابہ کرام صدیق اکبر کے خلافت پر (نعوذ باللہ) غاصبانہ قبضہ کے بعد متفق ہوگئے تھے۔ تاکہ ان کے خیال کے مطابق عام لوگ ان اموال کے سبب اہل بیت کی طرف مائل ہی

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 6726. [2] تأويل مختلف الحديث لابن قتيبة، ص: 19.

نہ ہوں اور اس طرح وہ ان کے ساتھ یکجا ہو کر کہیں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت سے بے دخل نہ کر دیں۔[1]

اس مسئلہ میں کتب رافضیہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے انکاری ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو ترکہ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔''[2]

روافض کے دعووں کا جواب

روافض کا یہ دعویٰ کہ مذکورہ حدیث ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی من گھڑت ہے، اس بارے میں الحلی کہتا ہے: ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث «مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ» کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے قبول نہیں کیا کیونکہ یہ من گھڑت ہے۔ مزید برآں ابوبکر رضی اللہ عنہ اس حدیث کی روایت میں منفرد ہیں۔[3] المجلسی نے لکھا ہے کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے فدک کا مال خود لے لیا تھا، اسی لیے انھوں نے «نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ» والی روایت (نعوذ باللہ) خود وضع کر کے بیان کر دی۔[4] خمینی کہتا ہے: ''ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی (نعوذ باللہ) بیخ کنی کے لیے یہ حدیث وضع کی گئی ہے۔''

علمائے حق نے اس دعویٰ کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ ساری باتیں یکسر جھوٹ اور افترا پردازی ہیں کیونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس روایت کو بیان کرنے میں منفرد نہیں ہیں بلکہ سیدنا عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، عبدالرحمٰن بن عوف، عباس بن عبدالمطلب، ازواج مطہرات، ابوہریرہ اور حذیفہ بن الیمان رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس حدیث نبوی کو روایت کیا ہے۔[5]

---

[1] العقيدة فى أهل البيت للدكتور سليمان بن سالم، ص:435. [2] صحيح مسلم، حديث: 1758.
[3] منهاج الكرامة للحلي: 4/193. [4] حق اليقين للحلي، ص: 191، بحواله العقيدة في أهل البيت للدكتور سليمان بن سالم السحيمى، ص:443. [5] العقيدة في أهل البيت، ص:444.

اس بارے میں امام ابن تیمیہ کہتے ہیں: مذکورہ تمام صحابہ سے یہ روایت صحاح اور مسانید کی کتابوں سے ثابت ہے اور محدثین اہل علم کے ہاں بہت مشہور ہے۔ کسی قائل کا یہ کہنا: ابوبکر اس روایت کے منفرد راوی ہیں، انتہائی جہالت پر مبنی ہے اور جان بوجھ کر جھوٹ بولنے پر دلالت کرتا ہے۔[1] امام ابن کثیر نے حدیث کے تمام راویوں کا حوالہ دے کر فرمایا ہے کہ اس حوالے سے رافضیوں کا دعویٰ سفید جھوٹ ہے۔ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس روایت کے منفرد راوی ہوتے تب بھی تمام اہل زمین پر ان کی روایت قبول کرنا اور اسے تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔[2]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خوش تھیں

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ بعد ازاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے راضی ہوگئی تھیں اور بوقت وفات بھی وہ ان سے راضی تھیں۔ امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ شعبی سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بیمار ہوئیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے گھر تشریف لائے اور ان سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''فاطمہ! ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں اور اندر آنے کی اجازت مانگ رہے ہیں انھوں نے اپنے شوہر عالی قدر سے پوچھا: ''کیا آپ کو پسند ہے کہ میں انھیں اجازت دے دوں۔'' انھوں نے فرمایا: ''جی ہاں! بالکل پسند ہے۔'' چنانچہ انھوں نے اجازت دے دی۔ اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے۔ ان کی رضا جوئی چاہی اور فرمایا: ''میں نے ہجرت کی۔ گھر بار اور مال و دولت اہل و عیال اور خاندان کو چھوڑا یہ سب کچھ میں نے صرف اللہ کی خوشنودی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور آپ جیسے مقدس اہل بیت کی خوشنودی کے لیے چھوڑا۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو راضی کرتے رہے حتی کہ وہ راضی ہوگئیں اور سیدنا

[1] منهاج السنة لابن تيمية: 199/4. [2] البداية والنهاية: 250/5.

ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نہایت احترام سے کہا: ہم آپ کے حسنِ سلوک سے راضی اور خوش ہیں۔ [1]

اس سے رافضیوں کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف عیب جوئی کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا شروع میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوئی بھی تھیں تو بعد میں انھیں کوئی گلہ نہ رہا اور اپنی خوشنودی ظاہر فرما دی۔ اور بوقت وفات بھی وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے راضی تھیں۔ جو بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اپنی عقیدت و محبت میں سچا ہے اسے لازماً اس شخصیت سے بھی راضی ہو جانا چاہیے جس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی خوشنودی ظاہر کر دی تھی۔ [2]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے باہمی احترام، مضبوط تعلق اور گہری ہمدردی کی سب سے وزنی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ہی مرضِ وفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے آخری سانس تک ان کے ساتھ رہیں، ان کے غسل اور تجہیز و تکفین میں شریک رہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ خود شام و سحر ان کی تیمارداری میں لگے رہے۔ اور اسماء بنت عمیس اس سلسلے میں ان کی مدد کرتی رہیں۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی تجہیز و تکفین کے حوالے سے اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو کچھ وصیتیں فرمائیں، جن پر حضرت اسماء نے پورا پورا عمل کیا۔ [3] سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے کہا: مجھے عورتوں کے ساتھ یہ برتاؤ برا لگتا ہے کہ عورت پر ایک کپڑا ڈال دیا جاتا ہے جو عورت کی نشان دہی کرتا ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا: اے دخترِ رسول! کیا میں آپ کو ایسی چیز نہ دکھاؤں جو میں نے حبشہ میں دیکھی تھی، پھر انھوں نے کھجور کی تازہ ٹہنی لی اور اسے کمان کی طرح بنا دیا، پھر اس پر کپڑا ڈال دیا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

---

[1] السنن الکبری للبیهقی: 301/6، امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کو مرسل بیان کیا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند جید اور قوی ہے بظاہر لگتا ہے کہ عامر الشعبی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یا اس شخص سے روایت کیا جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ [2] البدایة والنهایة: 253/5، والانتصار للصحب والآل للدکتور إبراهیم الرحیلي، ص: 434. [3] الشیعة وأهل البیت للأستاذ إحسان إلٰهي ظهیر، ص: 77.

یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ اس کے ذریعے عورت کی میت مرد کی میت سے پہچانی جاسکتی ہے۔[1]

ابن عبدالبر سے مروی ہے: سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا وہ پہلی شخصیت ہیں جن کی میت کو اسلام میں پہلی مرتبہ ایک خاص طریقے سے ڈھانپا گیا۔ بعدازاں سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی رحلت پر بھی ایسا ہی انتظام کیا گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے اور ان سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے حالات معلوم کر رہے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مریضہ تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں پانچوں نمازیں ادا کر رہے تھے۔ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ان سے مسجد ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کی خیریت معلوم کرتے تھے۔ اور دوسری طرف ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ اسماء بنت عمیس سے بھی سیدہ فاطمہ کی صحت کا حال معلوم کرتے تھے کیونکہ وہی تھیں جو سیدہ کی نگرانی کر رہی تھیں اور تیمارداری پر مامور تھیں۔ جس دن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رحلت فرما گئیں، اس دن لوگ اسی طرح رنج وغم میں ڈوب گئے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر شدید صدمے کا شکار ہوئے تھے۔ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تعزیت کے لیے آئے۔ انھوں نے کہا: ''اے ابوالحسن! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے جنازے میں جلدی نہ کیجیے گا تاکہ ہمیں شرکت کی سعادت نصیب ہوجائے۔''[2]

ان کی وفات تین رمضان سن گیارہ ہجری کو منگل کی رات ہوئی۔

علی بن الحسین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات مغرب اور عشاء کے درمیان ہوئی۔ جنازہ میں ابوبکر، عمر، عثمان، زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم سبھی شریک ہوئے۔ جب ادائے نماز کے لیے ان کا جنازہ رکھا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ! آگے بڑھیے'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ابوالحسن! آپ کی موجودگی میں؟'' حضرت

---

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر: 4/378. [2] الشیعة وأهل البیت للأستاذ إحسان إلٰهي ظهير، ص: 77، وكتاب سليم بن قيس، ص: 255.

علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! ان کی نماز جنازہ صرف آپ ہی پڑھائیں گے۔ کوئی اور ان کا جنازہ نہیں پڑھائے گا۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ انھیں رات کے وقت دفن کر دیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ پڑھائی تو چار تکبیریں پڑھیں۔[1] صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ ان کی نماز جنازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود پڑھائی۔ یہی روایت راجح ہے۔[2]

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے قابل رشک تعلقات

خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اہل بیت کے افراد کے ساتھ مخلصانہ، محبت بھرا اور قدر افزائی کا ایسا تعلق تھا جو ان کے شایانِ شان تھا۔ محبت اور اعتماد کا یہ رشتہ دو طرفہ تھا۔ یہ اتنا مضبوط تھا کہ اس میں تھوڑی سی بھی دوری یا اختلاف نہیں تھا۔ اگرچہ قصے کہانیاں گھڑنے والوں نے اپنے طور پر تانے بانے بننے کی بہت کوشش کی مگر منہ کی کھائی۔ حضرت عائشہ بنت الصدیق رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ وہ طاہرہ اور مطہرہ تھیں۔ منکرین چاہے کتنا ہی انکار کریں، قرآن سیدہ عائشہ کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ اسماء بنت عمیس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی جعفر بن ابی طالب کی زوجہ تھیں، وہ شہید ہو گئے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کی، ان سے ایک بیٹا ہوا، اس کا نام محمد رکھا گیا۔ وہ مصر کے گورنر مقرر ہوئے جب ابوبکر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسماء سے شادی کی ان سے ایک بیٹا ہوا، اس کا نام یحییٰ رکھا گیا۔[3]

---

[1] المختصر من كتاب الموافقة للزمخشري، ص: 68. اس کی سند ضعیف ہے۔ [2] صحيح مسلم، حديث: 1759. [3] خلافة علي بن أبي طالب، و ترتيب و تهذيب البداية والنهاية للسلمي، ص: 22.

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پوتی کا نکاح محمد الباقر سے ہوا۔ وہ روافض کے ہاں پانچویں امام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں۔ الاستاذ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے خود روافض کی کتابوں سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ بیتِ نبوت اور بیت صدیق کے درمیان رشتہ داری کا بڑا قریبی اور مضبوط تعلق تھا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم بن محمد بن ابی بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب، دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ قاسم بن محمد کی ماں اور علی بن الحسین کی ماں دونوں یزد گرد بن شہریار بن کسریٰ کی بیٹیاں ہیں۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایران سے گرفتار شدہ خواتین کے ساتھ آئی تھیں۔ الشیخ احسان الٰہی ظہیر نے اہل بیت اور بیت الصدیق کے درمیان محبت ومودت کے تعلقات اور باہمی احترام کے جذبات واحساسات کو بڑے مدلل انداز میں کھول کر بیان کیا ہے۔[1]

ان دونوں خاندانوں کی باہمی محبت وشیفتگی کا یہ حال تھا کہ اہل بیت نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت کی بنا پر اپنے بیٹوں کے نام ابوبکر رکھے۔ ان میں سرفہرست حضرت علی بن ابی طالب ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رکھا۔ یہ عمل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے محبت واخوت اور قدر شناسی کے جذبات کی بڑی بھاری دلیل ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس بیٹے کی ولادت حضرت ابوبکر کے خلافت وامامت پر متمکن ہونے کے بعد ہوئی بلکہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی جیسا کہ عیاں ہے۔ کیا آج شیعہ صاحبان میں وہ لوگ جو علی رضی اللہ عنہ اور اولاد علی رضی اللہ عنہ سے محبت کے دعویدار ہیں اپنے بچوں کا یہ مبارک نام رکھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں رکھتے تو اس صورت میں وہ اہل بیت سے محبت کرنے والے ہیں یا ان کے مخالف ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے کا یہ نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اظہار محبت کے لیے رکھا، نیز ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان سے وفاداری کی علامت کے لیے رکھا۔

[1] الشیعة وأهل البیت، ص: 78-83.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے بنو ہاشم میں کوئی ایسا فرد موجود نہیں جس نے اپنے بیٹے کا نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا ہو، پھر یہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی پر موقوف نہ رہا کہ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت و یگانگت کا ثبوت دیا ہو بلکہ ان کے بعد ان کے مایۂ ناز صاحبزادے بھی اسی راہ پر چلے۔ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما دونوں نے اپنے ایک ایک بیٹے کا نام ابوبکر رکھا۔ یہ بات یعقوبی اور مسعودی نے بڑی وضاحت سے لکھی ہے اور یہ دونوں روافض کے مؤرخین میں شمار ہوتے ہیں۔ [1]

اہل بیت نے نسل در نسل اپنے بیٹوں کا نام ابوبکر رکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت علی کے بھتیجے عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رکھا۔ یہ ان دونوں خاندانوں کے درمیان محبت ومودّت کی بہت بڑی پہچان ہے۔ کیا یہ بات روافض کے ان دعووں کی کھلی تردید نہیں کرتی کہ ان دونوں خاندانوں میں باہم شدید ناراضی اور دائمی لڑائی تھی۔ [2]

جعفر بن محمد بن علی بن الحسین روافض شیعہ کے ہاں ''صادق'' کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ''میں دو اعتبار سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیٹا ہوں۔ [3] ایک یہ کہ میری ماں ام فروہ مدینہ کے سات فقہاء میں سے ایک شخصیت قاسم بن محمد بن ابی بکر کی بیٹی ہیں اور قاسم، ام المومنین عائشہ کی گود میں پلے بڑھے۔ اور دوسرا اس اعتبار سے کہ میری والدہ ام فروہ کی والدہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی بیٹی ہیں۔

سیدنا جعفر صادق اس وقت روافض سے بہت ناراض ہوتے تھے جب انھیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کے نانا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عزت کے درپے ہیں۔ چنانچہ جو شخص بھی حضرت جعفر اور اہل بیت کی محبت کا دعویدار ہے، وہ سیدنا جعفر کے عظیم نانا کو لعن طعن کرنے پر کیسے راضی ہوسکتا ہے؟

---

[1] تاریخ الیعقوبی: 228/2، و النتیجة والأشراف، ص: 82. [2] الشیعة وأهل البیت، ص: 83، والدرالمنثور من تراث أهل البیت والصحابة للسید علاء الدین المدرسی، ص: 38-44. ورحماء بینهم للصالح بن عبداللّٰه الدرویش. [3] سیر أعلام النبلاء: 254/6.

عروہ بن عبداللہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے ابوجعفر محمد بن علی سے تلواروں کو مزین اور آراستہ کرنے کے بارے میں پوچھا، انھوں نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی تلوار کو آراستہ کیا تھا۔ راوی کہتے ہیں: میں نے کہا کہ آپ انھیں الصدیق کہتے ہیں، یہ سن کر وہ اچھل پڑے اور قبلہ رو ہو کر تکرار کے ساتھ کہا: جی ہاں، الصدیق رضی اللہ عنہ! جی ہاں، الصدیق رضی اللہ عنہ! جی ہاں، الصدیق! جو انھیں الصدیق نہیں مانتا، اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں کبھی سچائی کی توفیق نہ دے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی میت پر

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان برگزیدہ شخصیتوں میں سے ایک تھے جن سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت پر کسی موزوں فرد کو فائز کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلافت پر متمکن ہوں۔[2] جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس دنیا سے کوچ کا وقت آیا اور انھوں نے فرشتہ اجل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وہ آخری الفاظ جو ان کی زبان سے ادا ہوئے قرآن حکیم کے یہ الفاظ تھے:

﴿ تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾

"(یا اللہ) میرا خاتمہ اسلام پر کر دے اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا دے۔"[3]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر مدینہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ نے کوئی ایسا سوگوار دن نہیں دیکھا اور رونے والوں اور رونے والیوں نے کوئی ایسی غم زدہ شام نہیں دیکھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی جلدی جلدی چلتے، روتے ہوئے اور إنا للهِ و إنا إليه راجعون پڑھتے ہوئے آ رہے تھے حتیٰ کہ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جسد مبارک کے

[1] صفة الصفوة: 2/109-110، ومختصر الإثنى عشرية، ص: 34. [2] الكامل لابن الأثير: 2/79، والمختصر من كتاب الموافقة للزمخشري، ص: 70-100. [3] يوسف 12:101.

سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: اے ابوبکر! اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی الفت و محبت کا پیکر تھے۔ ان کے رازدان، مشیر اور بااعتماد ساتھی تھے، لوگوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے تھے، یقین و اخلاص سے سرشار تھے، انتہائی تقویٰ اور اللہ کا خوف رکھنے والے تھے، اللہ کے راستے میں بے دریغ مال لٹانے والے تھے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ انتہائی محتاط رویہ رکھنے والے اور آپ ﷺ کی بہترین مصاحبت اختیار کرنے والے تھے، فضیلت و منقبت میں سب سے بڑھ کر تھے، درجے میں بہت بلند تھے اور رسول اللہ ﷺ کے طریق زندگی اور سیرت سے بہت مشابہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی اس وقت تصدیق کی جب لوگ ان کی تکذیب کر رہے تھے، آپ ان کی آنکھ اور کان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں صدیق کے لقب سے نوازا اور فرمایا:

﴿ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ ﴾

"اور جو سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی (عذاب سے) بچنے والے ہیں۔"[1]

جب لوگوں نے بخل کیا، آپ نے نبی کریم ﷺ کی مدد کی، مشکل حالات میں جب لوگ بیٹھ گئے آپ نبی ﷺ کے ساتھ قدم ملا کر کھڑے رہے، کٹھن حالات میں آپ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا، آپ ثانی اثنین ہیں، یعنی غار میں آپ ﷺ کے ساتھی ہیں، آپ ان کے لیے باعث سکینت تھے، ہجرت میں ان کے رفیق تھے، اللہ کے دین کی سرفرازی کے لیے آپ ﷺ کے خلیفہ تھے۔ مرتدین کے خلاف ڈٹ کر جہاد کرنے والے تھے۔ آپ نے وہ وہ کام انجام دیے جو کسی نبی کے خلیفہ نے انجام نہیں دیے، جب لوگوں نے کمزوری دکھائی تو آپ مردِ میدان ثابت ہوئے اور قوت کا مظاہرہ کیا۔ آپ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے منہج پر قائم رہے، آپ کے

[1] الزمر 39:33.

بارے میں جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آپ ویسے ہی تھے، آپ جسم و جان کے اعتبار سے کمزور تھے مگر اللہ کے معاملے میں قوی تھے۔ اپنی نظر میں متواضع مگر اللہ کی نظر میں عظیم تھے، لوگوں کی نظر میں بزرگ اور ان کے دل میں عالی مقام تھے، آپ کی کوئی عیب جوئی کرنے والا تھا نہ کوئی طعن و تشنیع کرنے والا تھا۔ کوئی آپ کی نرمی سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا، ضعیف آپ کی نظر میں قوی تھا جب تک آپ اس کا حق نہ دلا دیتے تھے، دور اور نزدیک کے سب لوگ آپ کی نظر میں برابر تھے، جو اللہ کا جتنا زیادہ فرمانبردار اور متقی ہوتا تھا وہی آپ کا مقرب ہوتا تھا، آپ کی شان سچائی اور نرم خوئی تھی، آپ کی بات فیصلہ کن ہوتی تھی، آپ کا حکم بردباری اور دانائی پر مبنی ہوتا تھا، آپ کی رائے علم واستقامت پر قائم ہوتی تھی، آپ کے باعث دین میں اعتدال پسندی آئی، آپ کی وجہ سے ایمان میں قوت پیدا ہوئی اور اللہ کے دین کو غلبہ ملا۔ اللہ کی قسم! آپ ہم سے سبقت لے گئے اور بعد والوں کو مشقتوں اور مصیبتوں کا شکار کر گئے اور خود خیر و بھلائی کے ساتھ کامیاب ہوگئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

ہم اللہ کی طرف سے اس کی قضاء وقدر پر راضی ہیں۔ ہم نے اپنا معاملہ اسی کے سپرد کر دیا ہے۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آج جیسی مصیبت مسلمانوں پر کبھی نہیں آئے گی۔ آپ دین کے لیے باعث عزت و حفاظت تھے، آپ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پیارے ہوگئے، اللہ ہمیں آپ کے اجر سے محروم نہ کرے اور آپ کے بعد ہمیں گمراہی سے بچائے!

اس دوران تمام لوگ خاموش رہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بات مکمل کر لی تو تمام حاضرین بہت روئے حتی کہ ان کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ انھوں نے بلند آواز سے کہا: اے علی! آپ نے جو کہا سچ کہا۔[1]

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کفن سے ڈھانپ دیا گیا تو علی میت کے پاس آئے اور کہا: ان سے زیادہ کوئی مجھے محبوب نہیں۔ میری تمنا ہے کہ جب میری اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہو تو میرا صحیفۂ اعمال ان جیسا ہو۔[2]

[1] التبصرة لابن الجوزی: 1/477-479. [2] تاریخ الإسلام، عهد الخلفاء الراشدین، ص: 120.

حضرت علی رضی اللہ عنہ عہد فاروقی میں

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مجلس شوریٰ کے بڑے ممتاز رکن تھے بلکہ مشیر اعلیٰ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت، تفقہ اور دانائی کے معترف تھے۔ ان کے بارے میں ان کی رائے بہت اچھی تھی۔ یہ بات ان کے اس قول سے ثابت ہے کہ «أَقْضَانَا عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ» [1] یعنی ہمارے مابین فیصلہ کرنے کی سب سے اچھی صلاحیت کے حامل علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

مسروق کہتے ہیں: لوگ چھ رجالِ کبار سے علم حاصل کیا کرتے تھے: سیدنا عمر، علی، عبداللہ بن مسعود، ابوموسیٰ اشعری، زید بن ثابت اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم۔ مسروق مزید کہتے ہیں: میں نے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قریب سے دیکھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کا علم ان چھ حضرات پر ختم ہوجاتا ہے: عمر، علی، عبداللہ بن مسعود، ابوالدرداء، ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم، پھر میں ان چھ اصحاب کے قریب ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ان کا علم ان دو ہستیوں پر ختم ہوجاتا ہے: علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما۔ [2]

علی رضی اللہ عنہ ان مقرب شخصیات میں سے تھے جو اپنی صائب رائے دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتے تھے اور ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے ان سے مل کر کوشش کرتے تھے

[1] الاستيعاب في معرفة الأصحاب، ص: 1102، والمعرفة والتاريخ: 481/1. [2] علل الحديث ومعرفة الرجال لعلي بن المديني، ص: 43,42، بحوالہ خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد علي، ص: 70.

جن کے بارے میں نص وارد نہیں ہے۔ وہ جدید اسلامی ریاست کے امور منظّم کرتے تھے۔ اس پر بہت سے شواہد ملتے ہیں، ان میں سے چند امور کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عدالتی امور میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مشورے

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیوانی عورت کو رجم سے بچایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت لائی گئی۔ اس نے بدکاری کا ارتکاب کیا تھا۔ انھوں نے اس کو رجم کرنے کا حکم دیا۔ صحابہ اس کو رجم کرنے کے لیے لے جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ملے۔ انھوں نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ بتایا گیا: اس عورت نے زنا کیا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو رجم کرنے سے روکا اور اسے واپس لے جانے کی تاکید فرمائی۔ وہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: واپس کیوں آ گئے ہو؟ انھوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیں واپس بھیج دیا ہے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ اقدام بلاوجہ نہیں کیا۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ وہ خفگی کے عالم میں آئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا ہوا آپ نے ان لوگوں کو واپس بھیج دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہیں سنی کہ تین قسم کے لوگ مرفوع القلم ہیں۔ ایک نیند کی حالت میں حتی کہ بیدار ہو جائے، دوسرا نابالغ تاآنکہ بالغ ہو جائے اور تیسرا دیوانگی میں مبتلا شخص یہاں تک کہ عقل وشعور کی حالت میں آ جائے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں، میں نے یہ حدیث سنی ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ فلاں قبیلے کی عورت ہے جو دیوانگی اور جنون کا شکار ہے۔ جب اس شخص نے اس سے بدکاری کی ہے شاید یہ اس وقت دیوانگی کے عالم میں مبتلا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یہ بات معلوم نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ بالآخر اسے بری کر دیا گیا۔[1]

[1] الموسوعة الحديثية (مسند أحمد) حديث: 1328، یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے۔
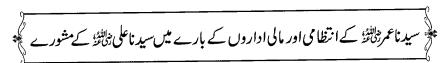
سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے انتظامی اور مالی اداروں کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مشورے

خلیفہ کے اخراجات

❁ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار بنے تو ایک عرصہ تک بیت المال سے کچھ نہیں لیا۔ اس طرح ان کے شب و روز انتہائی عسرت سے گزرنے لگے۔ وہ جو تجارت کرتے تھے اس کا منافع ان کی ضروریات کے لیے کافی نہ تھا کیونکہ وہ رعایا کے مسائل میں مشغول ہو گئے تھے، لہٰذا آپ نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجا، اس بارے میں ان سے مشورہ کیا۔ آپ نے کہا: ''میں ریاست کے امور میں مصروف ہو گیا ہوں۔ اب اگر میں کچھ لوں تو کیا یہ صحیح ہو گا؟'' عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ اپنے اور گھر والوں کے اخراجات بیت المال سے لے سکتے ہیں۔'' حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل نے بھی یہی رائے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' انھوں نے فرمایا: آپ صبح کے کھانے اور شام کے کھانے کے مصارف لے لیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ طریقہ اختیار کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے اپنے حصے کے بارے میں فرمایا: ''میں نے اپنے آپ کو اللہ کے اس مال میں بس یتیم کے سرپرست کی حیثیت دی ہے، یعنی اگر مجھے ضرورت نہ ہو تو بیت المال سے کچھ نہ لوں اور ضرورت پڑے تو معروف طریقے سے کھا لوں۔''[1]

❁ **اراضی کی تقسیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے:** جب سواد کی سرزمین فتح کی گئی تو بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ اسے فاتحین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے لیکن زمین کی وسعت، اس کی زرخیزی اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی دور اندیشی

---

[1] الخلافۃ الراشدۃ للدکتور یحیی، ص: 270.

کے باعث اسے تقسیم کرنے پر مطمئن نہیں تھے، انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو ان کی رائے خلیفہ کی رائے کے مطابق تھی کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی رائے پر عمل کیا اور فرمایا: ''اگر مجھے مستقبل میں آنے والے مسلمانوں کی فکر نہ ہوتی تو جو بستی یا علاقہ فتح ہوتا اسے فاتحین کے درمیان تقسیم کر دیتا جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو تقسیم کیا تھا۔''[1]

سب کچھ بانٹ دو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ مال لایا گیا۔ آپ نے اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ کچھ مال بچ گیا، اس بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا، انھوں نے کہا: اسے کسی آنے والی ممکنہ مصیبت کے مقابلے کے لیے محفوظ کر لیں تو مناسب ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش کھڑے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی رائے معلوم کرنا چاہی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں بحرین کے مال کی حدیث سنائی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا مال تقسیم کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: اسے لازماً تقسیم کر دو! تو علی رضی اللہ عنہ نے اسے تقسیم کر دیا۔[2]
لگتا ہے کہ یہ سب کچھ باقاعدہ دفتری نظام سے قبل ہوا۔[3]

انتظامی امور میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مشورے

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مستقل بنیادوں پر سرکاری سطح پر تاریخ کے تعین کی ضرورت محسوس کی تاکہ ریاست کے امور کو منظّم اور منضبط کیا جائے تو آپ نے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے پوچھا: ہم اپنے ریاستی امور منظّم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اپنی تاریخ کا اجرا کہاں سے

[1] الأموال لقاسم بن سلام، ص: 57، وخلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد علي، ص: 75.
[2] مسند أحمد: 94/1، اس کی سند میں انقطاع کے باعث حدیث ضعیف ہے۔ [3] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 75.

کریں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس دن سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تھی اور شرک کی سرزمین کو خیر باد کہا تھا، عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز فوراً قبول کر لی اور سن ہجری کا اجرا فرمایا۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بہترین لیڈر سمجھتے تھے، ان سے منقول ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ انصار قبیلہ کے ایک آدمی سے سرگوشی میں پوچھ رہے تھے: بتاؤ تمھارا کیا خیال ہے، میرے بعد کسے خلیفہ بنایا جائے؟ انصاری نے بعض مہاجر صحابہ کا ذکر کیا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام نہیں لیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ اللہ کی قسم! اگر انھیں خلیفہ بنالو تو تم راہ حق کو پسند کرو یا نہ کرو آپ لوگوں کو بہر حال حق پر قائم رکھ سکتے ہیں۔[2] جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو انھوں نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ سے کہا کہ اب پختہ ارادہ رکھنے والے اور پیش قدمی کرنے والے فرد کو اپنا خلیفہ بنانا جو انھیں سیدھے راستے پر لے کر چلے۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ بطور قائم مقام خلیفہ

(ا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں کئی بار اپنا جانشین مقرر کیا۔ فتح قادسیہ سے کچھ پہلے حضرت عمر نے انھیں اس وقت جانشین مقرر کیا جب وہ مقام صراء کے پانی پر گئے اور وہاں فوج کو خیمہ زن کیا۔ اہل فارس مسلمانوں کے خلاف جمع ہو چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا، سب نے ان کو دشمن کے خلاف روانگی کا مشورہ دیا۔[4]

(ب) حضرت عمرو بن العاص کے اجنادین میں پڑاؤ کے دوران ارطبون الروم نے انھیں لکھا، اللہ کی قسم! اجنادین کے بعد اب آپ فلسطین میں کچھ بھی فتح نہیں کر سکتے، واپس چلے

[1] التاريخ الكبير للبخاري: 9/1. [2] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 76، کہتے ہیں کہ یہ روایت مرسل ہے۔ [3] بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث، تحقيق: حسين أحمد: 741/3. اس کی سند صحیح ہے۔ [4] المنتظم: 192/4.

جاؤ، حملہ نہ کرنا۔ اب اسے وہ فتح کرے گا جس کا نام سہ حرفی ہے۔ عمرو بن العاص سمجھ گئے کہ اس کی مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھا کہ فتح آپ کی منتظر ہے، انھوں نے لوگوں میں اس کا اعلان کیا اور علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا۔[1]

(ج) جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ازواج مطہرات کے ساتھ حج کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو جانشین بنایا۔ یہ آخری حج تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے ساتھ مل کر کیا، یہ ہجرت کا 23 واں سال تھا۔ وہ امہات المومنین کے ساتھ گئے۔ امہات المومنین کے ساتھ وہ قریبی رشتہ دار بھی تھے جن سے وہ پردہ نہیں کرتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بدستور مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو جانشین مقرر کیا۔[2]

جہاد اور دیگر ریاستی امور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشیر اول تھے، وہ ان سے چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے امور میں مشورہ لیا کرتے، جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا، پھر جب مدائن فتح ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہاوند اور اہل فارس کے خلاف لڑائی کا ارادہ کیا، پھر انھوں نے رومیوں کے خلاف لڑائی کے لیے نکلنے کا ارادہ کیا۔ ہجری کیلنڈر کا تعین ہوا، اس کے علاوہ دیگر اہم امور طے پائے۔ ان تمام مرحلوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی سے خصوصیت کے ساتھ مشورے کرتے رہے۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ، عمر بھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے خیر خواہ مشیر رہے، ان سے محبت اور ان کی حفاظت کرتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت محبت کرتے اور ان کے مابین نہایت قابل رشک اعتماد قائم تھا لیکن اس کے باوجود، دشمنان اسلام کو اصرار ہے کہ وہ

[1] المنتظم: 4/192. [2] المنتظم: 4/327، والفتح: 4/87. [3] علی بن أبي طالب مستشار أمين للخلفاء الراشدين، ص: 99.

تاریخ میں آراستہ جھوٹ کے طومار باندھیں اور ایسی روایات بیان کریں جو ان کے مزاج اور مسلک ومشرب سے مناسبت رکھتی ہیں، وہ خلفاء راشدین کے دور کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں گویا ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے آنے والی مصیبت کا منتظر ہے تاکہ وہ اس پر ٹوٹ پڑے۔[1]

خلافت عمر رضی اللہ عنہ پر غور کرنے والا جو چیز بہت نمایاں طور پر محسوس کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے تعلقات خصوصی بنیادوں پر قائم تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان تعاون اور خلوص کا جذبہ واضح نظر آرہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو تجویز پیش کی، آپ نے اسے پوری طرح نافذ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر حالت اور تمام معاملات میں بھلائی، خیر خواہی اور خلوص کا مجسمہ تھے۔ جب اہل فارس بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے نہاوند میں اکٹھے ہوگئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کو جمع کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ ان کی طرف رخ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اکثر لوگوں نے ان کے مقابلہ ہی کا مشورہ دیا۔ اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے، اور نہایت پروقار تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا: اے امیر المومنین! اگر آپ اہل شام کو جنگ میں شریک کریں گے تو رومی ان کے اہل خانہ پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ نے اہل یمن کو جنگ میں شرکت کی دعوت دی تو حبشہ والے ان کی طرف حملہ آور ہوسکتے ہیں۔ اگر اس سرزمین کے لوگ جنگ میں شریک ہوں گے تو اطراف واکناف کے عرب ہم پر ٹوٹ پڑیں گے اور آپ کو اپنے سامنے کے حالات سے زیادہ ان مقامات کی فکر لاحق ہوجائے گی جنھیں آپ پس پشت غیر محفوظ چھوڑ کر آئے ہوں گے۔ ان سب لوگوں کو اپنے اپنے علاقوں ہی میں رہنے دیجیے اور اہل بصرہ کو لکھ بھیجئے کہ وہ تین حصوں میں تقسیم ہو جائیں، ایک گروہ اپنے اہل خانہ میں رہے، ایک گروہ اپنے اہل معاہدہ کے ساتھ رہ کر یہ دھیان رکھے کہ وہ بدعہدی نہ کرنے پائیں اور ایک گروہ کوفہ میں

[1] علي بن أبي طالب مستشار أمين للخلفاء الراشدين، ص: 138.

اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے روانہ ہو جائے۔ کل عجم والے آپ کو دیکھیں گے تو آپس میں کہیں گے کہ یہ سردارِ عرب ہے۔ آپ پر حملہ آور ہونے کی جرأت کرنا ان کے لیے بڑی سخت بات ہے، البتہ آپ کا یہ کہنا کہ اہل فارس مسلمانوں سے لڑنے کے لیے چل پڑے ہیں تو یاد رکھیے، اللہ تعالیٰ ان کی پیش قدمی کو آپ سے زیادہ برا سمجھتا ہے اور جس چیز کو اللہ رب العزت برا سمجھے اسے روکنے پر وہ قادر مطلق زبردست قدرت رکھتا ہے۔ ان کی تعداد کے بارے میں آپ جو کچھ کہتے ہیں، ٹھیک ہے لیکن کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ ماضی میں بھی ہم کثرت کے بل بوتے پر نہیں لڑتے تھے بلکہ اللہ کی تائید و نصرت کے سہارے جہاد کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ کی رائے کو پسند کرتا ہوں اور اسی پر عمل کروں گا۔ [1]

تاریخ کے اوراق میں یہ حقیقت سورج کی کرنوں سے زیادہ روشن نظر آتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک ہی نہیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت تک تمام صحابہ کرام ایک محکم اجتماعیت کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے اور پوری طرح متحد تھے۔ کسی کے ذہن میں خلافت کے بارے میں یا خلافت کے زیادہ حق دار ہونے کے حوالہ سے کوئی واہمہ موجود نہیں تھا۔ [2]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا معمول مبارک تھا کہ وہ مختلف درپیش مسائل پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے پیہم مشورے کرتے تھے لیکن اس کثرت مشاورت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تفقہ اور علم میں ان سے کم تھے۔ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم اور دین میں کامل اور دانش و بینش سے آراستہ بلند مرتبہ شخصیت تھے۔ باہمی مشاورت سے ان کا لگاؤ امت مسلمہ میں باہمی اتحاد اور ہم آہنگی کا جذبہ بڑھانے اور اپنے بعد آنے والے حکام کو مشورے کے ذریعے امور مملکت انجام دینے کا سبق سکھانے کے لیے تھا۔ وہ سب کو اظہار رائے کی مکمل آزادی دیتے تھے۔ کسی پر اپنی رائے تھوپنے سے پرہیز فرماتے تھے۔ [3] ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

---

[1] تاریخ الطبري: 480/3، وتحقيق مواقف الصحابة: 94/2. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 295.
[3] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد علي، ص: 77.

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے موافقت رکھتے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ ان سے کثرت کے ساتھ مشاورت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے مشاورت کرتے ہیں تو میری ایک رائے ہوتی ہے اوران کی ایک اور رائے ہوتی ہے اور میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موافقت کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کا احترام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ انھیں اپنے بیٹوں اور اپنے خاندان پر ترجیح دیتے تھے، اس سلسلے میں ہم بعض واقعات کا ذکر کرتے ہیں:

❁ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: پیارے بیٹے! کبھی ہمارے پاس بھی ملاقات کے لیے آؤ۔ ایک دن میں چلا گیا۔ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ علیحدہ بیٹھے تھے۔ ان کا بیٹا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اجازت نہ ملنے کے باعث باہر دروازے ہی پر رکا ہوا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں واپس آگیا۔ بعدازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھر ملے، فرمایا: بیٹے! تم ہمارے پاس نہیں آئے۔ میں نے عرض کیا: میں حاضر ہوا تھا۔ آپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ علیحدہ تشریف فرما تھے۔ میں نے آپ کے صاحبزادے عبداللہ کو دیکھا کہ وہ لوٹ گئے ہیں تو میں بھی واپس آگیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیٹے! تم اجازت ملنے میں عبداللہ سے زیادہ حق دار ہو، پھر انھوں نے میرے سر پر اپنا ہاتھ پھیرا۔[2]

حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے لیے نیا لباس

ابن سعد، جعفر بن محمد الباقر سے روایت کرتے ہیں، وہ اپنے والد علی بن الحسین سے

[1] الإمامة والرد على الرافضة للأصبهاني، ص: 295. [2] المرتضىٰ، ص: 118، وكنز العمال: 105/7، والإصابة: 133/1.

روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یمن سے کچھ نئے کپڑے آئے، انھوں نے لوگوں میں تقسیم کر دیے۔ وہ روضۂ اطہر اور منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ ان کے پاس آ رہے تھے، انھیں سلام کر رہے تھے اور ان کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔ اسی دوران حسن اور حسین رضی اللہ عنہما بھی اپنی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے نکلے۔ وہ مسجد نبوی میں لوگوں کو پھلانگتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کا لباس پرانا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ کا دل بھر آیا اور آنکھیں نمناک ہوگئیں، پھر فرمایا: مجھے افسوس ہے کہ میں تمھیں نیا جوڑا نہیں پہنا سکا۔ لوگوں نے کہا: اے امیر المومنین! آپ نے رعایا کو پہنایا، بہت اچھا کیا۔ انھوں نے فرمایا: ان دو بچوں کے پاس کپڑوں کا نیا جوڑا نہیں تھا، مجھے اس پر افسوس ہوا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یمن کے حاکم کو لکھ بھیجا کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے لیے دو نئے جوڑے بھیج دو۔ دیر نہ کرنا۔ اس نے بھجوائے اور آپ نے حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو پہنا دیے۔[1]

بنی ہاشم کو ترجیح

ابو جعفر سے روایت ہے کہ فتوحات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے لیے وظیفہ مقرر کرنا چاہا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا، ان سے مشورہ مانگا۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا: اس کا آغاز آپ اپنے آپ سے کیجیے۔ انھوں نے فوراً فرمایا: ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رشتہ داروں سے شروع کروں گا اور پھر بنی ہاشم سے، لہٰذا انھوں نے سب سے پہلا وظیفہ حضرت عباس کے لیے مقرر فرمایا، پھر علی رضی اللہ عنہ کے لیے، تا آنکہ یکے بعد دیگرے پانچ قبائل کو وظیفہ عطا کیا حتی کہ بنی عدی بن کعب تک پہنچے، پھر دریافت فرمایا کہ غزوہ بدر میں کون کون شریک ہوئے؟ پھر پہلے بنی ہاشم میں سے، بنی امیہ بن عبد شمس میں سے جو اس میں شریک تھے ان کے لیے درجہ بدرجہ عطیات مقرر فرمائے۔ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے لیے

[1] المرتضی، ص: 118، والإصابة: 106/1.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے حد درجہ شفقت و محبت کے باعث خصوصی عطیات مقرر فرمائے۔[1]

یہ کپڑا مجھے میرے بھائی اور میرے دوست نے پہنایا ہے

ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے، وہ عدن کی بنی ہوئی چادر زیب تن کیے ہوئے تھے۔ فرمایا: یہ چادر مجھے میرے بھائی، میرے مخلص دوست امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے پہنائی ہے۔[2]

ابو السفر سے ایک روایت ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے، وہ اکثر ایک چادر پہنا کرتے تھے، عرض کیا گیا: اے امیر المومنین! آپ اکثر اوقات یہی چادر اوڑھتے ہیں، انھوں نے کہا: جی ہاں! یہ مجھے میرے مخلص دوست عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پہنائی تھی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص کا معاملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں قبول فرمالیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ رو پڑے۔[3]

ساری جاگیر فی سبیل اللہ دے دی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ینبع میں ایک جاگیر عطا فرمائی، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ اور جاگیر بھی خریدی۔ وہاں چشمہ کھدوایا، لوگ کھدائی کر رہے تھے کہ اچانک پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی گئی، وہ بہت خوش ہوئے اور اسے فی سبیل اللہ فقراء و مساکین کے لیے صدقہ کر دیا۔ یہ صدقہ انھوں نے اس دن کی کامیابی کے حصول کے لیے کیا جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہروں پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ انھوں نے اللہ کی راہ میں اس صدقہ کے بارے میں یہ تحریر لکھی:

''یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا اپنے مال کے بارے میں فیصلہ ہے: میں نے ینبع، وادی القری، اذنیہ اور راعہ کو اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کی خاطر صدقہ کر دیا ہے، میں صرف اللہ کی رضا

[1] كتاب الخراج لأبي يوسف، ص: 25,24، والمرتضٰی، ص: 118. [2] المختصر من كتاب الموافقة، ص: 140. [3] المصنف لابن أبي شيبة: 29/12 حديث: 12047، بحوالہ الشريعة للآجري: 2327/5، اس کی سند حسن ہے۔

چاہتا ہوں۔ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر ضرورت کے لیے خرچ کیا جائے، حالت امن ہو یا حالت جنگ، دور و نزدیک کے کسی رشتے دار کے ہاتھ یہ بیچا جائے نہ کسی کو ہبہ کیا جائے۔ میں زندہ رہوں یا فوت ہو جاؤں، اس کا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ اس عمل سے میرا واحد مقصد اللہ کی خوشنودی اور دارِ آخرت میں کامیابی کا حصول ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، وہی اس کا بہترین وارث ہے۔ یہ فیصلہ میرے اور اللہ عزوجل کے مابین ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شادی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی (ام کلثوم) جو کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ کے بطن سے ہے، آپ سے بیاہ دی۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ اعزاز ان کے حسن سیرت اور ان کے اعلیٰ محاسن کے اعتراف میں بخشا۔ اس بابرکت شادی سے یہ اظہار کرنا بھی مطلوب تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین نہایت مضبوط، خوشگوار تعلقات ہیں۔ اس مبارک شادی سے عزت و شوکت والی امت مسلمہ کے دشمنوں کے دل جل گئے اور ان کی ناک خاک آلود ہوئی۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی وجہ سے اہل بیت کے لیے ایسی خاص محبت موجزن تھی جو کسی اور کے لیے نہیں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کے اکرام و احترام اور ان کے حقوق کا خیال رکھنے کی وصیت فرمائی تھی، اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی سیدہ ام کلثوم سے نکاح کی استدعا کی اور ان سے بدرجہ غایت محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: اللہ کی قسم! روئے زمین پر کوئی نہیں جو ام کلثوم کے ساتھ حسن سلوک کا ایسا اہتمام کر سکے جو میں کروں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی مکمل تائید فرمائی۔ عمر رضی اللہ عنہ مہاجرین کی طرف متوجہ ہوئے اور مسرت

[1] المحلی: 110/6، ومصنف عبدالرزاق: 375/10، وفقه الإمام علی لقلعجی، ص: 626.
[2] الشیعة وأهل البیت، ص: 105.

بھرے لہجے میں فرمایا: ''مجھے مبارک باد دو۔'' پھر فرمایا: میں نے یہ شادی اس لیے کی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ ''قیامت کے روز ہر سبب اور نسب ختم ہو جائے گا مگر جو سبب میری وجہ سے اور جو نسب مجھ سے متعلق ہو گا (وہ برقرار رہے گا)۔'' اس لیے میری تمنا تھی کہ میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی سببی تعلق بھی موجود ہو۔[1]

تمام اہل تاریخ، اہل انساب، شیعہ کے تمام محدثین، فقہاء اور مناظرین (اور ان کے خیال میں) تمام ائمہ معصومین نے اس شادی کی تصدیق کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ الشیخ احسان الٰہی ظہیر نے اس شادی کے بارے میں تمام روایات اپنی کتاب الشیعہ والسنہ میں جمع کردی ہیں۔[2]

اہل سنت کے علماء نے تاریخ میں اس شادی کا وضاحت سے تذکرہ کیا ہے اور تمام مصادر تاریخ اس پر متفق ہیں۔ اس شادی کا واقعہ تحریر کرنے والے مصنفین میں یہ ممتاز حضرات بھی شامل ہیں: الطبری،[3] ابن کثیر،[4] ذہبی،[5] ابن الجوزی[6] اور دیار بکری۔[7] سوانح حیات[8] لکھنے والے اصحاب قلم سے ابن حجر[9] ابن سعد[10] اور اُسد الغابہ (ابن اثیر) نے اس شادی کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔

اے بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تمھارے ابا سے زیادہ ساری دنیا میں ہمیں کوئی محبوب نہیں اور تمھارے ابا کے بعد ساری دنیا مخلوقات میں تم سے زیادہ ہمیں کوئی محبوب نہیں۔

اسلم العدوی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی تو حضرت علی اور زبیر، سیدہ فاطمہ (رضی اللہ عنہم) کی خدمت میں گئے تاکہ ان سے مشورہ کریں۔ حضرت عمر کو یہ خبر ملی تو وہ بھی پہنچ گئے۔ اور وہ اجازت لے کر

---

[1] اس کی سند حسن ہے۔ امام حاکم نے اسے المستدرك: 142/3، میں بیان کیا ہے۔ [2] الشيعة وأهل البيت، ص: 105. [3] تاريخ الطبري: 28/5. [4] البداية والنهاية: 220/5. [5] تاريخ الإسلام، عهد الخلفاء الراشدين، ص: 166. [6] المنتظم: 131/4. [7] تاريخ الخميس، بحوالہ زواج عمر من أم كلثوم لأبي معاذ، ص: 19. [8] الإصابة لابن حجر، ص: 276، كتاب الكنى اور كتاب النساء. [9] الإصابة لابن حجر، ص: 276، كتاب الكنى اور كتاب النساء. [10] أسد الغابة: 425/7.

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آئے اور کہا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر! آپ کے والد گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ساری دنیا میں ہمیں کوئی محبوب نہیں اور ان کے بعد ہمارے نزدیک آپ سے زیادہ کوئی مکرم و محبوب نہیں، پھر حضرت عمر نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں اپنی گزارشات پیش کیں۔ ان کی گفتگو کے بعد علی اور زبیر، فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہنچے تو سیدہ نے فرمایا: تم دونوں راہ راست کی طرف واپس چلے جاؤ! پھر وہ دونوں بیعت کرنے کے بعد ہی واپس آئے۔ یہ وہ صحیح اور ثابت روایت ہے جو صحیح سند کے ساتھ ساتھ اس مقدس نسل کے لوگوں کے ساتھ کامل مطابقت رکھتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں پاکباز قرار دیا ہے۔ روافض نے جھوٹ اور بہتان کا طومار باندھ کر اس روایت میں اضافہ کر دیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دھمکی دی تھی کہ میں ان لوگوں کے گھر جلا دوں گا کیونکہ انھوں نے بیعت کرنے میں تاخیر کی ہے۔ اس طرح انھوں نے مسلمانوں کی رٹ قائم نہیں ہونے دی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ چلے گئے، تھوڑی دیر بعد جب علی اور زبیر رضی اللہ عنہما اور دیگر حضرات سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے تو انھوں نے انھیں بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تھے، وہ قسم کھا رہے تھے کہ اگر تم لوگ اس گھر کی جانب واپس آئے تو وہ تم سب کے سمیت اسے جلا دیں گے۔ اللہ کی قسم! انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اسے وہ سچ کر دکھائیں گے۔ اس لیے تم لوگ واپس چلے جاؤ، انھوں نے ایسا ہی کیا اور بیعت کرنے کے بعد ہی واپس آئے۔[1] یہ من گھڑت افسانہ ہے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔ یہ دعویٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ کا گھر جلانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ شیعہ مکتبِ فکر کے دیگر جھوٹوں میں سے ایک سفید جھوٹ ہے۔ الطبری الطبرسی[2] نے دیگر جھوٹوں کے ساتھ یہ جھوٹ بھی اپنی کتاب «دلائل الإمامة»[3] میں لکھ دیا ہے۔ ائمہ حدیث کے متفقہ فیصلہ کے مطابق اس کا راوی جابر جعفی رافضی اور جھوٹا ہے جیسا کہ امام ذہبی نے میزان الاعتدال[4] میں اور

[1] عقائد الثلاثة والسبعين فرقة لأبي محمد اليمني: 140/1. [2] (یہ طبری، مشہور امام طبری کے سوا کوئی اور ہے) [3] دلائل الإمامة، ص: 26، بحوالہ عقائد الثلاثة والسبعين: 140/1. [4] الميزان للذهبي: 279/1.

ابن حجر نے تہذیب التہذیب[1] میں بیان کیا ہے۔ بعض روافض نے تو اس حد تک دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اتنا مارا کہ ان کا بیٹا محسن، جو اُن کے بطن میں تھا، ساقط ہو گیا۔ یہ رافضیوں کے ان جھوٹوں میں سے ہے جن کی مطلق کوئی بنیاد نہیں، انھیں یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس طرح وہ (نعوذ باللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کر رہے ہیں کہ وہ تمام صحابہ کرام میں بہادر[2] ہونے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے چپ رہے اور بزدلی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس کے برعکس خود بعض روافض نے اپنی کتابوں میں اس جھوٹ اور ہذیان کی واضح طور پر تردید کی ہے۔ گمراہوں اور بدنیت لوگوں کے جھوٹ کا پول اسی حقیقت سے کھل جاتا ہے کہ حضرت علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے محسن بن علی رضی اللہ عنہ کی ولادت تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی ہی میں ہو گئی تھی جیسا کہ صحیح روایت سے ثابت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تقرر کی سفارش

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زہریلا خنجر مار کر زخمی کیا گیا تو وہ سمجھ گئے کہ اب وہ زندگی کو الوداع کہہ دیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے پاس تیمار داری کے لیے مسلسل آ رہے تھے اور انھیں یہ کہہ رہے تھے کہ اے امیر المومنین! وصیت کر دیجیے اور کسی کو اپنا جانشین بنا دیجیے!

انھوں نے فرمایا: میں اس کا سب سے زیادہ حق دار ان لوگوں کے سوا کسی کو نہیں سمجھتا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے وقت راضی تھے۔ انھوں نے علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد اور عبدالرحمٰن[3] کا نام لیا، پھر ان میں سے چند خاص حضرات کو بلوایا، یہ عبدالرحمٰن، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم تھے۔[4] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں نصیحت کرتے ہوئے کہا: عمر اس وقت امامت کے منصب پر فائز ہے، اسے چاہیے کہ سب سے بہتر انسان کو مسلمانوں کا خلیفہ بنا کر جائے، اس نے یہ اجتہادی رائے قائم کی ہے کہ وہ چھ شخصیات جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوقت وفات

---

[1] تهذيب التهذيب: 47/2. [2] حقبة من التاريخ، ص: 224. [3] البداية والنهاية: 142/7.
[4] صحيح البخاري، حديث: 3700.

راضی تھے، دوسروں سے زیادہ حق دار ہیں۔ ان سب کے تعین کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے منتخب ہونے والے خلیفہ کے ساتھ تعاون کریں۔

یہ ایک خیر خواہ اور عادل حکمران کا اجتہاد ہے۔ یہ میری خواہش نہیں ہے بلکہ یہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ﴾

''(مومنین) اپنے معاملات آپس میں مشورے سے چلاتے ہیں۔'' [1]

اور ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾

''اور انھیں بھی شریک مشورہ رکھو۔'' [2]

لٰہذا شوریٰ کی تشکیل بھی مصلحت پر مبنی ہے۔ [3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ شخصیات کے معاملے پر اچھی طرح غور فرمایا اور محسوس کیا کہ یہ سبھی حضرات صاحبان فضل و کمال ہیں، کسی میں ایک طرح کی خوبیاں نمایاں اور کسی میں دوسری طرح کے اوصاف جلوہ گر ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں کسی ایک شخصیت کا تقرر کردوں اور اس کے نتیجے میں کوئی خلل واقع ہوتو پھر اس کی نسبت میری طرف کی جائے گی، لٰہذا انھوں نے خوف الٰہی کے باعث کسی ایک فرد کو مقرر کرنے کا خیال ترک کردیا۔ انھوں نے دو مصلحتوں کو یکجا کردیا۔ ایک یہ کہ ان میں زیادہ حق دار ہونے کے اعتبار سے کوئی برتر نہ تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی ایک فرد کے تعین کو اس خیال سے ترک کردیا مبادا مجھ سے اس میں کوئی کوتاہی سرزد ہوجائے۔ اللہ کی طرف سے یہ فرض بہت ضروری ہے کہ بندہ حتی الامکان احتیاط سے کام لے۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ انتہائی مصلحت کا تقاضا تھا۔ [4] یہ نہیں کہا جا سکتا

[1] الشوریٰ 38:42. [2] آل عمران 159:3. [3] منهاج السنة: 3/162-164، والمنتقى، ص: 362-364. [4] منهاج السنة: 3/162-164، والمنتقى، ص: 362-364.

کہ انھوں نے چھ شخصیات کی شوریٰ بنا کر اپنے پیشرووں کی مخالفت کی، جیسا کہ شیعہ مکتب فکر کے لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ کیونکہ مخالفت کی دو صورتیں ہیں: ایک تضاد والی مخالفت اور دوسری تنوع کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا اس کا تعلق دوسری صورت سے ہے۔[1] تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کو صحیح قرار دیا، کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ خلیفہ کے انتخاب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو نیا انداز اختیار فرمایا، میں نے اپنی کتاب «فصل الخطاب فی سیرۃ أمیر المومنین عمر بن الخطاب، شخصیتہ و عصرہ» میں اس پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جسے زیادہ وضاحت مطلوب ہو وہ اس کی طرف رجوع کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گواہی

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی میت لائی اور رکھی گئی، جنازہ اٹھائے جانے سے پہلے لوگ ارد گرد کھڑے تھے اور دعا کر رہے تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پکڑ لیے، میں نے دیکھا تو وہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ کی رحمت کی دعا کی اور فرمایا: آپ میری نظر میں جو محبوب ترین چیز چھوڑ کر جا رہے ہیں وہ آپ کے نیک اعمال ہیں۔ اللہ کی قسم! مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں کی مصاحبت نصیب فرمائے گا کیونکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اکثر یہی سنتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرمایا کرتے تھے: ''میں، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما گئے۔'' میں، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے۔ ''میں، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما باہر نکلے۔''[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان

بلاشبہ عمر راہ راست پر تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان

[1] عقیدۃ أهل السنة: 1042/3. [2] صحیح البخاري، حدیث: 3658.

کی مخالفت نہیں کی۔ عبد خیر سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: جب اہل نجران آئے تو میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر کی کسی بات کی تردید فرمائیں گے تو آج کا دن ہوگا۔ راوی کہتے ہیں کہ وفد کے ارکان نے سلام کیا اور ان کے سامنے صف بنا کر بیٹھ گئے، پھر ان میں سے ایک شخص نے اپنی آستین میں ہاتھ ڈالا، ایک تحریر نکالی، حضرت علی کے ہاتھ پر رکھ دی اور کہا: اے امیر المومنین! یہ مسودہ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا تھا۔ راوی کہتے ہیں۔ یہ تحریر دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آنسو ٹپک پڑے، انھوں نے اس وفد کے لوگوں کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا: اے اہل نجران! یہ وہ آخری تحریر ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی تھی۔ ارکان وفد نے کہا: اس میں جو لکھا ہوا ہے وہ ہمیں دیجیے! انھوں نے فرمایا: میں اس بارے میں تمھیں اصل بات بتاتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ واپس لے لیا تھا، وہ اپنی ذات کی بنیاد پر نہیں لیا تھا۔ وہ انھوں نے مسلمانوں کی جماعت کی مرضی سے لیا تھا اور جو کچھ تم سے لیا تھا، اس سے بہتر تمھیں عطا کیا تھا۔ اللہ کی قسم! میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو رد نہیں کرسکتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ صراط مستقیم پر تھے۔[1]

اس واقعہ پر فقہاء نے اس رائے کی بنیاد رکھی ہے کہ کوئی قاضی، حضرت علی کی رائے کے مطابق[2] اپنے سے پہلے قاضی کے اجتہاد کو رد نہیں کرسکتا۔ ان سے مروی ہے کہ انھوں نے تاکید فرمائی: اسی طرح فیصلہ کرو، جس طرح تم سے پہلے فیصلہ کر رہے تھے، تاکہ اس طریقے کے تسلسل سے تم اجتماعیت کی صورت اختیار کرلو، مجھے اختلاف کا ڈر ہے۔[3] یہی جمہور فقہاء کی رائے ہے۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا: میں وہ گرہ نہیں کھول سکتا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ

[1] معجم البلدان: 269/5، والمختصر من كتاب الموافقة، ص: 139، وفقه الإمام علي: 813/2، بحوالہ سنن بیہقی، اس کی سند مرسل ہے، والآجري: 1777/4. [2] فقه الإمام علي: 813/2. [3] مصنف عبدالرزاق: 329/10، بحوالہ فقه الإمام علي: 813/2. [4] فقه الإمام علي: 813/2.

نے مضبوطی سے باندھا ہو۔[1]

جو بات عمر رضی اللہ عنہ کو ناگوار تھی وہ مجھے بھی گوارا نہیں

حضرت علی رضی اللہ عنہ جب جمل کے مرحلے کے بعد بصرہ میں داخل ہوئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مکہ کی طرف واپسی کا ارادہ فرمایا تو آپ نے انھیں نہایت احترام سے رخصت کیا، پھر بصرہ سے کوفہ کو چلے، وہاں 36 ہجری، 12 رجب کو سوموار کے دن داخل ہوئے۔ ان سے عرض کیا گیا کہ قصر ابیض میں قیام کریں تو فرمایا: ہرگز نہیں! حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وہاں قیام کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اسی لیے میں بھی ناپسند کرتا ہوں، پھر ایک کھلی جگہ قیام کیا اور مسجد میں دو رکعت نماز ادا کی۔[2]

اہل بیت کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے محبت

اہل بیت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑی محبت تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹوں کے نام ان کے نام پر رکھے، یہ عمل ان کی شخصیت سے محبت اور شیفتگی کے باعث تھا،[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی سربلندی کے لیے جو خدمات جلیلہ اور عظیم کارنامے سرانجام دیے تھے، اہل بیت ان کی بڑی قدر افزائی کرتے تھے۔ اسی قدر شناسی کا اظہار تھا کہ سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ام حبیب بنت ربیعہ البکر یہ سے ہونے والے اپنے بیٹے کا نام عمر رکھا۔[4]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت اور عقیدت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیروی کی، لہٰذا انھوں نے بھی اپنے ایک بیٹے کا نام عمر رکھا۔ اسی طرح

---

[1] المختصر من كتاب الموافقة بين أهل البيت والصحابة، ص: 140، اس کی سند منقطع ہے، مصنف ابن أبي شيبة: 33/12، حديث: 12054. [2] تاريخ الخلافة الراشدة لمحمد كنعان، ص: 383. [3] تاريخ اليعقوبي: 213/2، والشيعة وأهل البيت، ص: 133. [4] الفصول المهمة، ص: 143، والشعية وأهل البيت، ص: 133.

حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے بھی عمر نام رکھا۔ حضرت حسین کے بعد حضرت علی زین العابدین نے اپنے ایک بیٹے کا نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا۔ موسیٰ بن جعفر نے، جن کا لقب کاظم ہے، اپنے ایک بیٹے کا نام عمر رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا۔[1]

یہ وہ ائمہ اہل بیت ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق زندگی پر چلتے رہے اور اہل سنت والجماعت کے منہج اوران کی پاکیزہ سیرت پر گامزن رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی مدت دراز تک ان کے لیے دل میں جو محبت اور تعلق خاطر تھا، حضرات اہل بیت اس کا اظہار کرتے رہے، حضرت عمر، ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے نام اہل بیت کی اولاد میں سے جو مذہب حق، یعنی اہل سنت کے عقیدہ پر ہیں ان میں ہمیشہ جاری وساری رہے۔ ہاشمیوں کے وہ گھرانے جو کتاب وسنت پر عمل پیرا رہے، ان میں اولاد کے نام صحابہ کرام اور امہات المومنین کے نام پر رکھے جاتے تھے۔ انھوں نے طلحہ، عبدالرحمٰن، عائشہ اور ام سلمہ جیسے نام رکھے۔ ہم شیعہ حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ حضرت علی، حسن، حسین رضی اللہ عنہم اور دیگر ائمہ اہل بیت کی پیروی کریں اور اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے نام خلفاء راشدین اور امہات المومنین کے ناموں پر رکھیں۔ ہم ان سے امید رکھتے ہیں کہ وہ حضرات اہل بیت کے طریق کار کی اتباع کر کے اہل بیت سے اپنی محبت کے دعووں کا ثبوت دیں گے۔[2]

حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی نسل کی ترقی کے لیے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا کردار

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل فارس کے غنائم میں آنے والی شاہ فارس یزدگرد کی بیٹی حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو عطا فرمائی۔ اسی عظیم خاتون نے زین العابدین علی بن الحسین کو جنم دیا اور حضرت حسین کے بیٹوں میں ان کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسل حضرت زین العابدین ہی کے ذریعے آگے بڑھی۔[3] جو بدنصیب لوگ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو برا بھلا

[1] الشيعة وأهل البيت، ص: 133-135. [2] اذهبوا فأنتم الرافضة لعبدالعزيز الزبيري، ص: 230.
[3] عمدة الطالب فی أنساب أبي طالب، الفصل الثانی، عنوان (عقب الحسين) بحوالہ: اذهبوا فأنتم الرافضة، ص: 232.

کہتے ہیں، انھیں ایسے مذموم کام سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کردار نہ ہوتا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسل کا سلسلہ ہی ختم ہو جاتا۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غنائم میں آنے والی شاہ فارس کی دوسری بیٹی محمد بن ابی بکر کو مرحمت فرمائی۔ اس طرح وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ہم زلف ہوئے اور ان سے قاسم بن محمد پیدا ہوئے، اس طرح قاسم بن محمد بن ابی بکر اور علی بن الحسین زین العابدین خالہ زاد بھائی قرار پائے۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں عبداللہ بن الحسن بن علی بن ابی طالب کا قول

حفص بن قیس راوی ہیں کہ میں نے عبداللہ بن الحسن سے جرابوں پر مسح کرنے کے بارے میں وضاحت چاہی تو انھوں نے فرمایا: میں تو مسح کرتا ہوں اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی مسح کرتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حسن سے میری یہ گفتگو اس وقت ہوئی جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر اور منبر کے درمیان تشریف فرما تھے۔ راوی نے کہا کہ میں نے ان سے عرض کیا: میں تو صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا آپ مسح کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: اللہ کے بندے! میں تمھیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتا رہا ہوں اور تم مجھ سے میری رائے پوچھ رہے ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ صرف مجھ سے بہتر تھے بلکہ اپنے زمانے کے تمام روئے زمین کے لوگوں سے بہتر تھے۔ میں نے عرض کیا: اے ابومحمد! کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے یہ عمل تقیہ کے طور پر ہے۔ یہ سن کر انھوں نے فرمایا: اے اللہ! ظاہر و باطن ہر حال میں میرا یہی قول ہے، میرے بعد اس قول کے خلاف کسی کی بات نہ سننا، جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مظلوم و مقہور تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کوئی حکم دیا اور انھوں نے اسے نافذ نہیں کیا، نعوذ باللہ! حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بے قدری کے لیے یہی بات کافی ہے کہ کسی کو یہ خام خیالی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایک حکم دیا تھا مگر انھوں نے اس پر عملدرآمد نہیں کیا۔[3]

---

[1] اذهبوا فأنتم الرافضة لعبدالعزيز الزبيري، ص: 232. [2] سير أعلام النبلاء: 254/6. [3] النهى

سیدنا علی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں
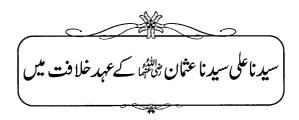
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان کی بیعت خوش دلی سے کی

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تدفین سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ مجلس شوریٰ کے ارکان امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں جمع ہوگئے، ایک اور روایت کے مطابق اکابر صحابہ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے گھر میں جمع ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مسلمانوں کو جو اہم مسائل پیش آگئے تھے ان کا فیصلہ نہایت ضروری تھا، صحابہ نے اس پر گفتگو کی، باہم تبادلۂ خیال کیا اور اپنی اپنی رائے پیش کی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سب ایک سیدھی اور میانہ روی کی راہ پر گامزن ہوئے، مسلمانوں کے خاص و عام سب نے یکساں طور پر اس معتدل راہ کو پسند کیا۔[1] مجلسِ شوریٰ کے اجلاس اور خلیفہ کے انتخاب کی نگرانی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کی۔ ارکانِ شوریٰ نے خلافت کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے اور مسلمانوں کے امور و معاملات چلانے کے لیے موزوں شخصیت کے انتخاب پر بڑی توجہ سے غور کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اس موقع پر بڑے وقار، تدبّر اور حزم و احتیاط سے کام لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس عظیم مشن میں نہایت خوش اسلوبی سے کامیاب ہوئے۔[2] انھوں نے جس مہارت سے شوریٰ کی قیادت کی وہ بے مثال ہے۔[3] امام ذہبی کہتے ہیں: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

[1] عثمان بن عفان للصادق عرجون، ص: 63,62. [2] عثمان بن عفان للصادق عرجون، ص: 71,70. [3] مجلة البحوث الإسلامية، شمارہ: 10، ص: 255.

کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شوریٰ ہی میں طے کر دیا کہ وہ خود کسی عہدہ کے امید وار نہیں ہوں گے۔ انھوں نے امت کے مسائل حل کرنے کے لیے اہل حل وعقد منتخب کیے اور امت کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب پر متحد کر دیا۔ اگر ان کی اپنی خواہش ہوتی تو وہ اپنے حق میں فیصلہ کراتے یا اپنے چچا زاد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کراتے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر کامل اتفاق ذوالحجہ کی آخری تاریخ 23 ہجری بمطابق 6 نومبر 644 عیسوی کو نمازِ فجر کے بعد ہوا۔ صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے نماز کی امامت کرائی، نماز کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ اس موقع پر انھوں نے وہ عمامہ زیب سر کر رکھا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پہنایا تھا۔ شوریٰ کے تمام ارکان منبر کے پاس جمع ہو گئے۔ انھوں نے مہاجرین وانصار کے تمام موجود حضرات اور لشکروں کے امراء کو بلا بھیجا، ان میں شام کے امیر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حمص کے امیر عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ، مصر کے امیر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ وغیرہ بھی شامل تھے۔ وہ اسی ذی الحجہ کے مہینے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تھے۔ وہ آخر دم تک ان کے ساتھ رہے۔[2] صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے: جب لوگ صبح کی نماز پڑھ چکے، یہ سب حضرات منبر کے پاس جمع ہو گئے، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا، پھر بعد میں فرمایا: اے علی! میں نے تمام صحابہ کے معاملے پر غور کیا اور محسوس کیا کہ کوئی بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں ہے۔ آپ اس صورتِ حال کا اثر نہ لیجیے گا! پھر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد دونوں خلفائے کرام کی سنت پر عمل کرتے ہوئے آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ پھر تمام مہاجرین وانصار، لشکروں کے امراء اور دیگر تمام مسلمانوں نے ان کی بیعت کی۔[3] التمہید و البیان کے مؤلف نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بعد بخوشی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔[4]

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 86/1. [2] شهید الدار، ص: 37. [3] صحیح البخاری، کتاب الأحکام، حدیث: 7207. [4] التمهید والبیان، ص: 26.

جن روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا عثمان کی بیعت بادل ناخواستہ کی تھی وہ سب من گھڑت ہیں۔

حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا درجہ

اہلِ سنت کا مسلک یہ ہے کہ جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر مقدم قرار دیا وہ گمراہ اور بدعتی ہے اور جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دی وہ غلطی پر ہے۔ ایسی غلطی کرنے والے کو اہلِ سنت گمراہ اور بدعتی نہیں سمجھتے۔[1] اگرچہ بعض علماء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے بارے میں سخت رائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں: جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دی، گویا اس کا خیال یہ ہے کہ صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت میں خیانت کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منتخب کر لیا۔[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل سنت کا یہ معاملہ طے پا چکا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم سمجھا جائے گا۔ ہر چندان دونوں شخصیتوں (کی افضلیت) کا مسئلہ ان اصولی امور میں سے نہیں ہے جن کی بنیاد پر جمہور اہل سنت اپنے سے مختلف رائے رکھنے والے کو گمراہ سمجھتے ہوں، البتہ جس بارے میں مخالف رائے رکھنے والے کو گمراہ قرار دیا جائے گا وہ مسئلۂ خلافت ہے۔ اہلِ سنت کا ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر رضی اللہ عنہ، پھر عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ جو شخص ان ائمہ کی خلافت پر طعن و تشنیع کرتا ہے وہ اپنے پالتو گدھے سے زیادہ گمراہ ہے۔[3] ابن تیمیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے بارے میں اہلِ علم کے اقوال بھی نقل کیے ہیں اور کہا ہے کہ اس بارے میں متعدد روایات ہیں: ایک یہ ہے کہ جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت

[1] مجموع الفتاوی: 102,101/3. [2] حقبة من التاريخ لعثمان الخميس، ص: 66. [3] مجموع الفتاوی: 102,101/3.

دی وہ سنت سے نکل کر بدعت کی راہ پر آ گیا، کیونکہ اس نے اجماع صحابہ کرام کی مخالفت کی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مقدم سمجھا، اس نے مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم پر عیب لگایا۔ یہ روایت ایک سے زیادہ علماء سے نقل کی گئی ہے۔ ان علماء میں ایوب السختیانی، احمد بن حنبل اور دارقطنی بھی شامل ہیں۔ دوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مقدم سمجھا اسے بدعتی نہیں کہا جائے گا کیونکہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ قریب قریب یکساں ہے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں حدود کی تنفیذ

حصین بن المنذر ر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص ولید کو لایا گیا۔ دو آدمیوں نے اس کے بارے میں گواہی دی۔ ان میں ایک گواہ حُمران تھا اس نے کہا کہ اس نے شراب پی ہے۔ دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے قے کر دی ہے، حضرت عثمان نے فرمایا: اگر اسے (شراب کی) قے آئی ہے تو اس نے ضرور پی ہو گی۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: اسے کوڑے ماریے! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا: اے حسن! اٹھو، اسے کوڑے لگاؤ۔ انھوں نے پس و پیش کیا۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن جعفر سے فرمایا: تم اٹھو، اسے کوڑے لگاؤ۔ انھوں نے کوڑے مارے حضرت علی رضی اللہ عنہ شمار کر رہے تھے، جب عبداللہ چالیس کوڑے مار چکے تو علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رک جاؤ، پھر فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس کوڑے کا حکم دیا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی چالیس کا اور عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے کا، ان میں سے ہر ایک کا فیصلہ سنت ہے مگر مجھے یہ چالیس والی سنت زیادہ پسند ہے۔[2]

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تعاون کرتے تھے۔ ولید کی

[1] مجموع الفتاوی: 267/4. [2] شرح النووی علٰی صحیح مسلم، کتاب الحدود: 216/11.

طرف منسوب اس فعل کے حوالے سے جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی کرتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں مسترد کر دیا اور عثمان کا دفاع کرتے ہوئے فرمایا: حضرت عثمان کو جو تم عار دلاتے ہو یہ ایسے ہے جیسے کوئی اپنے پیچھے سوار ساتھی کو قتل کرتے ہوئے خود ہی کو نیزے کا نشانہ بنا لے۔[1] اس میں عثمان کا کیا گناہ ہے کہ انھوں نے گناہ کی پاداش میں کسی کو کوڑے مارے اور اسے اس کی ذمہ داری سے معزول کر دیا اور ہمارے معاملے میں جو کچھ عثمان نے کیا اس میں ان کا کیا گناہ ہے؟[2]

حضرت علی، سیدنا عثمان کے مشیر تھے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو والی مصر عبداللہ بن سعد کی طرف سے خط ملا کہ مسلمان افریقہ کے اطراف پر حملے کر دیں تو انھیں دشمن کے مقابلے میں بڑی کامیابی نصیب ہوگی۔ یہ خط پڑھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے افریقہ کے علاقوں میں جہاد کے لیے اپنی رغبت ظاہر کی۔ اس سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے افریقہ کی طرف لشکر کشی کے بارے میں رائے طلب کی، پھر امیر المومنین حضرت عثمان اور ابن مخرمہ رضی اللہ عنہما کی جو گفتگو ہوئی وہ یوں ہے کہ حضرت عثمان نے پوچھا: ابن مخرمہ! آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ان کے خلاف جنگ کیجیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے اکابر کو جمع کروں گا اور ان سے مشورہ کروں گا، جس رائے پر وہ متفق ہو گئے یا ان کی اکثریت متفق ہو گئی میں وہی اقدام کروں گا چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے علی، طلحہ، زبیر اور عباس رضی اللہ عنہم سے رائے لی، کچھ اور صحابہ سے بھی رجوع کیا۔ مسجد میں موجود تمام صحابہ سے بات کی، پھر ابوالاعور سعید بن زید کو بلایا اور فرمایا: اے ابوالاعور! تمھیں افریقہ کی طرف لشکر کشی کیوں ناپسند ہے؟ انھوں نے کہا: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سنا تھا کہ جب تک میری آنکھوں میں پانی ہے

[1] تاریخ الطبری: 278/5. [2] تحقیق مواقف الصحابة فی الفتنة: 421/1.

میں مسلمانوں کو ان کے خلاف لشکر کشی کے لیے نہیں بھیجوں گا۔ میری رائے ہے کہ آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف کچھ نہ کریں۔ حضرت عثمان نے فرمایا: اللہ کی قسم! ہم ان سے نہیں ڈرتے۔ پھر حضرت عثمان نے جن جن صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا انھوں نے ان کی رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور انھیں افریقہ کی طرف لشکر کشی کے لیے پکارا، بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس مشن کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان میں عبداللہ بن زبیر اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔[1]

ایک قراءت کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے

حضرت عثمان نے مہاجرین وانصار کو جمع کیا، اس موقع پر بڑے بڑے صحابہ تشریف لائے۔ ان میں سر فہرست حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امت کی ان منتخب شخصیات سے مشورہ کیا جو ہدایت یافتہ تھیں اور امت کو بھی ہدایت کی راہ پر گامزن کرنے والی تھیں۔ ان سب نے مل کر اس معاملے کا تفصیلی مطالعہ کیا، اس پر اچھی طرح بحث وتمحیص کی، تا آنکہ وہ ایک رائے پر متفق ہو گئے۔ بعد ازاں دنیا کے اطراف و اکناف میں وہ موقف پہنچ گیا جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہوا تھا۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی متفقہ رائے کا کہیں کوئی مخالف نظر نہیں آیا، نہ اس پر کوئی نکیر کرنے والا تھا۔ پھر قرآنِ کریم کی یکساں قراءت کا معاملہ امت کے ہر فرد پر روشن ہو گیا۔ معروف ائمہ کرام اور علمائے عظام اس باب میں صحابۂ کرام کے اجماع سے بہ تمام وکمال آگاہ تھے۔[2]

بلاشبہ حضرت عثمان نے مصحف کو جمع کر کے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ ان سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ کام کر چکے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام بہت اچھا لگا۔ انھوں نے حضرت

---

[1] ریاض النفوس: 9,8/1، والجهاد والقتال لهيكل: 556/1. [2] عثمان بن عفان لصادق عرجون، ص: 175.

عثمان رضی اللہ عنہ کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا: آپ نے یہ بڑا اچھا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مصحف کی یکسانیت کے حوالے سے آپ کا فیصلہ بڑا صائب ہے۔[1] مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے متفقہ مصحف کے اہتمام کے بعد باقی مصاحف جلا دیے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس اقدام کی بڑی تعریف کی۔[2] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر عیب تھوپنے والوں کو منع کرتے تھے اور تاکید فرماتے تھے: اے لوگو! عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلو کا ارتکاب نہ کرو، ان کے لیے صرف بھلائی کی بات کے سوا کچھ نہ کہو، اللہ کی قسم! انھوں نے مصاحف کے معاملے میں جو کچھ بھی کیا ہے ہم سب صحابہ کی موجودگی میں کیا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے حاکم بنایا گیا ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو انھوں نے کیا۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت بھی آئی ہے۔ انھوں نے فرمایا: جب لوگوں نے قرآن کے بارے میں اختلاف کیا اور عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے ہم تمام اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کیا اور ہم سے اس موضوع پر مشورہ کیا کہ تمام لوگوں کو ایک ہی قراءت پر جمع کر دیا جائے۔ ہم سب اس معاملے میں ان سے متفق تھے۔ پھر (حضرت علی رضی اللہ عنہ نے) فرمایا: اگر مجھ پر بھی وہی ذمہ داری ہوتی تو میں بھی وہی کرتا جو انھوں نے کیا۔[4]

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی الم ناک شہادت کے فتنے میں کردار ادا کرنے والے مختلف قسم کے اسباب جمع ہو گئے تھے جو آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ مثلاً خوشحالی کی فراوانی اور معاشرے میں اس کے اثرات، معاشرے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے دبدبے والے زبردست ایڈمنسٹریٹر کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آنا، کبار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مدینہ سے دوسرے شہروں میں منتقل

[1] فتنة مقتل عثمان: 78/1. [2] التاريخ الصغير للإمام البخاري: 94/1، اس کی سند حسن لغیرہ ہے۔
[3] فتح الباری: 18/9 اس کی سند صحیح ہے۔ [4] سنن أبي داود، كتاب المصاحف، ص: 29، 30، اس کی سند صحیح ہے۔ خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد علي، ص: 80.

ہو جانا، جاہلی عصبیت، کینہ پرور لوگوں کی سازشیں، عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف منظم تدبیریں، لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے کے لیے مختلف حربے اور وسائل کا استعمال اور خطرناک سبائی اثرات وغیرہ۔ میں نے اپنی کتاب «تیسیر الکریم المنان فی سیرۃ عثمان بن عفان، شخصیته و عصره» میں یہ تمام اسباب تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کے دشمنوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے کریم النفس اور حلیم خلیفہ کی نرمی سے فائدہ اٹھا کر فتنے بھڑکانے کا موقع مل گیا۔ ان لوگوں نے افواہ سازی کے کارخانے کھول دیے۔ جھوٹی اشتعال انگیز اور من گھڑت خبریں ادھر ادھر اڑانے اور پھیلانے لگے۔ اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف عام لوگوں کو بھڑکا کر فضا میں زہر گھولنے لگے۔ غلط خبروں کی نشر و اشاعت کے ذریعے دوسروں کو برانگیختہ کیا، اس قماش کے کچھ لوگوں نے عام لوگوں کے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مناظرے اور مجادلے شروع کر دیے۔ یہ لوگ مختلف والیانِ علاقہ جات پر طعن و تشنیع کرتے تھے۔ کچھ فتنہ پرور لوگوں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ کے نام سے جعلی خطوط لکھ کر بہت سے لوگوں کو ورغلایا اور اس بات کی اشاعت کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حق دار ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انھی کے لیے خلافت کی وصیت کی گئی تھی۔ بصرہ، کوفہ اور مصر میں علاقائی سطح پر مختلف فسادی جتھے منظم کیے گئے۔ ہر علاقے سے شرپسندوں کے چار چار گروہ فتنہ گری کے لیے نکل پڑے اور مدینہ آ پہنچے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا کہ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی کے تحت ہوتا رہا۔ ان فتنہ پرور گروہوں نے اہلِ مدینہ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ وہ تو صحابہ کے بلانے پر آئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی شکایات اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیں کہ فضا مکدر ہو گئی۔ [1]

اِن اسباب کے ساتھ ساتھ انھوں نے مختلف علامات اختیار کیں اور نعرے گھڑ لیے، مثلاً وہ نعرۂ تکبیر لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا جہاد مظالم کے خلاف ہے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ

---

[1] دراسات فی عھد النبوۃ والخلافۃ الراشدۃ، ص:401.

ہم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے آئے ہیں۔ اس قسم کے اعلانات کے شور میں وہ مختلف گورنروں کی تبدیلی یا معزولی کا مطالبہ کرتے تھے حتی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منصبِ خلافت سے علیحدہ ہونے کا مطالبہ کرنے لگے۔ یوں شر انگیز فتنہ پرور لوگوں کی جسارت بڑھتی چلی گئی۔ اسی دوران انھیں خبر ملی کہ مختلف علاقوں سے لوگ خلیفہ کی مدد کو آنے والے ہیں، اس صورتِ حال میں ان شر پسندوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر عرصہ حیات تنگ کر کے اُنھیں شہید کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔[1]

ان واقعات میں اور پھر بعد میں رُونما ہونے والے المیوں کے پسِ پردہ عبداللہ بن سبا یہودی کی قیادت میں سبائی تنظیم کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔

فتنہ کی ابتدا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلفائے کرام کے ساتھ اپنے معروف تعاون کا طریقہ جاری رکھا اور وہ سمع و طاعت، مشاورت اور سب کی بھلائی اور خیر خواہی کے جذبوں سے سرشار تھے۔ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اطاعت کی انتہا کر دی۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم کو شاق گذرنے کے باوجود فرض کا درجہ دیتے تھے۔ انھوں نے فرمایا: اگر عثمان رضی اللہ عنہ مجھے صرار کی طرف روانہ کر دیں تو میں سمع وطاعت سے کام لوں گا۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے باغیوں نے ذی المروۃ میں ڈیڑھ ماہ تک پڑاؤ ڈالے رکھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک شخصیت کو جن کا نام روایات میں نہیں ملتا، باغیوں کے پاس بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن سے ملاقات کی اور تاکید فرمائی:

اللہ کی کتاب کو ہر معاملے میں سامنے رکھو۔ ناراضگی اور ملامت کے اسباب دور کرو، انھوں نے حضرت علی کی اس بات سے اتفاق کیا۔[3]

---

[1] دراسات فی عهد النبوة والخلافة الراشدة، ص: 402. [2] مُصَنَّف ابن أبی شیبة: 225/15، اس کی سند صحیح ہے۔ [3] تاریخ دمشق ترجمه عثمان، ص: 328، وتاریخ خلیفة، ص: 169.

انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر غلبہ پانے کی کوشش کی چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اُن سے سختی کا رویہ اختیار فرمایا، ایسا تین مرتبہ ہوا، پھر وہ خود کہنے لگے: ''آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد ہیں، امیرالمؤمنین (عثمان رضی اللہ عنہ) کے پیامبر ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی کتاب پیش کرتے ہیں۔[1] پھر انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ پانچ امور پر صلح کی، ایک یہ کہ جلاوطن کیے جانے والے کو واپس لایا جائے گا، محروم کو عطا کیا جائے گا، مالِ فے پورا ادا کیا جائے گا۔ تقسیم میں انصاف ہوگا۔ امانت وقوّت والے کی خدمات لی جائیں گی۔ یہ معاہدہ بھی تحریری طور پر کیا گیا کہ ابن عامر کو بصرہ واپس بھیج دیا جائے گا اور ابو موسی کوفہ ہی میں رہیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر وفد سے اسی طرح علیحدہ علیحدہ معاملاتِ صلح طے کیے اور تمام وفود واپس چلے گئے۔[2]

فتنہ گروں کو یہ بات بڑی گراں گزری کہ صلح کے بعد تمام اہلِ بلاد ہنسی خوشی واپس چل دیے ہیں اور ان کے مذموم منصوبے ناکام ہو رہے ہیں، اس لیے انھوں نے ایک اور تخریبی منصوبہ تیار کیا جس کے نتیجے میں تمام مصالحتی معاہدے ختم ہو گئے اور ایک لامتناہی المیے کا دروازہ کھل گیا۔ ہوا یوں کہ اہلِ مصر نے واپسی کے دوران ایک اونٹ سوار دیکھا۔ وہ ان کے سامنے تو آجاتا تھا مگر پھر دور الگ تھلگ رہ جاتا تھا جیسے وہ خود اس کوشش میں ہو کہ یہ لوگ اسے گرفتار کر لیں۔ اہل مصر نے اسے گرفتار کر لیا اور تفتیش پر پتا چلا کہ یہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا ایلچی ہے۔ انھیں اس ایلچی کے پاس سے ایک تحریر ملی۔ اس میں اہل مصر کے بارے میں لکھا تھا کہ خلیفہ نے حکم دیا ہے کہ ان لوگوں کو سولی پر چڑھا دیا جائے یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ یہ تحریر پڑھ کر وہ لوگ مشتعل ہو گئے اور مدینہ واپس آ گئے۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس تحریر کی تردید فرمائی اور ان لوگوں سے کہا:

تم مسلمانوں میں سے دو آدمیوں کو یہاں کھڑا کرو (وہ گواہی دیں) یا میں اس اللہ کی قسم

---

[1] فتنة مقتل عثمان: 129/1. [2] فتنة مقتل عثمان: 329/1. [3] تاریخ الطبري: 379/5.

اٹھاؤں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے یہ تحریر نہیں لکھی۔ نہ اس کی املا کرائی، نہ اس کے بارے میں مجھے کوئی علم ہے۔ ایسا آدمی جو بالکل سچا اور کھرا ہو اگر اس کی طرف کوئی نامعقول تحریر منسوب کی جائے تو لوگ اس تحریر کا ہرگز یقین نہیں کرتے۔[1]

اِن سرکش، منحرف باغیوں کا یہ دعویٰ کہ یہ خط عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی طرف سے ہے اور اُس پر ان کی مہر بھی ہے۔ یہ تحریر اُن کا ایک غلام صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ پر عاملِ مصر ابن اَبی سرح کی طرف لے جا رہا تھا۔ اُس تحریر میں ان لوگوں کو قتل کرنے کا حکم درج ہے۔ یہ سب کچھ جُھوٹ کا انبار ہے۔ اس کی نسبت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف غلط طور پر کی گئی ہے،[2] اس کی متعدد وجوہ ہیں:

عراقیوں کا رُخ اپنے ملک کی طرف تھا اور اہلِ مصر، جو یہ جعلی خط تھامے ہوئے تھے، اپنی راہ پر تھے۔ ان دونوں کے درمیان بہت دور کی مسافت ہے۔ عراقی مشرق میں اور مصری مغرب میں تھے، اس کے باوجود دونوں ایک ہی وقت میں اکٹھے کس طرح واپس آئے؟ صاف ظاہر ہے کہ اُن کے درمیان یہ سب کچھ پہلے سے طے تھا جنھوں نے جھوٹی تحریر پر مبنی خط تیار کیا۔ انھوں نے ایک اونٹ سوار کو کرائے پر لیا، وہ مصریوں کے سامنے بُویب میں اپنا کھیل پیش کر رہا تھا اور دوسری طرف ایک اور اونٹ سوار کرائے لے کر عراقیوں کے پاس گیا تاکہ انھیں بتائے کہ مصریوں نے ایک تحریر دریافت کی ہے جس میں عثمان رضی اللہ عنہ نے منحرف مصریوں کے قتل کا حکم بھیجا ہے۔ یہی متضاد بات حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پکڑ لی، انھوں نے فرمایا: اے اہل کوفہ و بصرہ! اہل مصر کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ یقیناً تم نے راستے میں کچھ طے کیا ہے۔ پھر ہماری طرف چلے آئے بلکہ علی رضی اللہ عنہ یقین سے فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! یہ معاملہ مدینہ میں سازش کی بنیاد پر طے ہوا ہے۔[3]

یہ منحوس خط پہلا خط نہیں ہے کہ مجرموں نے اس میں جھوٹ باندھا ہو بلکہ انھوں نے تو

---

[1] فتنة مقتل عثمان: 132:5، والبداية والنهاية: 191/7. [2] تيسير الكريم المنّان فی سيرة عثمان ابن عفان للصلابی، ص: 410. [3] تاريخ الطبري: 359/5.

امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن پر جھوٹ باندھا۔ حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم پر بھی جھوٹ باندھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ تہمت لگائی کہ انھوں نے لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کا حکم دیا، وہ اس کی نفی کرتے ہوئے فرماتی ہیں: اُس اللہ کی قسم جس پر مؤمن ایمان لائے اور کافروں نے انکار کیا، میں نے آج کے لمحۂ موجود تک کوئی تحریر یا خط نہیں لکھا۔ اَعمش کہتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خط حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تہمت لگاتے تھے کہ انھوں نے باغیوں کو خط لکھا کہ وہ اُن کے پاس مدینہ آجائیں لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ تو ان سب باتوں کا انکار فرماتے تھے اور قسم کھاتے تھے کہ اللہ کی قسم! میں نے اُن کی طرف کچھ بھی نہیں لکھا۔ اسی طرح دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی یہ منسوب کیا گیا کہ انھوں نے اہل بلاد کو خطوط لکھے کہ وہ اُن کے پاس آجائیں کیونکہ لوگ دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فاسد سمجھ کر چھوڑ چکے ہیں (نعوذ باللہ) اور مدینہ میں جہاد کرنا دور دراز کی سرحدوں پر جہاد سے بہتر ہے۔[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ سب کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے۔ یہ ملمع سازی اور جھوٹ پر مبنی خطوط ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین خوارج کی طرف حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی جانب سے لکھے گئے مزعومہ خطوط جھوٹ کا پلندہ ہیں جس کا انھوں نے واضح طور پر انکار کیا، اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب خط کی نسبت بالکل جھوٹ ہے، متذکرہ خط نہ انھوں نے لکھا، نہ کسی کو لکھنے کا حکم دیا، نہ اُنھیں اس بارے میں کچھ معلوم تھا۔[2] امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ صحیح روایات کے مطابق کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ان خطوط کا صریح انکار کیا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر جھوٹ باندھنے والے یہ مجرم ہاتھ دراصل وہی ہیں جنھوں نے اوّل تا آخر فتنے کی آگ بھڑکائی، جس کے نتیجے میں زبردست فساد پھیل گیا، انھی فسادیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جھوٹی باتوں کی ترویج

---

[1] تحقیق مواقف الصحابة: 334,335/1، والبداية والنهاية: 175/7. [2] البداية والنهاية: 175/7.

کی اور انھی کے شر کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے۔ سبائیوں اور یہودیوں کی مجرمانہ سازش کا شکار صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی نہیں ہوئے بلکہ پوری امت مسلمہ کو اس ہولناک سانحے سے شدید قلق ہوا اور ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ بعد میں آنے والی مسلمان نسلوں کو جو تاریخ ملی، اس کی شکل بگاڑنے میں بھی خواہشات کے پُجاریوں، کینہ پرور اور خبثِ باطن رکھنے والے انھی یہودیوں اور اُن کے مددگاروں کا ہاتھ ہے۔ کیا مسلمانوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ وہ بیدار ہو جائیں۔ اپنی حقیقی تاریخ اور اپنی عظیم المرتبت شخصیات کو ان کی بے مثل صفات کی روشنی میں جانیں اور پہچانیں؟ کیا آج کے دور کے لکھنے والوں میں کوئی ایسا رجل رشید نہیں جو اللہ سے ڈر جائے اور ان بے گناہ اور بری الذمہ پاکیزہ نفوس پر صحیح روایات اور تاریخ کی روشنی میں تحقیقی کام کرے۔ حالات و واقعات کی باریک بینی سے چھان بین کرے اور صحیح نتائج سامنے لائے تاکہ یہ امّت سقوط و زوال کی بجائے عروج کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ [1]

محاصرے کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف

باغیوں کی بھڑکائی ہوئی آگ پھیلتی رہی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ شدّت اختیار کرتا چلا گیا، نوبت یہاں تک آگئی کہ انھیں مسجد میں باجماعت ادائے نماز سے روک دیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اِس مصیبت و آزمائش میں ثابت قدم اور صابر تھے۔ اُن کا قضاء وقدر پر پختہ ایمان تھا۔ وہ اس مصیبت کا حل تلاش کرتے رہے۔ کبھی تو وہ لوگوں کو مسلمان کے خون کی حرمت پر خطاب فرماتے اور احساس دلاتے کہ ناحق خون بہانا جائز نہیں۔ کبھی وہ اپنے فضائل اور اسلام کی راہ میں اپنی خدماتِ جلیلہ یاد دلاتے، عشرہ مبشرہ میں اپنی شمولیت کی شہادت پیش کرتے تھے۔ فی الجملہ اُن کے ارشادات کا خلاصہ

[1] عثمان بن عفّان الخليفة الشاكر الصابر، ص: 229,228.

یہ تھا کہ جس شخص کا عمل زندگی بھر درخشاں رہا اور جسے اللہ تعالیٰ نے فضائل و محاسن کا تاج پہنایا، بھلا اُس کے لیے کیونکر ممکن ہے کہ وہ دنیا کی طمع کرے اور اُسے آخرت پر ترجیح دے! کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرے اور اُمّت کے مال اور خون سے کھیلے؟ جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے کرتوتوں کا انجام بھی جانتا ہو، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو وہ بطلِ جلیل ہیں جنھوں نے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ نگرانی تربیت پائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی پاکبازی کی گواہی دی، کیا اُن کے ساتھ اس قسم کا وحشیانہ سلوک جائز ہے؟ مدینہ میں بلوائیوں اور فسادیوں کے غلبے میں شدّت آ گئی، حتی کہ اکثر اوقات فسادی لوگ دیگر لوگوں کے ساتھ مل کر نماز بھی پڑھتے۔[1] جب صحابہ کرام کو اندازہ ہوا کہ معاملہ ایسا نہیں جیسا وہ گمان کر رہے ہیں تو انھیں ڈر لگا مبادا کوئی ایسا واقعہ پیش آ جائے جس کا انجام اچھا نہ ہو، اُنھیں خبر مل گئی کہ باغی لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے دَر پے ہیں، اُنھوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو پیش کش کی کہ ہم آپ کا دفاع کرنے کو تیار ہیں۔ ہم ان باغیوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ اُن کی وجہ سے قتل اور خون ریزی کا سلسلہ شروع ہو اور معصوم لوگوں کا خون بہے۔[2] یہ صورتِ حال دیکھ کر اکابر صحابہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیے بغیر اپنے بیٹوں کو بھیجا تاکہ وہ امیر المؤمنین کے گھر پر پہرا دیں۔ ان میں حسن بن علی رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ خود عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے زخمی اٹھائے گئے۔[3] حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے علاوہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، محمد بن حاطب اور مروان بن حکم بھی زخمی ہوئے۔ اُن کے ساتھ حسین بن علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم بھی تھے۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے بڑھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع کر رہے تھے، مروان بن حکم نے خود اس کی شہادت دی ہے۔ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے انتہائی قریب تھے اور اس المناک آزمائش

[1] سير أعلام النبلاء: 3/515. [2] فتنة مقتل عثمان: 1/167، والمسند: 1/396، أحمد شاكر.
[3] الطبقات لابن سعد: 8/128، اس کی سند صحیح ہے۔ [4] تاريخ خليفة، ص: 174.

میں سائے کی طرح اُن کے ساتھ جُڑے ہوئے تھے۔﴿1﴾ ابن عساکر نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ میرے پاس پانچ سو زرہ پوش جوان ہیں، آپ اجازت دیں تاکہ میں شرپسند باغیوں کے بالمقابل آپ کا دفاع کروں، آپ سے ہرگز ایسا کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا جس کے نتیجے میں آپ کا خون بہانا جائز قرار پائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اللہ آپ کو جزائے خیر مرحمت فرمائے، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا خون بہے۔﴿2﴾

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرے کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ قدم بہ قدم کھڑے رہے، بلوائیوں نے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پانی پہنچنے سے روک دیا اور ان کے اہلِ خانہ کے پیاسے مر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پانی سے بھرے ہوئے تین مشکیزے بھجوائے جو اُن تک نہیں پہنچ سکے۔ آب رسانی میں مزاحمت کی وجہ سے بنو ہاشم اور بنو امیہ کے متعدد قریبی رشتہ دار زخمی بھی ہو گئے۔ تاہم اس بلوے کے باوجود اُن تک پانی پہنچا دیا گیا۔﴿3﴾

اچانک ان ملال انگیز واقعات میں تیزی آ گئی۔ بلوائی دیواریں پھاند کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھس گئے اور انھیں شہید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے راضی ہو جائیں!

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت مسجد میں تھی۔ اُن تک یہ وحشت ناک خبر پہنچی تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں سے باز پرس کی: تم لوگ اُن کے گھر کے دروازہ پر پہرا دے رہے تھے، پھر عثمان رضی اللہ عنہ کو کیسے شہید کر دیا گیا؟ حسن رضی اللہ عنہ زخمی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں جھٹکا دیا۔﴿4﴾ ابن الزبیر اور ابن طلحہ رضی اللہ عنہم کو بُرا بھلا کہا۔ وہ شدید

﴿1﴾ تاريخ الإسلام للذهبي، الخلفاء الراشدون، ص: 460-461، اس کی سند قوی ہے۔ ﴿2﴾ تاریخ دمشق، ص: 403. ﴿3﴾ أنساب الأشراف للبلاذري: 67/5. ﴿4﴾ الآحاد والمثاني لابن أبي عاصم: 125/1، بحوالہ: خلافة علي، ص: 87.

غصے کے عالم میں یہ کہتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے: اللہ ان ظالموں کو برباد کرے! پھر کہا: اے اللہ! میں عثمان رضی اللہ عنہ کے ناحق خون سے بری الذمہ ہوں، نہ میں نے انھیں شہید کیا۔ نہ اس فعل میں کسی کو مدد دی۔[1] یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف تھا جو خیر خواہی، مشاورت اور سمع و طاعت پر مبنی تھا۔ فتنہ کے دوران انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھرپور ساتھ دیا اور اُن کا دفاع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کبھی نامناسب الفاظ میں اُن کا تذکرہ نہیں کیا، وہ اصلاحِ احوال چاہتے تھے۔ وہ خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اُن پر خروج کرنے والوں کے درمیان معاملات سلجھانے کی کوشش فرماتے رہے لیکن معاملات اُن کے بس سے باہر ہو گئے، شاید اللہ تعالیٰ کی مشیّت میں یہی طے تھا کہ اُمیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں۔[2]

آلِ علی رضی اللہ عنہ اور آلِ عثمان رضی اللہ عنہ کے مابین رشتے

بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان وہ بُغض و عداوت اور نفرت کبھی نہیں رہی جسے دشمنانِ اسلام نے ایجاد کیا اور اُن کی مختلف شخصیتوں کے گرد افسانے بُنتے رہے۔ ہر انصاف پسند پر خوب روشن ہے کہ بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کے درمیان چچازاد بھائیوں اور دوستوں جیسا تعلق تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ان کے مابین محبت و احترام اور قدر افزائی کا رشتہ تھا۔ آپس میں ایک دوسرے کا غم بانٹتے تھے، اِس صورت حال نے اُن کو گویا ایک ہی باپ کی اولاد اور ایک ہی دادا کے پوتے بنا دیا۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد وہ ایک ہی درخت کی شاخوں کی حیثیت رکھتے تھے، وہ دونوں ایک ہی چشمۂ صافی سے سیراب اور اللہ تعالیٰ کے دینِ حنیف کے ثمرات سے فیض یاب ہوتے رہے۔ یہ وہ دین ہے جو صادق و امین، معلّم و مُربّی، خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا۔

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 209/15، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد علي، ص: 87.

حضرت ابوسفیان اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے درمیان گہری دوستی تھی۔ ان کی دوستی مکہ میں ضرب المثل بن گئی تھی۔ (1) اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد اُن کے درمیان رشتہ داریوں کا ہمیشہ تعلق رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی چار بیٹیوں میں سے تین بیٹیوں کی شادی خاندان بنی امیہ کے ابو العاص بن الربیع اور عثمان بن عفان بن ابی العاص بن اُمیہ سے کی۔ اس کے ساتھ ساتھ عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی اُس پھوپھی کے نواسے ہیں جس کی جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کے ساتھ جُڑواں ولادت ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی والدہ اَروی بنت کریز بن حبیب بن عبدشمس ہیں اور اروی کی والدہ اُم حکیم بیضاء بنت عبدالمطلب ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھیں۔ عثمان بن عفان کے بعد بنو ہاشم میں شادی کرنے والے اُن کے بیٹے ابان بن عثمان ہیں، جن کی بیوی ام کلثوم بنت عبداللہ بن جعفر الطیار بن ابی طالب ہے۔ (2)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوتی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بیٹی سکینہ، کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن عَمرو بن عثمان سے شادی ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری پوتی یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی دوسری بیٹی فاطمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دوسرے پوتے محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں۔ اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا، جو بنی اُمیہ کے سردار ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، وہ بنی ہاشم کے علاوہ ساری اولاد آدم کے سردار صادق وامین حضرت محمد ﷺ کی اہلیہ تھیں۔ اور ہند بنت اَبی سفیان رضی اللہ عنہا، حارث بن نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب بن ہاشم کی زوجہ تھیں جن سے اُن کا بیٹا محمد پیدا ہوا۔ (3)

اور لُبابۃ بنت عُبید اللہ بن عباس بن عبدالمطلب کی شادی عباس بن علی بن ابی طالب سے ہوئی، بعدازاں لُبابۃ کے شوہر معاویہ بن ابی سفیان کے بھتیجے ولید بن عتبہ بن اَبی سفیان بنے۔ اور رملۃ بنت محمد بن جعفر الطیار کی شادی سلیمان بن ہشام بن عبدالملک (اُموی)، بعدازاں

(1) الشیعة وأهل البیت، ص: 141. (2) المعارف لِلدَینوری، ص: 86، والشیعة وأهل البیت، ص: 141.
(3) الطبقات لابن سعد: 15/5، والإصابة: 3/59,58.

أبوالقاسم بن ولید بن عتبۃ بن أبی سفیان سے ہوئی۔ اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیٹی رَملۃ کی شادی مروان بن حکم کے بیٹے سے ہوئی۔ حضرت علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہ کی پوتی کا نکاح، مروان بن حکم کے پوتے سے ہوا۔ نفیسہ بنت زید بن حسن بن علی بن أبی طالب، ولید بن عبدالملک بن مروان کی زوجیت میں آئیں اور انھی کے ہاں اُن کی وفات ہوئی، ان کی والدہ لُبابۃ بنت عبداللہ بن عبّاس ہیں۔ میں نے یہاں محض چند رشتوں کے تذکرہ پر اکتفا کیا ہے، جو حق اور حقیقت کا خواہش مند ہو، اُس کے لیے اتنی آگہی بھی کافی ہے۔[1]

[1] نسب قریش، ص: 133، والشیعة وأهل البیت، ص: 144,143. والطبقات لابن سعد: 234/5.

خلفائے راشدین کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات

سیدنا ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی خلافت کے صحیح ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع و اتفاق ہے اور جو شخص اِن میں سے کسی ایک پر طعن و تشنیع کرے تو وہ اس فرمان خداوندی کی مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے:

﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ ﴾

''جو شخص رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، اس بات کے باوجود کہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اُسے ہم اُسی طرف چلائیں گے جِدھر وہ خود پھر گیا اور اُسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔'' [1]

فرمانِ نبوی ہے:

''تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے، اُسے مضبوطی سے تھامے رکھو۔''

یہ خلفاء راشدین ابو بکر و عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم ہیں اور جو بھی اچھے طریقے پر ان کا پیروکار ہو۔ ایوب السختیانی نے اس مناسبت سے بہت خوب کہا ہے، فرماتے ہیں: جس نے ابو بکر رضی اللہ عنہ

---

[1] النساء 4:115.

سے محبت کی اُس نے دین قائم کیا اور جس نے عمر رضی اللہ عنہ سے محبت کی اُس نے (ہدایت کا) راستہ واضح کیا اور جس نے عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت کی وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے مُنوّر رہوا اور جس نے علی رضی اللہ عنہ سے محبت کی اُس نے (اسلام کے) مضبوط کڑے کو مضبوطی سے تھام لیا اور جس شخص نے اُصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے اچھی بات کہی وہ نفاق سے بری الذمہ ہے۔[1]

گذشتہ صفحات میں قطعی اور واضح دلائل پیش کیے گئے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دیگر خلفائے راشدین کے ساتھ کتنے خوشگوار تعلقات تھے۔ اسی نوعیت کے چند دلائل اور سن لیجیے:

① حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا:

ایک دن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، اس دوران ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ دونوں انبیاء و رُسل کے بعد اہل جنت کے ادھیڑ عمر افراد اور جوانوں کے سردار ہیں۔[2]

② سُوید بن غفلہ سے روایت ہے کہ میں گمراہ لوگوں کے ایک گروہ کے پاس سے گزرا، وہ حضرت اُبو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نامناسب اسلوب میں بات کر رہے تھے، میں سیدھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور عرض کیا: امیر المؤمنین! میں ابھی کچھ لوگوں کے قریب سے ہو کر آیا ہو، وہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے تھے جو اُن کے شایانِ شان نہیں ہیں، اگر آپ اس بارے میں نرم رویّہ اختیار نہ کرتے تو اُنھیں آج ایسی جرأت نہ ہوتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تو اُن دونوں حضرات کے بارے میں نیک تمنائیں رکھتا ہوں۔ اللہ اس پر لعنت کرے جو نیک جذبات کے علاوہ اُن کے بارے میں دل میں کچھ اور چھپا کر رکھتا ہو۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اُٹھ گئے۔ اُن کی آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ رو رہے تھے، اُنھوں نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ اسی حالت میں مسجد میں

---

[1] الشريعة للآجري: 4/1768-1773. [2] السوسوعة الحديثية (مسند أحمد)، حديث: 602، یہ حدیث صحیح اور سند حسن ہے۔

داخل ہوئے، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ انھوں نے اپنی ڈاڑھی پکڑ رکھی تھی۔ وہ اُسے دیکھ رہے تھے کہ یہ سفید ہو چکی ہے، اسی دوران لوگ جمع ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ مختصر اور بلیغ خطاب فرمایا، انھوں نے کہا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ قریش کے دو سرداروں اور مسلمانوں کے دو بزرگوں کا نامناسب انداز سے تذکرہ کرتے ہیں، جو کچھ انھوں نے کہا میں اس سے بَری الذمہ ہوں اور انھیں سزا دینے والا ہوں۔

پھر فرمایا: اُس ذات کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا اور جاندار کو پیدا کیا، ان دونوں بزرگوں سے متقی مومن ہی محبت کرتا ہے۔ فاجر و فاسق اُن سے بغض رکھتا ہے۔ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے وفادار تھے، وہ نیکی کا حکم دیتے تھے۔ برائی سے روکتے تھے، اپنے کسی کام یا بات میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے تجاوز نہیں کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن کی رائے کو اہمیت دیتے تھے اور جیسی محبت ان سے کرتے تھے ویسی محبت کسی اور سے نہیں کرتے تھے، ان دونوں کی وفات ہوئی تو تمام مومنین ان سے خوش تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ مومنوں کو نماز پڑھائیں تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زندگی میں 9 دن تک نمازیں پڑھائی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کو پیارے ہو گئے تو مومنوں نے انھیں اپنے معاملات و امور کا والی بنایا، لوگوں نے انھیں زکاۃ ادا کی، ان کی بیعت کی، نہ چاہتے ہوئے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی رہ جانے والوں میں وہ سب سے بہتر تھے، سب سے زیادہ رحیم و شفیق اور پرہیزگار تھے۔ عمر کے لحاظ سے بھی بزرگ تھے۔ اسلام قبول کرنے میں بھی سب سے آگے تھے۔ وہ سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر گامزن رہے، پھر عمر رضی اللہ عنہ اُن کے بعد ذمّہ داری کے مرتبے پر فائز ہوئے کچھ نے اُنھیں پسند کیا۔ کچھ نے ناپسند کیا۔ جب اُنھوں نے اس جہان فانی سے کُوچ کیا تو ناپسند کرنے والے بھی اُن سے خوش تھے۔ اُنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رفیق کار حضرت اُبو بکر رضی اللہ عنہ کا راستہ ہی اختیار فرمایا، وہ ان دونوں کا راستہ اس طرح اختیار کیے رہے جیسے بچہ اپنی ماں کے نقش

قدم پر چلتا ہے، وہ مظلوموں کے مددگار تھے، اللہ کی ذات عالیہ کے حوالے سے انھیں کسی کی ملامت کا کوئی خوف نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اُن کی زبان پر سچائی کو جاری کر دیا، حتی کہ ہم یہ گمان کرتے تھے کہ اُن کی زبان سے کوئی فرشتہ بولتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کے نام کے ذریعے اسلام کو عزت بخشی۔ ان کی ہجرت دین کے قیام کے لیے تھی، اللہ نے منافقین کے دلوں میں اُن کا خوف ڈال دیا اور مومنوں کے دلوں میں محبت پیدا فرما دی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: کیا تم لوگوں میں کوئی اُن دونوں جیسا ہے؟ ہمیں انھی کے راستے پر چلنا ہوگا، انھی کے نقش قدم کی پیروی کرنی ہوگی۔ انھی سے محبت کا دم بھرنا ہوگا۔ لوگو! سنو، جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اُسے اُن دونوں سے بھی محبت رکھنی چاہیے، جو اُن دونوں سے محبت نہیں رکھتا، گویا وہ مجھ سے بُغض رکھتا ہے اور میں اُس سے بری الذمہ ہوں۔ اگر آج کے بعد کوئی اُن دونوں بزرگوں کے بارے میں ان کی شان کے منافی بات کہتا پایا گیا تو اسے جُرمِ افتراء پردازی کی سزا ملے گی۔ سنو! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امّت کے سب سے بہترین لوگ یہی دونوں بزرگ ہیں، اگر میں چاہوں تو تیسرے کا نام بھی لے لوں۔ میں اپنے اور آپ سب کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش اور مہربانی کا طلبگار ہوں۔[1]

میں نے عثمان بن علی کا نام عثمان بن عفان کے نام پر رکھا ہے

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: میں نے ایک لڑکے کو دیکھا۔ وہ سنِ بلوغت کو پہنچ رہا تھا، سر کے بال مینڈھیوں والے تھے اور اتنے لمبے تھے کہ کندھوں تک لٹکے ہوئے تھے، اللہ جانتا ہے، میں شک میں پڑ گیا کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ پھر اس سے بھی زیادہ خوبصورت نوجوان کے پاس سے گزر ہوا۔ وہ نوجوان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے ان سے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت سے نوازے، یہ آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا

[1] النهي عن سبّ الأصحاب و مافيه من الإثم والعقاب، ص: 43، وشرح أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي، حديث: 4456.

نوجوان کون ہے؟ انھوں نے فرمایا: یہ عثمان بن علی ہے، میں نے اس کا نام عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا ہے۔ میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نام پر بھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر بھی اپنے بیٹوں کے نام رکھے ہیں، میں نے دنیا جہان میں سب سے بہتر شخصیت کے نام پر بھی نام رکھا ہے البتہ حسن، حسین اور محسن رضی اللہ عنہم، یہ نام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھے تھے۔[1] اُنھی نے اُن کا عقیقہ کیا اور اُن کے سر مُنڈ وائے۔ بالوں کے ہم وزن صدقہ کیا، اُن کے نام رکھے اور ختنہ کیا۔[2] ان کی ولادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مبارک زندگی میں ہوئی تھی۔

ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے خلاف بات کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہے

یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور عام و خاص کسی سے بھی مخفی نہیں کہ ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت قریبی خصوصی تعلق تھا، اُن حضرات کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری قائم ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے بڑی محبت کرتے اور اُن کی تعریف و تحسین فرماتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی ظاہری و باطنی اعتبار سے دینِ حنیف پر استقامت سے قائم تھے۔ اگر بالفرض صورتِ حال اس کے برعکس تھی تو دو میں سے ایک بات لازم آتی ہے: یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حالات سے آگاہی نہ تھی یا آپ ان سے (نعوذ باللہ) مداہنت سے کام لے رہے تھے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی بات ہو یہ بہرحال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات پر عیب لگانے کے مترادف ہے کہ (نعوذ باللہ) اگر ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم جیسی شخصیتیں استقامت کے بعد منحرف ہوگئی تھیں تو اس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اُمّت کے خواص کے حوالہ سے رسوائی کی بات ہے (معاذ اللہ) امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

[1] مسند أحمد: 115/2، حديث: 769، اُحمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ [2] مختصر من كتاب الموافقة، ص: 141.

رافضہ کے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کا مقصود یہ ہے کہ کہنے والا یہ کہے کہ نعوذ باللہ وہ بُرے انسان تھے، اُن کے اصحاب بھی بُرے تھے، اگر وہ صالح ہوتے تو اُن کے اصحاب بھی صالح ہوتے، یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم کہتے ہیں: رافضی زندیقین کی سازشوں کا نتیجہ ہیں۔ [1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر تبرے کا موجد ابن سبا ہے

رافضیوں کے تکفیرِ صحابہ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بات امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کے مترادف ہو جاتی ہے کہ انھوں نے حکم الٰہی کو قائم نہیں کیا اور اس سے شریعت کے تواتر کو ساقط کرنا لازم آتا ہے۔ اگر اس شریعت کو ہم تک پہنچانے والے ہی (نعوذ باللہ) مرتد ہو گئے تھے تو پھر سب کچھ باطل اور بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ پھر قرآن کریم کی حقانیت اور اس پر ایمان پر بھی حرف آتا ہے، کیونکہ سارا دین ہم تک ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے واسطے سے پہنچا۔

امام ابو زُرعۃ فرماتے ہیں: جب تم کسی شخص کو صحابۂ کرام کی عیب جوئی کرتے دیکھو تو جان لو کہ وہ زندیق ہے۔ کیونکہ قرآن حق ہے، رسول حق ہے اور قرآن وسنت کا سارا سرمایہ ہم تک انھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے پہنچا ہے۔ ظالم نقاد قرآن وسنت کے گواہوں پر جرح کر کے قرآن وسنت ہی کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ زندیق ہیں۔ [2]

یہی وجہ ہے کہ کتبِ شیعہ میں یہ اعتراف پایا جاتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب وشتم کا موجد ابن سبا ہے، یہ پہلا شخص ہے جس نے اُبو بکر، عمر، عثمان اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر عیب تھوپنے اور تبّرا کرنے کا عقیدہ ظاہر کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ علی رضی اللہ عنہ نے اُسے اس بات کا حکم دیا ہے۔ [3]

---

[1] منهاج السنّة: 4/123، وأصول مذهب الشيعة: 2/931. [2] الكفاية، ص: 49. [3] المقالات والفرق للقمّي، ص: 20، بحوالہ: أصول مذهب الشيعة: 2/933.

خلفائے ثلاثہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہترین تعلقات تھے

سیرتِ علی رضی اللہ عنہ سے ایسے ناقابلِ تردید دلائل و عملی قرائن ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دیگر خلفائے راشدین کے ساتھ ان کے تعلقات اخوت و محبت کے جذبے سے لبریز تھے۔ ان شگفتہ تعلقات کی داستانیں زبان زد عام ہیں۔ ایسی اکثر باتیں ہم گزشتہ صفحات میں بتا چکے ہیں جن سے اُن کی باہمی سچی محبت و مودّت ظاہر ہوتی ہے۔ ان دلائل و براہین کی سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی دختر بلند اختر ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا۔[1]

انصاف پسند، صاحب شعور اور بے غرض انسان جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت رضی اللہ عنہم سے سچی محبت رکھتا ہے وہ خلفائے اربعہ کی باہمی محبت و یگانگت کی حقیقت بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مُعزّ الدولۃ اُحمد بن بُو یہ رافضی تھا اور صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا تھا۔ جب اسے بتایا گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا تھا تو اس کی آنکھیں کُھل گئیں۔ اس نے فوراً کہا: مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اس نے اُسی وقت توبہ کی۔ اپنے مال کا بہت سارا حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ اپنے غلاموں کو آزاد کیا۔ اپنی طرف سے کیے گئے بہت سارے مظالم کی تلافی کی۔ پھر وہ رونے لگا۔ اتنا رویا کہ اُس پر غشی طاری ہو گئی۔[2] اُسے اپنے جرم کی سنگینی کا شدید احساس ہوا اور وہ سمجھ گیا کہ روافض کے شبہات سے دھوکا کھا کر اس نے کتنی پاکباز ہستیوں کی عزت و حُرمت پر دُھول پھینکی تھی۔[3]

رافضیوں کے ''شیوخ'' نے اس صورتِ حال کا اثر زائل کرنے کی خاطر ایک اور حربہ اختیار کیا۔ انھوں نے مسلمان ائمہ کرام کی طرف من گھڑت اور جھوٹی روایات منسوب کیں۔[4] جن کی رُو سے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نعوذ باللہ ایسا دَیّوث بتلایا گیا جو اپنے گھر کی عزت کی مدافعت نہیں کرتا اور برائی کو اپنے گھر میں پنپنے دیتا ہے۔ کیا اسلام کے

---

[1] أصول مذهب الشيعة: 932/2. [2] المنتظم: 39,38/7. [3] أصول مذهب الشيعة: 937/2.

[4] فروع الكافي: 10/2، وأصول مذهب الشيعة: 937/2.

عظیم ہیرو، خیبر شکن، شیرِ خدا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟

عام عربی النسل شخص بھی اپنی اور اپنے گھر کی عزت و ناموس کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے، کجا یہ کہ بنو ہاشم کے بارے میں ایسی گھناؤنی باتیں کی جائیں جو سادات العرب اور بڑے عالی نسب تھے، جوانمردی اور غیرت اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ بھلا وہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی کے بارے میں اس قسم کی بدترین بات کہہ سکتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ تو ساری دنیا میں اسد اللہ یعنی اللہ کے شیر کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ مسلمین کو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں، دیگر خلفائے راشدین کے لیے اُن کی زندگی میں، دورِ خلافت میں اور پھر وفات کے بعد بھی محبت و احترام کے تعلق کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ دورِ خلافت میں سمع و طاعت، باہمی محبت، باہمی تعظیم اور قدر و منزلت، پسند و ناپسند میں شرکت، پیش آنے والے مصائب میں مشاورت کا تعلق اس قدر روشن ہے کہ کور باطن مخالفین کے سوا سب کو بخوبی نظر آتا ہے۔[2] امام سفیان ثوری فرماتے ہیں: عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی محبت صرف شریف النفس لوگوں ہی کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔[3] حضرت انس بن مالک فرماتے تھے: جو لوگ کہتے ہیں کہ کسی دل میں بیک وقت عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی وہ جھوٹ بولتے ہیں، الحمد للہ! اللہ عز و جل نے اِن دونوں کی محبت ہمارے دلوں میں بیک وقت پیدا کی ہے۔[4]

---

[1] مؤتمر النجف للسویدی، ص: 86، بحوالہ: أصول مذہب الشیعۃ: 937/2. [2] الشریعۃ للآجری: 2312/5، اس کی سند صحیح ہے۔ [3] حلیۃ الأولیاء: 32/7. [4] الشریعۃ للآجری: 2312/5، اس کی سند صحیح ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بحیثیت خلیفہ بیعت
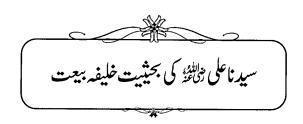
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت بحیثیت خلیفہ منتخب ہونے کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔ ارد گرد کے علاقوں سے آنے والے اور مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے باغی اور فسادی لوگوں نے، جو دین سے یکسر خارج ہوگئے تھے، خلیفۂ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو جھوٹ، ظلم اور زیادتی کی بنیاد پر شہید کردیا، یہ المناک واقعہ سن پینتیس ہجری میں 18 ذوالحجہ کو جمعہ کے دن پیش آیا۔[1] مدینہ میں اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو شخصیات موجود تھیں انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، کیونکہ اُس وقت بالاطلاق اُن سے افضل کوئی نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کسی نے بھی اپنی ذات کو امامت و خلافت کا حق دار نہیں سمجھا۔ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اس منصب کے آرزو مند نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مدینہ میں موجود صحابہ کرام کے زبردست اصرار پر منصب خلافت قبول کیا۔ آپ دنیاوی شان وشوکت اور جاہ و جلال سے دور بھاگتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کو یہ خوف لاحق ہوگیا مبادا امت میں فتنے بڑھ جائیں اور انتشار کی وبا پھوٹ پڑے، اس لیے امت مسلمہ کی بھلائی اور یک جہتی کے لیے آپ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

لیکن اس کے باوجود آپ بعض جاہلوں کی تنقید سے محفوظ نہ رہ سکے۔ جب کہ آپ کو جنگ جمل اور جنگ صفین جیسے الم ناک واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلام کے دشمن ابن سبا

[1] الطبقات لابن سعد: 31/3.

اور اُس کے پیروکاروں نے حق اور ہدایت سے روگردانی کے باعث فتنے کی آگ اور زیادہ بھڑکائی۔

بعض اہل علم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب اور بیعت کے حوالہ سے پیش آمدہ احوال اس طرح بیان کیے ہیں:[1]

محمد بن الحنفیہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا جبکہ حضرت عثمان محصور تھے، ایک آدمی اُن کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ دردناک خبر سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے خوف کے مارے اُن کا دامن تھام لیا اور انھیں روکنے کی کوشش کی۔ انھوں نے غصے سے فرمایا: ہٹو! پھر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر گئے۔ اس وقت تک وہ اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ چکے تھے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر تشریف لے گئے اور اُنھوں نے گھر کا دروازہ بند کرلیا، اسی دوران لوگ بھاگے بھاگے آئے۔ انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا تو وہ اندر چلے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کردیے گئے ہیں۔ اب امت مسلمہ کو فوری طور پر خلیفہ برحق کی ضرورت ہے۔ ہمارے علم کے مطابق اس وقت آپ سے زیادہ کوئی فرد اس منصب کا حق دار نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے امیر بننے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں امیر کا مددگار بنوں۔ ان سب نے کہا: اللہ کی قسم! آپ سے زیادہ ہم کسی کو اہل اور حقدار نہیں سمجھتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تمھیں اصرار ہے تو میری بیعت یہاں مخفی طریقے سے نہیں ہوگی۔ میں مسجد کی طرف چلتا ہوں۔ وہاں سب لوگوں نے آپ کی بیعت کی اور آپ کو اپنا خلیفہ چن لیا۔[2]

ایک اور روایت میں سالم بن ابی الجعد، محمد بن الحنفیہ سے یہ عبارت نقل کرتے ہیں:

---

[1] عقيدة أهل السنة فى الصحابة الكرام: 677/2. [2] كتاب السنة لأبى بكر الخلال، ص: 415.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اصحاب رسول آئے۔ انھوں نے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے ہیں۔ امت کے لیے ایک امام وقائد کا ہونا ضروری ہے۔ اس منصب کا آپ سے زیادہ اہل اور حق دار ہمیں کوئی نظر نہیں آرہا جو آپ سے بڑھ کر قدیم الاسلام ہو یا آپ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی تعلق رکھنے والا ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا نہ کرو، میرے امیر بننے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں امیر کا مددگار بنوں۔ اُن سب نے کہا: ہم آپ کی بیعت کے سوا اور کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا اصرار دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر مسجد میں چلو! اگر میری ہی بیعت کرنی ہے تو یہ خفیہ نہیں ہوگی۔ اس میں تمام مسلمانوں کی رضامندی شامل ہونی چاہیے۔ سالم بن ابی الجعد کہتے ہیں کہ اُس موقع پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مجھے اچھا نہیں لگتا کہ مسجد میں شور برپا ہو، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں مانے۔ آپ نے مسجد میں جانے ہی پر اصرار کیا، جب لوگ مسجد میں داخل ہوئے تو تمام مہاجرین وانصار آگئے، انھوں نے آپ کی بیعت کی اور پھر تمام لوگوں نے بیعت کی۔ [1]

اسباق وفوائد

مذکورہ صحیح احادیث سے جو اسباق عبرت اور فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

1. حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان کی حفاظت کے لیے مسلسل سینہ سپر رہے۔ آپ نے ان کی نصرت اور دفاع، تواتر سے جاری رکھا، بلکہ انھوں نے تمام لوگوں سے زیادہ آگے بڑھ کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع کیا، یہ حقیقت بہت سی روایات سے ثابت ہے۔ مروان بن حکم نے اس کی شہادت دیتے ہوئے کہا: تمھارے صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہمارے صاحب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کسی نے دفاع نہیں کیا۔ [2]
2. حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے بے نیازی، اس کی طمع نہ کرنا، اپنے گھر چلے جانا اور اکیلے

[1] کتاب السنة للخلال، ص: 416، اس کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ [2] بیعة علی بن أبی طالب لأم مالك الخالدی، ص: 2، بحوالہ: تاریخ الإسلام، عهد الخلفاء الراشدین، ص: 460، اس کی سند قوی ہے۔

بیٹھ رہنا آپ کی بے لوثی کی دلیل ہے۔ حتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے بیعت کی درخواست کی۔

③ مدینہ میں عام لوگوں اور مہاجرین و انصار صحابہ کا آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اتفاق تھا۔ ان میں اہل حل وعقد بھی شامل تھے، انھی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رُخ کیا اور اُن سے مطالبہ کیا کہ وہ بیعت کے معاملہ میں موافقت فرمائیں۔ انھوں نے اس پر بے حد اصرار کیا یہاں تک کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ منصب قبول فرمالیا۔ یہ سب کچھ نہ تو قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کی وجہ سے ہوا، نہ لوگوں کے شوروغوغا کے باعث ہوا، جیسا کہ بعض ضعیف اور من گھڑت روایات میں بتایا گیا ہے۔

④ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت تمام لوگوں سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے۔ تمام صحابہ کا اُن کی جانب رُخ کرنا اور اصرار کرنا اس حقیقت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ انھوں نے صراحت سے کہا کہ آپ سے زیادہ خلافت کا حق دار کوئی نہیں۔

⑤ خلافت کی زبردست اہمیت معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر چننے میں جلدی کی۔ اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے: اگر مجھے اللہ کے دین کا ڈر نہ ہوتا تو میں اُن کی بات کبھی قبول نہ کرتا۔ [1]

⑥ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے حوالہ سے جو شکوک وشبہات پیش کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جن خوارج نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا تھا ان میں سے بعض ان کی شہادت میں شریک تھے اور یہ لوگ مدینہ منورہ ہی میں موجود تھے اور انھی لوگوں نے بیعت کی ابتدا کی۔ نیز حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے مجبوراً بیعت کی۔ یہ سب مؤرخین کے بے اصل اور من مانے اقوال ہیں۔ ان کی کوئی بنیاد نہیں۔ نہ وہ کسی صحیح سند سے ثابت ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس وقت لوگوں کا پیمانۂ نظر بہت بلند تھا، لہٰذا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے بعد

[1] فتح الباري: 13/75، اس کی سند صحیح ہے۔ وبیعة علی، ص: 105.

انھیں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آئی جو علم، تقویٰ، دین، سبقت فی الاسلام اور جہاد میں ان سے زیادہ قدر و منزلت والی ہو۔ اب مہاجرین اور انصار کی نظریں سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر جم گئیں۔ انھوں نے تمام مسلمانوں کے ساتھ مل کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے خلافت کی انتہائی اہم ذمہ داری سنبھالنے کی درخواست کی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بڑے دور اندیش مدبر تھے۔ فوراً بھانپ گئے کہ اگر انھوں نے اسی وقت بار خلافت سنبھالنے کا فرض نہ نبھایا تو پورے عالمِ اسلام میں انتشار پھیل جائے گا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں جلدی نہ کی جاتی تو بہت بڑا فتنہ برپا ہو جاتا۔ پوری اسلامی مملکت میں اختلاف کا زہر پھیل جاتا، مسلمانوں کے لیے فلاح کا تقاضا یہی تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کا معاملہ قبول کر لیں، چاہے حالات کیسے ہی ہوں۔ پھر مدینہ منورہ میں موجود صحابہ کرام میں سے کوئی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ فتنہ پرور لوگوں نے ان کی بیعت اور بصرہ کی طرف ان کی معیت میں جانے کے معاملے کو گڈمڈ کر دیا ہے، صورت حال یہ بنی کہ تمام مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی البتہ اُن کے ساتھ بصرہ کو روانگی کا معاملہ اجتہادی مسئلہ تھا۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی پر لازم قرار نہیں دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ نکلے، اس کی تفصیل واقعہ جمل کے حوالہ سے آگے آ رہی ہے۔

⑦ بعض ایسے نام نہاد مؤرخوں کی مبالغہ آرائی سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد پانچ دن تک مدینہ کا امیر غافقی بن حرب رہا، جبکہ اس دوران اہل مدینہ مناسب خلیفہ کے انتخاب کی کوششیں کرتے رہے۔[2]

ایسے لوگ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ مصر سے آنے والے فتنہ بازوں نے حضرت علی کو منصب امارت کی پیش کش کی لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ کوفہ کے خوارج نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو خلافت پیش کرنا چاہی لیکن وہ مل نہ سکے اور بصرہ سے آنے والوں نے حضرت

[1] المدينة النبوية لمحمد شراب: 311/2. [2] تاريخ الطبري: 432/4.

طلحہ رضی اللہ عنہ کو بیعت لینے کی پیش کش کی لیکن صحیح روایات کے بالمقابل یہ باتیں ثابت نہیں۔ ان کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔[1]

اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ پر اپنا مکمل کنٹرول قائم رکھا، اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انھیں بلوائیوں کے خلاف طاقت کے استعمال سے نہ روکتے تو وہ باغیوں کا بھی خاتمہ کر سکتے تھے۔ میں نے یہ ساری تفصیلات اپنی کتاب «تسیر الکریم المنان فی سیرۃ عثمان بن عفان» میں بیان کردی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت مسلمانوں کی کامل رضامندی سے ہوئی، فتنہ پرور لوگوں کا ان کی بیعت میں کوئی کردار نہیں تھا۔ مدینہ میں موجود تمام صحابہ کرام[2] نے بالاتفاق امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔

⑧ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے متعلق صحیح روایات کی تعداد گیارہ تک پہنچتی ہے۔[3] اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آرہی ہے۔

حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی

ابو بشیر العابدی سے روایت ہے، انھوں نے بتایا: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، میں مدینہ میں تھا۔ تمام مہاجرین و انصار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے۔ ان میں طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ ان سب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گزارش کی: اے ابوالحسن! آیئے! ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ تو انھوں نے فرمایا: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں، جسے تم منتخب کرو گے میں بھی اس پر راضی ہوجاؤں گا۔ اللہ کی قسم! وہ

---

[1] استشهاد عثمان و وقعة الجمل لخالد الغيث، ص: 136-140. [2] استشهاد عثمان، ص: 240.

[3] بيعة علي بن أبي طالب، ص: 122.

سب بیک زبان ہو کر بولے: ہم آپ کے سوا کسی کو اپنا خلیفہ منتخب نہیں کریں گے۔ [1]
اس روایت میں بہت واضح اور جامع طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے متفقہ بیعت کا ذکر ہے۔
اس بارے میں روایات بہت ہیں، ان میں سے بعض ابن جریر نے اپنی تاریخ میں بیان کی ہیں۔ [2] اور یہ سب روایات صحابہ کرام کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی بیعت ہونے پر دلیل ہیں۔ صحابہ کرام طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما سمیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر متفق تھے۔ بعض روایات میں جو یہ کہا گیا ہے کہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے مجبوراً بیعت کی تھی تو یہ بات صحیح نہیں اور ثابت بھی نہیں ہے۔ صحیح روایات اس کے برعکس ہیں۔ [3] طبری نے عوف بن ابی جمیلہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے محمد بن سیرین سے سنا، وہ فرماتے تھے: حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور طلحہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اپنا ہاتھ آگے کیجیے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔ اس پر طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ بیعت کے زیادہ حق دار ہیں، آپ ہی امیر المؤمنین ہیں، اپنا ہاتھ آگے کیجیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ان کی بیعت کر لی۔ [4]

عبد خیر الخیوانی روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ان دونوں آدمیوں طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی؟ انھوں نے کہا: جی ہاں۔ [5] محقق امام ابن العربی نے اس بات کو قطعاً غلط ٹھہرایا ہے کہ حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے مجبوراً بیعت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات ان کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شایان شان نہیں ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ خود حضرت طلحہ نے فرمایا ہے: ''میں نے اس حال میں بیعت کی کہ تلوار میری گردن پر رکھی تھی۔'' تو ہم جواب دیں گے کہ یہ من گھڑت

---

[1] تاریخ الطبري: 449/5، یہ روایت حسن لغیرہ ہے۔ وحملة رسالة الإسلام الاولون لمحب الدین الخطیب، ص: 57. [2] تاریخ الطبري: 448/5-450، ان روایات کو جمع کر کے ان کی تحقیق و تخریج ڈاکٹر محمد أمحزون نے کی ہے۔ وتحقیق مواقف الصحابة: 59/2-75. [3] الانتصار للصحب والآل، ص: 236. [4] تاریخ الطبري: 456/5. [5] تاریخ الطبري: 517/5.

بات ہے جسے بلا سوچے سمجھے تراشا گیا ہے۔ اور جس نے حضرت طلحہ کی نسبت یہ کہا ہے کہ ان کا بیعت کرنے والا ہاتھ بیمار ہاتھ ہے اور معاملہ انجام کو نہیں پہنچ سکے گا۔[1] دراصل اس قول کے قائل کا گمان یہ ہے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ پہلی شخصیت تھے جنھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔

جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرنے والا ہاتھ تو مسلمانوں کو ناپسندیدہ صورتِ حال سے بچانے کی علامت بن گیا تھا۔ الحمد للہ! بیعت کا معاملہ بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔ بعد ازاں تقدیر نے اپنا فیصلہ نافذ کر دیا۔[2] وہ روایات جن میں یہ کہا گیا ہے کہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کو بیعت پر مجبور کیا گیا، صریحاً غلط ہیں۔[3]

ایسی واضح صحیح روایات موجود ہیں جن میں ان دونوں حضرات کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کا ذکر ہے۔ ایک صحیح روایت جسے ابن حجر نے بیان کیا ہے۔[4] احنف بن قیس سے مروی ہے کہ سیدہ عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم نے احنف بن قیس کو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کا حکم دیا جب اس نے ان سے یہ مشورہ کیا کہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد وہ کس کی بیعت کرے؟[5]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اسلام میں سبقت، غیر معمولی فضیلت اور ان کی جانب سے کتاب و سنت کے کامل التزام، پوری مضبوطی سے اس پر عمل اور پہلے ہی خطبے میں شرعی اوامر و نواہی کے نفاذ کا عہد، وہ باتیں تھیں جن کی بنیاد پر کسی کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان کے امیر المؤمنین ہونے پر حرف گیری کر سکے۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلافت کے لیے زیر غور شخصیات میں سے ایک تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جن چھ شخصیات کا

---

[1] یہ اشارہ ہے ان بعض روایات کی طرف کہ طلحہ اولین شخصیت ہیں جنھوں نے علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، ان کا دایاں ہاتھ جنگ احد والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرتے ہوئے شل ہو گیا تھا تو ایک آدمی نے کہا کہ امیر المؤمنین پہلے ہی بیعت بیمار ہاتھ سے ہوئی، یہ معاملہ صحیح انجام کو نہیں پہنچے گا۔ وتاریخ الطبری: 457/5، والبدایة والنهایة: 237/7. [2] العواصم من القواصم، ص: 149,148. [3] استشهاد عثمان، ص: 141. [4] فتح الباري: 38/13. [5] استشهاد عثمان، ص: 141، والمصنف لابن أبی شیبة: 118/11. اس روایت کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں صحیح قرار دیا ہے: 34/13۔

اشارہ دیا تھا ان میں ان کو بھی نامزد فرمایا تھا۔ شوریٰ کے لیے چار حضرات: عبدالرحمٰن بن عوف، سعد، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم نے اپنے حق سے دستبرداری کا اعلان کرتے ہوئے حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما دونوں کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا۔ اہل شوریٰ کا اس پر اجماع تھا کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ موجود نہ ہوتے تو خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے تھی۔ پھر حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ایسے ہی ہوا۔ جبکہ اہل مدینہ نے انھیں ترجیح دی تو وہ خلافت کے مستحق قرار پائے کیونکہ اس وقت موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان سے زیادہ خلافت کا اہل اور حق دار کوئی نہ تھا، وہ اسلام کے سابقین اور اولین مہاجرین میں سے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد تھے، اس پر مزید یہ کہ علمی فضیلت، اہلیت اور صلاحیت میں وہ جس عالی رتبے پر فائز تھے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا علم و فضل، ان کی بہادری، قوتِ فیصلہ، ذہانت اور عدالتی فیصلوں میں ان کی زبردست سوجھ بوجھ اپنی وضع کی ایک نادر مثال تھی۔ بڑے اہم اور نازک مواقع پر ان کے مختلف مواقف ان کے غیر معمولی علمی رسوخ، ان کے حزم و احتیاط اور حق کے بارے میں ان کی بے باکی اور پختگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان تمام عوامل واسباب نے زندگی کے ان حساس لمحات میں ان کو مسلمانوں کی امامت وخلافت کے لیے غیر متنازع اور موزوں ترین شخصیت کی حیثیت سے خلافت کی مسند پر لا بٹھایا۔ تمام مہاجر و انصار صحابہ نے متفقہ طور پر ان کی بیعت کرکے ان کی خلافت کے برحق ہونے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع

تمام اہل سنت والجماعۃ کا اس حقیقت پر اجماع ہو چکا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مہاجرین و انصار کی بیعت کے نتیجہ میں منصب خلافت پر مامور ہوئے کیونکہ مدینہ میں موجود تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انھی کو سب سے زیادہ اہل اور جامع الفضائل

[1] تحقیق مواقف الصحابة فی الفتنة: 92,91/2.

قرار دیا، وہ اسلام میں سبقت لے جانے والے، علم میں بلند مقام پر فائز، نسبی طور پر نبی ﷺ کے نہایت قریبی عزیز، فی ذاتہ نہایت بہادر شخص، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ مناقب والے، سب سے افضل و اعلیٰ مقام و مرتبے والے اور صورت و سیرت میں رسول اللہ ﷺ سے بہت مشابہت رکھنے والے تھے۔

مدینہ میں موجود تمام صحابہ کرام نے بالاجماع ان کی خلافت پر بیعت کی، وہ اس وقت امام برحق تھے، تمام لوگوں پر ان کی اطاعت واجب ہو چکی تھی، ان کے خلاف خروج اور ان کی مخالفت حرام قرار دے دی گئی تھی۔

اہل علم کی کثیر تعداد نے ان کی خلافت پر اجماع کو نقل کیا ہے۔

① جو اصحابِ نبی ﷺ مدینہ میں موجود تھے اور دین میں سبقت کے ساتھ ساتھ سچی عزت و سرفرازی کی شان والے تھے، محمد بن سعد رحمہ اللہ نے ان کی جانب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اجماع نقل کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے اگلے روز حضرت علی کی بیعت ہوئی، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید بن عمرو بن نفیل، عمار بن یاسر، اسامہ بن زید، سہل بن حنیف، ابو ایوب انصاری، محمد بن مسلمہ، زید بن ثابت، خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہم اور مدینہ میں موجود تمام اصحاب نے ان کی بیعت کی۔[1]

② ابن قدامہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ عبدالرزاق سے، انھوں نے محمد بن راشد سے اور انھوں نے عوف سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے حضرت ابو موسی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے پر بُرا بھلا کہا تو حضرت حسن غضبناک ہو گئے۔ پھر فرمایا: سبحان اللہ! امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے ہیں، تمام لوگوں میں سب سے اچھی شخصیت کی بیعت کے لیے لوگ جمع ہوئے ہیں، کیا ابو موسیٰ کو اس پر ملامت کیا جا رہا ہے![2]

[1] الطبقات الکبرى: 31/3. [2] منهاج القاصدين فى فضل الخلفاء الراشدين، ص: 78,77، بحوالہ: «عقيدة أهل السنة فى الصحابة»: 689/2.

③ ابو الحسن الاشعری کہتے ہیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد صحابہ کرام میں سے اہل حل وعقد کی جانب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کو ہم صحیح اور ثابت سمجھتے ہیں کیونکہ تمام اہل شوریٰ ان کے علم وفضل اور فیض وفضیلت پر متفق تھے، اپنے سے پہلے خلفاء کے ادوار میں انکا خلافت کا دعویٰ نہ کرنا بالکل درست تھا کیونکہ انھیں علم تھا کہ ابھی ان کی خلافت کا وقت نہیں آیا لیکن جب خلافت ان کے سپرد کردی گئی تو انھوں نے علانیہ بیعت لی اور لوگوں کی کتاب وسنت کے مطابق اسی طرح صحیح اور مخلصانہ رہنمائی کی جس طرح پہلے خلفاء اور عدل کے ائمہ سرانجام دے رہے تھے۔ ان چاروں خلفاء کی عظمت و فضیلت اور ان کے عدل پر پوری امت کا اجماع ہے۔[1]

④ امام غزالی فرماتے ہیں: ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اوّلیت پر تو اجماع تھا، بعد ازاں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر کو نامزد کیا، پھر صحابہ نے حضرت عثمان پر اجماع کیا اور آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی اجماع کیا، ان میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اللہ کے دین میں خیانت کر سکتے ہیں۔ صحابہ کرام کا خلفائے راشدین کی خلافت پر اجماع، خلفائے راشدین کی فضیلت وشرف میں ترتیب کی بہترین دلیل ہے۔ اہل سنت کے نزدیک ان کی فضیلت کی یہی ترتیب ہے۔ بعدازاں جب اس بارے میں تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اور اہل اجماع کے ہاں اس ترتیب کی سند اور دلیل موجود تھی۔[2]

⑤ ابوبکر بن العربی کہتے ہیں: اللہ کے فیصلے اور تقدیر کے مطابق جو ہونا تھا ہوا، معلوم ہو گیا کہ حق لوگوں کو مہمل ہی نہیں چھوڑ دے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد امت کو ایسے خلیفہ کی ضرورت تھی جو صاحبِ فکر ونظر ہو، تینوں خلفاء کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا علم اور تقویٰ کہیں اور نہ تھا، لہٰذا سب نے ان کی بیعت کی، بیعت میں اگر جلدی نہ کی جاتی تو اوباش لوگوں نے جس فتنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا اسے روکنا ناممکن ہو جاتا، لیکن مہاجرین و

---

[1] الإبانة عن أصول الديانة، ص: 78. [2] الاقتصاد في الاعتقاد، ص: 154.

انصار کے عزم اور بہت نازک حالات و واقعات کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ ﴿1﴾

⑥ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متفقہ طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: ''تم پر میری اور میرے بعد ہدایت پر قائم خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے۔ اسے مضبوطی سے تھام لو اور دین میں نئی نئی باتوں سے بچو، کیونکہ ہر نئی بات گمراہی ہے۔'' ﴿2﴾

اہل سنت کے تمام علماء، امراء، عبادت گزار اور مجاہدین اس ترتیب پر متفق ہیں: ابوبکر، عمر، عثمان، اور پھر علی رضی اللہ عنہم۔ ﴿3﴾

⑦ امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت سن پینتیس ہجری کو ماہ ذوالحجہ کے اوائل میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہوئی۔ مہاجرین و انصار اور مدینہ میں موجود دیگر تمام صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کی، حضرت علی کی بیعت کا حکم نامہ پوری اسلامی ریاست میں بھیج دیا گیا اور سب لوگوں نے حضرت علی کی فرمانبرداری کی، البتہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل شام سمیت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔ ان کے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ ﴿4﴾

بیعت پر اجماع کے حوالے سے علمائے کرام کے اقوال سے جو استفادہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی امت مسلمہ کے بہترین لیڈر تھے۔ ان کی بیعت برحق، بروقت اور صحیح طور پر ہوئی۔ ﴿5﴾

خلافت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اجماع کے متعلق بعض لوگوں نے کئی وجوہ کی بنا پر اعتراض کیا ہے، مثلاً:

﴿1﴾ العواصم من القواصم، ص: 142. ﴿2﴾ سنن أبي داود، حديث: 4607، وجامع الترمذي، حديث: 2676، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ﴿3﴾ الوصية الكبرى، ص: 23. ﴿4﴾ فتح الباري: 72/7. ﴿5﴾ عقيدة أهل السنة والجماعة فی الصحابة: 293/2.

① صحابہ کرام کی ایک جماعت بیعت سے پیچھے رہی جن میں سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ، ابن عمر، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم اور دیگر ان جیسے حضرات شامل ہیں۔ [1]

② لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت اس لیے کی کہ وہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیں۔ [2]

③ اہل شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے آپ کی بیعت نہیں کی بلکہ آپ کے خلاف قتال کیا۔ [3]

مذکورہ اجماع کے بالمقابل اعتراضات کی ان وجوہ کی ہرگز کوئی حیثیت نہیں، متعدد وجوہ کی بناء پر ان کو رد کیا گیا ہے۔

پہلی وجہ

یہ دعویٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک جماعت بیعت سے پیچھے رہی، صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کی بیعت سے کوئی پیچھے نہیں رہا تھا، البتہ وہ حضرات ان کی نصرت سے پیچھے رہے جن میں سے بعض حضرات کا اوپر ذکر آچکا ہے، کیونکہ یہ اجتہادی مسئلہ تھا۔ ہر ایک کی اپنی اجتہادی رائے تھی، جس کی جو بھی سوچ تھی اس نے اسی پر عمل کیا۔ [4]

البتہ ابن خلدون نے جو یہ کہا ہے: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر لوگ مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں حاضر نہیں ہو سکے۔ اور جو موجود تھے ان میں سے بعض نے بیعت کی اور بعض نے توقف کیا، تا کہ تمام لوگ اکٹھے اور ایک خلیفہ پر متفق ہو جائیں جیسے سعد بن ابی وقاص، سعید اور ابن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ [5]

ابن خلدون کی یہ تحریر ان کی طرف سے مبالغہ آرائی ہے۔ جہاں تک سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے تو ابن سعد، ابن حبان اور ذہبی وغیرہ نے ان کی بیعت کا واقعہ نقل کیا ہے۔ [6] اسی طرح باقی صحابہ کرام تھے، انھوں نے بھی بیعت کی جیسا کہ ہم نے ان کے بارے

[1] العواصم من القواصم، ص: 147,146. [2] العواصم من القواصم، ص: 145. [3] عقيدة أهل السنة والجماعة فی الصحابة: 2/295. [4] التمهيد للباقلانی، ص: 234,233، والعواصم من القراصم، ص: 147. [5] المقدمة، ص: 214. [6] الطبقات: 3/31، والثقات: 2/268، ودول الإسلام: 1/14.

میں اجماع کو نقل کیا ہے۔ خود ابن خلدون نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد مدینہ میں موجود تابعین کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے انعقاد اور تمام مسلمانوں پر اس کے لزوم پر اتفاق نقل کیا ہے۔ میں نے ابن خلدون کی تحریر اس لیے نقل کر دی ہے کہ بہت سے لکھاریوں اور محققین نے ان کی اسی تحریر پر اعتماد کیا ہے۔

دوسری وجہ

خلافت کا قیام اور امام کا تقرر اس قدر ضروری اور واجب کام ہے جس کے بغیر چارۂ کار نہیں، مگر پوری امت کے لیے اس کی خاطر حاضر ہونا ایک ناممکن بات ہے، اس شرط کو لازمی قرار دینا صحیح نہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے ایک واجب کی نفی ہوتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔ [1]

تیسری وجہ

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور بعض انصار کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے سے اجماع حاصل ہو گیا، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ دیگر صحابہ اس وقت موجود نہ تھے۔ اسی طرح سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، اسامہ بن زید، عمار رضی اللہ عنہم اور دیگر موجود بدری صحابہ کے بیعت کرنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع ہو گیا۔ بیعت سے غیر حاضر یا بیعت نہ کرنے والوں کی وجہ سے اس اجماع کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ کی قسم! حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت ہی کی مانند تھی۔ [2]

---

[1] منهاج القاصدين في فضل الخلفاء الراشدين، ص:77,76. [2] عقيدة أهل السنة في الصحابة: 696/2.

چوتھی وجہ

یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت اس لیے کی گئی کہ وہ قاتلینِ عثمان سے بدلہ لیں گے۔ بیعت کی شرائط میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے حضرت علی کی بیعت اس بات پر کی کہ وہ حق پر مبنی حکومت کے امور انجام دیں گے اور عادلانہ فیصلے کریں گے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ خون کا طالب حاضر ہو، مطلوب بھی موجود ہو۔ دعویٰ پیش کیا جائے اور اس کا جواب دیا جائے، پھر اس پر دلیل و حجت قائم ہو اور پھر اس کے بعد فیصلہ صادر کیا جائے۔[1]

بعض روایات میں جو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ طلحہ، زبیر اور بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے لیے حدود قائم کرنے کی شرط لگائی تھی، تو اس کی سند ضعیف ہے۔ مزید برآں اس کے متن پر بھی اعتراض کیا گیا ہے۔[2] اس بارے میں ابن العربی کہتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں نے بیعت کے لیے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ قاتلینِ عثمان سے بدلہ لیں گے تو ہماری رائے میں بیعت کے معاملے میں اس قسم کی شرط لگانا صحیح نہیں ہے۔[3]

پانچویں وجہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کی خلافت پر کوئی لڑائی نہیں کی، نہ ان کی امامت و قیادت کا انکار کیا۔ ان کی لڑائی کا سبب ان کی یہ خواہش تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں جو بھی شریک ہے اس پر شرعی حد نافذ کی جائے۔ وہ اپنی اجتہادی رائے کو صحیح سمجھتے تھے، لیکن وہ اپنے اس اجتہاد میں غلطی پر تھے، تاہم انھیں ان کے اجتہاد کا اجر ملے گا۔[4] صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا اختلاف قاتلینِ عثمان ہی کے حوالے سے تھا۔ انھوں نے خلافت کے معاملہ میں ان سے کوئی اختلاف نہیں کیا بلکہ وہ اس کو تسلیم کرتے تھے۔

---

[1] عقيدة أهل السنة في الصحابة: 696/2. [2] تاريخ الطبري: 460,459/5. [3] العواصم من القواصم، ص: 150. [4] العواصم من القواصم، ص: 150.

ابومسلم خولانی سے روایت ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: آپ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیا تنازع ہے؟ کیا آپ خود کو ان جیسا سمجھتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: نہیں، اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے افضل ہیں اور مجھ سے زیادہ خلافت و امارت کے حقدار ہیں، لیکن کیا تمھیں معلوم نہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نہایت مظلومیت کی حالت میں شہید کر دیئے گئے، میں ان کا چچازاد ہوں اور ان کے خون کا دعویدار ہوں۔ تم لوگ ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ وہ قاتلینِ عثمان میرے حوالے کریں، میں ان کی اطاعت کے لیے تیار ہوں۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے بات کی تو انھوں نے قاتل ان کے حوالہ نہیں کیے۔ (1)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ دونوں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کس بات پر تنازع ہے؟ اللہ کی قسم! وہ آپ سے اور آپ کے والد سے زیادہ قدیم الاسلام ہیں اور آپ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین عزیز ہیں اور امارت و خلافت کے بھی آپ سے کہیں زیادہ حق دار ہیں۔ یہ سن کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ان سے میری لڑائی قاتلینِ عثمان کے حوالے سے ہے۔ انھوں نے ان قاتلوں کو پناہ دے رکھی ہے، تم دونوں ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ وہ قاتلینِ عثمان سے ہمیں قصاص لے کر دیں، پھر اہل شام میں سے میں پہلا شخص ہوں گا جو ان کی بیعت کرے گا۔ (2)

اس بارے میں علماء کے پاس بہت سی مشہور روایات ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مسئلہ خلافت میں کوئی جھگڑا نہیں کیا۔ (3) یہی وجہ ہے کہ اہل علم میں سے محققین نے اس مسئلے کو صراحت سے بیان کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (4) امام الحرمین الجوینی کہتے ہیں: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

(1) البداية والنهاية: 265/7، وتحقيق مواقف الصحابة: 147/2. (2) البداية والنهاية: 270/7، والانتصار للصحب والآل، ص: 239. (3) البداية والنهاية لابن كثير: 268/7-270. (4) الانتصار للصحب والآل، ص: 239.

لڑائی کی، لیکن وہ ان کی امامت کا انکار نہیں کرتے تھے۔ نہ خود اس کے دعویدار تھے، وہ صرف قاتلینِ عثمان کو حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ صحیح رائے پر ہیں لیکن ان کی اجتہادی رائے درست نہ تھی۔ [1]

ابن حجر ہیتمی کہتے ہیں: اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جو تنازعات رونما ہوئے، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ (کی خلافت) کے بارے میں نہیں تھے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلافت کے سب سے زیادہ اہل اور حق دار تھے۔ فی الجملہ حضرت علی کی خلافت پر کسی کو کوئی اختلاف نہ تھا، فتنے کا اصل سبب یہ تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل ان کے حوالے کر دیے جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے چچا زاد تھے، لیکن حضرت علی ان کا یہ مطالبہ پورا نہ کر سکے۔[2] عدم حوالگی کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا موقف اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے کا سبب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر کسی اعتراض کے حوالے سے نہ تھا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت کے دعویدار نہیں تھے، ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تنازع اور بیعت نہ کرنے کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ خود کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔ اور اس کا اقرار کرتے تھے۔ ان سے جو شخص بھی اس بارے میں سوال کرتا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ بس وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ سیدنا عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کے ساتھیوں سمیت سب لوگ یہ بات تسلیم کرتے تھے

[1] لمعة الأدلة فی عقائد أهل السنة والجماعة، ص: 115. [2] الصواعق المحرقة بحوالہ: الانتصار للصحب والآل، ص: 239.

کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل نہیں ہیں، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت، ان کی اسلام میں سبقت، ان کا علم، دینداری، بہادری اور دیگر تمام فضائل روز روشن کی طرح واضح اور معروف تھے۔[1] اس سے یہ ثابت ہوا کہ خلافت کے معاملہ میں کسی نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت نہیں کی، نہ ان کے مخالفین نے اور نہ کسی اور نے۔[2]

علمائے کرام کے یہ تمام اقوال خلافت راشدہ کی ترتیب میں اہل سنت والجماعہ کے عقیدے کا بیان ہیں۔ اس کا دفاع بہت ضروری ہے، اسی پر آنے والی نسلوں کی تربیت ہونی چاہیے اور یہ ترتیب ہی ہمارے لیے باعث اعزاز وافتخار ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت کی شرائط اور خطبہ خلافت

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیعت کے لیے چند شرائط مقرر کیں۔ ان میں سے پہلی شرط یہ تھی کہ بیعت برسرِ عام ہو، خفیہ نہ ہو، مسجد میں ہو اور مسلمانوں کی رضامندی کی بنیاد پر ہو۔ مزید برآں وہ سرکاری نظام اپنی صوابدیدی اور علم کے مطابق چلائیں گے، سب نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا اور اگلے روز صبح کے وقت مسجد میں آپ کی بیعت ہوئی۔ وہ ایک بھرپور دن تھا۔ امیر المؤمنین اپنے مکمل لباس میں تشریف لائے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد انھوں نے ان تمام کوششوں کا ذکر کیا جو پیش آمدہ حالات میں کی گئیں، آپ نے فرمایا: میں یہ ذمہ داری اٹھانا پسند نہیں کرتا تھا، تم نے اصرار کیا کہ میں ہی اس ذمہ داری کو اٹھاؤں، اس لیے میں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی لیکن تمھاری مدد کے بغیر میں یہ معاملات نہیں چلا سکتا، سنو! تمھارے مال کی چابیاں میرے پاس ہیں۔ میں اس میں سے ایک درہم بھی لینا جائز نہیں سمجھتا۔ پھر فرمایا: اے لوگو! امور مملکت میں تمھاری مرضی کے بغیر کسی کو تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں، گزشتہ روز بعض امور پر اختلاف

[1] مجموع الفتاوی: 35/72، 73. [2] الانتصار للصحب والآل، ص: 241.

ہوا تھا، اگر تم چاہو تو میں دستبردار ہو جاتا ہوں۔ اس صورت میں میرے دل میں کسی کے خلاف میل نہیں آئے گا۔ پھر آپ نے بہ آواز بلند پوچھا: کیا تم مجھ پر راضی ہو؟ تمام حاضرین بولے: جی ہاں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: اے اللہ! گواہ رہنا، بعد ازاں تمام لوگ آگے بڑھے اور ان کی بیعت کی۔ بیعت کے اختتام پر فرمایا: تم نے میری بیعت کی ہے جس طرح مجھ سے پہلے (تینوں) اصحاب کی بیعت کی تھی۔ اب جبکہ تم نے میری بیعت کر لی ہے تو تم نے اپنا اختیار میرے حوالے کر دیا ہے۔ امام (خلیفہ) پر لازم ہے کہ وہ استقامت کی راہ اختیار کرے اور رعیت کی ذمہ داری تسلیم و رضا ہے، اور یہ بیعت عام ہے۔[1]

گزشتہ مندرجات کے اسباق وفوائد
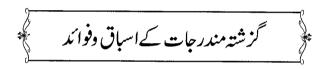
شوریٰ کا اصول

اس حقیقت کے باوجود کہ امت کو اس موقع پر شدید مشکلات لاحق تھیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے حالات بے حد سنگین ہو گئے تھے، امت مسلمہ نے اسلام کے سیاسی نظام کی پوری پابندی کی۔ چوتھے خلیفۂ راشد کی بیعت میں شوریٰ کے اصول پوری طرح برقرار رکھے۔ خلفائے راشدین کے دور کے معمولات ہی بروئے کار لائے گئے۔ بیعت کی تکمیل خاندانی یا قبائلی بنیادوں پر نہیں ہوئی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کسی عہد یا وصیت کی بنیاد پر ہوئی، اگر ایسی صورت حال ہوتی تو پیش آمدہ بحث و مباحثے کی نوبت ہی نہ آتی۔ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انکار کیا تو لوگوں کے پرزور اصرار پر یہ منصب

[1] تاریخ الطبری:5/448، 449، ودراسات فی عہد النبوۃ والخلافۃ الراشدۃ، ص:281، 282.

قبول فرما لیا۔ اس سے پہلے وہ اس ذمہ داری سے جان چھڑانے کی کوشش میں لگے رہے۔ تا آنکہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے قبول فرما لیا، لوگوں نے آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کی بنیاد پر بیعت کا مطالبہ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام اسے نافذ کرنے میں ہرگز کسی قسم کا تردد نہ کرتے۔ نہ ہی ان کی بیعت کی وجہ عبد مناف سے ان کا تعلق تھا، قریشی ہونے کی بنیاد پر بھی ان کا انتخاب نہیں ہوا بلکہ اس بنا پر ہوا کہ وہ سابقین اولین اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد شوریٰ کے وقت لوگوں کی طرف سے انتخاب کے سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اگلے نمبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت عثمان کو خلافت کے منصب پر فائز کر رہے تھے تو لوگ ان سے یہ پوچھ رہے تھے کہ اگر عثمان رضی اللہ عنہ موجود نہ ہوتے تو آپ کس کا انتخاب کرتے؟ اس پر وہ کہتے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا۔ [1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں اہل حل وعقد

ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے خلافت پر متمکن ہونے کے وقت عشرہ مبشرہ میں سے باقی اور اوس وخزرج کے قبائل کے سردار اہل حل وعقد میں شامل تھے۔ یہ سب مدینہ میں رہنے والے تھے اور علم وایمان میں راسخ ہونے کے علاوہ سابقین میں شمار ہوتے تھے۔ [2]

باپ بیٹے کا مکالمہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ خلافت کے انتخاب کا معاملہ، مدینہ منورہ میں باقی رہ جانے والے مہاجرین وانصار، اہل بدر میں سے اہل حل وعقد اور اصحاب شوریٰ طے کریں۔ حسن بن علی رضی اللہ عنہما یہ چاہتے تھے کہ اسلامی معاشرہ اور اجتماعیت کی نئی ترتیب وتنظیم میں نئے

[1] دراسات فی عهد النبوة والخلافة الراشدة، ص: 282. [2] الخلافة بین التنظیر والتطبیق لمحمود المرداوي، ص: 288.

پیش آمدہ امور کا لحاظ کیا جائے، یہ بات حسن بن علی رضی اللہ عنہما اور ان کے والد گرامی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک مکالمہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے آپ سے عرض کیا لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی، ہوسکتا ہے کل آپ کو کسی صحرا میں قتل کر دیا جائے اور کوئی آپ کا مددگار نہ ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: تم ابھی تک لڑکیوں کی طرح آہیں بھر رہے ہو، میں نے تمھاری کون سی بات نہیں مانی۔ حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے کہا: جس روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا تو میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ مدینہ سے چلے جائیں، ان کی شہادت کے وقت آپ یہاں موجود نہ ہوں۔ پھر ان کی شہادت کے روز میں نے عرض کیا کہ اس وقت تک بیعت کا سلسلہ شروع نہ فرمائیں جب تک اردگرد کے مختلف شہروں اور علاقوں سے وفود نہ آن پہنچیں۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مختلف علاقوں کے وفود آنے تک بیعت نہ کرنے کا جو کہا گیا، اس بارے میں ہم نے اہل مدینہ کی موجودگی پر اکتفا کیا تاکہ امت میں انتشار پیدا نہ ہو اور بوجہ تاخیر نقصان نہ اٹھانا پڑے۔[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ اہل مدینہ کے مہاجرین و انصار کے علاوہ اور حضرات کی طرف سے بھی بیعت جائز ہے لیکن وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء کے بعد کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو ان کے طریق کار اور منہج سے ہٹ کر ہو، یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اہل مدینہ کے علاوہ باہر کے قبائل کے لیے مسلمان حاکم کے انتخاب کا معاملہ ابھی تاخیر کا شکار نہیں ہوا، لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ معاملہ مدینہ کے مہاجرین و انصار کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔[3] اس پر دلیل یہ ہے کہ اہل کوفہ نے ان کی خدمت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کا معاملہ بھی پیش کیا تو انھوں نے فرمایا: نہ میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں، نہ ہی میں اس کا حکم دیتا ہوں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ سے باہر کے لوگوں کے لیے حاکم کے انتخاب میں جواز موجود ہے۔

---

[1] البدایة و النهایة: 245/7. [2] البدایة و النهایة: 245/7. [3] الخلافة بین التنظیر والتطبیق، ص: 294,293.

حضرت حسن اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان مذکورہ مکالمہ کے نتیجہ میں ذیل کے امور ثابت ہوئے۔

(ا) دونوں فریقوں کا بحث ومباحثہ کے دوران ایک دوسرے کی رائے کا احترام۔

(ب) امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے اپنے صاحبزادے کے لیے نرمی کا معاملہ۔

(ج) صاحبزادے نے جو صحیح سمجھا اسے واضح طور پر والد گرامی کی خدمت میں عرض کر دیا۔

(د) امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ہر بات دلائل کے ساتھ پوری توجہ سے سنی۔

(ہ) تمام دلائل کا جواب یکے بعد دیگرے علمی اسلوب پر دیا۔[1]

خلیفہ کا منصب خالی نہ رہے

مدینہ میں موجود انصار ومہاجرین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو باصرار راضی کیا کہ خلافت کا منصب قبول فرمالیں تاکہ امت اسلامیہ فساد اور اختلاف و انتشار کا شکار نہ ہوجائے، لہٰذا انھوں نے یہ منصب قبول کرلیا اور باغیوں کے شوروشغب سے بچنے کے لیے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے انھوں نے یہ شرط عائد کی کہ بیعت مسجد میں علانیہ طور پر ہو، اس طرح اہل حل وعقد امامت وقیادت کے مسائل طے کرتے رہیں گے اور عام لوگ عمومی اور علانیہ بیعت کریں گے۔[2] انھوں نے برسر منبر اس اصولی بات کو تاکیداً طے کردیا اور صاف فرمایا: اے لوگو! تمھارے ان معاملات میں کسی اور کا کوئی حق نہیں ہے، جیسے تم کہو گے ویسا ہی ہوگا۔[3]

بیعت علی رضی اللہ عنہ پر رائے زنی کے حوالہ سے معاصر کتابوں کی تردید

شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے بارے میں بات کرتے ہوئے عقاد کا

---

[1] منهج علي بن أبي طالب في الدعوة إلى الله، ص: 428,427. [2] الدور السياسي للصفوة في صدر الاسلام للسيد عمر، ص: 72. [3] تاريخ الطبري: 449/5.

کہنا ہے: مختصر ہونے کے باوجود اس خبر نے مدینہ میں خلافت کے امیدواروں کا تعین کر دیا۔ خلافت کے مضبوط طلبگار طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما تھے، ان دونوں نے بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اس کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ قریشی اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ کوئی ہاشمی خلافت کی ذمہ داری پر فائز نہ ہو اور قوی امکان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس راہ سے ہٹا دیا جائے گا، جیسا کہ اس سے قبل ہٹایا جا چکا ہے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ترجیحی رائے یہ تھی کہ خلافت مذکورہ دونوں شخصیتوں میں سے کسی ایک کو ملے یا عبداللہ بن زبیر کو کیونکہ طلحہ قبیلۂ تیم سے ہیں اور زبیر ان کی بہن اسماء کے شوہر ہیں۔ یوں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے ان میں سے کسی ایک کی تائید پر امید کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ [1]

عقاد نے ایک اور مقام پر کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امام نے دوسروں کی بیعت کرنے کے لیے ناقابل برداشت دباؤ کا رد کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ ان کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت کا تعلق ایک ایسا وصف ہے جو انھیں خلافت کا حقدار بناتا ہے، کیونکہ ان کے نظریۂ و اعتقاد کے مطابق خلافت نبوت کی ایک شاخ کے مترادف ہے اور وہ شجرِ نبوت اور رسالت کا مقام نزول ہیں۔ [2]

عقاد نے مزید لکھا ہے: یہ بات معلوم و معروف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ وہ اپنے سابقین سے بھی زیادہ خلافت کے حق دار تھے۔ جب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے تو انھیں مسلسل اپنے حق سے محروم رکھا گیا۔

موضوع روایات کی بنیاد پر عقاد نے یہ اور اس قسم کے دیگر جھوٹے بہتان باندھے ہیں۔ بعدازاں خالد محمد خالد نے اپنی کتاب ''خلفائے رسول'' میں یہی اسلوب کلام اختیار کیا ہے

[1] عبقرية علی لعقاد، ص: 84. [2] عبقرية علی لعقاد، ص: 84.

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وہ کلام نقل کیا ہے جو افتراء پردازی ہے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق خلافت غصب کیا۔ خالد البیطار نے اپنی کتاب ''علی بن ابی طالب'' میں بھی خلافِ حقیقت بات کی ہے۔ اس میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا اپنے والد گرامی کی میراث کے حوالے سے موقف اور خلافتِ ابی بکر رضی اللہ عنہ سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف بیان کیا گیا ہے۔ [1]

یہ ریشہ دوانیاں ہیں۔ یہ فتنہ پروری کا ماحول بناتی ہیں اور لوگ اس میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔ انھی ریشہ دوانیوں میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہادتِ عثمان کے بعد خلافت سے دور ہٹانے کی اسی طرح کوشش کی گئی جیسا کہ (نعوذ باللہ) پہلے بھی ان کو اس منصب سے دور ہٹایا گیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تعصب کی بنیاد پر، بنی ہاشم کے خلاف، خود خلافت کے حصول کے لیے یا دنیاوی طمع کی خاطر سازش کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دوسروں کی بیعت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو زبردست دباؤ کا سامنا کرنا پڑا جبکہ وہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خلافت کے لیے راہ بھی ہموار کی اور لوگوں کے لیے انھیں محبوب شخصیت بنادیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتاً فوقتاً مختلف مواقع پر ان کو امیر مقرر کیا اور گاہے بگاہے انھیں اپنا جانشین بنایا۔ امام اور صحابہ کے درمیان کوئی گہرا رشتہ اور تعلق نہ تھا۔ پھر انھوں نے شیخین سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے خلافت پر قبضہ کرنے کی زیادتی کو معاف کردیا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد کی۔

یہ سب کچھ سفید جھوٹ ہے۔ یہ بہتان طرازی اور افتراء پردازی کے سوا کچھ نہیں، حق اور عدل سب اس سے انکاری ہیں، صحیح تاریخ بھی اسے نہیں مانتی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جو واضح گفتگو پہلے بیان کی جاچکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سابقہ تمام خلفاء کی

---

[1] علی بن أبی طالب لخالد البیطار، ص: 84.

افضلیت کا اعتراف کیا۔ جب وہ خود مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو برسر منبر خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت کا اعلان فرمایا کرتے تھے اور جو شخص انھیں دیگر خلفاء سے افضل قرار دیتا تھا اسے سزا کی وعید سناتے تھے، یہ سب کچھ صحیح سندوں سے ثابت ہے۔ وہ ان خلفاء سابقین کے معین و مددگار رہے تھے، ان کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے اور مخلصانہ محبت پر استوار تھے۔ محبت و رحمت کے یہ تعلقات اتنے پختہ تھے کہ تند و تیز آندھیاں اور طوفان بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔[1] من گھڑت خبروں اور ضعیف روایات کے حاملین، جن میں سے بعض کی اوپر مثال پیش کی گئی ہے، وہی ان کو بھڑکاتے تھے۔ اور ان لوگوں کا اس گڑھے میں گرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ تاریخ نویسی میں منہج اہل سنت سے ناواقف ہیں، وہ صحیح مصادر اور بے وقعت حوالوں کے درمیان فرق نہیں کرتے، وہ صحیح روایات اور ضعیف و من گھڑت روایات میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں، وہ اپنے تجزیوں میں من گھڑت روایات کا سہارا لیتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پہلا خطبہ

خلافت پر متمکن ہونے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا: **بیشک اللہ** تعالیٰ نے مبنی بر ہدایت کتاب نازل فرمائی ہے، اس میں خیر اور شر دونوں کا بیان ہے، خیر و بھلائی کو اختیار کرو اور شر کو چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرائض ادا کرو، وہ تمھیں جنت سے سرفراز کرے گا، اللہ تعالیٰ نے کچھ باتیں حرام قرار دی ہیں جو بالکل واضح ہیں۔ اس نے مسلمان کی عزت و حرمت کو تمام حرمتوں پر ترجیح دی ہے اور مسلمانوں کو اخلاص اور عقیدۂ توحید کی تاکید کی ہے۔ سچا مسلمان وہ ہے کہ حق کے سوا دیگر امور میں تمام مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ مسلمان کو اذیت دینا جائز نہیں۔ عوام کے مسائل حل کرنے میں دیر نہ کرو۔ موت کو ہر دم یاد رکھو۔ لوگ تمھارے آگے نکل چکے ہیں اور تمھارے پیچھے

[1] علی بن أبی طالب لخالد البیطار، ص: 130.

قیامت ہے۔ وہ تمھیں تیز چلانے کے لیے اکسا رہی ہے۔ اپنے بوجھ ہلکے رکھو، تم اگلے لوگوں سے جا ملو گے، کیونکہ لوگ پچھلوں کے منتظر ہیں۔ اللہ کے بندوں اور اس کے ملک کے بارے میں ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو، تم سے جوابدہی ہوگی حتی کہ زمین اور جانوروں کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا، اللہ کی اطاعت کرو، اس کی نافرمانی سے بچو، خیر و بھلائی دیکھتے ہی اسے فوراً اختیار کرلو، شر کو چھوڑ دو۔[1] ''یاد کرو وہ وقت جب تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا۔''[2]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ایک الم انگیز فتنے کے بعد عمل میں آئی، اس فتنہ کے دوران سابق خلیفہ مسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے، انھوں نے مسلمانوں کو خیر و بھلائی اختیار کرنے اور شر کو ترک کرنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی حرمت تمام حرمتوں سے بڑھ کر ہے، کسی حالت میں بھی کسی مسلمان کو اذیت دینا جائز نہیں۔ پھر آپ نے انھیں موت اور آخرت کی یاد دلائی اور انھیں تقویٰ، اطاعت اور نیک اعمال اختیار کرنے کی ترغیب دی۔[3]

خطبہ کا مرکز و محور عقیدہ، عبادت اور اخلاق کے موضوعات تھے۔ اس میں بعض مقاصد شریعت نہایت اہتمام کے ساتھ بیان فرمائے۔ ان کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے حاضرین کو تاکید فرمائی: اس عہد و میثاق کی طرف لوٹ آؤ جس پر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں قائم تھے۔ امیر المومنین نے حکمت و بلاغت کے ساتھ اس منہج اور طریقہ کار کی نشاندہی فرمائی جس کا سامنا عنقریب خلافت کے جدید دور میں ہونے والا تھا۔ کہ خیر کو اپناؤ اور شر سے بچو۔ انھوں نے اس آیت کریمہ پر اپنی بات مکمل کی جس کے استحضار کی ضرورت محسوس کر رہے تھے تاکہ وہ اسلام سے پہلے اور بعد از اسلام کے حالات کے درمیان موازنہ کرسکیں آپ نے یاد دلایا کہ اسلام سے پہلے ہم قلت اور ضعیفی، بے قدری اور بے وقعتی کا شکار تھے، ان کی مثال ہتھیلی پر رکھے ہوئے گوشت کے اس ٹکڑے جیسی تھی

[1] تاريخ الطبري: 459,458/5. [2] الأنفال 26:8. [3] الأدب الإسلامي لنايف معروف، ص: 75.

جسے پرندے اُچک لے جائیں، پھر اسلام لانے کے بعد انھیں قوت، وسعت، امن وسلامتی اور خوشحالی حاصل ہوگئی، وہ اللہ کی نعمتوں سے سرفراز ہوئے اور چار دانگِ عالم میں ان کی کامیابی کے جھنڈے لہرا رہے تھے اور ساری دنیا ان کی مطیع ہوگئی تھی۔ [1]

امام، خلیفہ اور امیر المومنین کا مطلب ومفہوم

امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام کے لیے خلیفہ اور امیر المؤمنین کے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ [2]

ابن خلدون کا کہنا ہے: ہم نے اس منصب کی حقیقت بیان کردی ہے، یہ دراصل صاحب شریعت کی نیابت کے مترادف ہے۔ اس کا مقصد دین کی حفاظت اور سیاستِ دنیا کا اہتمام ہے، خلافت وامامت اسی چیز کا نام ہے اور اس کا قیام خلیفہ اور امام کی ذمہ داری ہے۔ [3]

ابن منظور نے خلافت کی تعریف امارت کے ساتھ ہی کردی ہے۔ [4]

ابوزہرہ، خلافت وامامت کے درمیان ترادف کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ امامتِ کبریٰ ہے اور اسے خلافت سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ جو یہ ذمہ داری سنبھالتا ہے اور مسلمانوں کا حاکم اعظم قرار پاتا ہے وہ امور سلطنت کو چلانے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہے۔ اس کا نام امامت اس لیے ہے کہ خلیفہ کو امام کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا، اس کی اطاعت واجب ہے کیونکہ لوگ ان کی اسی طرح اقتداء اور پیروی کرتے ہیں جس طرح نماز کے امام کے پیچھے اس کی اقتداء کرتے ہیں۔ استاد محمد المبارک نے ان الفاظ (امام، خلیفہ اور امیر المومنین) کو اختیار کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا: قدیم قوموں، رومیوں اور اہل فارس کے ہاں جو بادشاہی نظام رائج تھا، جدید اسلامی نظام اس سے بالکل مختلف ہے۔ دور اول کے خلفاء کو ائمہ کے لقب سے بھی پکارا جاتا تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت

---

[1] المرتضی للندوی، ص: 141,140۔ [2] روضة الطالبين: 49/10۔ [3] المقدمة، ص: 190۔ [4] لسان العرب: 83/9۔

کے دور سے مسلمانوں نے امیر المؤمنین کا لقب استعمال کرنا شروع کیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اہل سنت کے ہاں عقیدہ اور فقہ اسلامی کی مباحث میں لفظ امامت کا استعمال غالب ہے۔ جبکہ لفظ خلافت کا استعمال تاریخی لٹریچر میں زیادہ ہوا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ عقیدہ سے متعلق مباحث، مبتدعین کے رد کے لیے لکھے گئے ہیں۔ جیسے شیعہ روافض اور خوارج وغیرہ۔ [1]

رافضی شیعہ خلافت کی بجائے امامت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ ایمان کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ ان کے ہاں امامت وخلافت میں فرق یہ ہے کہ ''امامت'' دین کی پیشوائی اور ''خلافت'' ریاست کی حکمرانی کی آئینہ دار ہے۔ [2] اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے تینوں سابقین خلفاء کے دور خلافت میں امامت کے مرتبہ پر فائز تھے۔ [3]

ابن خلدون کہتے ہیں کہ شیعہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو درجۂ امامت کے عنوان سے موسوم کرنا ان کو امامت کی اس صفت سے متصف کرنا ہے جو خلافت کے مترادف ہے۔ اس میں ان کے مذہب کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نماز کی امامت کے لیے بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ حق دار تھے۔ [4]

خلیفہ، امام اور امیر المومنین کے القاب

شرعی نقطہ نظر سے یہ القاب تعبدی امور میں سے نہیں ہیں، یہ تو ایسی اصطلاحات ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سامنے آئیں اور لوگوں نے انھیں بطور اصطلاح استعمال کرنا شروع کیا۔ بعدازاں مسلمانوں کے ہاں ان کے علاوہ دیگر القاب، مثلاً امیر وغیرہ کا استعمال بھی سامنے آیا۔ اندلس میں یہی کچھ مروج تھا۔

[1] الإمامة العظمٰى عند أهل السنة والجماعة للدميجي، ص: 36. [2] الإمامة العظمٰى عند أهل السنة والجماعة للدميجي، ص: 36. [3] الإمامة العظمٰى عند أهل السنة والجماعة للدميجي، ص: 36. [4] نظام الحكم لعارف خليل، ص: 81.

اسی طرح سلطان کا لقب بھی مستعمل رہا۔ اسلامی ریاستوں میں حکام انھی میں سے کوئی ایک لقب اختیار کرتے تھے۔

دراصل اہم بات یہ ہے کہ مسلمان امت اوران کے حکام اس چکر میں پڑنے کی بجائے کہ کون سا لقب اختیار کیا جائے، عقائد اور احکام میں اسلامی شریعت کے پوری طرح پابند بنیں۔ بہ تقاضائے احوال صدر مملکت، وزیر اعظم، خلیفہ یا امیر المومنین جیسے القاب میں سے کوئی بھی لقب اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ افضل یہ ہے کہ دور اول میں جو القاب استعمال کیے گئے انھی کو رواج دیا جائے، کیونکہ وہ دیگر اقوام کے القاب سے بالکل مختلف ہیں اور ممتاز سیاسی مفہوم کے حامل ہیں۔ اوران القاب کی ایک تاریخی حیثیت ہے، نیز وہ اسلامی تہذیب کی علامت ہیں۔[1]

رضی اللہ عنہ، کرم اللہ وجہہ یا علیہ السلام؟

تمام صحابہ کرام کا ذکر آنے پر بنیادی بات رضی اللہ عنہ کہنا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسٰنٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾

”وہ مہاجرین و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔“[2]

ایک اور جگہ فرمانِ ربانی ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ﴾

”اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔“[3]

[1] نظام الحکم لعارف خلیل، ص: 82. [2] التوبة 9:100. [3] الفتح 48:18.

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت نے ہر اس صحابی کے حوالہ سے جس کا ذکر آیا ہو یا ان سے حدیث روایت کی جا رہی ہو، ہمیشہ یہی کہا اور لکھا ہے مثلاً: ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

میرے علم کے مطابق ان میں سے کسی ایک کے تذکرہ میں بھی علیہ السلام کا لفظ استعمال نہیں ہوا جبکہ سلام مسلمانوں کے مابین تحفہ وہدیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ﴾

''جب گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، یہ دعائے خیر اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی، بڑی بابرکت اور پاکیزہ ہے۔''[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ ''رضی اللہ عنہ'' سلام سے زیادہ افضل ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾

''اللہ کی رضا جوئی سب سے بڑھ کر ہے۔''[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائیں گے:

''میری رضا جوئی (خوشنودی) تمھارے لیے حلال کر دی گئی ہے، میں تم پر کبھی ناراض نہ ہوں گا۔''[3]

لیکن علمائے کرام نے سلام کی اصطلاح کو انبیائے علیہم السلام کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴾

''اور سلام ہے رسولوں پر۔''[4]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ ﴾

[1] النور 61:54. [2] التوبة 72:9. [3] صحیح البخاري، حدیث: 6549. [4] الصّٰفّٰت 181:37.

''سلام اس پر کہ جس روز وہ پیدا ہوا۔'' [1]

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ حدیث بھی وارد ہے: کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تم میرے سامنے اس طرح ہو، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہارون علیہ السلام تھے۔ [2]

غالی رافضی امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے علیہ السلام یا کرم اللّٰہ وجهه کے القاب استعمال کرتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس کے پوری طرح اہل ہیں لیکن اس تکریم میں دیگر صحابہ بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ [3]

بہت سارے کاتب حضرات کے نسخوں میں اور بعض علمائے اہل سنت سے بھی یہ ثابت ہے کہ وہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے علیہ السلام یا کرم اللّٰہ وجهه کے القاب استعمال کرتے ہیں۔

اس کے معنی ہر چند صحیح ہیں، لیکن مناسب یہی ہے کہ اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان یکساں طریقہ اختیار کیا جائے۔ [4]

[1] مریم 19:15. [2] صحیح البخاري، حدیث: 3706. [3] فتاوی فی التوحید لعبد اللّٰہ بن جبرین، ص: 37. [4] الناهية عن طعن أمیر المؤمنین معاویة، ص: 26 من تعلیق المحقق احمد التویجری.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب
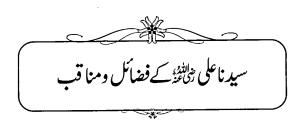
امام احمد، اسماعیل القاضی، نسائی اور ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں: قابل اعتماد سندوں کے ساتھ کسی بھی صحابی کے اتنے فضائل و اوصاف بیان نہیں ہوئے جتنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیان ہوئے ہیں۔[1] حافظ ابن حجر کہتے ہیں: اس کا سبب یہ ہے کہ وہ خلفائے راشدین میں سب سے آخر میں ہیں، ان کے دور میں اختلاف و انتشار پیدا ہوا۔ کچھ لوگوں نے ان کے خلاف خروج بھی کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے مخالفین کی تردید میں بڑی کثرت سے ان کے فضائل ومناقب بیان کیے۔ بعدازاں اہل سنت نے ان کے فضائل کو اور زیادہ شائع کیا۔ اس طرح ان کے فضائل ومناقب بکثرت منقول ہوگئے وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ اہل سنت کے مطابق، عدل کی ترازو کی رو سے دیکھا جائے تو ان چاروں خلفاء راشدین کے فضائل ان کی ترتیب کے مطابق ثابت ہیں۔[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں سے یہ بھی ہے کہ وہ عشرہ مبشرہ میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسب میں سب سے زیادہ قریب تھے۔[3]

پچھلے صفحات میں میں نے ان کے بہت سے فضائل بیان کیے ہیں یہاں ان کے مزید فضائل بیان کیے جاتے ہیں:

❁ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس

---

[1] فتح الباری: 71/7. [2] فتح الباری: 71/7. [3] البدایۃ والنھایۃ: 29/11.

نے دانے کو پھاڑا اور انسانی روح کو پیدا کیا، نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ مجھ سے صرف مومن ہی محبت کرے گا اور منافق ہی بغض رکھے گا۔[1]

❁ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حراء پر تھے آپ کے ساتھ ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم بھی تھے، اسی دوران چٹان حرکت کرنے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پرسکون رہو، تم پر ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صدیق یا ایک شہید ہے۔''[2]

❁ ابو اسحاق کہتے ہیں: ایک آدمی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں بھی ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا: کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شریک تھے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا: وہ صرف شریک ہی نہیں ہوئے بلکہ دو زِرہ پہنے ہوئے تھے اور مبارزت کرنے والے تھے۔[3]

❁ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں ہوں گے، (آپ کے علاوہ) ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد رضی اللہ عنہم بھی جنت میں ہوں گے اور اگر تم کہو تو دسویں کا نام لوں؟[4]

❁ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا تو گویا اس نے مجھے برا کہا۔''[5]

ایک آدمی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور ان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے ان کے اچھے اور قابل تعریف کاموں کا ذکر کیا اور کہا: شاید تمھیں یہ بات اچھی نہیں لگی، اس نے کہا ہاں! یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اس پر انھوں نے فرمایا: اللہ تمھاری ناک خاک آلود کرے۔ پھر اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: وہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کا حصہ ہیں، انھوں نے فرمایا: شاید یہ بات تمھیں ناپسند ہو،

---

[1] الصحيح المسند من فضائل الصحابة، ص: 111. [2] صحيح مسلم، حديث: 2417. [3] الصحيح المسند من فضائل الصحابة، ص: 117. [4] الصحيح المسند، ص: 117. [5] الصحيح المسند، ص: 121.

اس نے کہا ہاں! تو انھوں نے فرمایا: اللہ تمھاری ناک خاک آلود کرے، جاؤ! یہاں سے چلے جاؤ اور میرے خلاف جو کر سکتے ہو کرو۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف، دراصل ایک ربانی قائد اور اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں زبردست قربانی دینے والی شخصیت کے اوصاف ہیں۔ یہاں پر ہم کچھ اوصاف کا تو اجمالی تذکرہ کرتے ہیں اور چند دیگر اوصاف کا تفصیلی تذکرہ کریں گے۔ ان کے اہم ترین اوصاف میں سلامتی عقیدہ، شرعی علم، اللہ پر اعتماد، سچائی، اہلیت وشجاعت، جوانمردی، زہد، قربانی، اچھے معاونین کا انتخاب، تواضع، حلم، صبر، بلند ہمتی، قوی ارادہ، عدل و انصاف، تعلیم دینے کی خوبی اور قیادت کی تیاری کی صلاحیت بہت نمایاں ہیں۔ ان کے دیگر اوصاف اور کمالات کا تعلق مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت صحبت میں رہنے اور مدنی دور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شرکت اور معاشرتی زندگی سے ہے۔ مزید برآں آپ کے بعض اوصاف کا تعلق اس دور سے ہے جب آپ امیر المومنین کے منصب پر فائز ہوئے۔ ذیل میں ان کے اوصاف وکمالات کا تفصیلی حال پیش کیا جاتا ہے:

علم اور تفقه في الدين

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ بزرگ صحابہ میں عالم شمار ہوتے تھے۔ یہ ان کا امتیاز تھا کہ تحصیل علم میں انھوں نے بڑی سنجیدگی اور محنت سے کام لیا، طلبِ علم اور استحکام علم کے لیے اپنے دور کے تمام وسائل بروئے کار لائے۔ آپ نے قرآن کریم سے اپنے تعلق کے حوالے سے بتایا: میں نے قسم اٹھائی تھی کہ نماز کے علاوہ اس وقت تک چادر نہیں اوڑھوں گا جب تک میں پورا قرآن پاک حفظ نہ کرلوں۔[2] ایک دن فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں کسی بھی دن اس وقت تک مجھ پر نیند طاری ہوئی نہ اونگھ آئی جب تک میں نے یہ معلوم نہ کرلیا کہ آج جبریل علیہ السلام

[1] الصحيح المسند من فضائل الصحابة، ص: 140. [2] الطبقات: 338/2.

حلال وحرام کے کیا احکام لائے ہیں۔ آج کے دن کون سی نئی سنت مطہرہ سامنے آئی ہے، امر ونہی کے کیا کیا احکام ملے ہیں اور قرآنی آیات کس پس منظر میں نازل ہوئی ہیں۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ آیت یا حدیث کا متن خود براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کریں اور جب ان کو کسی اور کے ذریعے سے حدیث ملتی، تو اسے قبول کرنے سے پہلے پوری تحقیق فرماتے، اور اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمائی ہو۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سوال کرنے والی زبان اور عقل و دانش سے لبریز دل و دماغ رکھتے تھے، انھوں نے فرمایا: ''بیشک میرے رب نے مجھے طلبِ علم کے لیے سوال کرنے والی زبان اور عقلمند دل سے نوازا ہے۔''[2] انھوں نے اپنے بے پایاں علم کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ علم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سوال کے ذریعے سے حاصل کیا، وہ فرماتے ہیں: جب بھی میں سوال کرتا، مجھے علم دیا جاتا تھا اور جب میں خاموش ہوتا تو مجھ سے ابتدا کی جاتی۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ حیا کے باعث علم حاصل نہ کرنے سے روکتے تھے آپ فرماتے تھے: علم نہ ہونے کی صورت میں علم حاصل کرنے میں حیا کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ ان چند مسلم شخصیات میں سے تھے جو اسلام کے ابتدائی دور ہی میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ وہ کاتبانِ وحی میں سے تھے، لکھنے پڑھنے کی مہارت کی وجہ سے آپ کو شرعی علوم میں تبحر حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ آپ فرماتے تھے کہ نصوص کو سطروں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھ کر اور حروف کو قریب کر کے واضح خط کے ساتھ لکھا جائے۔ ابو عثمان عمرو بن بحر بن الجاحظ سے روایت ہے: امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے فرمایا: خط ایک علامت

[1] مسند الإمام زید، ص: 343، منقول از منهج علي بن أبي طالب في الدعوة. [2] الطبقات: 338/2، والحلية: 67/1. [3] فضائل الصحابة: 647/2. اس کی سند صحیح ہے، ومصنف ابن أبي شيبة: 284/13.

ہے، جتنا واضح ہوگا اتنا ہی اچھا ہوگا۔ [1]

انھوں نے اپنے کاتب عبید اللہ بن ابی رافع کو حکم دیتے ہوئے فرمایا: اپنی دوات بنا سنوار کے تیار کرو، قلم کے قط کو لمبا رکھو، سطروں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھو اور حروف کو قریب قریب لکھو۔ [2] ابوحکیمہ العبدی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: ہم کوفہ میں مصاحفِ قرآنی تحریر کیا کرتے تھے۔ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لاتے تھے تو فرماتے تھے: قلم بڑا کرو یعنی جلی حروف میں لکھو چنانچہ میں قلم کا قط بڑا کر کے لکھتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: اللہ نے جسے روشن رکھا ہے تم بھی اسے روشن رکھو۔ [3] آپ جو بھی علم حاصل کرتے اسے عمل کے ساتھ منطبق فرماتے تھے، خاص طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی علم حاصل کرتے، مشکل حالات کے باوجود بھی اس کی عملی تطبیق فرماتے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اور حضرت فاطمہ کو اذکار سکھائے، امیر المومنین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب سے میں نے یہ اذکار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے انھیں پڑھنا کبھی ترک نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کا دوام رکھا۔ پوچھا گیا کیا صفین کی رات بھی نہیں؟ فرمایا: ہاں صفین کی رات بھی ترک نہیں کیا۔ [4] آپ فرماتے تھے: علم سیکھو، اس کی معرفت حاصل کرو اور اس پر عمل کرو، پھر تم اہل علم کہلاؤ گے۔ [5]

وہ سمجھتے تھے عالم کو اس وقت تک عالم نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ اپنے علم پر عمل نہ کرے، یہی وجہ ہے کہ وہ حاملین علم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے حاملینِ علم! عالم وہ کہلاتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرنے والا ہو، اس کے علم اور عمل میں مطابقت ہو۔ [6] مزید فرمایا: علم عمل کو آواز دیتا ہے اگر وہ قبول کرے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ علم وہاں سے کوچ کر جاتا ہے۔ [7]

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں جو بکثرت فتوی دینے والے تھے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو فتوی دینے والے تھے،

[1] الجامع لأخلاق الراوی:262/1. [2] الجامع لأخلاق الراوی:262/1. [3] الجامع لأخلاق الراوی:260/1. [4] صحیح البخاري، حدیث: 5362. [5] البدایة والنهایة: 6/8. [6] بیان العلم وفضله، ص:285. [7] منهج علی بن أبی طالب، ص:63.

مرد و خواتین سمیت ان کی تعداد تیس سے کچھ اوپر ہے، اور پھر ان میں سے زیادہ فتویٰ دینے والی سات شخصیات ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

① عمر بن الخطاب ② علی بن ابی طالب ③ عبد اللہ بن مسعود ④ ام المومنین عائشہ ⑤ زید بن ثابت ⑥ عبد اللہ بن عباس ⑦ اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم۔[1]

امام ابن حزم نے کثرتِ فتویٰ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تیسرے مرتبے میں شمار کیا ہے۔ عدالتی مسائل اور ان کے فقہی اجتہادات کے بارے میں گفتگو آگے آئے گی ان شاء اللہ۔ آپ ایک دوسرے کی زیارت اور باہم پڑھائی کی ترغیب دیتے تھے، فرماتے تھے کہ ایک دوسرے کی زیارت کو جاؤ اور باہم مل کر حدیث پڑھو، اسے ہرگز نہ چھوڑو مبادا وہ مٹ جائے۔[2] ایک اور روایت میں آیا ہے، ایک دوسرے کی زیارت کے لیے جایا کرو اور حدیث کا علم سیکھو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو علم مٹ جائے گا۔[3]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ استاذ کو لازم پکڑنے اور اس سے علم حاصل کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ فرماتے تھے استاد کی طویل صحبت سے سیر نہ ہو، اس کی مثال کھجور کے درخت کی سی ہے۔ تم انتظار کرو کہ کب تم پر اس سے کوئی چیز گرتی ہے۔[4] اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کے لیے کیسی زبردست خوش نصیبی مہیا فرما دی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو لازم پکڑا۔ بچپن ہی میں ان کی گود میں پرورش پائی اور بڑے ہو کر ان کے داماد اور ان کے نواسوں کے والد بنے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب تھے، ان سے علم اخذ کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت گہری وابستگی پر سیدہ عائشہ بھی گواہ ہیں۔

مقدام بن شریح اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بتایا: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ مجھے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی ایسے صحابی کے بارے میں بتائیے

---

[1] أعلام الموقعين: 12/1. [2] الجامع لأخلاق الراوی: 236/1. [3] شرف أصحاب الحديث للخطيب بغدادی، ص: 93. [4] تذكرة السامع، ص: 100.

جن سے میں موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں معلوم کرسکوں، انھوں نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کیونکہ وہ ہر دم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سفر کے دوران موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیں علوم کے حصول میں انتخاب کا حکم دیتے۔ فرماتے تھے: سارا علم محفوظ نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا ہر علم میں سے اچھے پہلوؤں کا انتخاب کر کے انھیں اخذ کرلو۔[2]

وہ علم کے میدان میں بہت بلند مرتبے پر فائز تھے۔ وہ جب عراق میں تھے تو لوگوں سے کہتے تھے: مجھ سے سوال کرو!...... سعید بن المسیب فرماتے ہیں: علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی شخصیت ایسی نہیں تھی جو لوگوں سے یہ کہہ سکے، مجھ سے سوال کرو۔[3] صحابہ ہوں یا تابعین ان کے علم پر سب کو اعتماد تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب ثقہ راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کرتے تو ہم کسی کے قول کو اس کے قول کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔[4] سوید بن غفلۃ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا جو وراثت کے حوالے سے پوچھ رہا تھا کہ ایک آدمی فوت ہوا اور اس نے ایک بیٹی اور ایک بیوی سوگوار چھوڑی، تو انھوں نے کہا: میں تمھیں اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بتاتا ہوں، اس آدمی نے جواب دیا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر راضی ہوں، انھوں نے کہا: بیوی کے لیے آٹھواں حصہ اور بیٹی کے لیے نصف ہے اور باقی بھی بیٹی کو دے دیا جائے گا۔[5]

لوگوں نے علم کے میدان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بے حد تعریف وتوصیف کی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: وہ سنت کے علم میں سب سے آگے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا طریق کار یہ تھا کہ جو مسائل انھیں پیش آتے، وہ انھیں لکھ لیتے تھے تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بعد

[1] مسند أحمد: 195/2، اس کی سند صحیح ہے، تحقیق احمد شاکر۔ [2] تاریخ الیعقوبی: 5/2. [3] الاستیعاب، ص: 1103. [4] الاستیعاب، ص: 1104. [5] سنن الدارمی: 470/2، حدیث: 3020.

میں معلوم کریں۔

عبداللہ بن عیاش بن ابی ربیعہ سے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: وہ حسب ونسب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت، اسلام میں سبقت، قرآن وسنت کے علم وفقہ کے میدان میں بلند مرتبہ، جنگ میں بہادری کا نشان اور سخاوت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ مسروق کہتے ہیں کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم عمر، علی، ابن مسعود اور عبداللہ رضی اللہ عنہم پر ختم ہوجاتا ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے طالبان علم، علماء اور فقہاء کے لیے جو نصائح ارشاد فرمائے، وہ اس لائق ہیں کہ انھیں یاد کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔ [1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی چند نصیحتیں

لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں: ربانی علماء، نجات کی راہ پر گامزن طالب علم اور تیسرے بے چرواہے کے ریوڑ جو ہر آواز دینے والے کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ حافظ ابونعیم کمیل بن زیاد سے روایت کرتے ہیں کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے صحرا کی طرف لے گئے، ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے، آپ نے تھوڑی دیر سانس لیا پھر فرمایا: اے کُمیل! دلوں کی مثال برتن جیسی ہے، ان میں سے بہترین برتن وہ ہے جو علم کو سنبھالے رکھے، میری بات سنو اور یاد رکھو، لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں: ① ربانی علماء، ② طالب علم، ③ اور تیسرے بے چرواہے کے ریوڑ جو ہر آواز کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ لڑھک جاتے ہیں، وہ علم کے نور سے روشنی حاصل نہیں کرتے اور نہ کسی مضبوط ستون سے پناہ لیتے ہیں۔ [2]

یہ بلیغ وصیت نہایت قیمتی موتیوں کی لڑی ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

[1] ذخائر العقبى لمحب الدين الطبري، ص: 79، وتاريخ الخلفاء للسيوطي، ص: 196. [2] حلية الأولياء: 329/1.

(ا) ربانی علماء: ان علماء سے مراد علمائے دین ہیں اور ربانی وہ ہیں جو فقہ وحکمت کو یکجا کیے ہوئے ہیں جیسا کہ فرمان الٰہی:

﴿ كُونُوا رَبَّٰنِيِّـۧنَ ﴾

''تم سب رب کے ہو جاؤ!۔''[1]

اس کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس سے مراد دانا فقہاء ہیں۔ یہ روایت امام بخاری نے نقل کی ہے۔ عبداللہ بن مسعود نے بھی یہی تفسیر بیان کی ہے۔[2]

لہٰذا جو لوگ دانائی اور تفقہ فی الدین دونوں صلاحیتوں کے مالک ہیں وہی امت کی تربیت اور رہنمائی کرنے کے اہل ہیں، کیونکہ حکمت کے معنی ہر چیز کو اس کے مناسب مقام پر رکھنا ہے۔ اسی بات میں لوگوں کے لیے شرعی احکام کے نفاذ کی توفیق بھی شامل ہے۔ یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ اسلامی معاشرہ کی اصل حقیقت باریک بینی سے سمجھی جائے۔ حکمت و دانائی یہ بھی ہے کہ دین کی بنیاد پر امت اسلامیہ کی تربیت کا بیڑا اٹھایا جائے۔ اور یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ دینی تعلیم وتربیت، تقویٰ اور فضائل اخلاق کے ساتھ کی جائے۔ فقہ اسلامی سے مراد یہ ہے کہ دین کے احکام اس کے شرعی مصادر کی روشنی میں سمجھے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ربانی علماء امت کے افضل لوگ تھے۔ انھوں نے علم کے حصول کے علاوہ تربیت پر مبنی تعلیم پائی۔ اور وہی امت کی تربیت اور رہنمائی کی اہلیت رکھتے ہیں۔[3] امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ پہچان بتائی کہ وہ لوگوں کو دانائی کی فکری غذا مہیا کرتے ہیں۔[4]

(ب) مخلص طالب علم کون ہے؟ جن طلبہ نے خلوص نیت سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حصول علم کی محنت کی تاکہ اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے وقت علم ان کے لیے سرخرو ہونے کا وسیلہ بن جائے۔ ایسے طلبہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے راہ نجات کے طالبان علم کا

[1] آل عمران 79:3. [2] صحیح البخاري، قبل الحدیث: 68، والتاریخ الإسلامي للحمیدي: 438/12,11. [3] التاریخ الإسلامي للحمیدي:438/12,11. [4] الفتاوی:49/1.

نام دیا ہے۔ اس سے مراد صرف وہی طلبہ نہیں ہیں جو طلب علم کے لیے وقف ہو چکے ہیں بلکہ ان میں ہر وہ طالب علم شامل ہے جو دین حنیف کے نفاذ کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہے اور اسے آخرت میں سرخرو ہونے کی فکر ہے۔ ایسا طالب علم ربانی علماء سے دینی امور کے بارے میں سوال کرتا ہے تاکہ وہ علی وجہ البصیرت اللہ کی بندگی کا فریضہ ادا کرسکے اور لوگوں کے ساتھ معاملات زندگی کو منہج ربانی پر قائم رکھے۔ اگرچہ ایسا شخص علم کے حلقوں میں نہ بیٹھے[1] وہ بہر حال نجات کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ ہمیں طلب علم کے لیے اخلاصِ نیت کی اہمیت بتا رہے ہیں اور دعوت دے رہے ہیں کہ ہم دار آخرت کو دنیا کی بے ثباتی اور شہواتِ نفسانی پر ترجیح دیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب لوگوں کو دعوت دیں اور پھر اس راہ میں صبر و استقامت سے کام لیں۔

(ج) جنھوں نے علم دین کو چھوڑ دیا اور ربانی علماء سے ناطہ توڑ لیا: امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ بے چرواہے کے ریوڑ، اور ہر آواز لگانے والے کے پیچھے چلتے ہیں، اور ہوا کے رخ پر بہتے ہیں۔ انھیں نور ہدایت حاصل نہیں ہوتا۔ امیر المومنین نے ایسے لوگوں سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو یہی دعوت دیتے رہے کہ ان کا مقصدِ زندگی جستجوئے حق اور اس پر استقامت ہونا چاہیے۔ انھیں دنیا اور آخرت میں اللہ کی اطاعت کا نمونہ بننا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے نور سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ اور دنیا کو آخرت کی طرف جانے کی سواری بنانی چاہیے۔

علم اور مال کا موازنہ

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کمیل بن زیاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: علم مال سے

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 438/12,11.

بہتر ہے، علم تمھاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو، عمل کرنے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور مال خرچ کرنے سے کم ہو جاتا ہے، علم حکمران اور مال محکوم ہوتا ہے، مال کی کارکردگی اس کے زوال کے ساتھ ہی زائل ہو جاتی ہے اور عالم کو علم سے محبت کا صلہ ملتا ہے، علم عالم کو زندگی میں اطاعت کی راہ پر گامزن کرتا ہے اور وفات کے بعد بھی ذکر خیر کا باعث بنتا ہے۔ مال جمع کرنے والے زندگی ہی میں مرجاتے ہیں اور علماء کو رہتی دنیا تک یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بذات خود موجود نہیں ہوتے لیکن وہ دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ [1]

مزید فرمایا: شرعی علم اہل آخرت کا ستون ہے، دنیا و آخرت دونوں میں ان کے لیے باعثِ عز و شرف ہے......، یہاں مال سے مراد وہ صاحبِ مال ہے جو اپنی ذات کے لیے جمع کرتا ہے اور اپنے رب کی شریعت کے مطابق اطاعت کی جانب توجہ نہیں دیتا۔ ارشاد گرامی کے مختلف پہلو ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔

(ا) علم، عالم کی حفاظت کرتا اور صاحبِ مال، مال کی حفاظت کرتا ہے

علم کی جانب سے عالم کی حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ دینی علم صاحب علم کو دنیا اور آخرت کی ہلاکتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ آخرت کا معاملہ تو بالکل واضح ہے کہ علم، صاحبِ علم کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور جنت کی طرف لے جاتا ہے اور جہنم کے راستوں سے بچاتا ہے، کیا خوب ہیں یہ عظیم مقاصد اور کتنے بلیغ ہیں یہ مفادات......۔ اور دنیا کی ہلاکتوں سے حفاظت کی صورت یہ ہے کہ حقیقی روحانی خوشی اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین ہی سے حاصل ہوتی ہے جس کے بالمقابل دنیاوی زندگی کی تمام مصیبتیں اور پریشانیاں ماند پڑ جاتی ہیں اور اہلِ یقین کے لیے وہ باعثِ سلامتی بن جاتی ہیں کیونکہ وہ انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے، جبکہ مصائب اور پریشانیاں دنیا کے پجاری اصحابِ مال کے لیے دنیا میں ہی جہنمی زندگی کا روپ دھار لیتی

[1] حلیة الأولیاء:1/75، وصفة الصفوة:1/329.

ہیں۔ ان کا دائمی مطمع نظر راس المال کی حفاظت اور مال کمانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گویا صاحبِ مال کا مال کی حفاظت کرنے کا معاملہ تو واضح ہے اس پر مستزاد یہ کہ وہ غم اور خوف، بے چینی اور بے کلی کا شکار رہتے ہیں اور راتیں اضطرابی حالت میں مال کی حفاظت میں گزارتے ہیں۔ [1]

علم، صاحبِ علم کو بصیرت اور روشنی سے ہمکنار کرتا ہے اور یہ شعور دیتا ہے کہ وہ زیادہ فضیلت کے معاملے کو اختیار کرے، اور گذری ہوئی قوموں کے واقعات سے عبرت حاصل کرے۔ علم پر مبنی زندگی انسان کو آفاقی سوچ عطا کرتی ہے، وہ بھلائی، بگاڑ اور مقاصد زندگی تمام پر نظر رکھتا ہے اور لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہوئے علم کی روشنی سے اپنی ترجیحات متعین کرتا ہے۔

(ب) علم پھلتا پھولتا ہے اور عمل کے ذریعے راسخ ہوتا ہے

عمل، دراصل علم کا انطباق ہے، عمل کے ذریعے سے حافظہ میں اضافہ اور علم میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ خیال رہے کہ یہاں مقصود اہل دنیا کا وہ مال ہے جو دنیا کی خاطر خرچ کیا جاتا ہے، البتہ فکر آخرت والے لوگوں کا مال تو شرعی طریقے پر خرچ ہوتا ہے، وہ خرچ کرنے سے پھلتا پھولتا ہے جیسا کہ فرمان نبوی ہے:

''کسی بندے کا مال صدقہ کرنے سے کم نہیں ہوتا۔'' [2]

(ج) وہ اجتماعی تعلق جو مالی مفاد پر مبنی ہو مال ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے

کیونکہ مال ہی ان تعلقات کی بنیاد تھا، اسی بناء پر مصلحتیں اور مفادات وجود میں آئے، جوں ہی مال ختم ہوا یہ مفادات بھی زائل ہو گئے۔ البتہ وہ برادرانہ تعلقات جو عالم اور اس سے محبت کرنے والوں کے درمیان تھے وہ شرعی علم کی بنیاد پر تھے، وہ دنیا اور آخرت میں

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 12/442. [2] جامع الترمذي، حديث: 2325.

ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ﴾

''وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے۔'' [1]

(د) شرعی عالم کو مسلمانوں کی طرف سے محبت اور اطاعت نصیب ہوتی ہے

ہر چند مسلمانوں پر علماء کی اطاعت لازم نہ کی جائے، پھر بھی وہ انھی کی اطاعت ومحبت کا دم بھرتے ہیں اور وفات کے بعد بھی ان کو اچھے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اگر ہم آج کے دور تک کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام کے دور ہی سے علماء کے نام کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ تاریخ ان کی زندگی کے حالات کتابوں، خطبوں اور علمی اسباق کے ذریعے دہراتی اور یاد کراتی ہے۔ جبکہ اس کے بالمقابل بڑے بڑے اہل دنیا کی وفات کے بعد ان کا نام ونشان مٹ جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات خود ان کی زندگی ہی میں ان کی شہرت کے چراغ بجھنے کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ [2]

(ہ) عالم اور فقیہ لوگوں کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونے دیتے

عالم وفقیہ لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے دیتا ہے نہ انھیں اللہ کے عذاب سے بے خوف ہونے دیتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے لیے گنجائش پیدا نہیں کرتا، نہ قرآن کریم سے بے رغبتی پیدا ہونے دیتا ہے۔ اس عبادت میں کوئی خیر نہیں جس کے پیچھے علم نہ ہو اور اس علم میں کوئی خیر نہیں جو بغیر فہم کے ہو اور ایسی قراءت وتلاوت میں خیر کا کوئی پہلو نہیں رہتا جس میں تدبر وتفکر نہ کیا جائے۔ [3]

---

[1] الزخرف 43:67. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 12/443. [3] حلية الأولياء: 1/77، وصفة الصفوة: 1/325.

مذکورہ متن میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ دین میں سمجھ بوجھ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دینی امور اور لوگوں کی اصلاح کے لیے کی گئی ہر کوشش میں توازن و اعتدال کا پہلو پیش نظر رکھا جائے۔ اور داعی خوف و امید کے مقامات پر درمیانی راہ اختیار کرے، لوگوں کو انتباہ کرنے اور ڈرانے میں اس حد تک نہ چلا جائے کہ وہ اللہ کی رحمت ہی سے ناامید ہو جائیں اور ترغیب کے پہلو میں اس حد تک نہ چلا جائے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب ہی سے بے خوف ہو جائیں۔

جگر ٹھنڈا کرنے کی بات

امام شعبی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: کیا خوب جگر کو ٹھنڈا کرنے والی بات ہے! پوچھا گیا: وہ کیا بات ہے؟ انھوں نے فرمایا: وہ بات جو تم نہیں جانتے کہو کہ ''اللہ اعلم'' اللہ سب سے بہتر جانتا ہے۔[1]

اہل علم کا لوگوں کو تعلیم دینا

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے اس وقت تک یہ عہد نہیں لیا کہ وہ علم حاصل کریں، جب تک اہل علم سے یہ عہد نہ لے لیا کہ وہ تعلیم دیں گے۔[2]

اصل خیر کثرت علم میں ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خیر و بھلائی یہ نہیں ہے کہ تمھارا مال اور اولاد کثیر ہے، اصل خیر یہ ہے کہ تمھارے علم میں اضافہ ہو اور حلم کا جذبہ بڑھ جائے، اپنے رب کی بندگی پر تمھیں خوشی ہو۔ اگر تم اچھا عمل کرو تو اللہ کی تعریف اور شکر ادا کرو اور اگر برا عمل کرو تو اللہ سے بخشش طلب کرو، دنیا میں کوئی خیر نہیں مگر ذیل کے دو آدمیوں میں سے کسی ایک میں، ایک وہ آدمی

[1] جامع بیان العلم وفضله:2/66. [2] فرائد الکلام، ص:361.

جس سے گناہ کا ارتکاب ہوگیا اور اس نے توبہ سے اس کی تلافی کی، دوسرا وہ آدمی جو خیروبھلائی کے کاموں میں جلدی کرے۔ تقویٰ کے ساتھ عمل کرنا ہی قابل قدر ہے چاہے تھوڑا ہی ہو۔ اسے کیسے تھوڑا کہا جائے جو قبولیت کا درجہ حاصل کر لے؟[1]

علم اور جہالت

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: علم کے لیے یہی اعزاز کافی ہے کہ اس کا مدعی وہ ہو جو علم نہیں رکھتا لیکن جب اس کی نسبت علم کی طرف کی جائے تو وہ خوش ہو اور جہالت کے کم تر اور گھٹیا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جاہل آدمی اس سے بیزاری کا اظہار کرے اور جب جہالت کی طرف اس کی نسبت کی جائے تو وہ غضبناک ہو جائے۔[2]

علم سے بے رغبتی کی وجہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگ علم حاصل کرنے کی طرف اس لیے راغب نہیں ہوتے کہ علم والوں نے بھی علم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔[3]

اس میں ان علمائے سوء سے بچنے کی طرف اشارہ ہے جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ مزید برآں اس میں علماء کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنے علم پر عمل کریں۔ اس میں عام لوگوں کو علم حاصل کرنے کی دعوت ہے اور اللہ کی راہ میں تکالیف پر صبر کرنے کی دعوت بھی ہے۔

امت پر علماء کے حقوق

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عالم کا حق یہ ہے کہ اس سے بہت زیادہ سوال نہ کیے جائیں۔ نہ اسے جواب دینے پر مجبور کیا جائے۔ جب وہ تھکاوٹ و کسلمندی کا شکار ہوں تو ان کے پاس نہ جائیں، جب وہ کھڑے ہو جائیں تو ان کے دامن نہ پکڑو، ان کے

[1] حلية الأولياء، ص: 75. [2] فرائد الكلام، ص: 366. [3] أدب الدنيا والدين، ص: 82-85.

راز افشاء نہ کرو، ان کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو، ان کی لغزشیں اور غلطیاں تلاش نہ کرو، اگر ان سے غلطی ہو جائے تو ان کی معذرت قبول کرو، جب تک وہ اللہ کے احکام کی حفاظت کریں ان کی عزت و توقیر تم پر لازم ہے۔ ان کے مد مقابل نہ بیٹھو، اگر انھیں کوئی ضرورت در پیش ہو تو ان کی خدمت کے لیے قوم سے سبقت لے جاؤ۔[1]

اللہ تعالیٰ کے نزدیک با عمل علماء کا درجہ

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس نے اپنے علم پر عمل کیا آسمانوں میں اسے عظمت ملی۔[2] یہ علم و عمل کی دعوت ہے۔ انھوں نے ایسے علم و عمل کی بنیاد پر اعلیٰ مقامات کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی ترغیب دی ہے جن کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت کارفرما ہو۔

حصول علم میں مشغولیت نفلی عبادت سے زیادہ افضل ہے

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عالم، قیام کرنے والے روزہ دار اور مجاہد سے افضل ہے۔ جب عالم فوت ہو جاتا ہے تو اسلام میں ایک ایسا شگاف پیدا ہوتا ہے کہ اس جیسا جانشین ہی اسے پر کر سکتا ہے۔[3]

یہ ساری رہنمائی اس حقیقت کی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک علم اور عمل کی کس قدر زبردست اہمیت ہے، وہ لوگوں کی بھلائی کے لیے عمل کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ اس عبادت کی نسبت جو علیحدگی میں کی گئی ہو اور جس کا فائدہ بھی انفرادی شخصیت ہی کو ہو، علم کے حصول کو مقدم قرار دیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے طالبانِ علم کے لیے یہ چند مفید اور نفع بخش ہدایات اور ارشادات ہیں۔ ان پر عمل کرنا طالبان علم کے لیے بے حد فیض رساں ثابت ہوگا۔

[1] جامع بیان العلم و فضله: 519/1. [2] جامع بیان العلم و فضله: 519/1. [3] المتجر الرابح في ثواب العمل الصالح للدمیاطي، ص: 13.

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی تشریح

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس علم کی اہمیت اس طرح اجاگر فرمائی ہے: اے علم کے طلبگار! عالم کی تین علامات ہیں:

① اللہ کے بارے میں علم۔

② اس امر کا علم کہ اللہ کن چیزوں کو پسند کرتا ہے۔

③ اور تیسرا یہ علم کہ اللہ کن باتوں کو پسند نہیں فرماتا۔[1]

انھوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوصاف عالیہ کا تعارف اس طرح کرایا ہے: وہ ہر مقام اور جگہ کا علم رکھتا ہے اور ہر آن اور ہر گھڑی اور ہر وقت سے باخبر ہے۔ اس نے جو بھی تخلیق کی، مخلوق پیدا کی اسے قائم و دائم رکھا۔ جو بھی تصویر بنائی بہترین بنائی، وہ اپنے بلند مرتبہ ہونے میں یکتائے روزگار ہے۔ مخلوق کی کسی قسم کی اطاعت کا محتاج نہیں، وہ دعا کرنے والوں کی دُعا قبول فرماتا ہے، آسمانوں اور زمینوں میں جہاں بھی فرشتے ہیں وہ اسی کے تابع فرمان ہیں، اسے زندہ انسانوں کے بارے میں بھی اتنا ہی علم ہے جتنا فوت شدہ لوگوں کے بارے میں ہے۔ وہ جس طرح بلند آسمانوں کے بارے میں جانتا ہے اسی طرح زمین کی نچلی سے نچلی زمین کے بارے میں بھی جانتا ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ طرح طرح کی آوازیں اسے حیرت زدہ نہیں کرتیں۔

مختلف قسم کی زبانیں اسے کسی بات سے غافل نہیں کرتیں، وہ مدبر ہے۔ دور رس نگاہیں

---

[1] تاريخ اليعقوبي:2/207، ومنهج علي بن أبي طالب، ص:91.

رکھنے والا ہے، وہ تمام امور کا علم رکھتا ہے، وہ زندۂ جاوید ہستی ہے وہ اپنی ذات عالی میں بجائے خود قائم ودائم ہے اور دوسروں کو بھی قائم رکھنے والا ہے۔ وہ اس بات سے پاک ہے کہ اس کی صفات کی کیفیات بیان کی جائیں۔ [1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک یہودی آیا۔ اس نے پوچھا کہ ہمارا رب کب سے تھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے کا رنگ فوراً بدل گیا [2] فرمایا کہ رب کے بارے میں ''تھا'' تو ہم تب کہیں جب کہ وہ اس وقت جلوہ فرما نہ ہو۔ وہ تھا، ہے اور آئندہ کے لیے بھی ہمیشہ ہمیشہ قائم دائم ہے۔ وہ بغیر کسی کیفیت کے ہے اس کے بارے میں ابتدا اور انتہا کا کوئی تصور نہیں۔ وہ ہر چیز کی غایت ہے، ہر چیز کی انتہا ہے۔ آپ کا یہ ارشاد سنتے ہی یہودی مسلمان ہو گیا۔ [3]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو سخت مزاجی پر عطا نہیں کرتا۔'' [4]

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت، اس کے معانی پر غور وفکر اور ان پر ایمان، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کی شکل میں ثمر آور ہوتا ہے۔ اور یہ محبت اور تعظیم اس کے امر ونہی پر مبنی احکام پر عمل کے لیے ضروری ہے۔ یہی محبت تقاضا کرتی ہے کہ مصائب میں اسی کی پناہ حاصل کی جائے اور حاجات کے وقت صرف اسی سے مانگا جائے پیش آمدہ مسائل کے حل میں صرف اسی سے مدد کی التجا کی جائے اور اس کے علاوہ بھی دیگر تمام قلبی عبادات میں اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔ [5]

---

[1] حلية الأولياء: 73/1. [2] لسان العرب: 181/5. [3] تاريخ الخلفاء للإمام السيوطي، ص: 206.
[4] سنن أبي داود، حديث: 4807. وصحيح مسلم، حديث: 2593. [5] منهج علي بن أبي طالب في الدعوة إلى الله، ص: 92.

باعث شکر نعمتوں کا تعارف

امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ اور بندوں پر اس کی نعمتوں کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا: اے اللہ کے بندو! میں تمھیں اس اللہ کا تقوی اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں جس نے تمھارے لیے مثالیں بیان کی ہیں، اور تمھارے لیے وقت اجل مقرر فرمایا ہے۔ تمھیں کانوں سے نوازا جو اللہ کے مقصود کو سنتے ہیں، تمھیں آنکھیں عطا فرمائیں، سمجھنے والا دل مرحمت فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تمھیں عبث پیدا نہیں کیا، تمھیں کامل ترین نعمتوں سے سرفراز کیا اور مؤثر ترین عطیات سے نوازا، تنگی وخوشحالی دونوں حالتوں میں تمھارے لیے جزا تیار کی ہے، اللہ کے بندو! اس کا تقویٰ اختیار کرو، طلب میں سنجیدگی اختیار کرو، اس وقت سے پہلے عمل کرنے میں جلدی کرو جب خواہشات ختم اور لذتیں معدوم ہو جائیں گی۔ [1]

امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ لوگوں کو نعمتوں پر شکر کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ نعمتوں کے نشے میں ڈوب کر غفلت اختیار کرنے اور ان پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے سے منع کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ نعمتوں پر شکر کرنے کے نتیجے میں اللہ کے پاس سے مزید خیر و بھلائی ملے گی، اس لیے اسی کی طرف رخ کر لو، اللہ ہی کے ہو جاؤ۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: اگر دل اور طبیعت (خیر کی طرف) راغب ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو، اللہ نے مسلمانوں سے اچھے انجام کا وعدہ کیا ہے، اور جو شکر کرے اسے

---

[1] الحلیة: 78/1، وصفة الصفوة: 328/1.

مزید عطا کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔[1]

امیر المومنین لوگوں کو اپنی ذات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ آپ فرماتے تھے:

جس نے خود کو پہچان لیا گویا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔[2]

فرمانِ ربانی ہے:

﴿ وَفِيٓ أَنفُسِكُمۡۚ أَفَلَا تُبۡصِرُونَ ﴾

''اور خود تمھارے اپنے وجود میں بہت سی نشانیاں ہیں کیا پھر تم دیکھتے نہیں۔''[3]

ایمان کی حلاوت اور تقویٰ کی برکتیں

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایمان، دل میں ایک سفید نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جوں جوں بندے کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، دل زیادہ سفید ہونے لگتا ہے اور جوں جوں بندے کے نفاق میں اضافہ ہوتا ہے، دل کی سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب بندہ نفاق میں کامل ہو جاتا ہے، دل پوری طرح سیاہ ہو جاتا ہے، اللہ کی قسم! اگر تم مومن کے دل کو پھاڑ کر دیکھو تو وہ سفید ہوگا اور کافر و منافق کا دل پھاڑ کر دیکھو تو وہ سیاہ نکلے گا۔[4]

علمائے اہل سنت نے ایمان کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: ایمان دل سے تصدیق، زبان سے شہادتین کا اقرار اور اعضائے بدن کے عمل کا نام ہے یعنی ایمان کے ارکان: عقیدہ، قول اور عمل ہیں۔ یہ تینوں حقیقت ایمان اور اس کے اجزاء کی نمائندگی کرتے ہیں۔ علماء کے اقوال متواتر اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس بارے میں بہت سی قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔[5]

جب امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے

[1] البداية والنهاية: 309/7. [2] مطلوب كل طالب من شرح كلمات علي بن أبي طالب منقول از منهج علي بن ابي طالب في الدعوة إلى الله، ص: 96. [3] الذاريات 21:51. [4] الفتاویٰ: 191/7.
[5] في ظلال الإيمان للخالدي، ص: 23.

فرمایا: ایمان چار ستونوں پر قائم ہے، صبر، یقین، عدل اور جہاد اور پھر صبر کے چار حصے ہیں: شوق، خوف، زُہد اور موت کا انتظار۔ جسے جنت کا شوق ہوگا وہ شہوات کو بھول جائے گا۔ جو جہنم سے خوف رکھے گا وہ مُحرمات سے اجتناب کرے گا، اور جو دنیا سے بے رغبت ہوگا وہ مصیبتوں کو اہمیت نہیں دے گا، اور جو موت کا انتظار کرے گا، وہ بھلائیوں کی طرف تیزی سے رواں دواں ہوگا۔ یقین کے بھی چار حصے ہیں: ہوشمندی وبصیرت، دانائی، عبرت پکڑنا اور پہلے لوگوں کی سنت۔

جو ہوشمندی اور بصیرت سے کام لے گا، دانائی کھل کر اس کے سامنے آجائے گی اور جب دانائی واضح ہوگی تو وہ عبرت کو پہچان لے گا اور جو عبرت کو جان لے گا گویا وہ اولین میں شمار ہونے لگے گا۔ عدل کے بھی چار حصے ہیں: گہرا فہم، گہرا علم، فیصلہ کن صلاحیت اور حلم وبردباری میں رسوخ۔ جو فہم سے کام لے گا علم کی گہرائی تک پہنچ پائے گا اور جو علم کی گہرائی تک پہنچ جائے وہ فیصلہ کرنے کے ضابطے جان لے گا اور جو بردباری سے کام لے گا وہ معاملاتِ زندگی میں افراط وتفریط کا شکار نہیں ہوگا اور لوگوں کے مابین قابل تعریف حالت میں زندگی بسر کرے گا۔

جہاد کے بھی چار حصے ہیں: امر بالمعروف، نہی عن المنکر، ہر موقع پر سچائی اختیار کرنا اور فاسقوں سے دشمنی۔ جو نیکی کا حکم دے گا وہ مومنوں کو تقویت پہنچائے گا اور جو لوگوں کو برائی سے روکے گا وہ منافقوں کی ناک خاک آلود کرے گا اور جو سچائی اختیار کرے گا گویا اس نے اپنی ذمہ داری ادا کی اور جس نے فاسقوں سے دشمنی کی اور اللہ کی خاطر ناراض ہوا تو اللہ قیامت کے روز اسے راضی کرے گا۔ [1]

امیر المومنین نے تقویٰ کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا: معصیت پر اصرار نہ کرنا اور اطاعت سے دھوکا نہ کھانا۔ [2]

[1] نہج البلاغة، ص:668,667. [2] تفسير الرازي: 21/2.

مزید فرمایا: تقویٰ ذاتِ جلیل سے خوف، اللہ کے نازل کردہ احکام پر عمل، تھوڑے پر قناعت اور دنیا سے کوچ کی تیاری کا نام ہے۔[1]

تقویٰ کی ترغیب دیتے ہوئے امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جو اہتمام کیا، فرد اور معاشرہ دونوں پر اس کے اثرات وثمرات مرتب ہوئے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

مسئلہ تقدیر

امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زمین میں رونما ہونے والی ہر چیز اسی وقت رونما ہوتی ہے جب اس کا فیصلہ آسمان میں کر دیا جاتا ہے۔ ہر شخص کی حفاظت و دفاع کے لیے دو فرشتے مقرر ہیں۔ لیکن جب اس کی تقدیر کا وقت ہو جاتا ہے تو فرشتے اس سے الگ ہو جاتے ہیں اور تقدیر کا لکھا پورا ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی اللہ کی طرف سے محفوظ ڈھال میسر ہے۔ پھر جب میری اجل آجائے گی تو میری ڈھال ختم ہو جائے گی۔ کوئی شخص اس وقت تک ایمان کی حلاوت نہیں پا سکتا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئے کہ جو چیز اسے مل گئی وہ کبھی چھن نہیں سکتی تھی اور جو اسے نہیں ملی وہ اسے کبھی مل نہیں سکتی تھی۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہر شخص کا جانی اور مالی نفع اور نقصان آسمان سے ایسے ہی نازل ہوتا ہے جیسے آسمان سے بارش برستی ہے۔ لہٰذا جس شخص کا مالی یا جانی نقصان ہو جائے اسے اس مصیبت کو اپنے لیے فتنہ و آزمائش نہیں بنا لینا چاہیے۔ بلکہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے دو خوبیوں میں سے ایک کی امید رکھنی چاہیے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں ہے وہی اس کے لیے بہتر ہے۔ یا تو اللہ تعالیٰ اسے مال و دولت سے نواز دیں اور وہ مال و دولت اور اہل و عیال کے ساتھ اپنے دین کی حفاظت کرتا ہوا زندگی گزار لے، یا ان چیزوں کی کمی کے ساتھ آخرت کی نعمتوں کا وارث بن جائے۔ اور آخرت تو سراسر خیر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔''

[1] فرائد الکلام، ص: 334.

کھیتی دو قسم کی ہے۔ ایک کھیتی دنیا کے مال و دولت اور تقوے کی ہے اور دوسری آخرت میں باقی رہنے والے نیک اعمال کی ہے۔ اور کبھی اللہ خوش نصیبوں کو دونوں ہی عطا فرما دیتا ہے۔

بندوں کا حساب

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اتنی بڑی تعداد کا حساب کیسے لے گا؟ تو انھوں نے فرمایا: جس طرح اتنی بڑی تعداد کو رزق عطا فرماتا ہے۔

امیر المؤمنین کا شاندار خطبہ

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ اپنی رعایا کی تعلیم و تربیت اور راہنمائی کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً انھیں ہدایات دیتے یا پھر جمعۃ المبارک کے خطبے میں انھیں پند و نصائح کرتے۔ جمعہ کے روز امت کی راہنمائی کے لیے خصوصی خطبات دیے جاتے۔ تاریخی کتب میں امیر المؤمنین کے متعدد خطبات محفوظ ہیں۔ ان خطبات میں سے ایک نادر اور شاندار خطبہ ملاحظہ فرمائیں۔

امیر المؤمنین نے فرمایا: لوگوں! دنیا جارہی ہے اور اس نے کوچ کا اعلان کر دیا ہے، اور آخرت آرہی ہے اور ٹیلوں سے جھانک رہی ہے۔ آج گھڑ دوڑ کی تیاری کا دن ہے اور کل مقابلے کا۔ خبردار! آج تم پُر امید دن گزار رہے ہو جن کے پیچھے تمھاری اجل لگی ہے۔ لہٰذا جس نے اپنی اجل سے پہلے پہلے عمل میں کوتاہی کی تو وہ ناکام و نامراد ہوگیا۔ خبردار! اللہ کی جنت اور انعامات کے شوق میں اسی طرح عمل کرو جس طرح اس کی جہنم کے ڈر سے کرتے ہو۔ بلاشبہ میں نے جنت جیسی نعمت نہیں دیکھی کہ جسے طلب کرنے والے سو رہے ہوں اور میں نے جہنم جیسی خوفناک جگہ نہیں دیکھی جس سے نجات چاہنے والے سو گئے ہوں۔

یقیناً جسے حق بات نفع نہ دے اسے باطل ضرور نقصان پہنچاتا ہے۔ جسے ہدایت، راہ مستقیم پر نہ چلاسکی اسے گمراہی لے اڑتی ہے۔ خبردار! تمھیں کوچ کا حکم دیا جا چکا ہے، زاد راہ کی راہنمائی کر دی گئی ہے، لوگو! آگاہ رہو، یہ دنیا فوری سامان ہے جس سے نیک و بد دونوں لطف اندوز ہو رہے ہیں جبکہ آخرت اللہ کا سچا وعدہ ہے جس میں قادر مطلق بادشاہ فیصلے کرے گا خبردار! شیطان تمھیں فقر و فاقے کا وعدہ دیتا ہے اور بے حیائی کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اللہ بہت وسعت والا خوب جاننے والا ہے۔

اے لوگو! اپنی زندگی میں نیک اعمال کرو، تمھاری نسلوں کا تحفظ ہو جائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمانبرداروں کو جنت کا وعدہ دیا ہے اور نافرمانوں کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔ وہ جہنم ایسی خوفناک جگہ ہے جہاں چیخ و پکار کبھی نہ تھمے گی، اس میں قید کبھی رہائی نہ پائے گا، جس کے نقصان کا کوئی ازالہ نہیں، بڑھکتی ہوئی آگ نہایت گہری ہے اور اس میں مشروب زخمیوں کی پیپ ہے۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زُہد و تقوی

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بڑے بالغ نظر عالم اور دور اندیش مدبر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں خوب نوازا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں رہے۔ اسی لیے ان کی تربیت نہایت اعلیٰ معیار پر ہوئی۔ آپ نے زندگی کا ہر لمحہ قرآن اور سنت کی چھاؤں میں بسر کیا، زہد و تقویٰ کو شعار بنانے، قرآن کریم کے سائے میں زندگی بسر کرنے، نبی امین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر آن وابستگی، صحابہ کرام کی مصاحبت اور دنیا کے احوال و انجام کے مطالعے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوب سمجھ لیا کہ یہ دنیا آزمائش کا گھر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے زُہد کی بڑی اعلیٰ مثالیں پیش کی ہیں۔

جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

① اے سونا اور چاندی! میرے سوا کسی اور کو دھوکا دینا

علی بن ربیعہ الوالبی سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ابن النباح آیا اور کہنے لگا: اے امیر المؤمنین! مسلمانوں کا بیت المال سونے اور چاندی سے بھر گیا ہے۔ یہ سن کر انھوں نے فرمایا: اللہ اکبر! پھر ابن النباح کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ پھر بیت المال میں آن کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے ابن النباح! کوفہ کے لوگوں کو میرے پاس بلاؤ۔ لوگوں کو منادی کر کے بُلایا گیا۔ لوگ آگئے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بیت المال میں جو کچھ تھا سب تقسیم کر دیا۔ آپ لوگوں کو رقوم، سونا اور چاندی دیتے جاتے اور ساتھ ساتھ فرماتے جاتے: اے سونا اور چاندی! کسی اور کو دھوکا دینا۔ آپ نے کوئی درہم چھوڑا نہ کوئی دینار سب کچھ بانٹ دیا۔ پھر بیت المال کو صاف کرایا اور اس میں دو رکعت نماز ادا کی۔ ابو نعیم کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے جس کی خبر مجمع التیمی نے دی ہے وہ کہتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیت المال میں جھاڑو پھیر دیتے اور پھر وہیں نماز ادا کرتے، اور اسے مسجد کا مقام دے دیتے، اس امید پر کہ قیامت کے دن وہ اُن کے حق میں گواہی دے۔

اس واقعہ میں اس کم تر دنیا کے مال و متاع سے مکمل بے نیازی کی شان جھلک رہی ہے۔ مال و دولت کے دنیاوی خزانوں سے ایسی بے نیازی کہیں نہیں ملتی۔ یہ زہد کی سب سے اونچی مثال ہے۔ بیت المال سونے اور چاندی سے بھرا ہوا ہے لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ اسے پسندیدگی اور متاثر ہونے کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ جب مالیات کے مسئول نے انھیں اس کی طرف متوجہ کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ اکبر! کچھ لوگ دنیا کو بڑا سمجھتے اور اس کی تعظیم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس دنیا سے اور اس کے سارے مال سے بڑا ہے۔ جب ایک مسلمان یہ حقیقی شعور رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے تو وہ اپنے دل کو ایک حقیر، بے توقیر اور چھوٹی چیز کا

خواہشمند کس طرح بنائے گا؟ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عظیم تفقہ فی الدین ہے۔ اُنھیں ادراک ہوا کہ دنیا تو ایک حقیر ترین چیز ہے تو انھوں نے اللہ کی کبریائی کا اعلان کر دیا۔ یوں وہ زبانِ حال سے اُس شخص کو ملامت کر رہے ہیں جو دنیا کے ضرورت سے زائد سامان اور مال سے دھوکا کھائے اور یہ حقیقت عظمیٰ بھول جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی بزرگ و برتر ہستی ہے۔ وہی سب سے بڑا ہے۔ اس کی بڑائی کے آگے ساری دنیا کا مال ومتاع ہیچ اور ناقابل توجہ ہے۔ یہ ترازو (میزان) باریک بین ہے جسے وہ مومن ہی محسوس کر سکتا ہے جسے اللہ نے نورِ بصیرت عطا کیا ہو۔[1]

② اللہ کی قسم! میں تمھارے مال میں سے کچھ نہیں لوں گا

زہد وتقوی میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ بے مثال تھے۔ ہارون بن عنترہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ میں خورنق مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گیا۔ وہ ایک پرانی چادر میں لپٹے ہوئے تھے، شدید سردی پڑ رہی تھی۔ اس وجہ سے وہ کپکپا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اور آپ کے اہل خانہ کے لیے اس مال میں حصہ رکھا ہے مگر آپ اپنے ساتھ یہ کیسا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں؟ یہ سن کر اُنھوں نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں تمھارے مال میں سے کچھ نہیں لوں گا، یہ میری چادر ہے جو میں گھر سے اوڑھ کر یہاں آیا ہوں یا فرمایا کہ مدینہ سے آیا ہوں۔''[2]

یہاں تھوڑی دیر کے لیے رک جائیے۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بلند مقامی پر غور کیجیے۔ وہ فقر و درویشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شدید سردی کے باوجود انھوں نے اسی ذاتی چادر پر گزارا کیا جو وہ اپنے گھر سے لائے تھے۔ حالانکہ وہ امت مسلمہ کے بڑے عظیم

[1] التاريخ الإسلامي للحُميدي: 427/12. [2] حلية الأولياء: 82/1، وصفة الصفوة: 316/1.

المرتبت فرمانروا تھے۔ بہت بڑی اسلامی مملکت کی عنان اقتدار سنبھالے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر ہم باہمی سوال کرتے ہوئے سوچتے ہیں کہ وہ کیا بات ہے جس کے باعث امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فقراء کے درویشانہ طرز زندگی کو پسند کیا اور شدید سردی کو برداشت کرنا پسند کیا، جبکہ وہ چاہتے تو روئے زمین کے اعلیٰ ترین اور گرم ملبوسات خرید سکتے تھے مگر انھوں نے گرم چادر خریدنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ زُہدِ حقیقی کی ایک لازوال مثال ہے۔ دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ ساز وسامان کے حصول کی طاقت رکھنے کے باوجود اس سے بے نیازی اور بے رغبتی کا مظاہرہ فرمایا۔ دراصل وہ نبوی تعلیم گاہ کے شاگردِ رشید ہیں۔ وہاں انھیں دنیائے فانی کے سامان سے بے نیازی اور بے رغبتی اور لازوال آخرت کی نعمتوں کے لیے مسابقت کی تربیت ملی تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ فقر کی زندگی کو ترجیح دی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجے کے مالداروں کی طرح آسائش کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔[1]

③ یہ سودا میری رضا مندی سے ہوا ہے

ابو مطر عمر بن عبد اللہ الجھنی سے روایت ہے، انھوں نے بتایا: ایک دن میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ تہبند باندھے ہوئے اور چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں دُرّہ تھا۔ وہ دیہی باشندے معلوم ہو رہے تھے، آگے راوی نے اُن کے بازار جانے اور ایک تاجر سے تین درھموں میں کپڑے کا سودا کرنے کا ذکر کیا ہے۔ تاجر اُن کو پہچان گیا، لہٰذا اُنھوں نے اس سے کچھ نہ خریدا۔ وہ ایک اور تاجر کے پاس گئے۔ اس نے بھی انھیں پہچان لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس سے بھی نہ خریدا، پھر وہ ایک لڑکے کے پاس آ گئے۔ اس سے تین درہموں میں ایک قمیص خریدی، بعد ازاں لڑکے کا باپ ایک درہم لے کر امیر المومنین کے پاس آیا اور انھیں ایک درہم واپس دینا چاہا، انھوں نے دریافت فرمایا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: قمیص کی قیمت صرف دو درہم تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس نے میری اور اپنی رضا مندی سے قمیص فروخت کی ہے۔[2]

[1] التاريخ الإسلامي: 428/12. [2] الزهد للإمام أحمد، ص: 130.

وہ اپنے عظیم منصب کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے بروئے کار لانے سے ہمیشہ دور رہے۔ خلیفہ جب عدل سے کام لے گا تو وہ ان سات اشخاص میں سے اول نمبر پر ہوگا جنھیں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سایہ فراہم فرمائے گا، وہ اپنے نیک عمل کو دنیوی اغراض سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے تھے تاکہ آخرت میں اجر کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور پھر وہ اپنے اعلیٰ کردار کے باعث اپنے جانشینوں کے لیے بہترین نمونہ عمل چھوڑ گئے۔ [1]

④ دل میں خشوع پیدا ہوگا اور مومن پیروی کریں گے

عمر بن قیس کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی قمیص میں پیوند کیوں لگائے ہوئے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: اس سے دل میں خشوع پیدا ہوگا اور دیگر مومن اِس کی اقتدا کریں گے۔ [2]

⑤ خلیفہ کے لیے اللہ کے مال میں سے دو پیالوں سے زیادہ حلال نہیں

عبداللہ بن زریر الغافقی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ہمیں کھانا پیش کیا جو خشک گوشت اور آٹے سے بنا ہوا تھا، میں نے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو خیر کثیر سے نوازا ہے، آپ کسی مرغابی وغیرہ کے گوشت کا انتظام کر لیتے تو اچھا تھا۔ اس پر انھوں نے فرمایا: اے ابن زریر! میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خلیفہ کے لیے اللہ کے مال میں سے دو پیالے لینا حلال ہے۔ ایک وہ جسے وہ خود اور اس کے اہل خانہ کھائیں اور دوسرا پیالہ وہ جو وہ مہمانوں کو پیش کرے۔ [3]

---

[1] التاریخ الإسلامی للحمیدی: 429/12. [2] تاریخ الإسلام، عهد الخلفاء الراشدین للإمام الذهبی، ص: 647. [3] مسند أحمد: 78/1، حدیث: 578، احمد شاکر کا کہنا ہے: اس کی سند صحیح ہے جبکہ بعض دیگر علماء نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

یہ ہیں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جو زوال پذیر دنیا میں کھانے پینے، آرام و آسائش اور مال و متاع سے بے رغبتی اختیار کرنے کی اعلیٰ مثال ہیں۔ بالکل جائز اور حلال ذرائع سے ان کے لیے پوری طرح ممکن تھا کہ جتنا مال چاہیں لے لیں۔ انھیں مالدار مسلمانوں کے مساوی معیشت کی پیش کش کی گئی، لیکن انھوں نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔ وہ موٹی جھوٹی، مشقت بھری سادہ زندگی اختیار کرنے پر خوشی خوشی راضی ہوگئے۔ وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے، احتیاط پر مبنی زندگی بسر کرتے تھے۔[1]

⑥ میں انجانی چیز کھانا پسند نہیں کرتا

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اس تھیلے کو سیل بند کر رہے تھے جس میں ان کے کھانے کے لیے جو کا آٹا تھا اور ساتھ ساتھ فرما رہے تھے: میں پسند نہیں کرتا کہ میرے پیٹ میں وہ چیز داخل ہو جسے میں نہیں جانتا۔[2]

سفیان کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غلہ جمع کرنے کے لیے گڑھے پر گڑھا رکھا نہ اینٹ پر اینٹ رکھی اور نہ ہی ڈنڈے سے کوئی ستون کھڑا کیا۔ ان کے لیے غلہ مدینہ سے ایک تھیلے میں لایا جاتا تھا۔[3]

⑦ میں مہکتی ہوئی خوش رنگ اور خوش ذائقہ غذا نہیں کھانا چاہتا

عدی بن ثابت اور حبہ بن جوین راوی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دسترخوان پر فالودے کا بھرا ایک تھال پیش کیا گیا۔ مگر انھوں نے یہ فالودہ نہیں کھایا بلکہ فالودے کو مخاطب کر کے فرمانے لگے: تو عمدہ خوشبو والی، خوش رنگ اور بہترین ذائقے کی چیز ہے لیکن مجھے پسند نہیں کہ اپنے نفس کو اس چیز کا عادی بناؤں جس کا وہ پہلے عادی نہیں۔[4]

---

[1] التاريخ الإسلامي: 431/12. [2] الكامل في التاريخ: 443/2. [3] الكامل في التاريخ: 443/2.
[4] الحلية: 81/1، وصحيح التوثيق، ص: 74.

⑧ دنیا کی زاہد ترین شخصیت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

حسن بن صالح بن حی کہتے ہیں: عمر بن عبدالعزیز کی مجلس میں زاہدوں کا تذکرہ ہورہا تھا انھوں نے کہا: دنیا میں سب سے بڑھ کر زاہد تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔[1]

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گدھے پر سوار ہوئے اور اپنی ٹانگیں ایک طرف ہی لٹکا دیں پھر فرمایا: یوں میں نے دنیا کی اہانت کی ہے۔ ان کا یہ عمل زہد وتقوی پر عملی تربیت کے حوالہ سے تھا۔ تکبر کے باعث نہیں تھا۔[2]

امام ابوعبید نے اپنی کتاب ''الاموال'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے سال میں تین مرتبہ (حاجتمندوں میں) مال تقسیم کیا، پھر اُن کے لیے اصفہان سے مال آیا تو فرمایا: آؤ چوتھی بار پھر یہ مال لے جاؤ، میں یہ مال جمع کر کے رکھنے والا نہیں ہوں، کچھ لوگوں نے لے لیا اور بعض نے نہیں لیا۔[3]

آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، میں نے تمھارے مال میں سے تھوڑا یا زیادہ کبھی کچھ نہیں لیا مگر یہ چیز!...... پھر اپنی قمیص کی آستین سے ایک شیشی نکالی، اس میں خوشبو تھی۔ فرمایا: یہ مجھے ایک دہقان نے ہدیہ کی تھی۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر بیت المال کی طرف آئے اور کہا: اس میں سے لے لو، پھر فرمانے لگے: جس شخص کے پاس بانس کی ٹوکری ہو اور اس میں سے روزانہ ایک کھجور کھا لیا کرے وہ کامیاب وکامران ہے۔[4]

ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زُہد کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو! زُہد، قلیل تمناؤں، نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور حرام باتوں سے بچنے کا نام ہے۔[5]

قلیل تمنائیں ان لمبی امیدوں کے برعکس ہیں جو انسان کو آخرت بھلا دیتی ہیں۔ قلیل تمناؤں

---

[1] تاریخ الإسلام، عهد الخلفاء الراشدين، ص: 645. [2] تاریخ الإسلام للإمام الذهبی، ص: 645.
[3] كنز العُمال: 320/2. [4] المرتضى للندوی، ص: 212. [5] علی بن أبي طالب لمحمد رشيد رضا، ص: 304.

سے مراد یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کے درمیان توازن قائم کیا جائے، اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مطلوب ہو۔ آپ نے نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا: ربانی مزاج رکھنے والے مسلمان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مادی اور معنوی دونوں قسم کی نعمتوں کا شعور رکھتا ہے اور پھر سب پر غالب اور وہاب ہستی کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور حرام باتوں سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی خاطر وہ حرام کی ہوئی چیزوں سے دوری اختیار کرتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قرآنی اخلاق

قرآنی اخلاق میں سے تواضع امیر المومنین کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝ ﴾

”زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔“ [1]

ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝ ﴾

”اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کرو، نہ زمین میں اکڑ کر چلو، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا، اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو، اور اپنی آواز ذرا پست رکھو سب آوازوں سے بُری آواز گدھوں کی آواز ہے۔“ [2]

[1] بني إسرائيل 37:17. [2] لقمان 18:31، 19.

سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت مبارک میں اپنے نفس کی پہچان، نرمی، عاجزی اور انکسار جیسے اعلیٰ اخلاق سے متصف ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ دین حنیف رعونت، تکبر، فخر وغرور اور لوگوں کو حقیر سمجھنے سے سختی سے منع فرماتا ہے، اور اس کے برعکس حکم دیتا ہے کہ ہم تواضع اور میانہ روی اختیار کریں۔ اور بُرے اخلاق کے بارے میں سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اللہ کسی خود پسند فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا......'' یہاں تواضع کے بارے میں جو ترغیب دی گئی ہے وہ مومن کے لیے کافی ہے۔[1] قرآن کریم نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ تواضع کرنے والوں کو تعظیم وتوصیف سے سرفراز بھی فرمایا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝﴾

''رحمان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال سے چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔''[2]

اس میں تواضع اختیار کرنے والوں کو تعریف وتوصیف سے نوازا گیا ہے یعنی انھیں عبدیت کی صفت سے یاد فرمایا گیا ہے، اس میں ان کے لیے بڑا اعزاز ہے، کیونکہ اللہ کی عبودیت اعلی ترین اوصاف اور محبت کرنیوالوں کے اعلی مرتبے کی نشان دہی کرتی ہے۔[3]

ہمارے نبی اکرم محمد ﷺ اس خلق عظیم پر بہر صورت وشکل اعلی ترین چوٹی پر سرفراز کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اعلیٰ مدارج کا بہترین ادب سکھایا، اسی سلسلے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

---

[1] أخلاق النبي في القرآن والسنة، أحمد الحداد: 454/1. [2] الفرقان 63:25. [3] أخلاق النبي في القرآن والسنة، أحمد الحداد: 454/1.

''تم اس متاعِ دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے ان میں مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ، انھیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو۔''[1]

اور فرمان ربانی ہے:

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمھاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔''[2]

اس آیت میں نرم پہلو اختیار کرنے کے الفاظ ہیں جن سے مراد تواضع اور نرمی ہے۔[3] نبی اکرم ﷺ نے اس ارشاد ربانی پر پورا عمل کیا اور اس تواضع کے اثرات ان کی ذاتی، خاندانی اور اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوئے۔ ہر حالت میں آپ ﷺ کا اللہ کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ تواضع کا رویہ بہر حال قائم رہا۔[4] امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت یہ ہے کہ وہ اس قرآنی اور نبوی تربیت پر ہمیشہ قائم رہے۔ یہی خوبی ان کی یکتائے روزگار شخصیت کا حصہ بن گئی۔

آیئے اسی کردار کی روشنی میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے مزید کچھ پہلو ملاحظہ فرمایئے!

(ا) بچوں والا خود اٹھانے کا زیادہ حق دار ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک درہم کی کچھ کھجوریں خریدیں، اور کپڑے میں ڈال کر اٹھا لیں۔ کچھ احباب نے کہا: امیر المومنین! لایئے ہم اٹھا لیتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: عیال دار خود اٹھانے کا زیادہ حق دار ہے۔[5] یہ ان کی خوئے تواضع کی مثال

[1] الحجر 88:15. [2] الشعراء 215:26. [3] روح المعاني للآلوسي: 80/5. [4] أخلاق النبي في القرآن والسنة: 459/1. [5] الزهد للإمام أحمد، ص: 133.

ہے کہ امیر المومنین اور بڑی عمر کا فرد ہونے کے باوجود انھوں نے اپنا سامان خود اُٹھایا۔ لوگوں سے خدمت لینے کا کوئی جواز پیدا نہیں کیا، تواضع کے معاملہ میں ان کی طرف سے ہمیشہ بہترین نمونہ پیش کیا گیا۔ یوں کسی بھی بڑے سے بڑے انسان کے لیے سامان خود اٹھانے کو عیب تصور کرنے کا ازالہ ہوگیا، اور اگر عاجزی وانکساری اختیار کرنے والے پر کسی کو اعتراض ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عملی زندگی کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو اپنے عہد کی سب سے بڑی مقتدر شخصیت ہونے کے باوجود عاجزی وانکساری کا مجسمہ تھے۔ [1]

(ب) اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ سے حسن سلوک

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام صہیب سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ اور پاؤں چوم رہے تھے اور فرما رہے تھے: اے میرے چچا! مجھ سے راضی ہو جائیے۔ [2]

ضرار الصدائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو اوصاف بیان کیے ہیں وہ ہمارے لیے قابل توجہ ہیں، وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوٹا لباس پسند تھا، سادہ کھانا اچھا لگتا تھا۔ وہ ہمارے مابین اس طرح رہتے جیسے ہم ہی میں سے ہوں، جب ہم ان سے کوئی سوال کرتے تو وہ ہمیں جواب مرحمت فرماتے تھے، اور جب کسی خبر کے بارے میں پوچھتے تو ہمیں آگاہ کرتے، ان کے اور ہمارے مابین بڑی قربت تھی۔ اس کے باوجود ان کی ہیبت اور رعب کا یہ عالم تھا کہ ہمیں ان سے بات چیت کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ [3]

تواضع کے بارے میں امیر المؤمنین کے اقوال یہ ہیں: آدمی کا تواضع اختیار کرنا اس کے لیے عزت افزائی کا موجب ہے۔ [4] آدمی جوں جوں کتاب وسنت کے علم وعمل میں راسخ ہوتا چلا جاتا ہے وہ اپنے نفس کی حقیقت کو جان لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اور مخلوق کے

---

[1] التاريخ الإسلامي: 64/17. [2] أصحاب الرسول: 224/1، و السيرة للإمام الذهبي: 94/2، اس کی سند صحیح ہے۔ [3] الاستيعاب: 1108/3. [4] منهج أمير المومنين علی فی الدعوة، ص: 523.

ساتھ برتاؤ میں اس کی عاجزی و انکساری میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ آج کے دور میں بعض داعیان اسلام کی خود پسندی دراصل ان کے علم اور فہم وشعور میں کمی کے باعث ہے۔ مزید برآں یہ کہ داعی اپنے اردگرد پیروکار لوگوں کو دیکھتا ہے، اور ربانی علماء کے لیے اللہ کے ہاں کیا کچھ ہے وہ اس سے غافل رہتا ہے۔ علماء اور طالبانِ علم کے ساتھ شیطان کی یہ مخفی چالیں ہیں جو وہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ حکمت و دانائی کے موتیوں میں سے یہ بھی ہے: جب اللہ تعالیٰ تجھے علم سے نوازے تو کم تر جاہلوں کی کثیر تعداد کے بارے میں نہ سوچو بلکہ اپنے سے برتر علماء کو دیکھو۔[1]

دیکھیے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد گرامی میں کتنی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تعلیم موجود ہے۔ آپ نے فرمایا: مالدار کا غریب کے ساتھ تواضع کا برتاؤ کیا خوب ہے جبکہ مالدار کی غرض وغایت اس کے سوا کچھ نہ ہو بلکہ اسے اللہ کی ذات عالی سے اجر وثواب کی امید ہو۔ اس سے بھی زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ غریب مالدار سے شان بے نیازی کا مظاہرہ کرے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پر پورا بھروسا رکھے۔[2]

اس کا مطلب تکبر نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ مالداروں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیازی اختیار کی جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان فیاضی

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم شخصیت میں جود وکرم کے گوہر والماس خوب چمکے۔ حافظ ابن کثیر اصبغ بن نباتہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! میں آپ سے ایک ضرورت کے سلسلے میں مدد کا طلبگار ہوں، لیکن آپ کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے یہ ضرورت اللہ تعالیٰ کے

[1] هداية المرشدين لعلى محفوظ، ص: 105. [2] موعظة المؤمنين: 344/2، وفرائد الكلام، ص: 339.

حضور پیش کر چکا ہوں، اگر آپ نے میری یہ ضرورت پوری کر دی تو میں اللہ کا شکر ادا کروں گا اور آپ کا شکریہ بھی ادا کروں گا۔ لیکن اگر آپ نے میری یہ ضرورت پوری نہ کی تو میں اللہ کا شکر ادا کروں گا اور آپ کو معذور سمجھوں گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنی ضرورت زمین پر لکھ دو مجھے یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ مانگنے کی ذلّت تمھارے منہ پر دیکھوں۔

اس شخص نے زمین پر لکھ دیا کہ مجھے پہننے کے لیے کپڑوں کا ایک جوڑا چاہیے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حکم پر اسے ایک خوبصورت جوڑا پیش کر دیا گیا۔ اس آدمی نے یہ جوڑا لے کر پہن لیا اور پھر اشعار کی صورت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سخاوت کی توصیف کی۔

امیر المومنین سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: سات دن ہوگئے میرے پاس کوئی مہمان نہیں آیا، مجھے ڈر ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوگیا۔ [1]

انھوں نے فرمایا: وہ بیس درہم جو میں اپنے مومن بھائی کو دوں مجھے ان سو درہموں سے زیادہ محبوب ہیں جو میں مساکین کے لیے صدقہ کروں۔ [2]

جب ان سے سخاوت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: سخاوت وہ ہے جو بن مانگے کی جائی اور اگر مانگنے پر کی جائے تو وہ بوجہ حیا تکلف پر مبنی جود و کرم ہوگا۔ [3]

انھوں نے اپنی زندگی ہی میں بہت کچھ اللہ کی راہ میں وقف کر دیا تھا، ینبع میں اپنی زمین مسلمانوں کے لیے وقف کر دی اور اس بارے میں تحریر لکھی: اس بات کا حکم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے دیا ہے اور اپنے مال کے بارے میں یہ فیصلہ کیا، میں نے ینبع، وادی القری الاذینہ اور زاعۃ اللہ کی راہ اور قریب اور دور کے ذوِی الارحام کے لیے صدقہ کر دیا ہے، نہ اسے کسی کو ہبہ کیا جائے اور نہ کوئی اس کا وارث ہوگا، چاہے میں زندہ رہوں یا فوت ہو جاؤں۔ [4]

[1] فرائد الکلام، ص:402، وموعظة المؤمنين:252/2. [2] موعظة المؤمنين:130/1. [3] تاريخ الخلفاء للسيوطي، ص:204. [4] تراث الخلفاء الراشدين، ص:517.

انھوں نے اپنے کیے گئے صدقات کے بارے میں فرمایا: میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہوا ہے جب میں نے بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا تھا جبکہ آج میرے صدقات چار ہزار دینار تک پہنچ چکے ہیں۔[1] چار ہزار دینار سے مراد ان کے مال کی زکاۃ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وقف شدہ صدقہ کی مالیت ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی مال جمع نہیں کیا۔ اس کی دلیل[2] یہ ہے کہ ان کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! آج تم سے وہ شخصیت جُدا ہوگئی ہے جس نے ترکے میں سونا چھوڑا نہ چاندی، ہاں صرف وہ سات سو درہم ضرور موجود ہیں جو ان کے وظیفے میں سے بچ گئے تھے، اور وہ اس سے ایک خادم خریدنا چاہتے تھے۔ وہ لوگوں کو اہل و عیال اور افراد خاندان کے اکرام کی ترغیب دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے:

اپنے اہل خاندان کی عزت کرو۔ وہ تمھارے لیے پَر کی مانند ہیں۔ تم انھی کے تعاون سے اڑان بھر سکتے ہو۔ وہ تمھاری عزت و طاقت ہیں۔ حالات کی شدت میں وہ تمھارے لیے قوت بازو ہیں، ان میں سے بڑے مرتبہ والے کی عزت کرو، بیمار کی بیمار پُرسی کرو، انھیں اپنے امور میں شریک کرو اور ان میں سے تنگ دست کے لیے آسانی پیدا کرو۔[3]

حیا خوف الٰہی کی نشانی ہے

حیا اخلاق فاضلہ میں اعلیٰ ترین صفت ہے کیونکہ یہ صفت نفس کی پاکیزگی، زندہ ضمیری، دینی بیداری اور خوف الٰہی پر دلیل ہے، اگر کوئی باحیا نہیں ہے تو وہ مہمان نوازی نہیں کرے گا، وعدہ وفا نہیں کرے گا، ادائے امانت سے روگردانی کرے گا، لوگوں کی ضروریات پوری نہیں کرے گا، ایثار و قربانی سے گریز کرے گا، برائی سے اجتناب نہیں کرے گا۔ ستر پوشی کا اہتمام نہیں کرے گا اور فواحش سے باز نہیں آئے گا۔

[1] أسد الغابة: 7/4. [2] صحيح التوثيق، ص: 77. [3] فرائد الكلام، ص: 348.

یہ صفتِ حیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھی، وہ خود اپنے اس خلق کے بارے میں فرماتے ہیں: مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا محسوس ہوتی ہے کہ گناہ، میری درگزر سے زیادہ بڑا ہو یا جہالت میرے حلم و بردباری سے زیادہ ہو یا ایسا عیب جسے میں نہ چھپا سکوں یا کوئی ایسا نقص ہو جس کی تلافی میری سخاوت سے نہ ہو۔ یہ کمی اور نقص کی چار جہات ہیں، جن کا تقابل حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چار صفاتِ کمال سے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے حیا انسان سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ میں قدرت و طاقت کے باوجود عفو و درگذر کی صفت اپنے اندر پیدا کرے۔ یہ بات اس وقت ہوگی جب انسان اللہ کی حدود میں سے کسی حد کی خلاف ورزی نہ کرے۔ انسان ایسے علم سے مُتصف ہو جو جاہلوں کی جہالت کو بھی ڈھانپ لے۔ وہ لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈالے اور وہ اپنے جودوکرم سے لوگوں کی ضرورتیں پوری کرے، دانشمندوں کے ہاں یہ چاروں صفات، صفاتِ کمال شمار ہوتی ہیں۔ آج کل بہت سے سیاستدان دنیاوی شہرت کمانے اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ان صفات کو اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان صفات کو حیا کے ساتھ مربوط کر دیا کیونکہ ان کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول تھا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ دنیوی اہداف کے بجائے یہی ہدف قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عبودیت، صبر اور اخلاص

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں عبادت کا جامع مفہوم اپنایا، آپ رات کے قیام کی وجہ سے ممتاز ہوگئے اور ان اہل تہجد میں سے ہوگئے تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

[1] التاريخ الإسلامی للحمیدی: 20/275.

﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝﴾

''ان کی کروٹیں اپنے بستروں سے الگ رہتی ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے وہ خرچ کرتے ہیں۔''[1]

ضرار بن ضمرہ الکنانی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: علی رضی اللہ عنہ اس دنیا اور اس کی رنگینیوں سے بڑی وحشت محسوس کرتے تھے۔ وہ رات کے اندھیرے سے بہت مانوس تھے۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں، میں نے انھیں اس وقت دیکھا جب رات اتر کر اپنی چادر پھیلا چکی تھی اور ستارے غروب ہو چکے تھے، وہ محراب کے اندر اپنی ڈاڑھی ہاتھ میں لیے ہوئے اضطرابی کیفیت میں اس طرح کروٹیں بدل رہے تھے جیسے سانپ کا ڈسا ہوا آدمی لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔[2] وہ غم زدہ انسان کی طرح رو رہے تھے۔ گویا میں اس وقت بھی ان کی آواز سن رہا ہوں، وہ بار بار ''اے میرے رب! اے میرے رب!'' کے الفاظ دہرا رہے تھے۔ اور اللہ کے حضور گڑگڑا رہے تھے، وہ دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے تھے: دور ہو جا! دور ہو جا!، میرے سوا کسی اور کو دھوکا دے، میں نے تجھے قطعی طلاق دے دی ہے۔ تیری عمر کم ہے، تیری ہم نشینی حقیر ہے، میری نظر میں تیری کوئی وقعت نہیں ہے۔ آہ! زاد سفر قلیل ہے، سفر بعید ہے اور راستے وحشت ناک ہیں۔ یہ باتیں سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آنسو نکل پڑے۔ وہ اس قدر روئے کہ ڈاڑھی تر ہو گئی، انھیں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رہا، وہ اپنی آستین سے آنسو پونچھ رہے تھے، وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی اتنا روئے کہ ان کی ہچکی بندھ گئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تھے ابوالحسن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ پھر فرمایا: اے ضرار! ان کے بعد تمھارے غم کی کیا کیفیت ہے؟ انھوں نے کہا: میں اس شخص جیسا غم محسوس کرتا ہوں جس کا کوئی پیارا ذبح ہونے کے

[1] السجدة 32:16. [2] حلية الأولياء:1/85,84، والرقة والبكاء، ص:198.

بعد اس کی گود میں پڑا ہو، یہ کہتے ہوئے نہ ان کے آنسو تھم رہے تھے نہ غم میں کوئی کمی آ رہی تھی۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر چلے گئے۔[1]

اشتر النخعی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ رات کی نماز ادا کر رہے تھے اور حالتِ قیام میں تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز پڑھ چکے تو اشتر نے کہا: اے امیر المومنین دن کے وقت روزہ اور رات کو بیداری؟ اور پھر ان دونوں کے درمیان تھکاوٹ؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آخرت کا سفر طویل ہے، لہٰذا یہ رات کے وقت چلنے ہی سے کٹے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا تقوی اور اس کی خشیت اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ انھوں نے فرمایا: اے لوگو! اس اللہ سے ڈرو کہ اگر تم کچھ کہو تو وہ سنتا ہے اور اگر کچھ چھپاؤ تو وہ جانتا ہے اور موت کی تیاری کرو، اگر تم نے اس سے فرار کی راہ اختیار کی تو وہ تمھیں آ لے گی اور اگر ٹھہرے رہے تو پھر بھی وہ تمھیں اچک لے گی۔[2] اور وہ فرمایا کرتے تھے: اے لوگو! مجھ سے یہ باتیں سیکھ لو، اگر تم سواری پر طویل سفر بھی اختیار کرو تب بھی ایسی بات کہیں نہ مل سکے گی۔ کوئی بندہ اللہ کے سوا کسی سے کوئی امید نہ رکھے، اور اپنے گناہوں کے سوا کسی چیز سے خوف نہ کھائے، اگر وہ علم نہیں رکھتا تو علم حاصل کرنے سے نہ شرمائے، اور اس بات سے بھی کبھی نہ شرمائے کہ اسے کسی سوال کا جواب نہیں آتا، کہہ دے کہ میں نہیں جانتا۔ خوب جان لو کہ ایمان میں صبر کا وہی مقام ہے جو جسم انسانی میں سر کا ہے اور ایسے جسم میں کوئی خیر نہیں جس کا سر نہ ہو۔[3] اس وصیت میں انھوں نے عقیدے کی تصحیح اور علم کے آداب کی نشاندہی دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ جبکہ انھوں نے امید اور خوف دونوں کو صحیح رُخ دینے کی کوشش بھی کی ہے۔

[1] لطائف المعارف لابن رجب، وکیف تتحمس لقیام اللیل محمد صالح، ص: 93. [2] أدب الدنیا والدین، ص: 123، وفرائد الکلام، ص: 369. [3] حلیة الأولیاء: 75/1، وصفة الصفوة: 326/1.

امیر المومنین نے بچپن ہی سے عملی زندگی میں صبر وتحمل کو اپنایا، خفیہ اسلام قبول کرنے کے وقت بھی اور مختلف جنگوں میں بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھی، انھوں نے بڑے حوصلے کا ثبوت دیا، خلافت راشدہ کے دور میں بھی انھیں بڑے بڑے حادثات کا سامنا کرنا پڑا اور خود اپنے دور خلافت میں بھی انھوں نے طرح طرح کے فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، حتی کہ وہ شہادت کے رتبہ پر فائز ہو گئے۔[1]

اُن کی زندگی کے ہر مرحلے میں آج کے داعیانِ اسلام کے لیے بہت قیمتی اسباق جگمگا رہے ہیں۔ آپ کی مجاہدانہ زندگی سے دعوت اِلی اللہ کے لیے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہر حال میں صبر وتحمل کا دامن تھامے رکھو۔[2] انھوں نے اشعث بن قیس سے فرمایا: اگر تم صبر کرو گے تو اللہ تعالیٰ کا قلم تمھارے لیے اجر لکھ دے گا اور اگر جزع فزع کرو گے تو اس کے برعکس لکھا جائے گا۔[3]

امیر المومنین فرماتے ہیں کہ ایمان میں صبر کا مقام جسم انسانی میں سر کے برابر ہے، اگر سر نہ ہو تو جسم بے قدر و قیمت ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں انھوں نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا: سنو! جس میں صبر نہیں اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔[4] پھر فرمایا: ''صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی۔'' اور اللہ کے دین میں تو اس کا معروف مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں صبر کا ذکر فرمایا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ کر یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ اعمال اس وقت تک قابلِ قبول نہیں جب تک نیت خالص نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی بندگی کا بنیادی رکن اخلاص ہے۔ وہ عبادت جو اخلاص سے خالی ہو بندے ہی کو لوٹا دی جاتی ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے:

[1] التاریخ الإسلامی: 434/12. [2] منهج علی بن ابي طالب في الدعوة إلى الله، ص: 525.
[3] أدب الدنیا والدین، ص: 278، وفرائد الکلام، ص: 371. [4] عُدّة الصابرین و ذخیرة الشاکرین لابن القیم، ص: 153.

''میں شرک کرنے والوں سے بے پروا ہوں، جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا، میں اس سے اور اس کے شرک سے لاتعلق ہو جاؤں گا۔'' [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ شرک کے دشمن تھے۔ آپ نے شرک کی تمام اشکال و انواع کے خلاف جنگ کی، چاہے وہ شرکِ ربوبیت ہو یا شرکِ الوہیت، وہ اپنی زندگی کی تمام حرکات و سکنات سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے آرزومند رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا ہر عمل خالص اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ وہ تمام لوگوں کو خاص طور پر طالبان علم کو ریاکاری سے دور رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا: اے حاملینِ علم! علم پر عمل بھی کرو، درحقیقت عالم وہی ہوتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرے، اور اس کے علم اور عمل میں پوری مطابقت ہو۔ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ علم حاصل کریں گے لیکن وہ ان کے گلے سے نیچے نہیں اترے گا، ان کا باطن ظاہر کے برعکس ہوگا، ان کے علم اور عمل میں تضاد ہوگا، یہ لوگ حلقے بنا کر بیٹھیں گے، ایک دوسرے پر فخر کا اظہار کریں گے اور اگر ان کا ساتھی کبھی انھیں چھوڑ کر کسی دوسرے کی مجلس میں بیٹھ جائے تو وہ اس پر غضبناک ہو جائیں گے، یہ وہ لوگ ہیں، جن کے اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف بلند ہی نہیں ہو پائیں گے۔ [2]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک خطرناک بیماری کا ذکر فرمایا اور وہ یہ کہ بعض علماء اظہار فخر اور طلب شہرت کے لیے لوگوں کو تعلیم دیں گے۔ اگر ان کے شاگرد انھیں چھوڑ کر کسی اور کی شاگردی اختیار کر لیں گے تو وہ اس پر سخت ناراض ہوں گے۔ استاد کی نظر میں طالب علم کی مصلحت کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی بلکہ اس کی نظر میں اپنے مقام و مرتبہ اور اپنی شہرت کی اہمیت ہوگی۔ ہر چند وہ یہ بات زبان سے نہیں کہے گا لیکن اس کی زبان حال اس کی باطنی حقیقت آشکارا کر دے گی۔ [3]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 5958. [2] سنن الدارمي، مقدمه: 118/1، حديث: 382، الجامع لأخلاق الراوي: 90/1. [3] منهج علي بن أبي طالب، ص: 513.

داعی الی اللہ کو اصل فکر اور احساس یہ ہونا چاہیے کہ لوگ حق کی پیروی کریں۔ چاہے وہ اس کی رائے کے مخالف ہی ہوں۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کا یہی حال تھا، انھوں نے ایک موقع پر فرمایا: (اے اہل عراق) تم جیسے پہلے فیصلے کرتے تھے ویسے ہی کرتے رہو کیونکہ مجھے عناد پر مبنی اختلاف پسند نہیں، اپنے ساتھیوں کی طرح میری مرتے دم تک انتہائی کوشش یہی ہوگی کہ لوگ اجتماعیت کو نہ چھوڑیں۔ اور جماعتی زندگی اختیار کریں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ اخلاق سے بدرجہ اتم متصف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی سمیت تمام صحابہ کرام کو شکر اور بندگی کے آداب سکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جوں ہی کسی نعمت کا احساس ہوتا تھا وہ فوراً اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے اہل ہمدان میں سے ایک آدمی سے فرمایا: نعمت شکر کے ساتھ متصل ہے اور شکر مزید نعمت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے اللہ کی طرف سے مزید عطا کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک بندے کی طرف سے ادائے شکر کا سلسلہ ختم نہ ہو۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: نعمت پر شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مدمقابل سے عفو و درگزر کا برتاؤ کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا: جب تمھیں دشمن پر قدرت حاصل ہو تو بدلہ لینے کی طاقت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور دشمن سے درگزر کرو۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات تھے

دُعا، خیر و برکت کے حصول کا ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔ بندے کے لیے یہ دروازہ کھل جائے تو خیر و بھلائی دم بدم چلی آتی ہے اور برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ تعلق باللہ کا مجسمہ تھے۔ وہ بڑی کثرت سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات با برکات سے وابستہ رہے،

[1] الشكر لابن أبي الدنيا، منقول از علو الهمة: 481/5. [2] الإعجاز والإيجاز للثعالبي، ص: 30.

انھوں نے دیکھا کہ رسالت مآب ﷺ کس طرح اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بڑی توجہ اور فکرمندی سے آپ ﷺ سے عبادت کا یہ اسلوب سیکھتے رہے، انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کی دُعا اور دیگر تسبیحات ٹھیک اسی طریقے پر ہوں جن کا رسول ﷺ حکم دیتے ہیں اور بہ نفس نفیس پسند فرماتے ہیں۔ کیونکہ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ دعا، تسبیحات، نفلی عبادات اور درود شریف پڑھنے کے لیے وہ طریقے اختیار کرے جو رسالت مآب ﷺ سے منقول نہیں، چاہے وہ ظاہری الفاظ کے لحاظ سے کتنے ہی خوبصورت اور معانی کے اعتبار سے کتنے ہی اچھے ہوں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ ہی خیر کی تعلیم دینے والے اور صراطِ مستقیم کی طرف رہبری فرمانے والے ہیں، آپ ﷺ ہی کو سب سے زیادہ معلوم ہے کہ دعاؤں اور عبادات میں کیا افضل اور کون سی کامل ترین بات ہے۔ کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب من گھڑت دعائیں اور اذکار منسوب کر دیے ہیں۔ یہ سب ان کی ذات گرامی پر جھوٹ اور بہتان باندھنے کے سوا کچھ نہیں۔ جو شخص حقیقی معنوں میں خلوص دل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ ان کی سیرت اور طریق زندگی کو لازم پکڑے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ زندگی کے ہر ہر مرحلے میں صرف رسالت مآب ﷺ کے طریقے پر عمل پیرا رہے۔ اور امت مسلمہ کو بھی تاکید فرماتے رہے کہ ہم اقوال و افعال میں نبی اکرم ﷺ کی پیروی کا راستہ اختیار کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات تھے۔ ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک حدیث سنائی تو انھوں نے فرمایا: تم نے یہ من گھڑت حدیث سنائی ہے۔ اس شخص نے تردید کی اور کہا: ایسا نہیں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم جھوٹے ہو تو میں تمھارے لیے بد دعا کرتا ہوں۔ اس نے کہا: کر لیجیے! آپ رضی اللہ عنہ نے بد دعا کی تو وہ شخص اندھا ہو گیا۔[1]

جب لوگ آپ رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے تو آپ فرماتے تھے: اے اللہ! اس بارے میں مجھے معاف فرما دے جو یہ لوگ میری نسبت نہیں جانتے، اور جو کچھ یہ میرے لیے کہتے ہیں اس

[1] البداية والنهاية: 6/8.

بارے میں میرا مؤاخذہ نہ فرمانا اور میرے بارے میں جو کچھ لوگ گمان کرتے ہیں مجھے اس سے بہتر بنا دے۔[1]

امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو الحمد للّٰہ (سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں) کہے، جو اس کے پاس موجود ہو وہ یَرْحَمُكَ اللّٰه (اللہ آپ پر رحم فرمائے) کہے اور پھر وہ اسے ان الفاظ سے جواب دے یَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَ يُصْلِحُ بَالَكُمْ (اللہ آپ کو ہدایت عطا فرمائے اور آپ کے معاملات درست فرمائے)۔[2]

یہ عمل حسنِ اخلاق اور اللہ تعالیٰ کے حضور ادب اختیار کرنے کا ایک شائستہ اسلوب ہے۔

حلیمی کہتے ہیں: دماغ میں قوت فکر ہے اور چھینک دماغ سے تکلیف دور کرتی ہے۔ دماغ ہی پٹھوں اور اعصاب کی بنیاد ہے اور اعصاب احساس کا مرکز ہیں، اعصاب ہی کی سلامتی سے دیگر اعضاء کی سلامتی وابستہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھینک بہت بڑی نعمت ہے، لٰہذا مناسب ہوا کہ چھینک پر الحمدللہ کہا جائے کہ اس میں اللہ کے خالق اور قادر ہونے کا اقرار و اعتراف ہے اور اس کی نسبت بھی انسانی طبائع کی طرف نہیں بلکہ اللہ کی جانب کی گئی ہے۔[3]

ابن اعبد کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دن مجھ سے فرمایا: اے ابن اعبد! کیا تم جانتے ہو کھانے کا حق کیا ہے؟ عرض کیا: اے ابن ابی طالب! آپ ہی آگاہ فرمائیں وہ حق کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: تم بسم اللہ پڑھو، پھر اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيمَا رَزَقْتَنَا پڑھو، یعنی اے اللہ جو تو نے رزق عطا فرمایا ہے اس میں برکت عطا فرما۔ پھر انھوں نے فرمایا: یہ بتاؤ، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر کس طرح ادا کرو گے؟ میں نے عرض کیا: آپ ہی فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ انھوں نے فرمایا: تم کہو! اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا "ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے

[1] فرائد الكلام، وموعظة المؤمنين: 2/228. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 3715. [3] فتح الباري: 10/602.

ہمیں کھلایا اور پلایا۔‘‘[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ کو دُعا کے یہ الفاظ بہت پسند ہیں:

«اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اَنْتَ، اَللّٰهُمَّ لَا اَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاكَ، اَللّٰهُمَّ لَا اُشْرِكُ بِكَ شَيْئًا، اَللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْلِي ذُنُوبِي، إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اَنْتَ»

’’اے اللہ! تیرے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، اے اللہ میں تیرے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتا۔ اے اللہ! میں تیرے ساتھ کسی کو شریک نہیں سمجھتا، اے اللہ میں اپنے اوپر ظلم کر بیٹھا ہوں، میرے گناہ بخش دے، تیرے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخشتا۔‘‘[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اکثر یہ دعا بھی کرتے تھے: اے اللہ! ہمیں بخوشی عدل و انصاف پر اور قرآن کے نظام پر ثابت قدمی عطا فرما، ہم خود بھی ہدایت پر قائم رہیں اور دوسروں کی ہدایت کا اہتمام بھی کریں۔ ہم تجھ سے راضی ہوں اور تو ہم سے راضی ہو جائے، نہ ہم خود گمراہ ہوں اور نہ کسی اور کی گمراہی کا سبب بنیں۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کی تلقین فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ کسی بھی درپیش مصیبت یا سخت حالات میں یہ دعا پڑھو:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيمُ الْكَرِيمُ، سُبْحَانَهُ، تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ»

’’اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، جو نہایت بردبار اور بہت زیادہ سخی ہے۔ وہ پاک ہے، اللہ عرش عظیم کا رب ہے۔ وہ بہت بابرکت ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔‘‘

[1] مسند أحمد: 329/2، محقق کہتے ہیں: اس حدیث کی سند حسن ہے۔ [2] مصنف ابن أبي شيبة: 149/2. [3] فقه علي بن أبي طالب، ص:252.

عبداللہ بن جعفر لب مرگ شخص کو یہ دعا پڑھنے کی تلقین کرتے، بخار کی شدت میں یہ دُعا پڑھ کر دَم کرتے اور وطن سے دور غیر رشتہ داروں میں شادی شدہ بیٹیوں کو بھی یہی دعا سکھاتے تھے۔[1]

یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی وہ چند صفات ہیں جو توحید اور ایمان باللہ کا ثمر ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے کے لیے ان کی فکر مندی کی جھلک دکھلاتی ہیں۔ ان شاء اللہ قارئین کرام آئندہ اوراق میں ان کے بالیدہ ذہن، شجاعت، بُردباری، فصاحت وبلاغت اور بے مثل خطابت کے علاوہ ان کے بلند کیریکٹر کے دیگر پہلوؤں کے احوال بھی پڑھیں گے۔

[1] فضائل الصحابة:820/2.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور میں امور مملکت
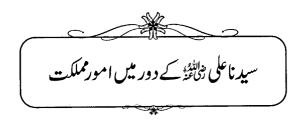
امیر المومنین کا امور ریاست میں مرجع اول و اعلیٰ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس کے بعد وہ شیخین یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی سیرت کی پیروی فرماتے تھے۔

① مصدر اول کتاب اللہ ہے

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۚ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۝ ﴾

''یقیناً ہم نے تمھاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے تم کو شناسا کیا ہے اور خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو۔''[1]

اللہ تعالیٰ کی کتاب ان تمام شرعی احکام پر مشتمل ہے جن کا تعلق زندگی کے امور و معاملات سے ہے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے وہ تمام اصول اور مبادیات بتا دیے ہیں جن کے وہ ضرورت مند ہیں اور جن پر ان کی ریاست قائم ہوتی ہے۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنے دین سے وابستہ رہو، اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ پر عمل کرو، سنت کی پیروی کرو، قرآن کے خلاف آنے والے اشکالات سے اعراض کرو، جو

[1] النسآء 4:105.

قرآن بتائے اسے لازم پکڑو اور جس کا انکار کرے اسے مسترد کردو۔ [1]

② مصدر ثانی: سنت مطہرہ

اسلامی دستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت سے اپنے اصول اخذ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے قرآنی احکام کے انطباق اور نفاذ کے قاعدوں کی پہچان ہوتی ہے۔ امیر المومنین نے فرمایا: اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی اقتدا کرو کیونکہ وہ بہترین سیرت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت پر عمل کرو کیونکہ وہ افضل ترین ہے۔ [2]

③ سابق خلفائے راشدین کی پیروی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرو۔'' [3]

ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس نے دانے کو پیدا کیا اور انسانی روح کی تخلیق فرمائی! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متقی اور مومن ہی محبت کرتا ہے اور فاسق و فاجر شخص ہی ان دونوں حضرات سے بغض رکھتا ہے۔ ان دونوں نے پوری سچائی اور وفاداری کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت اختیار کی۔ وہ دونوں امر و نہی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ انھوں نے اپنے اعمال و کردار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے تجاوز نہیں کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں حضرات کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان دونوں سے جیسی محبت کرتے تھے ویسی محبت کسی اور سے نہیں کرتے تھے، جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی وہ ان دونوں سے راضی تھے، اور جب ان دونوں حضرات نے اپنی جان اللہ کے سپرد کی تو تمام مسلمان ان سے راضی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: وہ سب سے بہتر انسان تھے،

[1] البداية والنهاية: 246/7. [2] فقه التمكين فى القرآن الكريم للصلابى، ص: 432، و البداية والنهاية: 319/7. [3] جامع الترمذي، حديث: 3662.

تمام رحم دلوں سے زیادہ رحم دل تھے۔ تمام شفقت کرنے والوں سے زیادہ شفیق تھے۔ سب سے زیادہ پرہیزگار تھے، وہ عمر میں بڑے تھے اور اسلام قبول کرنے میں بھی سب سے آگے تھے۔ وہ ہمارے درمیان رہے، رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر عمل کرتے رہے۔ ان کے بعد حضرت عمر نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو انھوں نے منہاجِ نبوت اور منہاج ابی بکر رضی اللہ عنہ پر حکومت کا نظام چلایا۔ وہ ان دونوں شخصیتوں کی یوں پیروی کرتے رہے جیسے اونٹنی کا دودھ چھڑایا ہوا بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے، آخر کار سلسلۂ گفتگو سمیٹتے ہوئے انھوں نے فرمایا: کیا تمھارے پاس ان دونوں جیسی کوئی شخصیت موجود ہے؟ کوئی مائی کا لال ان دونوں کے اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچ سکتا، ہاں ان کی پیروی اور ان سے محبت کے نتیجے میں وہ اللہ کی بارگاہ میں اپنا مقام بنا سکتا ہے۔ سنو! جو مجھ سے محبت کرتا ہے اسے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما دونوں سے محبت کرنی چاہیے۔ جس نے ان دونوں سے محبت نہ کی اس نے مجھ سے بغض کیا۔ میں ایسے آدمی سے براءت و بیزاری کا اظہار و اعلان کرتا ہوں۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قدر شناس تھے۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اجتہادی آراء اور فیصلوں کا دفاع کرتے تھے اور فرماتے تھے اے لوگو! عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلو کا مظاہرہ نہ کرو، ان کے بارے میں اچھی بات کے سوا کچھ نہ کہو، انھوں نے قرآن کریم کی خدمت و اشاعت سمیت جتنے بھی کارنامے کیے وہ ہم تمام صحابہ کی مشترکہ رائے کے مطابق تھے، اللہ کی قسم! اگر مجھے والی بنا دیا جاتا تو میں بھی وہی کام کرتا جو انھوں نے کیے تھے۔[2] سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: میں وہ بندھن ہرگز نہیں کھولوں گا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مضبوطی سے باندھا تھا۔[3]

---

[1] شرح اعتقاد أهل السنة والجماعة للالكائي: 4456. [2] فتح الباري: 8/9. اس کی سند صحیح ہے۔
[3] المختصر من كتاب الموافقه، ص: 140، اور اس کی سند منقطع ہے، ومصنف ابن أبي شيبة، حديث: 120.

حکام کی نگرانی امت کا حق ہے

امت کا حق ہے کہ وہ حکمرانوں کی نگرانی کرے اور انھیں سیدھا رکھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ ﴾

''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح ونجات پانے والے ہیں۔''[1]

امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد فرمایا: تمھارے معاملاتِ حکومت میں کسی کا کوئی حق نہیں ہاں جن کو تم چاہو گے، تمھارے مشورے کے بغیر میرا کوئی حکم صادر نہیں ہوگا۔[2]

یہ ٹھیک وہی بات ہے جو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی کہی تھی، انھوں نے فرمایا تھا: اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں بُرا کام کروں تو مجھے سیدھا کرو۔[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: میری نظر میں تمام لوگوں میں سے محبوب ترین وہ شخص ہے جو مجھے میرے عیوب سے مطلع کرے۔[4] پھر انھوں نے فرمایا: مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ میں کوئی غلطی کروں اور کوئی میرے ڈر کی وجہ سے میری تردید نہ کرے۔ اسی طرح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں تمھیں یہ بات ملے کہ مجھے مقید کر دو، تو مجھے قید میں ڈال دو۔

خلفائے راشدین کے دور میں یہی عمل جاری رہا۔ اس عہد مبارک میں حکمرانوں کی نگرانی

---

[1] آل عمران 3:104. [2] تاريخ الطبري:457,449/5. [3] البداية والنهاية:305/6. [4] الشيخان أبوبكر و عمر من رواية البلاذري، ص:231.

کے لیے امت کا حق پوری طرح تسلیم کیا جاتا رہا اور کسی نے اسے غلط نہیں کہا تو گویا اس پر اجماع ہو گیا۔[1]

خلافت راشدہ کے دور میں حکام اور عوام تمام صحابہ کے اجماع کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ ہے کتاب اللہ کا صحیح فہم اور سنت پر التزام کے ساتھ عمل کا طریق سلیم۔ یہ وہ حضرات ہیں جو نزولِ کتاب کے دور کے شاہد ہیں اور انسانی زندگی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق مبارک کے مطابق منور و مزین کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے، وہ دین کی روح اور مقاصدِ شریعت کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، یہ بات محال ہے کہ وہ باطل پر اجماع کر لیں، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''بیشک میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ ان کا اجماع حجت ہے اسے اسلامی دستور کے مصادر میں شمار کیا جانا لازم ہے۔

اجماع امت کسی نص کو سمجھنے پر ہو سکتا ہے اور اجتہاد و قیاس کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے اور وہ حجت قرار پائے گا۔[3]

بیشک امیر المومنین علی بن ابی طالب اپنے دورِ خلافت میں لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بڑی ترغیب دیتے تھے۔ ایک روز انھوں نے خصوصی خطاب فرمایا، حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا: اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہو گئے کہ انھوں نے معاصی پر سواری کر لی، ربانیوں اور علماء نے انھیں منع ہی نہیں کیا۔ آخر کار انھیں سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا، لہٰذا تم نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو، اس سے پہلے کہ تم پر بھی اسی طرح عذاب نازل ہو جس طرح پہلوں پر نازل ہوا تھا۔ خوب جان لو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر رزق کو ختم کرتا ہے نہ موت کو قریب کرتا ہے۔[4]

---

[1] الدولة والسيادة في الفقه الإسلامی لفتحی عبد الكريم، ص: 378. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 3950.
[3] روضة الناظر و جنة المناظر: 358/1. [4] تفسير ابن ابي حاتم: 15/3، وتفسير ابن كثير: 603/2.

باہم مشاورت

اسلامی ریاست کے اساسی قواعد وقوانین میں سے ایک اہم ترین قانون یہ ہے کہ ریاست کی قیادت اور حکمران، مسلمانوں کے ساتھ مشاورت کیا کریں۔ ان کی رائے اور مشورے کا احترام کریں اور نظام حکومت ان کے مشورے سے چلائیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ ﴾

''اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ تلخ زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، سو آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے استغفار کریں اور ان سے کام کا مشورہ کیا کریں، پھر جب آپ کا پختہ ارادہ ہوجائے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں، بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''[1]

اور فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ ﴾

''اور وہ لوگ جو اپنے رب کے فرمان کو قبول کرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے اور جو ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے ہمارے نام پر دیتے ہیں۔''[2]

اس آیت میں مسلمانوں کو باہم مشورہ کرنے کا حکم نماز قائم کرنے کے حکم کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اس سے مشورے کی زبردست اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس بات سے یہ

[1] آل عمران 3:159. [2] الشورٰی 42:38.

دلیل بھی ملتی ہے کہ شوریٰ کا حکم نماز کے حکم کی مانند ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ نماز شرعی طور پر فرض ہے، ٹھیک اسی طرح باہم مشورہ کرنا بھی شرعاً واجب اور فرض قرار دیا گیا ہے۔[1]

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اپنے ہر کام اور تمام فیصلوں میں شوریٰ کے منہج کا خصوصی التزام فرماتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ واقعہ ہے کہ معقل بن قیس الریاحی کو خریت بن راشد الناجی کی سرکوبی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، ان کا خط حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، انھوں نے فوراً اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور یہ خط پڑھ کر سنایا، پھر ان سے مشورہ کیا اور ان کی رائے طلب کی، سب کی مجموعی رائے یہ تھی کہ سب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ معقل بن قیس کو خط لکھیں کہ وہ اس فاسق شخص کا کھوج لگائیں اور جب تک نہیں ملتا، اس کی تلاش جاری رکھیں، جونہی وہ ملے اسے قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں، تاکہ وہ لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکا نہ سکے اور لوگ اس کے فساد سے امان پائیں۔[2]

شوریٰ کے بارے میں امیر المومنین سے مروی ہے:

مشورہ کرنا عین ہدایت ہے اور جو خود کو عقل کل سمجھتا ہے وہ خطرات ہی میں گھرا رہے گا۔[3] بہترین تعاون مشاورت ہے۔ اور بُری پالیسی استبداد ہے۔[4] انھوں نے مزید فرمایا: بزرگ کی رائے لڑکے کے مشاہدہ سے زیادہ بہتر ہے۔ امیر المومنین نے جب مالک بن الحارث الاشتر کو مصر بھیجا تو شوریٰ کے لیے اسے یہ تاکید فرمائی: مشورے میں بخیل کو شامل نہ کرنا وہ آپ کو فضل و کرم سے روکے گا اور فقیری سے ڈرائے گا، کسی بزدل سے بھی مشورہ نہ کرنا وہ معاملات میں آپ کو کمزور کرنے کی کوشش کرے گا، کسی حریص سے بھی مشورہ نہ کرنا وہ اپنے حرص کو ظلم سے آراستہ کرے گا، بلاشبہ بخل، بزدلی اور حرص مختلف قسم کی مزاجی کیفیات ہیں، ان کا جامع عنوان اللہ تعالیٰ سے بدگمانی ہے۔ حضرت علی جانتے تھے کہ اگر کسی حکمران

---

[1] النظام السیاسی في الإسلام لأبی فارس، ص: 9. [2] تاریخ الطبري: 39/6. [3] أدب الدنیا والدین للماوردی، ص: 291,89 والإدارة العسکریة: 279/1. [4] نهایة الأرب: 21/6، وفي «الحکم الإسلامی» ص: 151، والشوری بین الأصالة والمعاصرة لعزالدین التمیمی، ص: 102.

کے مخلص مشیر نہ ہوں تو وہ اپنی ریاست کی خوبیوں اور خامیوں کو نہیں جان سکتا، اس طرح ریاست کے بہت سے امور اور اہم معاملات اس کی آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ شوریٰ ان بہت سے امور سے باخبر رکھتی ہے جس سے حکمران ناواقف ہوتے ہیں، مشورے سے تمام امورِ سلطنت میں شکوک وشبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ اشتر نخعی کو جب مصر کا والی بنا کر بھیجا تو اسے فرمایا: اپنے عاملینِ حکومت پر نظر رکھو، ان کے انتخاب میں عدل وانصاف سے کام لینا۔ کسی کی قربت ومحبت باعث انتخاب نہ ہو۔ ترجیحی سلوک اور ذاتی پسند و ناپسند، ظلم اور خیانت کے مترادف ہیں۔ عمال حکومت اور لوگوں کے مسائل و امور اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتے جب تک ان لوگوں کی اصلاح نہ ہو جن سے مسائل کے حل میں مدد لی جا رہی ہے۔ عُمال حکومت کے انتخاب کے لیے تقویٰ، پاکدامنی، علم اور سیاسی بصیرت کی صفات کا معیار ہمیشہ پیش نظر بناؤ۔ نیک اور دین کے پابند گھرانوں میں سے اہل، تجربہ کار، دانشمند اور صاحب حیا لوگوں کا انتخاب کرو۔ وہ اعلیٰ اخلاق کے حامل ہوں گے، کم لالچ کرنے والے ہوں گے اور سرکاری وعوامی امور کی انجام دہی میں بہتر ثابت ہوں گے۔ اس قسم کے لوگ ہی آپ کے عُمال اور اعوان وانصار ہونے چاہئیں۔

عدل ومساوات

اسلامی حکومت کے اہداف میں یہ امر ترجیحی طور پر شامل ہے کہ اسلامی نظام وہ قواعد قائم کرنے کی کوشش کرے جو اسلامی معاشرے کے قیام میں مددگار ثابت ہوں، ان اہم قواعد میں ایک نہایت اہم قاعدہ عدل ومساوات ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے ما بین پوری طرح عدل قائم کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف حمیدہ اور علمی وفقہی کمالات و رجحانات نے ان میں یہ اہلیت پیدا کر دی کہ اپنا کردار پوری طرح ادا کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صلاحیتوں پر اعتماد فرمایا اور انھیں یمن میں قاضی بنا کر بھیجا۔[1]

[1] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين لحمد محمد الصمد، ص:141.

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے یہ عظیم الشان دُعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ لِسَانَهُ وَاهْدِ قَلْبَهُ»

''اے اللہ ان کی زبان میں ثبات و استقلال عطا کیجیے! اور ان کے دل کو ہدایت سے سرفراز کیجیے!''[1]

لہٰذا یہ بالکل فطری بات تھی کہ وہ اپنے دور خلافت میں اپنی حکومت مکمل عدل پر قائم کریں اور اسے اپنے مقاصد و اہداف میں سرفہرست رکھیں، وہ خوب سمجھتے تھے کہ تمام امور اسی طرح سیدھے ہوں گے اور اسی طریقے سے رعیت کے مابین محبت پیدا ہوگی۔[2]

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ امیر المومنین کی سوچ کے مطابق عدل سے مراد اسلام کا بتایا ہوا عدل ہے جو اسلامی معاشرہ کے قیام میں بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس معاشرے میں ظلم کا دور دورہ ہو وہاں اسلام کا وجود ناممکن ہے۔

امیر المومنین اپنے عدل و انصاف میں ایک درخشاں نمونے کی حیثیت رکھتے تھے، انھوں نے اپنی سیرت کے حسن سے لوگوں کے دلوں کو اپنا اسیر اور ان کی سوچ کو اپنا حامی بنالیا۔ عدل خلافت راشدہ کے نظام حکومت میں ستون کی مانند ہے۔ عدل، درحقیقت اسلام کی عملی دعوت کا نام ہے جو لوگوں کے دلوں کو ایمان کے لیے کھول دیتا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ عدل کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج پر قائم تھے، ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ لوگوں کے مابین مکمل عدل کا معاملہ کیا جائے۔ قاضی شریح راوی ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مقابلے کے لیے نکلے تو اپنی ایک زِرہ گُم پائی۔ لڑائی ختم ہوگئی۔ آپ کوفہ لوٹ آئے تو اچانک وہ زِرہ ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھی جو اسے بازار میں فروخت کر رہا تھا، انھوں نے فرمایا: اے یہودی! یہ زِرہ میری ہے۔ میں نے اسے فروخت کیا ہے اور نہ کسی کو ہبہ۔ یہودی نے کہا: یہ میری زِرہ ہے اور میرے ہی ہاتھ میں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم قاضی کے

[1] فضائل الصحابة: 871/2، حدیث: 1195، اس کی سند حسن ہے، ومسند أحمد: 111/1، حدیث: 882. [2] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين، ص: 141.

پاس چلتے ہیں، چنانچہ دونوں قاضی شُریح کی عدالت میں پہنچے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاضی کے پہلو میں بیٹھ گئے اور یہودی سامنے بیٹھ گیا۔

قاضی شُریح نے کہا: اے امیر المؤمنین! کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے کہا: یہ زِرہ جو اس یہودی کے ہاتھ میں ہے، میری ہے، نہ میں نے بیچی، نہ کسی کو ہبہ کی۔ شریح نے کہا: امیرالمومنین! اپنے دعوے کی کوئی واضح دلیل دیجیے؟ انھوں نے فرمایا: میرا غلام قنبر اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما گواہی دے رہے ہیں کہ یہ زِرہ میری ہے۔ قاضی نے کہا: باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی قبول نہیں۔ انھوں نے فرمایا: کیا نوجوانانِ جنت کے سرداروں کی شہادت بھی قبول نہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ فرما رہے تھے: ''حسن اور حسین، اہل جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔''[1]

یوں قاضی شریح نے یہودی کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ یہودی اسلام کے نظامِ عدل کی یہ معراج دیکھ کر بے حد متأثر ہوا۔ اس نے بے ساختہ کہا:

امیر المومنین نے مجھے قاضی کے حضور پیش کیا، اور قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا؟ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں۔ پھر وہ کہہ اٹھا: «اَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ» میں گواہی دیتا ہوں اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ آپ اپنے خاکستری اونٹ پر سوار تھے۔ صفین کی طرف جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا جب آپ کی زرہ گر گئی۔ میں نے لپک کر اُٹھا لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب جبکہ تم نے اقرار کر لیا ہے تو اب یہ تمھاری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے سواری کے لیے گھوڑا عطا کیا۔ پھر میں نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ وہ جنگ نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ وہ خارجیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوا۔

لیجیے حکمرانی کے دوران سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عدل کی کچھ اور مثالیں دیکھیے!

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3768، عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ.

ناجیۃ القرشی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا: ہم محل کے دروازے پر کھڑے تھے، اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے سامنے سے گزرے۔ ہم نے انھیں دیکھا تو ان کی ہیبت اور رُعب کی وجہ سے ہم ایک طرف ہٹ گئے، جب وہ آگے نکل گئے تو ہم ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، اسی دوران کوئی آدمی چلایا: اللہ کے لیے میری مدد کو پہنچو۔ وہاں دیکھا تو دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے سینوں پر ہاتھ مارا پھر فرمایا: ایک طرف ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔ ان میں سے ایک نے کہا: امیر المؤمنین! اس شخص نے مجھ سے بکری خریدی۔ میں نے شرط رکھی کہ وہ مجھے کھوٹے پیسے نہیں دے گا، اس نے ایک درہم کھوٹا دیا ہے۔ میں نے اسے اس کا کھوٹا درہم واپس کیا تو اس نے مجھے تھپڑ دے مارا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے دوسرے سے پوچھا، تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: امیر المؤمنین! یہ صحیح کہتا ہے، تو آپ نے فرمایا: اس کی شرط پوری کرو۔ پھر تھپڑ مارنے والے سے کہا: بیٹھ جاؤ! پھر جسے تھپڑ مارا گیا تھا اسے کہا: اس سے بدلہ لو! اس نے کہا: امیر المومنین! کیا میں اسے معاف نہ کردوں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا: یہ تمھاری مرضی ہے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے گروہ مسلمین! اس ملزم کو پکڑ لاؤ۔ وہ آگیا تو اسے پندرہ دُرے مارے، پھر فرمایا: یہ اس شخص کی سزا ہے جس نے وعدے اور شرط کی حرمت کو توڑا، ایک اور روایت میں ہے کہ امیر المومنین نے فرمایا: یہ سلطان کا حق ہے۔[1]

یہ حدیث بتاتی ہے کہ امیر المومنین تواضع کی ایک اعلیٰ مثال تھے۔ امیر المومنین اپنے گھر سے بازار جاتے ہیں تاکہ لوگوں کے حالات کا جائزہ لیں۔ اور پھر بذاتِ خود ان مشکلات کو حل فرماتے ہیں۔ یہ اعلیٰ کردار کی ایک شاندار مثال ہے جو رعیت کی حقیقی زندگی میں والیانِ ریاست کے وجود اور کردار کو ظاہر کرتی ہے، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اس صورتِ حال کی تکرار روزانہ ہو لوگوں کو اتنا شعور دینا کافی ہے کہ والیان ان کی مشکلات میں ان کے ساتھ

[1] تاریخ الطبري:6/73,72.

ہیں تا کہ صاحبِ حق اپنے حق کے تحفظ اور بقا پر مطمئن رہے۔ اور جس شخص کے دل میں لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کا خیال مچل رہا ہے وہ اس سے باز رہے۔

صاحبِ حق کے دستبردار ہونے کے باوجود امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے زیادتی کرنے والے پر سزا لاگو فرمائی، اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ امن وسلامتی کو یقینی بنانے کے لیے اسلام کے مقاصد کا ادراک نہایت ضروری ہے۔ وہ اس طرح کہ جو شخص زیادتی کی طرف مائل ہو اسے خوب معلوم ہو کہ چاہے اس کا حریف اسے معاف کر دے لیکن جرم کی سزا اس پر بہر حال لاگو ہو کر رہے گی۔ [1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقاماتِ عدل میں سے ایک وہ واقعہ بھی ہے جسے عاصم بن کلیب نے اپنے والد سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اصفہان سے مال آیا، انھوں نے اس کے سات برابر برابر حصے کیے، اس مال میں ایک روٹی بھی تھی، اس کے بھی سات ٹکڑے کیے اور ہر حصے پر ایک ٹکڑا رکھ دیا، پھر آپ نے یہ مال لینے والے افراد کے درمیان قرعہ ڈالا کہ سب سے پہلا حصہ کسے دیا جائے۔ [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقاماتِ عدل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ مال آتے ہی عام لوگوں کی ضروریات پر خرچ کر دیتے تھے۔ اس کے بعد جو مال باقی بچتا تھا اسے فوراً لوگوں میں برابر تقسیم کر دیتے تھے۔ وہ اپنی ذات کے لیے اس سے زیادہ ایک دمڑی بھی جائز نہیں سمجھتے تھے کہ جتنا کسی ایک عام شخص کے حصے میں آتا تھا۔ وہ اپنے مخالفین خارجیوں کو بھی اتنا ہی دیتے جتنا دوسرے لوگوں کو دیتے تھے، یہ اس وقت کی بات ہے جب خارجیوں نے لوگوں پر زیادتی کرنا اور ان کا خون بہانا شروع نہیں کیا تھا۔ [3]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ لوگوں کے مابین عطیات میں مساوات کا خاص اہتمام فرماتے تھے، اور

[1] التاریخ الإسلامی للحُمیدی: 433,423/12. [2] الکامل في التاریخ: 442/2. [3] نظام الحکم في عهد الخلفاء الراشدین، ص: 216.

اس باب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء کرتے تھے۔ آپ کسی اشرافیہ طبقے والے کو کم تر طبقے کے انسان پر اور کسی عربی کو عجمی پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ دو عورتوں کو کھانا اور کچھ درہم برابر برابر مرحمت فرمائے، ان میں سے ایک خاتون عربی اور دوسری عجمی تھی، ان میں سے پہلی خاتون نے احتجاج کیا اور کہا: میں عربی ہوں اور یہ عجمی ہے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں اس مال فیٔ میں بنی اسماعیل کو بنی اسحاق پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

جب ان سے مطالبہ کیا گیا کہ عرب کے اشرافیہ طبقہ اور قریش کو دیگر مَوالی اور عجمیوں پر ترجیح دی جائے تو انھوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر یہ مال میرا اپنا ہوتا تب بھی میں ان کے مابین برابری کا معاملہ کرتا، اب تو مال ان کا اپنا ہے۔[1]

یحییٰ بن سلمہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن سلمہ کو اصفہان کا گورنر بنایا، وہ جب واپس آئے تو اپنے ساتھ مال اور مشکیزے لائے جن میں شہد اور گھی بھرا ہوا تھا، ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما نے عمرو بن سلمہ کو پیغام بھیج کر ان سے گھی اور شہد طلب کیا۔ اس نے انھیں ایک برتن میں شہد اور دوسرے برتن میں گھی بھجوا دیا۔ دوسرے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے۔ آپ نے مال، گھی اور شہد پیش کرنے کا حکم دیا تاکہ اسے تقسیم کیا جائے۔ آپ نے مشکیزے شمار کیے تو دو کم تھے۔ پوچھا: یہ مشکیزے کہاں ہیں؟ عمرو نے چھپانے کی کوشش کی اور کہا ہم وہ دونوں مشکیزے بھی پیش کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تاکیداً پوچھا تو عمرو نے بتادیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے دونوں مشکیزے واپس منگوائے۔ انھوں نے جب دونوں مشکیزے دیکھے تو وہ کم تھے، انھوں نے تاجروں کو بلایا اور کم ہونے والی مقدار کا تخمینہ لگوایا، ان کی قیمت تین درہم طے ہوئی، لہٰذا یہ رقم حضرت ام کلثوم سے وصول کی اور پھر باقی تمام گھی اور شہد تقسیم کر دیا۔[2] حضرت ابورافع سے روایت ہے کہ جب وہ بیت المال پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خازن تھے، ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر آئے تو دیکھا

[1] تراث الخلفاء الراشدين، ص: 101. [2] الكامل في التاريخ: 2/442.

کہ ان کی بیٹی نے زینت کی چیزیں پہن رکھی ہیں، اس کے جسم پر بیت المال کے کچھ موتی دیکھے تو پہچان گئے۔ دریافت فرمایا: یہ کہاں سے آئے؟ پھر فرمایا: اللہ کی قسم مجھے اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیے۔ ابورافع کہتے ہیں کہ جب میں نے ان کو اس قدر سنجیدہ دیکھا تو میں نے کہا: اللہ کی قسم امیر المؤمنین! میں نے یہ اپنی بھتیجی کو زینت کے لیے دیے تھے، اگر میں نے نہ دیے ہوتے تو آخر یہ کہاں سے لاتی؟ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔[1]

آزادی کی ضمانت

آزادی ان بنیادی اصولوں میں سے ہے جس پر خلفائے راشدین کے عہد میں حکمرانی کا نظام قائم تھا، یہ اصول شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے لوگوں کو عام آزادیوں کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام کی دعوت کی بنیاد ہی لوگوں کی آزادی کی ضمانت تھی۔ تاریخ میں اتنی عظیم الشان وسیع وعریض دعوت کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ متعدد قرآنی آیات میں لوگوں کو اللہ کی توحید، دیگر مخلوقات و کائنات کے بغیر ایک اللہ ہی کی عبادت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ توحید کی اس دعوت میں انسان کے لیے بے مثال آزادی اور استقلال کے معنی پوشیدہ ہیں، مزید برآں یہ کہ اسلام نے آزادی کی تعریف تمام معانی اور مفاہیم کے ساتھ کی ہے، کبھی تو یہ مثبت کام ہوتا ہے جس میں نیکی کا حکم اور برائی سے روکا گیا ہے اور کبھی یہ منفی پہلو سے اجاگر کیا جاتا ہے جیسے دین اسلام میں داخل ہونے کے لیے جبر و اکراہ کی ممانعت، اور کبھی حریت یعنی آزادی کا معنی رحمت، عدل، شوریٰ اور مساوات سے مل کر بنتا ہے کیونکہ اسلام کے یہ اصول جن کی دعوت پیش کی گئی ہے آزادی کے بغیر بے معنی ہیں۔ خلفائے راشدین کی حکمرانی کے ابتدائی دور خاص طور پر جس وقت اسلام کی دعوت پھیلنے لگی اور مسلمانوں کو پے در پے فتوحات حاصل ہوئیں اور ریاست کا رقبہ پھیلتا چلا گیا تو آزادی نے

[1] تاريخ الطبري: 6/72.

اپنا فعال کردار ادا کیا، کیونکہ اسلام نے انسان کو عزت سے نوازا اور وسیع پیمانے پر آزادیوں کی ضمانت دی۔ اس دور میں روم اور فارس کی مملکتوں میں جو دیگر سیاسی نظام جاری وساری تھے وہ گروہی تھے، اور تسلط اور استبداد پر مبنی تھے، اس کی وجہ سے رعایا اور خاص طور پر سیاسی مخالفین اور دینی اقلیتوں کو شدید قسم کے ظلم، رسوائی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ صرف اسلام ہی ہے جس کے تحت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں انسانیت کو وہ حقیقی آزادی میسر تھی جس کے معنی آج کے دور میں بڑی آسانی سے سمجھے جاسکتے ہیں۔[1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال میں آزادیوں کا پورا دفاع کیا گیا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عملی کردار نے بھی اسلامی معاشرہ میں آزادی کے اصول کو تقویت دی۔ ان کے مشہور اقوال میں سے ایک قول ہے: ''آخرت کے لیے بُرا زادِ راہ بندوں پر زیادتی کرنا ہے۔'' ان کا یہ مختصر قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لوگوں پر زیادتی چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو، اسلام میں جائز نہیں اور زیادتی کرنے والوں کو قیامت کے روز اللہ کی طرف سے سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔ ان کا یہ قول تو بہت مشہور ہے: ''یہ عدل نہیں کہ گمان پر اعتماد کر کے فیصلہ دے دیا جائے۔'' ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ یہ بات قطعاً جائز نہیں ہے کہ لوگوں کو شبہات کی بنیاد پر پکڑ کر ان کے خلاف فیصلہ دے دیا جائے بلکہ یہ کام ایسے یقین کی بنا پر ہونا چاہیے جس کے دلائل قطعی ہوں۔ بہترین دلائل وہ ہیں جو شریعت میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ سزا کے جدید قوانین میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ملزم کے خلاف جب تک ثبوت نہ ملے وہ بے گناہ تصور کیا جائے گا۔ اسلام نے یہ حقیقت بہت مدت پہلے عیاں کر دی تھی اور اس کا اعلان کر دیا تھا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں آزادی وحریت کا اصول بہترین شکل اور اپنے کامل مفہوم

---

[1] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين، ص: 158,157. [2] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين، ص: 165.

میں روشن رہا۔ ان کے عہد میں بہت سنگین حالات پیش آئے۔ فتنوں، سازشوں اور جنگوں کا ظہور ہوا اور اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ افراد کی آزادی، ان کی نقل و حرکت اور قیام کرنے کے سلسلے میں کچھ پابندیاں لگائی جائیں۔ آج کل کے زمانہ میں اس قسم کے حالات میں ہنگامی قوانین نافذ کر کے لوگوں کی نقل وحرکت پر متعدد پابندیاں لگا دی جاتی ہیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی کی آزادی پر کوئی قدغن نہیں لگائی، چاہے کوئی ان کا پیروکار ہو یا مخالف۔ کسی شخص نے بھی ان کی حکمرانی کے دوران ان کے زیر سایہ رہنے یا باہر جانے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی۔ دشمنوں کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دینے کے لیے کسی شخص پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی نہ انھوں نے کسی کو معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے سے روکا۔

اسی طرح انھوں نے عبداللہ بن مسعود، عبیدہ السلمانی اور ربیع بن خثیم کے ساتھیوں کو بھی نقل وحرکت کی کوئی ممانعت نہیں کی۔ نہ انھیں اہل شام کے خلاف جنگ میں اپنا ساتھ دینے پر مجبور کیا، حالانکہ پہلے انھوں نے اہل شام کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا بلکہ آپ نے ان لوگوں کی مرضی کے مطابق بعض سرحدی علاقوں کی جانب جانے کی بخوشی اجازت دے دی۔[1]

صفین کے معرکہ کے بعد تحکیم کو قبول کرنے کی وجہ سے جب خوارج آپ کے خلاف بھڑک اٹھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنے زیر سلطنت علاقوں سے نہیں نکالا۔ اس کے برعکس اپنے ماتحت عاملین کو حکم دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ یعنی جب تک وہ زمین میں فساد پیدا نہ کریں اور لوگوں پر زیادتی نہ کریں انھیں کچھ نہ کہا جائے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں فرمایا: ہم تمھیں تین حقوق دیتے ہیں: مسجد میں نماز ادا کرنے سے منع نہیں کریں گے، جب تک تم ہمارا ساتھ دو گے فیٔ کے مال سے تمھارا حصہ نہیں روکیں گے۔ اگر تم ہمارے خلاف نہیں لڑو گے تو ہم بھی تمھارے خلاف نہیں لڑیں گے۔[2]

---

[1] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين، ص: 159، 160. [2] تاريخ الطبري: 688/5.

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا التزام

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی اللہ کی توحید، لوگوں میں ایمان کے معانی اجاگر کرنے، اللہ پر اعتماد و توکل اور اس کے خوف سے معمور تھی۔ انھوں نے اللہ کا تعارف اس کے اسمائے حسنیٰ اور اعلیٰ صفات بیان کر کے اور مختلف اشکال و انواع میں شرک کے خلاف جنگ کے ذریعے سے کرایا۔ وہ لوگوں کی جس طرح رہنمائی فرماتے، تعلیم و تربیت دیتے، جس طرح توحید کی دعوت دیتے اور شرک کے خلاف ڈٹ کر جنگ کرتے تھے، وہ بڑی ولولہ انگیز اور سبق آموز داستان ہے۔ اس کے چند امور نہایت اہم ہیں:

ان کا قول ہے: ''کوئی شخص اپنے رب کے سوا کسی سے کوئی امید نہ رکھے اور اپنے گناہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈرے۔'' [1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ چھوٹا سا جملہ قطرے میں دجلہ کے مترادف ہے۔ اس ننھے سے فقرے میں معانی کا ایک بہت بڑا جہاں پوشیدہ ہے۔ یہ بڑی بہترین بات ہے، یہ فصاحت و بلاغت کا مرقع ہے۔ امید ہوتی ہے تو خیر و بھلائی ہی کی ہوتی ہے اور خوف بہر حال شر اور برائی سے ہوتا ہے۔ کسی کو اگر شر کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو صرف اپنے گناہوں کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَآ أَصَٰبَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا۟ عَن كَثِيرٍ ۝ ﴾

''تمھیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمھارے اپنے ہاتھوں ہی کے کرتوت کا بدلہ ہے اور وہ تو بہت سی باتوں سے درگزر فرما لیتا ہے۔'' [2]

پر امید شخص خیر کے حصول کا آرزومند ہوتا ہے اور شر کو دور کرنا چاہتا ہے۔ نعمتیں تو بس اللہ ہی کی جانب سے ملتی ہیں اور مصائب کو دور کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

[1] الفتاویٰ: 101/8. [2] الشوریٰ 30:42.

﴿ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ﴾

''اور اگر اللہ تمھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اسے دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی ہٹانے والا نہیں۔''[1]

آثار جاہلیت مٹانے کا حکم

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں شامل تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جو مدینہ جائے اور وہاں جو بھی بُت دیکھے اسے توڑ ڈالے؟ اور جو (بلند و بالا) قبر دیکھے اسے برابر کردے اور جو بھی تصویر دیکھے اسے مسخ کر دے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روانہ ہو جاؤ، لہٰذا وہ چلے گئے اور واپس آکر اطلاع دی کہ انھوں نے تمام بت پاش پاش کر دیے، ہر بلند قبر برابر کردی اور ہر تصویر کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ بعدازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو ان مذکورہ چیزوں کو دوبارہ بنائے تو اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے دین کا کفر کیا۔''[2] جب حضرت علی رضی اللہ عنہ امیرالمومنین بنے تو آپ نے ابو الہیاج الاسدی کو بلا بھیجا اور اس سے فرمایا: میں تمھیں اس مقصد کے لیے بھیج رہا ہوں جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا ''جاؤ کوئی بت باقی نہ چھوڑو، سب کو مٹا دو، اور بلند و بالا قبریں برابر کردو۔''[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اکثر اوقات قبروں کی زیارت کرنے اور عبرت کے حصول کے لیے قبرستان جاتے تھے اور فرماتے تھے: اے اہلِ قبور! اپنا حال سناؤ، ہمارے پاس تمھارے لیے یہ خبر ہے کہ تمھاری عورتوں نے شادی کرلی، تمھارا مال تقسیم ہو چکا، تمھاری رہائش گاہوں میں

[1] یونس 10:107۔ [2] مسند أحمد: 1/87، 138، احمد شاکر نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ [3] صحیح مسلم، حدیث: 969.

دوسرے لوگ رہنے لگے۔ پھر فرمایا: اگر یہ قبروں والے بولنے کی سکت پائیں تو یہ کہیں گے: اللہ کی قسم! تقویٰ سے بہتر ہم نے کوئی چیز نہیں دیکھی۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ توحید کے عقیدے پر بہت زور دیتے تھے۔ ہر طرف سے شرک کے وسائل واسباب ختم کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے منع کیا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا اور یہ بات مردوں کی پوجا تک پہنچادے گی، انھوں نے وضاحت فرمائی کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ بدترین لوگ ہیں جیسا کہ انھوں نے فرمایا: ''جو لوگ قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں وہ بدترین لوگ ہیں۔'' [2] یہ بات انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں کہی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ کا ان لوگوں پر شدید غضب نازل ہوا جنھوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔'' [3] اس معنی ومفہوم کی اور بھی بہت سی صحیح احادیث ہیں۔ لہٰذا اس بات پر یہ انتباہ بڑا ضروری ہے کہ قبروں کی زیارت کے صرف دو مقاصد ہیں جیسا کہ سیرت نبوی سے ثابت ہے، ایک یہ کہ موت سے عبرت ونصیحت حاصل کی جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ میت کے لیے اللہ کی رحمت کی دعا کی جائے، قبر کی زیارت کا یہ مقصد نہیں ہے کہ صاحبِ قبر سے کسی فائدے کے حصول کا قصد کیا جائے۔ یہ بات سیرت پاک کے برعکس ہے اور زیارتِ قبور کے آداب کے منافی ہے۔ [4]

قبروں پر عرس منانے کا تاریخی پس منظر

کہا جاتا ہے کہ قبروں پر سالانہ زیارت کے لیے مجلسیں منعقد کرنے کی بدعت فاطمیوں نے چوتھی صدی ہجری میں شروع کی تھی۔ احمد بن علی مقریزی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے

[1] الاستذکار: 234/1. [2] مصنف عبدالرزاق: 405/1، وکنزالعمال، حدیث: 22522. [3] فتح الباري: 376/4، اس کی سند حسن ہے۔ والموطأ، حدیث: 414. [4] الغلو في الدین للدکتور صادق الغریاني، ص: 119.

لکھتے ہیں: ''وہ چھ قسم کے میلاد مناتے تھے، ① نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد، ② حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا میلاد، ③ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا میلاد، ④ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا میلاد، ⑤ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا میلاد ⑥ وقت کے خلیفہ کا میلاد...... وہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قبر پر اونٹ، گائیں اور بکریاں بھی ذبح کرتے تھے۔''[1]

اس تاریخ سے پہلے کی تینوں صدیوں میں مسلمان نہ قبروں کے پاس میلے لگاتے تھے۔ نہ کسی عرس کا اہتمام کرتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم بقیع الغرقد سے دور مصر، شام اور عراق میں دفن ہوئے۔ آج ہمیں ان کی قبروں کا کوئی نام ونشان تک نہیں ملتا اور جن کی قبریں معلوم ہیں ان کے بارے میں سیرت نگاروں اور مؤرخین کا اختلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ سیرت وتاریخ نگاروں کی نگاہ سے یہ قبریں کیسے مخفی رہیں، جبکہ وہ عظیم صلحاء، علماء اور ہدایت کی روشنی کے مینار تھے؟ جنھوں نے علم دین، جہاد اور اللہ کی بندگی کا جھنڈا بلند کیے رکھا۔ اگر ان کے زمانے میں یا تابعین کے زمانے میں ان کی قبروں کا کہیں تذکرہ ہوتا، تو ان کا مقام کبھی مخفی نہ ہوتا۔

پکی قبروں کی تعمیر کے لیے سامراجی منصوبہ

مغربی سامراجی طاقتوں کے مسلمانوں پر حملوں نے انھیں قبر پرستی کی لعنت میں مبتلا کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ انگریزی اخبار ٹائمز نے برطانوی استعمار کے ایک اہم شخص کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ اس نے مسلمانوں میں بدعات وخرافات، وہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ضعیف الاعتقادی اور قبر پرستی مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کا تیر بہدف طریقہ ہے۔ شیخ احمد باقوری کا کہنا ہے کہ مستشرقین میں سے ایک بڑی شخصیت نے انھیں ایشیا میں بعض سامراجی طور طریقوں،

[1] المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار: 427/1، والغلو في الدين للغرياني، ص: 103.

خفیہ حکمت عملی اور عملی اقدامات کے بارے میں بتایا۔ سامراجی مقاصد کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان سے آنے والے قافلے بغداد سے گزر کر دیگر علاقوں کو جائیں لیکن قافلے یہ روٹ اختیار کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ اس سلسلے میں مختلف اقدامات پر بہت غور وفکر کے بعد بالآخر یہ طے ہوا کہ اس راستے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قبے اور مزار تعمیر کر دیے جائیں۔ لہٰذا تھوڑے ہی عرصے میں ان اولیاء کے مزارات کی خبریں مشہور ہوگئیں اور پھر پروپیگنڈہ کے زور پر یہ بات عام کر دی گئی کہ ان میں فلاں فلاں اولیاء آخری آرامگاہ کے طور پر قیام پذیر ہیں اور ان کی فلاں فلاں کرامات دیکھی گئی ہیں،...... اس حربے کے ذریعے سے یہ راستے اور مقامات، قبریں اور قبے لوگوں کی نظر میں مانوس ہوکر ان کا مقصود بن گئے اور آباد ہوتے چلے گئے۔

انگریز حکومت نے مصر میں لوگوں کی دینی حالت کا جائزہ لیا، دوسری طرف وہ اس علاقہ میں سوشلسٹوں کی تحریک پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی۔ انگریزوں کو مصر میں مسلمانوں کی دینی پستی دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا۔ خاص طور پر وہ اس بات سے بڑے خوش ہوئے کہ اسی سال طنطا میں احمد البدوی کی قبر پر تیس لاکھ مسلمان زیارت کے لیے آئے۔ وزارتِ اوقاف کی طرف سے جو عالم وعظ کے لیے مقرر ہوئے ان کا کہنا ہے کہ میں لوگوں کی جو غیر دینی حالت اور غیر اسلامی افعال دیکھ رہا تھا وہ اس پر ڈانٹ ڈپٹ کے نہیں بلکہ کوڑے مارے جانے کے مستحق تھے۔ اگر انھیں صحیح دینی فرائض و واجبات کی طرف دعوت دی جاتی تو وہ ضرور بھاگ جاتے۔ ان کی دینی پستی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس بزرگ کی قبر پر مانی ہوئی نذریں پوری کرنے اور صاحبِ قبر کے حضور گڑ گڑا کر دعا کرنے کے لیے آئے تھے۔[1]

کیا مزارات دین میں ترمیم و اضافہ کے مترادف ہیں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام مخلوقات میں معزز ترین اور

[1] الغلو في الدين، ص: 105.

تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور صحابہ کی طرف سے ان کا انتہائی احترام کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، انھیں آپ ﷺ سے جس قدر محبت تھی اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، آپ ﷺ کی قبر مبارک آپ ہی کے گھر میں تھی اور تمام صحابۂ کرام کو معلوم تھی۔ یہ قبر مبارک دنیا کی افضل ترین قبر تھی مگر صحابہ کرام نے اس پر نہ کوئی عمارت بنائی، نہ کوئی قبہ بنایا۔ نہ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ سالانہ بنیادوں پر ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے ان کی قبر مبارک پر جمع ہوئے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ جب آپ کی قبر مبارک کے قریب سے گزرتے تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان پر درود وسلام بھیجتے تھے۔ صحابہ کرام آپ ﷺ کے احکام کی اطاعت کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی طرف سے دیے گئے اوامر ونواہی پر عمل کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی، ان کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پابندی کا آئینہ دار تھا۔

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾

''جو کچھ رسول (ﷺ) تمھیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رُک جاؤ۔'' [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نجوم پرستی کو سختی سے مسترد کر دیا

جب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے خلاف لڑائی کے لیے سفر کا ارادہ کیا تو ایک نجومی آیا۔ اس نے آپ سے کہا: اس وقت سفر مت کیجیے چاند عقرب میں ہے، آپ نے اس حالت میں سفر کیا تو آپ کے ساتھیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت علی نے فرمایا: تم غلط کہتے ہو، میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور توکل کی بنا پر تمھیں جھٹلانے کے لیے ضرور سفر کروں گا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے سفر کیا، اللہ نے انھیں اس سفر میں برکت عطا فرمائی۔ اکثر

[1] الحشر 7:59.

خارجی مارے گئے۔[1] ایک روایت میں آیا ہے: جب آپ جنگ نہروان سے فارغ ہوئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور ارشاد فرمایا: اگر ہم نجومی کے دیے گئے وقت کے مطابق چلتے تو جاہل لوگ کہتے کہ آپ نجومی کے بتائے ہوئے وقت پر چلنے کی وجہ سے کامیاب ہوئے۔[2]

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امیر المومنین کو عقیدہ کی سلامتی کی کتنی فکر تھی، انھوں نے نجومی کے دعوے اور فاسد عقیدے کو مسترد کر دیا، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خارجیوں کے خلاف لڑائی کے نازک معاملے اور اس معرکہ کے نتائج کے بارے میں بہت فکر مند تھے لیکن وہ نجومی کی بات کی تردید کرنا نہیں بھولے، انھوں نے فتح یاب ہونے کے بعد ایک مناسب وقت پر نجومی کے فاسد عقیدے کی پوری وضاحت سے تردید کی۔[3]

اہل بازار کے لیے رہنمائی

حضرت علی رضی اللہ عنہ منڈی اور بازار کے کاروباری معاملات پر ہمیشہ نظر رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کو شریعت کے مطابق معاملات طے کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ بازار کے معاملات میں وہ کڑا احتساب کرتے تھے۔ حر بن جرموز المرادی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بتایا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ وہ پنڈلی تک تہبند باندھے ہوئے تھے اور اوپر کی چادر سمیٹ کر پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں درہ تھا اور وہ بازاروں کا چکر لگا رہے تھے۔ لوگوں کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت فرما رہے تھے۔ اچھے انداز میں خرید وفروخت کا حکم دے رہے تھے۔ فرما رہے تھے: ناپ اور تول دونوں کو پورا رکھو! اور گوشت کی ہڈیوں سے مخ نہ نکالو۔[4]

---

[1] مجموع الفتاوی: 179/35، والبداية والنهاية: 288/7. [2] البداية والنهاية: 188/7. [3] منهج علي بن أبي طالب في الدعوة إلى الله، ص: 329. [4] لسان العرب: 624/2، وفضائل الصحابة: 688/2، اس کی سند صحیح ہے۔

ابو مطر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں مسجد سے باہر نکلا۔ اچانک میں نے سنا کہ ایک آدمی میرے پیچھے آواز لگا رہا ہے: اپنا تہبند اونچا کرو، اس طرح تمھارا کپڑا صاف رہے گا اور اسی میں رب کا تقویٰ ہے، اگر تم مسلم ہو تو سر کے بال کٹواؤ، میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، وہ تہبند باندھے ہوئے تھا۔ سر پر چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی بدوی ہے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا یہ صاحب کون ہیں؟ اس نے کہا: لگتا ہے تم یہاں اجنبی ہو، میں نے کہا: جی ہاں! میں بصرہ سے آیا ہوں۔ اس نے کہا: یہ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابن ابی معیط کے گھر تک گئے وہ اونٹوں کو ہانک رہے تھے انھوں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: خرید و فروخت کے معاملات میں قسمیں نہ کھایا کرو، قسم سے سودا تو بک جاتا ہے مگر برکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کھجور فروشوں کے پاس پہنچے، وہاں دیکھا کہ ایک خادمہ رو رہی ہے، پوچھا کیوں روتی ہو؟ اس نے کہا: اس آدمی نے ایک درہم میں میرے ہاتھ یہ کھجوریں فروخت کیں لیکن میرے آقا نے یہ کھجوریں لینے سے انکار کر دیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تاجر سے فرمایا: اپنی کھجوریں لے لو اور اس کا ایک درہم واپس کر دو، کیونکہ وہ بے چاری بے اختیار ہے۔ اس نے انھیں دھکا دے دیا۔ میں نے تاجر سے کہا جانتے ہو یہ کون ہیں؟ اس نے کہا: نہیں، میں نے کہا یہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ سنتے ہی اس کا لہجہ نرم ہو گیا اور اس نے خادمہ کو ایک درہم واپس دے دیا پھر وہ کہنے لگا: امیر المؤمنین! آپ مجھ سے راضی ہو جائیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم لوگوں کے حقوق ادا کرتے رہو گے تو میں بھی تم سے راضی رہوں گا۔ پھر آپ کھجور والوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کھجور والو! مسکینوں کو کھلاؤ، تمھاری کمائی میں اضافہ ہو گا، پھر مچھلی والوں کے پاس آئے تو فرمایا: ہمارے بازار میں پھولی ہوئی پانی پر تیرنے والی مچھلی نہ بیچو، پھر کپڑوں کے بازار دار فرات میں گئے۔ [1]

[1] البداية والنهاية: 8/4.

زاذان سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اکیلے بازار میں جاتے تھے، آپ راستہ بھولے ہوئے راہ گیر کی رہنمائی کرتے، کمزور کی مدد فرماتے اور دکانداروں کے پاس سے گزرتے تو قرآن کی یہ آیت پڑھ کر سناتے تھے:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○﴾

''یہ آخرت کا گھر (جنت) ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص رکھیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی اور فساد کے چاہنے والے نہیں ہیں اور اچھی عاقبت تو متقین ہی کی ہے۔''[1]

پھر فرماتے تھے کہ یہ آیت اہل اقتدار اور حکمرانوں وغیرہ کے لیے ہے تاکہ وہ عدل اور تواضع سے کام لیں۔[2]

خلال نے اپنی سند کے ساتھ ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ بازار میں آئے اور فرمایا: اے بازار والو! اللہ سے ڈرتے رہو۔ قسم اٹھانے سے بچو، قسم سے سودا تو بک جاتا ہے لیکن برکت ختم ہو جاتی ہے۔ تاجر اپنا حق پورا لیتا ہے اور دوسروں کا پورا حق دیتا ہے بصورت دیگر وہ تاجر فاجر کہلائے گا'' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سلام کیا اور واپس چلے گئے۔ تاجروں کو نصیحت کرنے کے لیے آپ کا یہی معمول تھا۔[3]

ابو الصہباء سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: میں نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شط الکلاء کے بازار میں دیکھا۔ وہ لوگوں سے گھاس کے بھاؤ پوچھ رہے تھے۔ ان کی یہ براہ راست نگرانی بہت سے امور کی ضامن تھی۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ خود بھی تاجروں اور کاروباری لوگوں کے معاملات پر کڑی نظر رکھتے تھے اور اپنے ماتحت حکام کو بھی ایسے معاملات کی نگرانی کا حکم دیتے تھے۔ وہ اچھی

---

[1] القصص 28:83. [2] الدر المنثور للسيوطي:6/444، والبداية والنهاية: 8/5. [3] كتاب السُّنّة، حديث:496، بتحقيق الدكتور عطية الزهراني.

کارکردگی والوں کی تعریف کرتے تھے۔ اور جو لوگ منع کرنے کے باوجود برائی کا ارتکاب کرتے تھے انھیں شرعی احکام کے مطابق سزا دیتے تھے۔ [1]

اس حوالے سے وہ انتہائی مفید ارشادات کے ساتھ ساتھ مناسب زجر و توبیخ بھی فرماتے تھے تاکہ لوگ فضائل اخلاق اور شریعت کے احکام کی تعمیل کو لازم سمجھیں، ان میں سے بعض امور یہاں پیش خدمت ہیں:

(1) عورتوں کے لیے مردوں کی بھیڑ میں گھسنے کی ممانعت

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو برا بھلا کہا جو اپنی عورتوں کو کافر مردوں کے ساتھ بازار میں بھیڑ میں چلنے پھرنے سے منع نہیں کرتے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: کیا تمھیں حیا نہیں آتی؟ کیا تم غیرت سے کام نہیں لیتے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھاری عورتیں بازار جاتی ہیں اور عجمی کافر مردوں کے ساتھ بھیڑ میں گھس جاتی ہیں۔ [2]

(2) زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے تھوڑے منافع سے منہ نہ موڑو

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ بازار جاتے تھے تو ان کے ہاتھ میں دُرّہ ہوتا تھا، اور وہ عبا پہنے ہوئے ہوتے تھے اور فرماتے تھے: اے تاجرو! اپنا حق وصول کرو اور دوسروں کو ان کا حق دو، سلامتی میں رہو گے، زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے تھوڑے منافع سے منہ نہ موڑو۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو قصے کہانیاں سنا رہا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا ابھی کل کی بات ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں ان کے ساتھ تھے۔ آج یہ حالت ہے کہ تم نے قصے کہانیاں بنانی اور سنانی شروع کر دی ہیں، میں تم سے سوال کرتا ہوں اگر تم نے صحیح جواب نہ دیا تو تمھیں دُرّہ ماروں گا۔ ہاں! یہ بتاؤ کہ دین کی

[1] الدور السياسي للصفوة في صدر الإسلام، ص: 202. [2] مسند أحمد: 2/254-255، علامہ احمد شاکر نے اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے۔

استقامت کیا ہے؟ اور زوال سے کیا مراد ہے؟ اس نے کہا ثابت قدمی یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور زوال یہ ہے کہ طمع اور لالچ پر مبنی زندگی بسر کی جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے ٹھیک کہا، جاؤ تمھیں قصہ گوئی کی اجازت ہے۔[1]

③ احکامِ تجارت جانے بغیر تجارت نہیں کرنی چاہیے

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس نے دین کے احکام کو سیکھے بغیر تجارت کی وہ سودی کاروبار کی کیچڑ میں گر پڑا پھر اس کیچڑ میں گر پڑا۔ پھر اس کیچڑ میں گر پڑا۔[2] جو شخص شرعی احکام جانے بغیر بازار میں آ بیٹھتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دُرّہ مارتے تھے اور فرماتے تھے: جو سودی معاملات کو نہیں سمجھتا وہ بازار میں نہ بیٹھے،[3] مزید فرماتے تھے کہ جو شخص دین کے احکام کو نہیں سمجھتا وہ بازار میں آ کر کاروبار نہ کرے، بصورتِ دیگر وہ خواہی نخواہی یعنی چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے سود کھانے کا مرتکب ہوسکتا ہے۔[4]

④ جو پہلے آیا وہ حق دار ہے

بازار میں کاروبار کے لیے جگہ حاصل کرنے کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے کوفہ کی منڈی میں اعلان کیا کہ جو شخص جو جگہ پہلے حاصل کر لے وہی اس کا حق دار ہے اگر وہ دن بھر وہاں رہے تو فبہا! لیکن وہ وہاں سے کہیں اور منتقل ہو گیا ہو تو وہ جگہ اس کی ہو گی جو وہاں پہنچ جائے گا۔ اصبغ بن نباتہ فرماتے ہیں: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ منڈی گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ لوگوں نے اپنے لیے مختلف مقامات پر پہلے ہی سے قبضہ کر لیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ یہ بات ان کے لیے جائز نہیں۔ مسلمانوں کی منڈی مسلمانوں کی نماز ادا کرنے کی جگہ کے مانند ہے اور اس میں پہلے آنے کی بنیاد پر جگہ

[1] المنتظم في تاريخ الملوك والأمم لابن الجوزي: 70/5. [2] بستان العارفين، ص: 350. [3] نظام الحكومة الإسلامية للكتّاني: 17/2. [4] نظام الحكومة الإسلامية للكتّاني: 17/2.

ملے گی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی کوفہ پر حکمرانی کے دور تک اسی قاعدے پر عمل ہوتا رہا۔ پھر سن 49 ھ میں جب زیاد بن ابیہ کی حکومت آئی تو یہ حکم جاری ہوا کہ جو کسی جگہ پر آ کر قابض ہو گیا، جب تک وہ وہاں موجود رہے گا وہ جگہ اسی کا حق مانی جائے گی۔[1]

⑤ ذخیرہ اندوز گناہ گار اور ملعون ہے

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غذائی اجناس کی ذخیرہ اندوزی کے بارے میں فرمایا: غلہ اور کھانے کی اشیاء سپلائی کرنے والے کو رزق سے سرفراز کیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوز گناہ گار اور ملعون قرار پاتا ہے۔[2] امیر المومنین نے کھانے کی ذخیرہ کی گئی اشیاء کو جلا دینے کا حکم دیا۔ حافظ ابن ابی شیبہ، حکم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی گئی کہ ایک لاکھ درہم مالیت کی کھانے کی اشیاء ایک آدمی نے ذخیرہ کر رکھی ہیں۔ اس پر انھوں نے ان غذائی اجناس کو جلا دینے کا حکم جاری فرمایا۔[3]

امام ابن قدامہ کی یہ رائے ہے کہ حرام ذخیرہ اندوزی وہ ہے جس میں تین شرائط پائی جائیں:

(ا) کوئی شخص سامان خریدے اگر وہ اپنا سامان بیچنے کے لیے لایا یا اپنے ہی غلے میں سے کچھ محفوظ کر لیا تو ایسا آدمی ذخیرہ اندوز شمار نہیں ہوگا۔ یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک فرمان سے بھی واضح ہے۔

(ب) خریدی ہوئی چیز کا تعلق کسی خوراک سے ہو۔[4]

(ج) اس خریداری سے اس کا مقصد کسی بھی غرض سے لوگوں کے لیے تنگی پیدا کرنا ہو۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کا جو حکم جاری کیا اس کی بنیاد

[1] الأموال لأبی عُبید، ص: 123، و الحیاة الاقتصادیة للدکتور بطاینه، ص: 115. [2] فقه علي لقلعجي، ص: 27، ومصنف عبدالرزاق: 204/8، ومسند زید، ص: 245. [3] المُصنّف: 103/6، حدیث: 433، والحسبة في العصر النبوي، ص: 34. [4] بعض علماء نے سامان خورونوش اور دیگر میں کوئی فرق نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر ہے: ''گناہ گار ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔''[1]

6 خسارہ مال پر لاگو ہوگا

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مضاربہ کے کچھ احکام بیان کیے ہیں: مضاربہ لوگوں کے درمیان مالی معاملات کی ایک قسم ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک متعین مقدار میں مال دوسرے شخص کو اس بنیاد پر دیا جائے کہ وہ اس سے کاروبار کرے، اور اس کا ایک متعین منافع مال دینے والے کو ملے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسے کاروبار میں اگر خسارہ ہو جائے تو یہ نقصان پورے مال کی مناسبت سے ہوگا اور اس کا منافع طے شدہ نسبت سے ہوگا جس پر فریقین متفق ہوئے تھے۔[2] مطلب یہ ہے کہ نقصان کا اطلاق مال پر ہی ہوگا یعنی جتنا جس کا مال ہوگا، خسارے کو بھی اسی کے مطابق شمار کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان دونوں کا مال مقدار میں ایک جتنا ہے تو نقصان بھی دونوں کے مابین آدھا آدھا تقسیم ہوگا اور اگر تہائی ہے تو نقصان بھی اسی مقدار کے مطابق ہوگا۔[3]

7 شراب فروخت ہونے پر بستی کو آگ لگا دی

حضرت علی رضی اللہ عنہ شراب کے معاملے میں نہایت سختی سے کام لیتے تھے۔ وہ ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص شراب بیچے۔ انھیں ایک بستی میں شراب بکنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے فوراً حکم دیا کہ اس بستی کو آگ لگا دی جائے۔ امام ابو عبید القاسم بن سلام سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زُرارہ[4] کی طرف دیکھا اور دریافت فرمایا: یہ کون سی بستی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ اس بستی کا نام زُرارَہ ہے، یہاں شراب فروخت کی جاتی ہے۔ یہ سنتے ہی آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس بستی میں جا پہنچے۔ فرمایا: آگ لاؤ اور اس بستی کو بھسم کر

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1605. [2] مُصَنَّف ابن أبي شيبة: 46/7، حديث: 22730. [3] المغني: 31/5. [4] کوفہ میں ایک محلے کا نام ہے جو اس کے بانی زُرارہ کے نام پر رکھا گیا۔

دو۔ بے شک ایک خبیث چیز دوسری خبیث شے کو کھا جائے گی۔ راوی کہتا ہے: وہ بستی آناً فاناً جل گئی۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ آگ خواستا بن جبرونا کے باغ تک جا پہنچی۔[1]

⑧ لباس اور وضع قطع پر احتساب کے ذریعے تہذیبی اصلاح

ابومطر سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں مسجد سے باہر نکلا۔ اچانک میں نے سنا کہ کوئی آدمی مجھے پیچھے سے پکار رہا ہے: اپنا تہبند اوپر کر لو۔ یہ طریقہ تمھارے کپڑے کے پاک صاف رہنے کے لیے بہت بہتر ہے اور تقویٰ کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے۔ اور اگر تم مسلمان ہو تو اپنے بالوں کی وضع قطع ٹھیک کر لو![2] یہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔

⑨ حضرت علی رضی اللہ عنہ فساد پھیلانے والوں کو جیل بھیج دیتے تھے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فساد پھیلانے والے لوگوں کا پیچھا کرتے تھے اور جو شریر قابو آ جاتا اسے قید کر دیتے تھے۔ قاضی ابو یوسف، عبدالملک بن عمیر سے روایت کرتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کسی قبیلے یا قوم میں کسی شریر، خبیث اور بدکار شخص کو دیکھتے تو اسے قید کر دیتے تھے۔ اگر وہ مالدار ہوتا تو اس کا خرچہ اسی کے مال سے کراتے تھے اور اگر مفلس ہوتا تو مسلمانوں کے بیت المال سے اس پر خرچ کرتے اور حکم دیتے تھے: شریروں اور فسادیوں کو قید میں رکھ کر عوام الناس کو ان کے شر سے محفوظ رکھا جائے اور بیت المال سے ان پر خرچ کیا جائے۔[3]

⑩ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر وعید کا تازیانہ

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بخیل کے مال کا مصرف کوئی حادثہ یا کوئی وارث ہے۔[4] مزید فرمایا: بخیل بیچارہ غربت ہی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ دنیا میں غریبوں

[1] الأموال، ص: 98,97، والحسبة لابن تيمية، ص: 60. [2] البداية والنهاية: 8/4. [3] الخراج للإمام أبي يوسف، ص: 150. [4] نثر اللآلي، منقول از منهج علي بن أبي طالب، ص: 183.

جیسی زندگی گزارتا ہے اور آخرت میں اس سے مالداروں جیسا حساب لیا جائے گا۔[1]

(11) نماز کے لیے پکار

حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کا حکم دینے کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ وہ کسی راستے سے گزرتے تو بلند آہنگی سے پکارتے تھے: نماز! نماز!!...... وہ منہ اندھیرے اپنے گھر سے نکل آتے اور ''نماز! نماز!!'' کی صدا بلند کر کے لوگوں کو فجر کی نماز کے لیے جگاتے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس دن وہ شہید ہوئے اس روز وہ گھر سے نکلے، اور دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی آواز لگائی: اے لوگو! نماز! نماز!!۔ یہی ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ آپ کے ہاتھ میں دُرّہ ہوتا تھا۔ اس روز ان کی راہ میں دو آدمی حائل ہوئے اور ابن ملجم نے ان کے سر پر ضرب لگائی۔[2]

(12) سڑکوں پر ضروری سہولتوں کا اہتمام

امیر المومنین نے حکم جاری کیا کہ مسلمانوں کے عام راستوں میں پانی اور بیت الخلاء کے لیے خصوصی انتظام کیا جائے۔[3]

(13) قصہ گوئی کی بدعت اور امیر المومنین کی اس سے ممانعت

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں قصہ گو قسم کے لوگوں کا ظہور ہوا تو صحابہ اور تابعین نے اس خرابی کی ممانعت کی کوشش کی۔ عبیداللہ بن نافع بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دور میں قصہ گوئی نہیں تھی۔ قصوں کا سلسلہ فتنے[4] کے زمانے میں شروع ہوا۔ قصہ گو لوگ وہ واعظین تھے جو علم کی مجالس کے بالمقابل وعظ کی مجلسیں منعقد کرتے

[1] منهج علي في الدعوة إلي الله، ص: 183. [2] البداية والنهاية: 339/7. [3] مصنف عبدالرزاق: 72/10. [4] البدع والنهي عنها، ص: 20.

تھے۔ وہ لوگوں کو قصے کہانیاں اور اسرائیلیات پر مبنی حکایات سناتے تھے، اور یہ سب کچھ وہ باتیں ہوتی تھیں جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی اور عام لوگوں کی عقل ان کا ادراک نہیں کر سکتی تھی۔

امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے انھیں اس کام سے منع کر دیا کیونکہ وہ لوگوں کو عجیب وغریب اور بے سروپا اوٹ پٹانگ باتیں سناتے جو ان کی حدِ ادراک سے باہر تھیں، اس لیے وہ ان کی باتیں سمجھ ہی نہیں پاتے تھے۔[1] چنانچہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے شرعی علم رکھنے والوں کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو مبنی بر حقیقت سچی داستانیں سنائیں۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی زندگی، توحید کی دعوت اور شرک کی مخالفت پر مبنی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ ہمیشہ آرزومند رہتے تھے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی تعلیم دی جائے۔ ان کے دلوں کو اسی ایک ذات عالی کے ساتھ جوڑ دیا جائے جو تمام موجودات کا خالق و مالک ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں اللہ کی نعمتوں کی یاد دلائی اور ان کا شکر ادا کرنے کی ترغیب دی۔ آپ جاہلیت کے تمام آثار مٹا دینا چاہتے تھے۔ آپ نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے تمام وسائل علم، دانائی، خطابت، شاعری اور دلیری کو دعوتِ دین کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ اپنی اخلاقی بلندی اور علمی درخشندگی کے ساتھ لوگوں کے مابین زندگی بسر کرتے رہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حکیمانہ اقوال

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے فی البدیہ صادر ہونے والے اقوال کا ایک مجموعہ موجود ہے جو عقل کی بلندی، دل کی پاکیزگی، نفس کی پارسائی، ایمان کی گہرائی اور دین میں استحکام پر دلالت کرتا ہے۔ انھیں براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم وحی حاصل کیا۔ جس سے ان کی زبان میں فصاحت اور بیان میں بلاغت پیدا ہوگئی۔ ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ موتیوں کی مانند ہیں

[1] دراسات في الأهواء والفرق والبدع، ص: 239.

اور ان کے جملوں میں حکمت و دانائی کے ایسے خزانے چمک رہے ہیں جو عقل والوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ملفوظات اہل بلاغت کا مقصود و مطلوب اور اہل ہدایت کے لیے بڑی قیمتی دولت ہیں۔ ان اقوال زریں میں انھوں نے فضائل اعمال بتائے ہیں اور اچھی عادات کی ترغیب دی ہے، تعلیم دین اور دعوت کے سلسلے میں ان کے حکیمانہ اقوال قیمتی گوہر والماس سے بھرپور ہیں۔ ان میں نفوس انسانی کی تہذیب و تربیت، دلوں کو زندگی اور عقلوں کو روشنی فراہم کرنے کا سامان ہے، اندازِ بیان نہایت عمدہ، معانی بہت واضح اور فکر میں بڑی گہرائی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ متقی دل اور صاف و شفاف سینے سے پھوٹنے والے گوہر آبدار ہیں۔[1]

ان حکیمانہ اقوال میں سے چند ایک یہ ہیں:

① رات کی نماز دن کو چہرے کے بارونق ہونے کا باعث ہے۔[2] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝﴾

''جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔''[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیام اللیل کے حوالہ سے یہ بھی فرمایا ہے: قیام اللیل کی وجہ سے مومن کو نور حاصل ہوتا ہے۔

② دین میں خیر تقویٰ کی وجہ سے ہے اور اس کے بگاڑ کا باعث طمع و لالچ ہے۔

③ مبارک ہو اس شخص کو جس نے اپنے علم پر عمل کیا۔

④ فرصت کے اوقات بادل کی طرح گزر جاتے ہیں۔[4]

⑤ دل کی سختی کا باعث پیٹ بھر کر کھانا ہے۔[5]

---

[1] منهج علي بن أبي طالب في الدعوة إلى الله، ص: 275. [2] مخطوطة نثر اللآلي منقول از منهج علي بن أبي طالب، ص: 276. [3] الفرقان 64:25. [4] مخطوطة نثر اللآلي، منقول از منهج علي بن أبي طالب، ص: 277,276. [5] مخطوطة نثر اللآلي منقول از منهج علي بن أبي طالب، ص: 278.

⑥ عظمت وشرف فضائل آداب واخلاق میں ہے حسب نسب میں نہیں ہے۔[1]

⑦ اخلاق کا حسن جسمانی خوبصورتی سے زیادہ افضل ہے۔[2]

⑧ اخلاق فاضلہ اور اعلیٰ ظرفی میں رزق کے خزانے پوشیدہ ہیں۔[3]

⑨ نیکی بہترین خزانہ ہے۔[4]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کچھ لوگ جمع تھے، انھوں نے نیکی کے موضوع پر باتیں کیں۔ امیر المومنین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمایا: نیکی ایک بہترین خزانہ ہے اور بہترین کھیتی ہے، اس کے انکار کرنے والے پر توجہ نہ دو، جو بھلائی حاصل نہ ہونے پر بھی شکریہ ادا کرے وہ بھلائی کے حصول پر شکریہ ادا کرنے والے سے زیادہ اونچے درجے کا آدمی ہے۔ نیکی کا برتاؤ کرتے ہوئے کسی کی طرف سے شکر گزاری کا انتظار نہ کرو۔ نیکی کی تکمیل تین باتوں سے ہوتی ہے۔ اپنی نیکی کو چھوٹا سمجھو، اسے چھپاؤ اور نیکی کرنے میں تاخیر سے کام نہ لو۔ جب اسے چھوٹا سمجھو گے تو یہ اس کے عظیم ہونے کی علامت ہوگی۔ جب نیکی چھپاؤ گے تو یہ اس کی تکمیل ہے اور جب اس میں تاخیر سے کام نہیں لو گے تو دوسروں کے لیے اس نیکی کو خوشگوار بنا دو گے۔[5]

⑩ بے ادبی کرنے سے کسی کو عزت وعظمت نہیں ملتی۔[6]

⑪ حاسد کو کبھی پرسکون زندگی نصیب نہیں ہوتی۔[7]

---

[1] الإعجاز والإيجاز للثعالبي، ص: 30، منقول از منهج علي بن أبي طالب، ص: 228. [2] مخطوطة نثر اللآلي منقول از منهج علي بن أبي طالب، ص: 278. [3] مخطوطة نثر اللآلي منقول از منهج علي بن أبي طالب، ص: 278. [4] تاريخ اليعقوبي: 210/2، و منهج علی بن أبي طالب، ص: 230. [5] تاريخ اليعقوبي: 210/2. و منهج علی بن أبي طالب، ص: 230. [6] الإعجاز والإيجاز للثعالبي، ص: 28. [7] مخطوطه، مطلوب كل طالب من كلمات علي بن أبي طالب، منقول از منهج علي، ص: 234.

⑫ حاسد اس پر غضبناک ہے جس کا کوئی گناہ نہیں۔ [1]

⑬ باغیوں کے لیے سب سے بڑے حاکم کی طرف سے ہلاکت ہے۔ [2]

⑭ جو کسی پر بغاوت کی تلوار سونتے گا خود اسی سے قتل ہوگا۔

⑮ ظلم کی ابتدا کرنے والے کے ہاتھ ہی میں نصیحت کا سامان ہے۔ [3]

یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ﴾

⑯ کٹھن حالات پر تشویش ظاہر نہ کرنا مردانگی ہے۔ [4]

⑰ برائی کے مرتکب کو روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے حسنِ سلوک کیا جائے۔ [5]

⑱ احسان زبان کو بند کر دیتا ہے۔

⑲ جس کی زبان میٹھی ہوگی اس کے دوست زیادہ ہوں گے۔

⑳ جس میں سچائی کم ہوگی، اس کے دوست بھی کم ہوں گے۔

㉑ تمھاری زبان اسی چیز کا تقاضا کرے گی جس کا تم نے اسے عادی بنایا ہے۔ [6]

㉒ جو بے مقصد چیز طلب کرے گا وہ بامقصد چیز سے بھی محروم ہو جائے گا۔ [7]

㉓ اچھے لوگوں سے دوستی کرو، بروں سے محفوظ رہو گے۔ [8]

㉔ خیر و بھلائی کا ہم نشین بڑی دولت کا مالک ہے۔ [9]

㉕ احمق کی دوستی دنیا میں خسارے اور آخرت میں حسرت و پشیمانی کا باعث ہے۔ [10]

[1] الإعجاز والإيجاز للثعالبي، ص: 29. [2] الإعجاز والإيجاز للثعالبي، ص: 35. [3] منهج علي بن أبي طالب في الدعوة إلي الله، ص: 235، 236، و الفرقان 25:27. [4] منهج علي بن أبي طالب، ص: 243. [5] مخطوطه نثر اللآلي من كلام علي بن أبي طالب، منقول از منهج علي، ص: 245. [6] مطلوب كل طالب في شرح كلمات علي بن أبي طالب، منقول از منهج علي، ص: 246، 248. [7] الإعجاز والإيجاز للثعالبي، ص: 29. [8] نثر اللآلي من كلام علي بن أبي طالب منقول از منهج علي، ص: 249. [9] نثر اللآلي من كلام علي بن أبي طالب منقول از منهج علي، ص: 249. [10] نثر اللآلي من كلام علي بن أبي طالب منقول از منهج علي، ص: 249.

㉖ تمھارے لیے اتنی تربیت کافی ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، دوسرے کے لیے بھی وہی پسند کرو۔ [1]

㉗ یہ نہ دیکھو کس نے کہا ہے، یہ دیکھو کہ کیا بات کہی ہے۔

㉘ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے نفع بخش ہو۔

㉙ آدمی کی شخصیت اس کی زبان کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ [2]

㉚ زبان ایک ترازو ہے۔ اس میں جہالت بے وزن اور عقلمندی کا پلڑا بھاری ہے۔ [3]

㉛ تمھارا حقیقی دوست یا بھائی وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے۔ [4]

㉜ ہر شخص کی قدر و قیمت اس کے علم و ہنر سے متعین ہوتی ہے۔

㉝ شریف آدمی جب بھوکا ہو اور کمینہ آدمی جب سیر شکم ہو تو ان دونوں سے بچو!

㉞ نفس خواہشات کی تکمیل کا طلبگار ہے۔ کھیل تماشے کی طرف راغب ہے، برائی کے لیے برانگیختہ کرنے والا ہے، گناہوں کا خواہشمند ہے۔ راحت کا آرزومند اور عمل سے نفور ہے، اگر اسے مجبور کرو گے تو اسے تھکا دو گے اور اگر اسے بے کار چھوڑ دو گے تو اسے ضائع کر دو گے۔ لہٰذا میانہ روی اختیار کرو۔

㉟ عاجز ہونا آفت ہے، صبر بہادری ہے، زہد بڑی دولت ہے اور تقویٰ جنت میں لے جانے والی چیز ہے۔

㊱ اللہ نے تمھیں آزاد بنایا ہے اس لیے کسی کی غلامی اختیار نہ کرو۔

㊲ خواہشات پر بھروسہ نہ کرو، یہ بیوقوف کا سامان زندگی ہے۔

㊳ لوگ سوئے ہوتے ہیں جب فوت ہوتے ہیں تو ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

㊴ لوگ جس بات کو نہیں سمجھتے وہ اس بات کے دشمن ہوتے ہیں۔

---

[1] نثر اللآلي من كلام علي بن أبي طالب منقول از منهج علي، ص: 250. [2] منهج علي بن أبي طالب، ص: 250،252. [3] أدب الدنيا والدين، ص: 265. [4] منهج علي بن أبي طالب، ص:253.

40. جو آدمی اپنی قدر و قیمت جانتا ہے کبھی ضائع نہیں ہوتا۔

41. بسا اوقات ایک لفظ کا بولنا تم سے نعمت چھین لینے کا سبب بن جاتا ہے۔

42. آداب و اخلاق کی حیثیت نت نئے لباس جیسی ہے اور سوچ صاف شفاف آئینہ ہے۔

43. غربت عقلمند کو اپنی دلیل پیش کرنے سے روک کر گونگا بنا دیتی ہے اور غریب اپنے شہر میں بھی اجنبی ہوتا ہے۔

44. جب دنیا کسی کے پاس آ جاتی ہے تو دوسروں کی خوبیاں بھی اسے دے دیتی ہے۔ اور جب دنیا اس سے منہ پھیر لیتی ہے تو اس کی ذاتی خوبیاں بھی اس سے چھین لیتی ہے۔

45. قلوب کی دلجمعی کا سامان کرو۔ ان کے لیے دانائی کے نوادرات کی تلاش میں رہو، وہ بھی اسی طرح اکتا جاتے ہیں جس طرح انسانی بدن بیزار ہو جاتے ہیں۔[1]

46. چہرے کی بشاشت، عطیۂ ربانی ہے۔[2]

47. قدرت رکھتے ہوئے کسی غلطی کے مرتکب کو معاف کر دینا اس قدرت پر اللہ کا شکر کرنے کے مترادف ہے۔[3]

48. معذرت کا اعادہ گناہ یاد دلانے کے مترادف ہے۔[4]

49. بلیغ ترین نصیحت مردوں کو دیکھنا اور قبروں کی زیارت کرنا ہے۔ (تاکہ تمھیں اپنا انجام یاد رہے)[5]

50. موت کی یاد دلوں کی پالش کا ذریعہ ہے۔[6]

یہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکیمانہ اقوال ہیں۔ اقوال کیا ہیں، سنہرے موتیوں کی لڑی ہے۔ کتنے چھوٹے چھوٹے جملے ہیں مگر معانی کے لحاظ سے کتنے عظیم الشان ہیں۔

---

[1] المرتضی للندوي، ص: 201,202. [2] نثر اللآلي في كلام علي بن أبي طالب، منقول از منهج علي، ص: 238. [3] مطلوب كل طالب منقول از منهج علي، ص: 239. [4] الإعجاز والإيجاز للثعالبي، ص: 29. [5] نثر اللآلي منقول از منهج علي، ص: 148. [6] منهج علي بن أبي طالب، ص: 149.

ان لفظوں میں ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے، ان کے معانی بڑے عظیم اور روشن ہیں۔ جس معاشرے میں انھوں نے زندگی بسر کی اس میں اور اس کے بعد کے معاشروں اور بعدازاں آج تک ان ملفوظاتِ عالیہ کے اثرات جاری ہیں۔ یہ حکیمانہ اقوال، اسلامی معاشرے کی رہنمائی اور تعلیم و تربیت کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رجالِ کبار کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خیالات
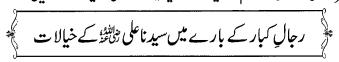
(1) نیکی میں اوجِ کمال والے اعاظم رجال کی صفات

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نیکی کے میدان میں باکمال لوگوں کی صفات کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: جب وہ نیکی کرتے ہیں تو خوشی محسوس کرتے ہیں، بھولے چوکے برائی کر لیں تو استغفار کرتے ہیں۔ کوئی آزمائش آتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور جب انھیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔[1]

مزید فرمایا: اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جیسے انھوں نے اہل جنت کو جنت کی دائمی زندگی میں چلتے پھرتے دیکھا ہے اور اہل جہنم کو عذاب میں مبتلا پایا ہے، برائیوں سے بہت دور، ان کے دل غمزدہ تھے۔ ان کے نفوس پاکدامن تھے۔ ان کی ضروریات معمولی تھیں۔ انھوں نے اس فنا پذیر دنیا کے قلیل ایام میں صبر سے کام لیا تاکہ آخرت میں لازوال راحت و آرام کی زندگی سے سرشار ہو سکیں۔ تم ایسے لوگوں کو رات کے وقت دیکھو تو ان کے رخساروں پر آنسو بہتے پاؤ گے۔ اپنے رب سے جہنم سے آزادی مانگ رہے ہوں گے۔ دن کے اوقات میں یہ عالم فاضل اور حلیم الطبع لوگ تقویٰ کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ کوئی دیکھنے والا انھیں دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ بیمار ہیں حالانکہ انھیں کوئی مرض لاحق نہیں ہوتا، وہ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور ان سے مل جل کر رہتے ہیں۔[2]

---

[1] مروج الذهب: 431/2. [2] البداية والنهاية: 6/8.

ایک موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مومن کو چاہیے کہ اپنی نگاہ کو نگاہِ عبرت بنائے، اپنی خاموشی کو بلند پایہ سوچ بچار کا حامل بنائے اور اس کی گفتگو دانائی کی آئینہ دار ہونی چاہیے۔[1]

نیز فرمایا: کیا مبارک ہے وہ شخص جو شہرت سے بچا ہوا ہے، وہ لوگوں کو جانتا ہے، لیکن لوگ اسے نہیں جانتے اور اس نے اللہ رب العزت کی رضاجوئی کی معرفت حاصل کر لی ہے، یہ لوگ ہدایت کے روشن چراغ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے تاریک راہوں کو روشن کر کے لوگوں کو فتنوں سے خبردار فرمائے گا اور انھیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا، ایسے لوگ بری باتیں نشر نہیں کرتے، نہ وہ سخت مزاج ہوتے ہیں نہ ریاکاری سے کام لیتے ہیں۔[2] امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ کلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کی بڑی واضح تشریح ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہے جو متقی ہو، دوسروں سے مستغنی ہو اور شہرت سے بچنے والا ہو۔''[3]

② صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف کی یاددہانی

جب امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں میں کچھ کوتاہی پائی اور اطاعتِ الٰہی میں کسی قدر کمی محسوس کی تو آپ نے انھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سیرت مقدسہ یاد دلائی۔ ابو اراکہ راوی ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ کچھ دیر کے بعد اچانک میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا ہیں۔ جب دھوپ مسجد کی دیوار پر ایک نیزے کے برابر آ گئی تو انھوں نے دو رکعتیں ادا کیں، پھر اپنے ہاتھ الٹ پلٹ کر فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو دیکھا ہے۔ ان کے مقابلے میں آج لوگوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان میں ان کے مشابہ کوئی بات نظر نہیں آتی۔ جب صحابہ کرام کو علی الصباح دیکھا جاتا تھا تو ان کی آنکھیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے ساری رات سجدے اور قیام ہی کی حالت میں گزاری ہے۔ وہ کتاب اللہ کی

[1] مروج الذهب:2/434. [2] صفة الصفوة:1/325. [3] صحيح مسلم، حديث:2965.

تلاوت کرتے تھے۔طویل قیام کرتے تھے۔طویل سجدے کرتے تھے۔وہ صبح کے وقت ذکر الٰہی میں مشغول ہوتے تو یوں لگتا تھا جیسے تیز ہوا کے جھونکوں سے درخت دائیں بائیں جھکے جا رہے ہیں۔ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگتی تھی کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے تھے اور وہ دنیا و مافیہا سے غافل نظر آتے تھے۔ان ارشادات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور خاموشی سے چلے گئے۔پھر ان کے لبوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی گئی یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ اللہ کے دشمن ابن ملجم نے انھیں شہید کر ڈالا۔[1]

③ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنے اصحاب کو فضائل اعمال کے لیے توجہ دلانا

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، مسلمان کے لیے افضل کام یہ ہے کہ وہ ایمان میں محکم ہو۔راہ حق میں جہاد اور کلمۂ اخلاص کی پاسداری کرے۔یہ عین فطرت اسلام ہے۔نماز قائم کرنا ملت کی علامت ہے۔ادائے زکاۃ ایک فریضہ ہے، ماہ رمضان کے روزے عذاب الٰہی سے بچاؤ کی ڈھال ہیں اور حج بیت اللہ گناہوں سے پاک کرنے کا سبب ہے۔صلۂ رحمی درازئ عمر کا باعث ہے۔اہل وعیال سے محبت اور پوشیدہ طور پر صدقہ کرنا گناہوں کا کفارہ اور رب العزت کے غصے کو ٹھنڈا کرنے والا ہے، نیکی کا رویہ اختیار کرنا بری موت سے بچنے کی یقینی تدبیر ہے، اللہ کے ذکر کی طرف لوٹ آؤ۔یہی بہترین ذکر ہے۔[2]

④ مریض کی عیادت

ثویر بن ابی فاختہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بتایا: ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا آؤ! حسن کی طرف چلیں، ہم اس کی عیادت کریں گے۔ہم وہاں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بھی موجود ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] حلية الأولياء: 76/1. [2] البداية والنهاية: 319/7.

نے ان سے پوچھا: آپ بیمار پرسی کرنے آئے ہیں یا محض ملنے کے ارادے سے؟ انھوں نے کہا: میں عیادت کے لیے آیا ہوں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ''جو مسلمان کسی مسلمان بھائی کی صبح کے وقت عیادت کرتا ہے، شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے رحمت و بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ اگر وہ شام کو عیادت کرے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے اللہ کی رحمت و بخشش کی دعا کرتے رہتے ہیں۔'' [1]

5 صاحب زادے کی خطابت سننے کی تمنا

ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا: میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں کہ تمھیں خطاب کرتے ہوئے سنوں۔ انھوں نے عرض کیا: مجھے آپ کے سامنے خطاب کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایک روز حسن رضی اللہ عنہ لوگوں سے خطاب کر رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک طرف چھپ کر بیٹھ گئے اور اپنے بیٹے کا خطاب سنا۔ ان کا خطاب فصاحت و بلاغت کا شہ پارہ تھا، خطاب سننے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی: [2]

﴿ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ ﴾

''یہ سب آپس میں ایک دوسرے کی نسل سے ہیں اور اللہ خوب سنتا اور جانتا ہے۔'' [3]

6 جیسا تم کہہ رہے ہو میں ویسا نہیں ہوں

عمرو بن مرہ، ابوالبختری سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا: ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا۔ اس نے ان کی تعریف کی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ایسا نہیں جیسا تم کہہ رہے ہو اور میں اس چیز سے بالاتر ہوں جو تمھارے دل میں ہے۔ [4]

[1] جامع الترمذي، حديث: 969. [2] البداية والنهاية: 37/8. [3] آل عمران 3:34. [4] تاريخ الذهبي، عهد الخلفاء الراشدين، ص: 646.

⑦ خواہشات کی پیروی پر انتباہ

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اپنے آپ پر خواہشاتِ نفس کی حکمرانی سے بچو، یہ نہایت قابل مذمت عمل ہے، اس کا انجام بہت برا ہو گا۔ اگر تم دیکھو کہ تنبیہ اور ڈرانے کے باوجود نفس نہیں مان رہا تو اسے امید اور رغبت سے رام کرو، جب ترغیب اور تنبیہ دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو نفس اللہ کی اطاعت کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔[1]

⑧ مسلمانوں کے لیے خوشی کا موجب بننا باعث مغفرت ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دوسرے مسلمان بھائی کے لیے خوشی کا سامان کرنے سے بخشش اور مغفرت ملتی ہے۔[2]

⑨ تین مشکل ترین اعمال

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مشکل ترین اعمال تین ہیں: ایک یہ کہ دوسرے کو اس کا حق دیا جائے، دوسرا یہ کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کیا جائے اور تیسرا یہ کہ مال کے ذریعے دوسروں کی غمخواری اور امداد کی جائے۔[3]

فکر و عمل کی خطرناک بیماریوں سے بچنے کا حکم

① گناہوں سے بچو! گناہ ہر مصیبت کی جڑ ہے

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس دنیا میں معصیت کی سزا یہ ہے کہ عبادت میں کوتاہی اور کمزوری سے معیشت میں تنگی اور لذت میں کمی آ جاتی ہے۔ پوچھا گیا کہ لذت میں کمی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ وہ شہوات اور خواہشات جو حلال ہیں ان میں

[1] أدب الدنيا والدين، ص: 26. [2] تنبيه الغافلين، ص: 245. [3] حلية الأولياء: 1/85.

تکدر اور گدلاہٹ آ جاتی ہے۔[1] معصیت پر تنبیہ اور خوف دلانے کے ساتھ ساتھ امیر المومنین ترغیب کے پہلو سے بھی غافل نہ تھے، انھوں نے فرمایا: جو شخص بغیر خاندان اور قبیلے کے عزت چاہتا ہے اور بغیر کثرت کے نسل چاہتا ہے اور بغیر مال کے استغناء کی دولت کا طلبگار ہے اسے چاہیے کہ وہ معصیت کی ذلت سے نکل کر اطاعت کی عزت اختیار کر لے۔[2] مزید فرمایا: جب تم عزت وشوکت کے طلبگار بنو تو حرام کردہ امور سے دور بھاگو۔[3]

② لمبی امیدیں اور خواہشات کی پیروی

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی جامع مسجد میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔ پھر فرمایا: ''اے لوگو! سب سے خوفناک چیز جس کی وجہ سے، میں تمھارے بارے میں ڈرتا رہتا ہوں وہ لمبی امید اور خواہشات کی پیروی ہے، لمبی امیدیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں، رہا خواہشات کی پیروی کا معاملہ تو یہ راہ حق سے روک دینے کا سبب بن جاتا ہے، یہ دنیا پیٹھ پھیر کر جا رہی ہے اور آخرت تمھارے سامنے ہے۔ ان دونوں کے اپنے اپنے بیٹے ہیں۔ تم آخرت کے بیٹے بنو، دنیا کے بیٹے نہ بنو۔ آج عمل کا وقت ہے حساب نہیں ہے۔ اور کل حساب ہوگا عمل کا وقت نہیں ہوگا۔''[4]

خواہشات کی پیروی، انسان کی زندگی کا رخ ہی بدل دیتی ہے اور اس کے ذہن میں بڑا مقصد نفس کی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ اسلامی اہداف ومقاصد بھول جاتا ہے۔ مسلمان کا اعلیٰ مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور جنت میں اس کے فضل کا حصول ہے۔ مقاصد کے تبدیل ہونے سے اعمال زندگی کا پروگرام بھی بدل جاتا ہے، دنیاوی پروگراموں کے ذریعے وہی اہداف حاصل کیے جا سکتے ہیں جو صرف اس دنیا کی زندگی کے لیے سودمند ہیں، جیسا کہ رابطے اور تعلقات کی شکل تبدیل ہو جاتی ہے تو اخوت دنیاوی

[1] تاريخ الخلفاء للسيوطي، ص: 204. [2] تاريخ اليعقوبي: 2/206. [3] منهج علي في الدعوة إلى الله، ص: 307. [4] حلية الأولياء: 1/76، وصفة الصفوة: 1/321.

مفادات پر قائم ہوتی ہے وہ ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتی۔[1]

③ ریا کاری

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خیر و بھلائی کا کوئی کام ریا کاری سے نہ کرو، نہ شرم کی بنیاد پر خیر و بھلائی کو چھوڑو۔[2] مزید فرمایا: ریا کار کی تین نشانیاں ہیں۔ جب وہ اکیلا ہوتا ہے تو اس پر کسل مندی طاری ہو جاتی ہے۔ جب لوگوں کے درمیان ہوتا ہے تو بڑا چاق چوبند نظر آتا ہے۔ جب اس کی تعریف کی جائے تو اپنی کارکردگی میں اضافہ کر دیتا ہے اور جب اس کی مذمت کا کوئی پہلو سامنے آئے تو اس کی کارگزاری گھٹ جاتی ہے۔[3]

شرعی نصوص میں ریا کو شرک اصغر کہا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: سب سے زیادہ خوفناک چیز جس سے میں تمھارے بارے میں ڈرتا ہوں وہ شرک اصغر ہے۔'' لوگوں نے پوچھا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ریا کاری، قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ عطا فرمائے گا، تو ریا کار لوگوں سے فرمائے گا: ان کے پاس جاؤ جن کی خاطر دنیا میں یہ ریا کاری کرتے تھے۔ دیکھو کیا وہاں سے تمھیں کوئی بدلہ یا جزا ملتی ہے؟[4]

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے بتایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ریا کاری کو شرک اصغر شمار کرتے تھے۔[5]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دل سے متعلقہ اس خطرناک بیماری سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے، اس کا تعلق انسان کے ارادے سے ہے۔ پھر انھوں نے لوگوں کو صرف ایک اللہ کی اطاعت اور سنت نبوی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی۔ ان سے منقول

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 276/20. [2] أدب الدنيا و الدين، ص: 110. [3] الكبائر للإمام الذهبي، ص: 145، و فرائد الكلام، ص: 338. [4] مسند أحمد: 429,428/5. [5] المستدرك للحاكم: 329/4، شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح الترغیب: 18/1 میں صحیح قرار دیا ہے۔

ہے کہ وہ قول جو عمل کے مطابق نہ ہو بے فائدہ ہے، وہ عمل جو نیت کے بغیر ہو بے معنی ہے اور وہ نیت جو سنت کی مطابقت کے بغیر ہو بے قدر و قیمت ہے۔ فضیل بن عیاض سے روایت ہے کہ انھوں نے اس ارشاد ربانی کی تلاوت کی:

﴿ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴾

''تا کہ وہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔''[1]

انھوں نے فرمایا: یہاں بہترین عمل سے مراد خالص ترین اور صحیح ترین ہے۔ لوگوں نے پوچھا: اے ابوعلی! خالص ترین اور صحیح ترین کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے فرمایا: جب عمل خالص ہو لیکن صحیح نہ ہو تو قبول نہیں ہوگا، اور جب عمل صحیح ہو لیکن خالص نہ ہو تب بھی قبول نہ ہوگا۔ خالص وہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر ہو اور صحیح کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔[2]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ریا کاری سے بچنے کی بڑی تاکید و تلقین فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ اعمال اس وقت تک قبول نہیں ہوتے جب تک وہ خالص اللہ کے لیے نہ کیے جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہ ہوں۔ انھوں نے سنت کو نہایت مضبوطی سے تھامنے پر بڑا زور دیا ہے، ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

''اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور طریقے پر عمل کرو۔ انھی کا طریقہ زندگی کا بہترین طریقہ ہے، انھی کی سنت اختیار کرو، وہ تمام سنن سے افضل ہے۔''[3]

④ غرور اور خود پسندی

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''خود پسندی عقل کے لیے آفت کا باعث ہے۔''[4]

---

[1] الملك 2:67. [2] مدارج السالكين: 89/2. [3] البداية والنهاية: 319/7. [4] جامع بيان العلم وفضله: 571/1.

غرور اور خود پسندی ان آفات میں سے ہیں جو باعث ہلاکت ہیں اور انسانی اعمال کو برباد کر دیتے ہیں۔ خود پسندی کا مرض ان بیماریوں میں سے ہے جو نیک لوگوں کو اللہ سے تعلق قائم کرتے ہوئے پیش آتی ہے، یہ ایسی مہلک بیماری ہے جو اخلاص کے منافی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور انکساری میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں بے ادبی کے مترادف ہے۔ مزید برآں خود پسندی کا عمل انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ نفس کے احتساب میں رکاوٹ، نفسانی بیماریوں کی تشخیص میں سدِ راہ اور دیگر عیوب کی پہچان میں مزاحم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بہت بڑی آفت ہے۔ اس مصیبت کے خطرات بے شمار اور شدید نقصانات بے شمار ہیں۔ یہ بیماری اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس سے جس قدر روکا اور خبردار کیا جائے کم ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں:

''خود پسندی اور غرور یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو وہ کچھ سمجھو جو درحقیقت تم نہیں ہو۔''[1]

[1] سیر أعلام النبلاء: 407/8.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پولیس کی ذمہ داریاں

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کی ذمہ داری پر متمکن ہوئے تو مملکتِ اسلامیہ میں پولیس کی ذمہ داری بڑی اہم اور معروف ذمہ داریوں میں سے ایک تھی۔ آپ کے عہد خلافت کے دوران پولیس کا کردار بیان کرنے والی کہانیاں اور آثار بہت ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو اصبغ بن نباتہ سے روایت کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک نوجوان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آ کر کچھ لوگوں کے خلاف شکایت کی، اس نے کہا کہ یہ لوگ میرے والد کے ساتھ سفر پر گئے تھے۔ اب یہ لوگ واپس آئے ہیں تو میرے والد ان کے ساتھ نہیں ہیں، میں نے ان لوگوں سے اپنے والد کے بارے میں پوچھا تو کہتے ہیں کہ وہ فوت ہو گیا، میں نے ان سے اپنے والد کے مال کے بارے میں پوچھا تو وہ کہتے ہیں تمھارا باپ تہی دامن تھا، اس نے کچھ نہیں چھوڑا۔ جبکہ وہ ان کے ساتھ بہت سارا مال لے کر گئے تھے۔ ہم یہ مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں لے کر گئے، انھوں نے ان لوگوں کو بری کر دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پولیس والوں کو بلایا اور ان ملزوں میں سے ہر آدمی کے لیے دو دو آدمیوں کی ذمہ داری سونپی اور انھیں تاکید فرمائی کہ ان لوگوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے ملنے نہ پائے۔ پھر اپنے سیکرٹری (کاتب) کو بلایا۔ بعد ازاں ان ملزموں میں سے ایک ملزم کو بلایا۔ اب سیکرٹری نے ملزم سے پوچھا کہ اس نوجوان کے والد کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کس دن تمھارے ساتھ سفر پر روانہ ہوا؟ راستے میں کہاں کہاں پڑاؤ ڈالا؟ سفر کیسا رہا؟ اس کا والد کس بیماری یا کس سبب سے فوت ہوا؟ پھر اس کا مال کہاں گیا؟ پھر

سیکرٹری نے یہ بھی پوچھا: اسے کس نے غسل دیا؟ کس نے نماز جنازہ پڑھائی؟ اور کہاں دفن ہوا؟ سیکرٹری اسی طرح کے سوالات پوچھتا رہا اور ملزم کا بیان لکھتا رہا۔ اس طرح کے دیگر سوالات بھی کیے، کاتب جوابات لکھتا رہا، اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حاضرین نے اللہ کی کبریائی کا نعرہ لگایا۔ یہ منظر دیکھ کر ملزم یہ سمجھتے رہے کہ ان کا بیان صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے۔

بعد ازاں دوسرے ملزم کو بلایا اور پہلے ملزم کو ایک طرف بھیج کر اس مجلس سے غائب کر دیا۔ اس سے بھی اسی طرح کے سوال کیے پھر تیسرے ملزم سے اسی طرح تفتیش کی گئی۔ یوں باری باری جب تمام ملزموں کے بیانات مکمل ہو گئے اور تحریر میں آ گئے۔ تو ان سب کے بیانات ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ اب پہلے ملزم کو بلایا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے دشمن خدا! میں نے تمھارے ساتھیوں سے جو معلومات حاصل کی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ تم جھوٹے ہو۔ اب تمھاری نجات اسی میں ہے کہ تم سچ سچ کہو۔ پھر اسے قید میں ڈال دیا، اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حاضرین نے پھر اللہ کی کبریائی کا نعرہ لگایا، ان میں سے ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ ان کے ساتھی نے (جرم کا) اقرار کر لیا ہے۔ انھوں نے پھر دوسرے ملزم کو بلایا اسے بھی دھمکایا تو اس نے صاف بتا دیا کہ میرے ساتھیوں نے جو کچھ کیا مجھے وہ ناپسند تھا۔ پھر سب کو بلایا، تو انھوں نے صحیح واقعہ بتا دیا۔ آخر میں قید میں موجود آدمی کو بلایا اور اسے کہا کہ تمھارے تمام ساتھیوں نے اقرار جرم کر لیا ہے۔ یوں تمھارے لیے سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، لہٰذا ان سب کے اقرار جرم کے بعد ان کو ادائے مال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور ان سے مقتول کا قصاص لیا گیا۔[1]

یہ قصہ بہت سے معانی اور امور پر دلالت کرتا ہے اس میں تفتیش کرنے والوں کے لیے استفادہ کی کئی صورتیں موجود ہیں مزید برآں اس واقعہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پولیس اور جیل کے نظام کا پتہ چلتا ہے۔[2] امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں

---

[1] الطرق الحكمية، ص: 49. [2] ولاية الشرطة في الإسلام للدكتور نمر الحميداني، ص: 107.

ایک جیل بنائی۔ اس کا نام ''نافع'' رکھا، لیکن وہ جیل مضبوط نہ تھی۔ قیدی اس میں سے نکل بھاگتے تھے، بعدازاں انھوں نے اسے گرا کر وہاں مضبوط بنیادوں پر ایک نئی جیل تعمیر کرائی اور اس کا نام ''مخیس'' رکھا۔[1] قیدیوں کے بارے میں یہ حکم صادر کیا کہ ان کے لیے ضروری خوراک اور سردی وگرمی کے مطابق لباس کا انتظام کیا جائے۔[2]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پولیس اصلاحی اور فلاحی مقاصد کے لیے تشکیل دی تھی۔ انھوں نے محکمۂ پولیس میں مختلف شخصیات کو نگران مقرر کیا، ان میں ابو الہیاج الاسدی، قیس بن سعد بن عبادۃ، معقل بن قیس الریاحی، مالک ابن خبیب الیربوعی، اصبغ بن نباتہ المشاجعی اور سعید بن ساریہ بن مرۃ الخزاعی شامل ہیں، پولیس کے ذمہ امن عامہ کی اجتماعی ذمہ داریوں کے علاوہ محتاجوں کی مدد، لاچاروں کی داد رسی، بھولے بھٹکے مسافروں کی رہنمائی، مساکین کو کھانا کھلانے اور ان سے نرمی کا سلوک کرنے کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا وہ انسانیت نواز تعاون بھی شامل تھا جس سے صرف رب ذوالجلال کی خوشنودی مطلوب ہو۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ کے دوران عوام الناس کی ہمہ جہت نہایت مخلصانہ خدمات انجام دی گئیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے معاشرے کو توحید کی دعوت اور اخلاقِ عالیہ سے متصف کرنے کے علاوہ شرک و بدعت سے بیزاری کی بنیاد پر صحیح دینی کلچر کو فروغ دینے اور حق وصداقت کا پرچم بلند رکھنے کے لیے آخر دم تک اپنی مساعی جمیلہ جاری رکھیں۔ اس سلسلے میں قرآن وسنت کی روشنی ہمیشہ ان کی رہنما رہی۔ مزید برآں انھوں نے اپنے پیش روسیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت کے اہم فیصلوں سے بھی استفادہ کیا۔ وہ اعلیٰ دینی وعلمی بصیرت کے انتہائی متقی حکمران تھے۔ ان کی خدماتِ جلیلہ کے احترام میں تاریخ کی پیشانی ہمیشہ جھکی رہے گی۔

[1] نافع سے مراد مفید اور نفع بخش ہے اور مخیس کا مطلب ہے باعث تذلیل وتہذیب۔ یہ دونوں عنوان بجائے خود جیل کے مقاصد عیاں کرنے کے لیے کافی ہیں۔ [2] ولایۃ الشرطۃ، ص: 108.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مالیاتی پالیسی

محکمۂ خزانہ

اسلامی ریاست کی مالیاتی پالیسی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں کوئی قابل ذکر تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ، مستحق لوگوں کو مال عطا کرنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے برابری کے نقطۂ نگاہ پر قائم رہے۔[1] کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح اور فضیلت نہیں دی۔ جس طرح سادات کے لیے عطا کرنے کا حکم تھا اسی طرح غلاموں کے لیے بھی تھا۔[2] بعض علاقوں میں خراج کی وصولی وہاں کے حاکموں کے ذمہ تھی۔ مصر میں قیس بن سعد بن عبادہ جو والیٔ عمومی تھے، خراج کے مسئول تھے۔ اسی طرح جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشتر نخعی کو مصر روانہ کیا تو انھیں ولایت عمومی کے ساتھ خراج کا مسئول بھی بنایا اور تاکید فرمائی کہ خراج اتنا ہو کہ اہل علاقہ کے لیے مناسب ہو اور لوگوں کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کیونکہ تمام لوگ خراج کے ضرورت مند ہیں۔ آپ نے انھیں اس بارے میں جو خط لکھا اس میں فرمایا: خراج کی وصولی سے زیادہ تمھاری توجہ اہل زمین کی آبادکاری پر ہونی چاہیے اور جس نے آبادکاری کے عمل کو چھوڑ کر خراج کے حصول ہی پر توجہ دی، وہ لوگوں کے لیے ضرر رساں اور بندگانِ خدا کے لیے ہلاکت کا موجب ہوگا۔ اس طرح نظام حکومت بھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ اگر لوگوں پر کوئی بوجھ ہو یا کوئی بیمار ہو، یا

[1] الاستیعاب: 11/3. [2] علي بن أبي طالب للدكتور علي شرفي، ص: 66.

پانی نہ ملنے کی شکایات ہوں، یا زمین زیر آب آ گئی ہو یا شدید قحط سالی کے باعث زمین پانی کو ترس رہی ہو تو لوگوں سے تخفیف کا رویہ اختیار کرو تا آنکہ ان کے مسائل حل ہو جائیں۔ جتنا بھی ممکن ہو آباد کاری کے لیے کوشش کرو۔ زمین کی خرابی اور ویرانی اہل زمین کو محتاج اور بدحال کر دے گی، لہٰذا حکام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نگرانی کے امور پر خوب دھیان رکھیں۔ اگر حالات جوں کے توں رہے تو حکام کے بارے میں بدگمانی کا پہلو سامنے آئے گا اور زمین کی منفعت سے زیادہ استفادہ نہیں ہو سکے گا۔[1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر خراج کے معاملات پر تھی کیونکہ پورے اقتصادی مسئلے کا حل خراج جمع کرنے پر موقوف تھا، اس دور میں خراج، اقتصادیات کا اصل سرچشمہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات معروف ہے کہ انھوں نے تمام علاقوں میں اپنے عمال کی نگرانی سخت کر دی تھی اور مالی امور ان اہم معاملات میں شامل تھے جن کی آپ نہایت باریک بینی سے نگرانی کر رہے تھے۔ وہ ایسے لوگوں کو تفتیشی نگران مقرر کرتے تھے جو گھات میں بیٹھ کر حالات کی خبر لاتے تھے۔[2]

مختلف علاقوں کے والیوں کو اپنی حکومت اور اس کے بیت المال میں سے خرچ کرنے کے عمومی اختیارات تھے۔ خلفائے راشدین کے دور میں جو لوگ بھی بیت المال یا خراج جمع کرنے کے براہ راست ذمہ دار تھے، وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے مفاد اور ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے شرعی طریقے سے غریبوں پر مال خرچ کرتے تھے۔ سب سے زیادہ وہ یہ مال جہاد کے امور اور فتوحات کے لیے، اسلحہ اور جانوروں کی تیاری اور فوجی لشکروں کی دیگر ضروریات کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ اسی طرح اعلیٰ حکام، دیگر تمام سرکاری عمال اور ملازمین کے اخراجات پر رقوم صرف کرتے تھے۔[3] پلوں کی تعمیر، چشموں، نہروں کی کھدائی اور دیگر فلاحی اصلاحات واقدامات کی تکمیل کو سرانجام دیتے اور یہ خراج کی وصولی

[1] الولاية على البلدان: 2/153-163. [2] النظريات المالية في الإسلام، ص: 155، والولاية على البلدان: 2/98. [3] التراتيب الإدارية للكتاني: 1/393.

ہی سے ممکن تھی۔[1] جیسا کہ بعض محققین[2] نے لکھا ہے کہ اگر خراج کے جمع کرنے کی ذمہ داری نہ بھی ہوتی تب بھی عمومی طور پر حکام ہی کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ ان اخراجات کا انتظام کرتے جن کا تعلق جہاد سے یا ضروری فلاحی تعمیرات و معاملات سے ہوتا تھا۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ حکام ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کے وسائلِ مال و دولت کو مسلمانوں کے مفاد پر خرچ کریں اور انھیں منجمد نہ کریں کیونکہ جن حقوق کی ادائیگی کے لیے مال جمع کیا گیا تھا اگر ان پر خرچ نہ کیا جائے تو یہ ظلم کے مترادف ہے۔ انھوں نے ریاست کے عام اموال کو منجمد کرنے کے عمل کو حکام کی کوتاہی اور ظلم قرار دیا ہے۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جس علاقے سے جو خراج وصول ہوتا، اس کا پہلا حقدار وہیں کے لوگوں کو سمجھا جاتا تھا۔ حکام وہ مال اپنے علاقوں سے دارالخلافہ مدینہ یا کوفہ کی طرف روانہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس علاقے کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اگر مال بچ جاتا تھا تو وہ مدینہ منورہ یا کوفہ بھیج دیا جاتا تھا۔[4]

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلفائے راشدین کے دور میں خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مختلف علاقوں میں خراج کی وصولی سمیت تمام مالیاتی امور کی انتہائی باریک بینی سے جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ آمدنی کے ذرائع اور عمومی اخراجات پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ انھوں نے اپنے سابقین کے تجربات سے صحیح طور پر استفادہ کیا، انھوں نے دفاتر قائم کرنے اور ان میں رجسٹر رکھنے کا نظام شروع کیا اور مختلف پہلوؤں سے تمام مالی امور منضبط کیے۔ عہد فاروقی میں یہ مالیاتی ادارہ زیادہ وسیع اور جامع اسلوب پر قائم ہوا۔ اگر کسی کو اس بارے میں زیادہ تفصیلات مطلوب ہوں تو میری کتاب ''فصل الخطاب فی سیرۃ أمیر المؤمنین عمر بن الخطاب'' سے رجوع کرے۔ بعض مستشرقین جن میں فلپ (Philip) بھی

[1] الولاية علي البلدان: 98/2. [2] النظم المالية في الإسلام، ص: 157، والولاية على البُلدان: 99/2.
[3] أصول الفكر السياسي الإسلامي لفتحي عثمان، ص: 43. [4] السياسة المالية لعثمان بن عفّان، لقطب ابراهيم، ص: 99.

شامل ہے، اس نے عربوں کی تاریخ کے حوالے سے اپنے انسائیکلوپیڈیا میں، مالیاتی امور کے بارے میں خلفائے راشدین کے کارنامے دھندلانے اور گھٹانے کی کوشش کی ہے، اس نے لکھا ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ تاریخ، عمر بن خطاب سے بہت سے ایسے کارناموں کو منسوب کرتی ہے جو مرور زمانہ اور نئے تجربات کے ساتھ بہرحال ہونے ہی تھے، خلفاء اور مختلف علاقوں کے حکام نے خراج کی وصولی، جزیہ اور ریاست کے مالی امور سے متعلق جو پالیسیاں بنائیں وہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ اسلام نے بیزنطینی نظام حکومت جو شام اور مصر میں رائج تھا، اسی پر اپنے نظام حکومت کی بنیاد رکھی۔ فارسی علاقوں میں ارباب حکومت نے پہلے سے قائم شدہ مقامی حکومت کے اصول اپنائے۔ فاتحین نے ٹیکسوں کی وصولی کا جو بھی نظام مقرر کیا اس میں سابقہ ادوار کا مزاج، چاہے وہ بیزنطینی ہو یا فارسی بہرحال ملحوظ رکھا گیا، خواہ وہ علاقہ انھوں نے صلح کی بنیاد پر حاصل کیا یا طاقت کے بل بوتے پر فتح کیا۔ اس معاملے میں انھوں نے عمر بن خطاب کی کسی قسم کی قانون سازی سے رہنمائی حاصل نہیں کی۔'' [1]

مصنف نے یہاں ان نصوص پر تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بذریعہ قوت حاصل کیے گئے مفتوحہ علاقوں میں خراج سے متعلق تمام ضابطے اور قاعدے استنباط کیے ہیں، بعض صحابہ نے سابقہ نظام پر بہت سے اعتراضات اور بحث و تمحیص کی، تاآنکہ ایک متفقہ رائے بنی اور پھر سب نے اس کے نفاذ پر اتفاق کیا۔ [2]

محمد ضیاء الدین نے معتبر تاریخی دلائل سے ان مستشرقین کا رد پیش کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے دعویٰ کی کوئی صحیح بنیاد ہی نہیں ہے اور مسلمان فقہاء نے سابقہ تاریخی باتوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تاریخی کارناموں کے درمیان بڑا نمایاں فرق بتایا ہے بلکہ عہد فاروقی میں خراج سے متعلق تمام فیصلوں کی تفصیل نہایت باریک بینی سے بیان کی ہے۔ [3]

[1] تاریخ العرب لفیلیب حِتّی: 228/1. [2] الولایة علی البُلدان: 100/2. [3] الخراج والنظم المالیة للدولة الإسلامیة، ص: 131-136، منقول عن الولایة علی البُلدان: 100/2.

اسلام کی عظیم شخصیات کا مرتبہ گھٹانے کے سلسلے میں مستشرقین اور ان کے دم چھلوں کی یہ پرانی عادت ہے، لیکن اس سے زیادہ المناک بات یہ ہے کہ انھیں مسلمانوں میں سے بھی ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو ان کے ہم نوا اور انھیں عزت بخشنے والے بن جاتے ہیں۔ داخلی جھگڑوں اور جنگوں کے باعث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مالی، عسکری اور دیگر متعدد ادارے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جن کے باعث خلافت راشدہ پر زوال آیا۔ اس کی تفصیل مناسب مقام پر پیش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ!

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں عدلیہ کا کردار
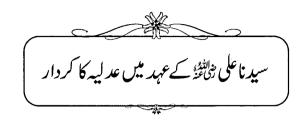
امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلافت پر متمکن ہوئے تو یہ لمحات تھے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت سفاکی سے شہید کر دیے گئے تھے۔ پھر اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا تھا اور وہ افتراق کا شکار ہو گئے تھے۔ ان حادثات و واقعات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر توجہ ان زخموں پر مرہم رکھنے کی طرف تھی۔ لیکن اس صورتحال سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ آپ نے تمام سرکاری ذمہ داریاں نہایت خوبی اور خلوص سے انجام دیں اور عدالتی امور کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی۔ ان کے انتظام و انصرام اور تنظیم و ترتیب کا عمل نہایت جامع پیمانے پر انجام دیا۔ ان کا ایک خط جو انھوں نے اپنے گورنر مصر اشتر نخعی کو لکھا۔[1] اس میں وہ فرماتے ہیں: ''لوگوں کے مابین فیصلہ کرنے کے لیے، رعیت میں سے ایسی افضل و اکمل شخصیت کا انتخاب کرو، جس کے معاملاتِ زندگی تنگی کا شکار نہ ہوں، اس کے مدمقابل کوئی اس سے جھگڑا کرنے والا نہ ہو۔ وہ خود اپنی غلطی پر اصرار کرنے والا نہ ہو، حق کو جان لینے کے بعد اس کی طرف رجوع کرنے میں اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو، اس کے دل میں کوئی لالچ نہ ہو۔ حقیقتِ حال جاننے کے لیے وہ تھوڑی بات سمجھنے کی بجائے پوری بات کامل گہرائی سے سمجھے، مشتبہ امور میں رک جانے والا ہو۔ دلائل سے حقائق اخذ کرنے والا ہو، مخالفین کی بار بار کی موشگافیوں سے زِچ نہ ہو، معاملات کی وضاحت میں انتہائی صبر کرنے والا ہو، فیصلہ واضح ہو جانے کے بعد

[1] وقائع ندوة النظم الإسلامية: 379/1.

قطعی رائے رکھنے والا ہو، مبالغہ آرائی کرنے والے کے ہاتھوں مجبور نہ ہو اور فساد پیدا کرنے والے کی بات پر برانگیختہ نہ ہو۔ تمھیں اس قسم کے لوگ کم ہی ملیں گے۔ بہر حال ایسا ہی جج ڈھونڈو پھر اس پر خرچ کرنے میں فراخ دلی سے کام لو، تا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگوں کا محتاج نہ ہو، اسے اپنے ہاں وہ مقام دو جس کی تمھارے خواص میں سے کوئی اور شخص طمع نہ کرے تا کہ وہ مطمئن ہو کہ اس پر کوئی چڑھائی نہ کر سکے گا۔''[1]

اسی خط میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی لکھا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ انصاف کرو یعنی اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے۔ خالصتاً صرف اسی کی بندگی کرو اور اپنی ذات سے لوگوں کے ساتھ بھی انصاف کرو، اپنے اہل خانہ میں سے خواص کے ساتھ بھی، اور اپنی رعیت میں سے جو تمھیں محبوب ہو اس سے بھی انصاف ہی کا معاملہ کرو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے ظلم کا وتیرہ اختیار کر لیا ہے۔ خوب یاد رکھو! جو شخص اللہ کے بندوں پر ظلم کرے اور ان کا حق مارے تو ان مظلوم بندوں کی بجائے خود اللہ تعالیٰ اس کے مدمقابل ہو گا، اور جس کے مدمقابل اللہ تعالیٰ کی ذات عالی ہو اس کی سب دلیلیں ختم ہو جاتی ہیں، اور اس کی اللہ کے ساتھ اس وقت تک جنگ رہتی ہے جب تک وہ اپنے ظلم سے باز نہ آ جائے اور توبہ نہ کر لے۔ ظلم پر قائم رہنا اللہ کی نعمت چھن جانے کا ذریعہ ہے۔ ظالم کو عبرتناک سزا دینے کے لیے اللہ کا انتقام بڑی تیزی سے ظالم کی طرف لپکتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ مجبوروں اور لاچاروں کی دعائیں سننے والا ہے اور وہ ظالموں کی گھات میں ہے۔''[2]

یہ جامع وصیت قاضی کی تمام صفات پر مشتمل ہے اور اس کے حقوق و واجبات بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی ہے۔ جو شخص بھی گورنر مصر کے نام امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس خط پر غور کرے گا تو اسے تعجب ہو گا کہ وہ وصیت جو سن 40 ہجری یا اس

[1] شرح نهج البلاغة، منقول عن نظام الحكم للقاسمي: 103/2. [2] شرح نهج البلاغة، منقول عن نظام الحكم للقاسمي: 559/2.

کے قریب قریب اس وقت تحریر کی گئی جب کہ ابھی تک عربوں کا دیگر تہذیبوں سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔غور کیجیے کہ اس وقت ایک سچے مسلمان کی عقل و دانش کس طرح اللہ کے نور سے منور ہو رہی تھی اور اس کے دل و دماغ پر زندگی کے مقاصد منہج کس وضاحت سے منکشف ہو رہے تھے۔ انھوں نے ریاست کے معاملات کو کس طرح صحیح منہج پر قائم کیا، جو آج کے دور کے دستوروں اور قوانین کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے۔ [1]

رعیت کے ساتھ انصاف اور اسے ظلم سے بچانے کے لیے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ نظریات بعد میں مظالم پر کنٹرول اور اس بارے میں قوانین کی ترتیب و تنظیم کے لیے بنیاد کی حیثیت اختیار کر گئے۔ [2]

خلفائے راشدین کے دور میں عدل وانصاف کے لیے قانون سازی

قانون سازی کے اس منصوبے سے مراد وہ راستہ ہے جس پر خلفائے راشدین اور صحابہ کرام، عملی زندگی میں پیش آمدہ واقعات مسائل کے لیے شریعت کے احکام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، یہ راستہ انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت کے نتیجے میں ملا۔ہم نے اپنی دیگر کتب میں خلفائے راشدین ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے احوال و آثار کے مطالعے کے دوران اور خلیفۂ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے حالیہ مطالعے کے دوران یہ دیکھا کہ جب بھی کوئی نیا واقعہ ظہور میں آیا یا مسئلہ درپیش ہوا، انھوں نے اسے حل کرنے کے لیے تین مرحلے اختیار کیے۔سب سے پہلے انھوں نے کتاب اللہ سے رجوع کیا۔اگر پیش آمدہ مسئلے کے بارے میں واضح طور پر کتاب اللہ سے رہنمائی مل گئی تو فبہا ورنہ وہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ڈھونڈتے تھے۔اگر اس میں بھی مسئلے کا حل نہ ملتا تو وسیع تر مفہوم میں رائے کی طرف منتقل ہو جاتے تھے۔ہم نے دیکھا کہ اکثر اوقات

[1] شرح نهج البلاغة، منقول عن نظام الحكم للقاسمي: 104/2. [2] نظام الحكم للقاسمي: 560/2.

پہلے مرحلے میں یہ رائے اجتماعی ہوتی، خاص طور پر جب وہ مسئلہ ریاست کے امور میں عمومی انداز کا ہوتا۔ انھیں اس بارے میں خصوصی مدد اس لیے ملی کہ کبار صحابہ ابھی تک مدینہ منورہ ہی میں قیام پذیر تھے، ان کی بیک وقت دستیابی آسان تھی۔ اور ان سے رائے لینا ممکن تھا، بعدازاں یہی بات اصطلاحی طور پر ''اجماع'' کہلائی اور قانون سازی کی بنیاد میں قیاس اور مصلحت کی اصطلاحات کا استعمال بھی کیا گیا۔

زیر نظر تحریر کے حوالے سے بہترین دلیل وہ بات ہے جو میمون بن مہران نے کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی مقدمہ آتا تو فوراً کتاب اللہ میں نظر دوڑاتے تھے۔ اگر اس میں اس مسئلے کا حل مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے تھے۔ اگر اس مسئلے کا حل اس میں نہ ہوتا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ان کے علم میں کوئی بات ہوتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے، اگر سنت میں بھی حل نہ ملتا تو صحابہ کرام کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کر کے ان کی رائے طلب کرتے تھے، جب ان کی اجتماعی رائے سامنے آ جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ایسا ہی کرتے تھے، اگر انھیں قرآن وسنت میں درپیش تقاضے کا جواب نہ ملتا تو پھر وہ یہ دیکھتے تھے کہ کیا اس بارے میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کوئی فیصلہ موجود ہے؟ اگر موجود ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ صادر فرما دیتے تھے، بصورتِ دیگر اجل صحابہ رضی اللہ عنہم کو بلاتے تھے۔ وہ جس بات پر اجماعی رائے دیتے اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے تھے۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں: آج کے بعد جسے کسی مسئلے کے بارے میں فیصلہ مطلوب ہو، وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ دے، اگر کتاب اللہ میں گوہر مقصود نہ ملے تو رہنمائی کے دوسرے سرچشمے سے رجوع کرے اور اس بارے میں

[1] سنن الدارمي: 58/1، اس حدیث کی سند میں جعفر بن برقان کے سوا تمام راوی ثقہ ہیں اور جعفر صدوق ہیں، السنن الكبرى للبيهقي: 114/10، اس حدیث کی سند کو ابن حجر نے فتح الباري: 13/3 میں صحیح قرار دیا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تلاش کرے۔ کوئی مسنون فیصلہ نہ ملے تو صالحین کی اجتماعی رائے کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اگر درپیش معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں میں سے کوئی روشنی نہ ملے۔ اور صالحین کا بھی کوئی اجماعی فیصلہ دستیاب نہ ہو، تو پوری دیانت سے اپنی اجتہادی رائے سے فیصلہ صادر کر دے۔ یہ نہ کہے کہ میں ڈرتے ڈرتے یہ رائے دے رہا ہوں، بے شک حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان کے مابین کچھ مشتبہ امور ہیں، شک میں ڈالنے والی بات کو چھوڑ دو اور وہ چیز اختیار کر لو جس میں شک کی گنجائش نہ ہو۔[1] ہم نے گزشتہ اوراق میں اسلامی ریاست میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اولین ترجیح کے حوالے سے یہی بتایا تھا کہ وہ بھی اسی منہج پر قائم تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے جج

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض ان قاضیوں کو ان کے منصب پر بحال رکھا جن کی اہلیت ثابت ہوگئی اور جو پہلے ہی سے قضاء کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ آپ نے ان کے علاوہ بھی قاضی اور والی مقرر کیے۔[2] ان میں سے کچھ کی تفصیل یوں ہے:

① شریح بن الحارث کوفہ کے قاضی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں وہیں برقرار رکھا۔ آپ انھیں ہر ماہ پانچ سو (500) درہم تنخواہ دیتے تھے۔[3]

② ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں قاضی مقرر کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں بھی برقرار رکھا۔ تاہم کچھ مدت بعد انھیں معزول کر دیا۔[4]

③ عبیداللہ بن مسعود، یمن کے والی اور قاضی تھے۔

④ عثمان بن حنیف، بصرہ میں قاضی تھے۔

⑤ قیس بن سعد، مصر میں تعینات تھے۔ وہ مصر کی فتح میں بھی شامل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] إعلام الموقعين: 62/1. [2] القضاء في صدر الإسلام لجبر محمود، ص: 239. [3] أخبار القضاة: 227/2. [4] تاريخ القضاء في الإسلام، ص: 149.

نے انھیں والی مصر مقرر کیا، انھوں نے وہاں اپنا گھر بنایا۔ آپ نے انھیں معزول کر دیا اور ان کی جگہ محمد بن ابی بکر کو والی بنا دیا۔[1]

⑥ عمارہ بن شہاب کوفہ میں تعینات تھے۔

⑦ تمام بن عباس مدینہ منورہ میں سن 37 ہجری میں اور قثم بن عباس مکہ میں اور پھر طائف میں قاضی رہے۔[2]

⑧ جعدہ بن ہبیرہ المخزومی، بعدازاں خلید بن قرہ الیربوعی خراسان میں قاضی تھے۔[3]

⑨ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، بصرہ کے والی مقرر ہوئے۔ ابو الأسود الدؤلی وہاں قاضی تھے۔ ایک قول کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس نے بصرہ میں عبدالرحمٰن بن یزید الحدّانی کو قاضی مقرر کیا جو مہلب بن ابی صفرہ کے اخیافی یعنی ماں کی طرف سے بھائی تھے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور تک اور بعد ازاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں کچھ عرصہ تک وہاں کے قاضی رہے، تا آنکہ زیاد کا دور آیا تو اس نے انھیں معزول کر دیا۔[4]

ابوعبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے اور ان کے مابین فیصلے کرتے تھے۔[5] ابن عباس جب بصرہ سے کہیں باہر جاتے تو ابوالأسود کو اپنا نائب بنا جاتے تھے۔ بعدازاں وہ فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اس وقت قاضی کو مفتی کہا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ حتیٰ کہ سن 40 ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ جب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ سے بصرہ گئے تھے تو انھوں نے وہاں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو والی مقرر فرمایا تھا۔[6]

⑩ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کوفہ تشریف لائے تو سعید بن نمران الہمدانی کو قاضی مقرر فرمایا۔ بعدازاں انھیں معزول کر دیا۔ ان کی جگہ مصعب بن زبیر کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ انھوں

[1] تاريخ الطبري: 589/5. [2] تاريخ الطبري: 71/6. [3] تاريخ القضاء في الإسلام، ص: 151. [4] أخبار القضاة: 289,88/1. [5] أخبار القُضاة: 288/1. [6] تاريخ القضاء في الإسلام، ص: 151.

نے تین سال تک یہ فریضہ انجام دیا۔ پھر ابن الزبیر نے عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کو قاضی مقرر کر دیا۔[1]

⑪ سعید الہمدانی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبیدہ السلمانی محمد بن حمزہ کو کوفہ میں قاضی مقرر کیا اور انھیں تاکید فرمائی: اسی طرح فیصلے کرو جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ بعد ازاں انھیں معزول کر دیا اور شریح کو مقرر فرمایا۔ امام شعبی کہتے ہیں، قضاء کے میدان میں شریح سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔ اور عبیدہ، شریح کے مدمقابل تھے۔ ان کے فیصلوں کو نادر فیصلوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہ کوفہ کے مشہور علماء میں سے تھے۔ شریح اکثر ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔[2]

⑫ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن زید بن خلیدہ الشیبانی کو کوفہ میں قاضی مقرر فرمایا، وہاں انھوں نے متعدد فیصلے کیے۔[3]

بعض شہروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ قاضی، ان علاقوں کے والی بھی متعین کر دیے جاتے تھے کیونکہ ان کی حکمرانی قضاء، امامت، حدود قائم کرنے، سرکاری نظام چلانے اور زکاۃ و صدقات جمع کرنے پر مشتمل تھی۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صوبوں کے گورنروں کو تاکید فرماتے تھے کہ وہ قاضیوں کے تقرر میں انتہائی احتیاط سے کام لیں۔ اس بات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تمام والیوں کو ان کے زیرنگیں علاقوں میں قاضی مقرر کرنے کا اختیار دے رکھا تھا۔ عام طور پر صورتِ حال یہ تھی کہ یہ والی قضاء کی ذمہ داریاں بھی ساتھ ساتھ ادا کرتے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ والیانِ ریاست کو عدالتی فیصلوں کے خلاف مقدمات میں اپیل سننے اور مظالم پر نگاہ رکھنے کا حق تھا۔ خاص طور پر وہ ان قاضیوں کے فیصلوں پر کڑی نظر رکھتے تھے جو خود ان کے مقرر کردہ تھے۔ وہ خلیفہ کے مقرر کردہ قاضیوں کے فیصلوں کا جائزہ بھی لیتے تھے۔[5] بعض فیصلوں کے بارے میں والی، خلیفہ سے بھی

---

[1] تاريخ القضاء في الإسلام، ص: 151. [2] أخبار القضاة: 397,396/2. [3] الطبقات لابن سعد: 10/6، وأخبار القُضاة: 2/399-401. [4] أخبار القُضاة: 395/1. [5] قضاء أمير المؤمنين لعبدالله بن عثمان، ص: 290.

رجوع کر لیتے تھے اور یہ بات تو معروف ہے کہ خلفاء، شکایت کنندگان کے لیے اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتے تھے، چاہے یہ شکایات والیوں یا قاضیوں کے خلاف تھیں یا عاملینِ خراج کے بارے میں۔ خلفائے کرام ان شکایات کی بھرپور چھان بین کرتے تھے۔[1]

عدالتی معاملات میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا طریقِ کار

① سابقہ اسلوبِ قضا برقرار رکھنے کا حکم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عدالتی معاملات، قضاء کے اسلوب اور مقدمات کے ضابطوں کے سلسلے میں بعض ایسی تبدیلیاں کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جو معاشرے کے جدید حالات اور تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ لیکن انھوں نے اس معاملے کو اس وقت تک مؤخر کیے رکھا جب تک کہ نظام حکومت میں استحکام پیدا ہو جائے، ان سے منقول ہے کہ انھوں نے قاضیوں سے فرمایا: ''جس طرح تم پہلے فیصلے کرتے تھے اسی طرح کرتے رہو، یہ عمل اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ تمھاری اجتماعیت مستحکم ہو جائے کیونکہ سردست مجھے اختلافات کا خطرہ ہے۔''[2]

② سابقہ عدالتی فیصلے برقرار رکھنے کی تاکید

معاملات حکومت کے استقرار اور ہمواری کے لیے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ رائے تھی کہ کسی قاضی کو دوسرے قاضی کا فیصلہ ختم کرنے کا حق نہیں ہے، خود انھوں نے اہل نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین طے پانے والا جو معاہدہ تحریر کیا تھا اس بارے میں بعدازاں اہل نجران کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس

[1] الأحكام السلطانية للماوردي، ص: 77. [2] الولاية على البلدان: 2/93، و مُصَنّف عبدالرزّاق: 11/329.

میں تبدیلی کی درخواست کی، انھوں نے ان کو اس میں سے کچھ متبادل عطا کر دیا، بعد ازاں انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متبادل فیصلے میں بھی تبدیلی کی درخواست کی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ درخواست مسترد کر دی۔ پھر یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کے پاس آئے اور کہا: امیر المؤمنین! آپ سے زبانی سفارش بھی مطلوب ہے اور تحریری بھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تمھیں سمجھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحیح فیصلہ دیا تھا،[1] میں وہ فیصلہ واپس لینے کے لیے تیار نہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیا ہو۔[2]

③ قضاء کے لیے مطلوبہ اہلیت

قضاء، ریاست کے امور سے وابستہ ہے، اس میں بھی وہی شرائط ہیں جو مسلمانوں کے حکمران پر عائد ہوتی ہیں اور وہ ہیں عقل، بلوغت اور اسلام۔ قاضی کو لوگوں کے مال سے بے پروا ہونا چاہیے، وہ بردبار ہو، کسی بات پر مشتعل نہ ہو، کسی طرف سے آنے والا تیر اسے غضبناک نہ کرے، احکام شریعت کا عالم ہو، ناسخ و منسوخ کا علم رکھنے والا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک قاضی سے پوچھا: کیا تم ناسخ و منسوخ کا علم رکھتے ہو؟ اس نے کہا نہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس تو خود بھی ہلاک ہوا اور دوسروں کے لیے بھی باعثِ ہلاکت بن گیا۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مذکورہ قاضی سے ناسخ و منسوخ کے بارے میں پوچھا تھا کیونکہ اس دور میں اس کی پہچان آسان نہ تھی۔ قاضی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اسے سابقہ عدالتی فیصلوں سے آگاہی ہو، تاکہ وہ ان کے اسلوب اور طریق سے باہر نہ نکل سکے۔ وہ احکام جن میں اختلاف ہے وہ ان میں اپنی قطعی رائے رکھنے والا ہو، اسے متواضع یعنی منکسر المزاج ہونا چاہیے، اسے زیادہ علم اور عقل والوں سے مشورہ کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ مشورہ اسے فیصلوں میں غلطی سے محفوظ رکھنے میں مدد دے

---

[1] سنن البیهقي: 120/10، حدیث: 20874. [2] المغني: 57/9. [3] سنن البیهقي: 117/10، حدیث: 20857.

گا۔ اسے حق کے معاملہ میں جرأت مند ہونا چاہیے۔ اسے حق کے مطابق فیصلہ دینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے، چاہے اس کا فیصلہ طاقت والوں کے لیے ناراضی کا باعث ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول میں یہ سارے امور یکجا بیان کر دیے گئے ہیں: ''قاضی اس وقت تک قاضی نہیں کہلا سکتا جب تک اس کے اندر یہ پانچ خوبیاں موجود نہ ہوں: پاکدامن ہو، بردبار ہو، سابقہ فیصلوں کا عالم ہو، عقل والوں سے مشورہ کرنے والا ہو، اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اسے کوئی خوف نہ ہو۔'' [1]

4 مقامِ عدالت کا انتخاب

قاضی کو چاہیے کہ مقدمات کی سماعت کے لیے شہر کے وسط میں جگہ کا انتخاب کرے تاکہ مقدمہ لے کر آنے والوں میں سے کسی کے لیے وہاں پہنچنا مشکل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ شہر کی بڑی مسجد میں عدالت لگائیں تاکہ وہاں پہنچنا آسان ہو۔ [2]

5 مفت انصاف کا حصول

لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام اسلامی ریاست کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ فقہ اسلامی کا فیصلہ یہ ہے کہ صاحبِ حق کو حصولِ حق کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، اس لیے مقدمہ کے فریقوں کو انصاف مفت حاصل ہوگا۔ کوئی فریق نہ قاضی کو کوئی رقم ادا کرے گا نہ ریاست کو بلکہ اسلامی ریاست ہی قاضی اور عدالت کے تمام اخراجات کی کفیل ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو جب کوفہ میں قضاء کی ذمہ داری سونپی تو انھیں ماہانہ پانچ سو درہم تنخواہ بھی مرحمت فرمائی۔ [3]

[1] المغني: 43/9. [2] مسند زید: 137/4، و موسوعة فقه علي بن أبي طالب، ص: 506. [3] مسند زید: 137/4، وموسوعة فقه علي بن أبي طالب، ص: 506.

6 وکالت کا آغاز

خلافت راشدہ کے دور میں نظامِ وکالت کے بیج ظاہر ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی بھی جھگڑے کے حوالے سے اپنے بھائی عَقیل کو وکیل بناتے تھے۔ جب عقیل رضی اللہ عنہ سن رسیدہ ہو گئے تو انھوں نے اپنی جانب سے عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کو وکیل مقرر کیا۔ آپ فرماتے تھے کہ میرے وکیل کے حق میں جو فیصلہ ہوگا وہ میرے حق میں ہوگا۔ اور جو فیصلہ میرے وکیل کے خلاف صادر ہوگا، وہ میرے خلاف ہوگا۔[1]

قاضی کے فرائض اور ذمہ داریاں
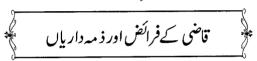
سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں قاضی کو اپنے فیصلوں کو یقینی بنانے کے لیے درج ذیل امور کا اہتمام کرنے کی تاکید کی جاتی تھی:

1 پیش آمدہ معاملے کا گہرا مطالعہ

قاضی کو پیشِ نظر مقدمے میں قطعی فیصلہ صادر کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر قاضی شریح سے فرمایا: جب تک آپ بات ہی نہیں کرتے آپ کی زبان آپ کی غلام ہے، جونہی آپ بول اٹھے، آپ زبان کے غلام ہو گئے، لہٰذا یہ دیکھو کہ کیا فیصلہ کر رہے ہو، کس بارے میں کر رہے ہو اور کس طرح کر رہے ہو۔[2]

2 دونوں فریقوں سے برابری کا سلوک

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مہمان آیا۔ ان کے پاس کچھ روز رہا۔ اس مہمان کے پاس مدمقابل فریق کا آدمی ملنے آیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: کیا تم اس کے

[1] أصول المحاكمات الشرعية، ص: 70، وتاريخ الفقهاء في الإسلام، ص: 132. [2] كنز العمال، حديث: 14433.

مدمقابل فریق ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! آپ نے مہمان سے فرمایا: یہاں سے چلے جاؤ، ہم کسی مقدمہ دائر کرنے والے مہمان کو ٹھہراتے ہیں تو اس کے مدمقابل فریق کو بھی ساتھ ہی ٹھہراتے ہیں۔ [1]

③ مدمقابل فریقوں سے اونچی آواز میں کلام کرنے سے اجتناب کا اہتمام

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ابوالأسود الدؤلی کو قضاء کی ذمہ داری سونپی، پھر انھیں معزول کر دیا۔ انھوں نے پوچھا: آپ نے مجھے کیوں معزول کیا؟ میں نے کوئی خیانت کی نہ کوئی جرم کیا، انھوں نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ تم دونوں فریقوں سے اونچی آواز میں بات کر رہے تھے۔ [2]

④ تعلقات یا قرابت داری کے اثرات

جعدہ بن ہبیرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: امیر المؤمنین! آپ کے سامنے دو آدمی آتے ہیں، آپ ان میں سے کسی ایک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ شخصیت ہو سکتے ہیں اور دوسرے کے دل میں آپ کے خلاف جذبات ہیں تو کیا آپ دوسرے شخص کے خلاف اوّل الذکر کے حق میں فیصلہ دیں گے؟ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جعدہ بن ہبیرہ کو برا بھلا کہا اور روانہ کر دیا اور بتایا کہ میں اپنی پسند یا ناپسند نہیں بلکہ شواہد اور دلائل کی بنا پر فیصلہ کروں گا۔ جہاں تک ذاتی پسند یا ناپسند کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ یہ بات میرے اختیار میں نہیں، یہ تو سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ [3]

---

[1] كنز العُمّال، حديث: 14429، و مصنف عبدالرزّاق: 300/8. [2] المغني: 104/9. [3] فقه علي بن أبي طالب لقلعجي، ص: 508.

5 شوریٰ

قاضی کی ذمہ داری ہے کہ اہل علم اور اصحاب رائے سے مشورہ کرے تاکہ کوئی اپنے حق سے محروم نہ ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، شوریٰ کے ان ارکان میں شامل تھے جن سے خلفائے راشدین میں سے کسی کو پیش آمدہ مسئلے کے بارے میں مشورہ کی ضرورت ہوتی تو ان سے ضرور مشورہ کرتے تھے۔ خصاف نے اُدب القاضی میں یہ روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے مقدمہ کے دونوں فریق پیش ہوتے تو وہ انھیں کہتے، علی رضی اللہ عنہ کو بلاؤ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کو بھی بلاؤ، کچھ اور اصحاب کو بھی بلاتے، جب وہ آ جاتے تو دونوں فریقوں سے فرماتے: اب تم اپنی اپنی بات پیش کرو، جب وہ اپنا معاملہ اور موقف پیش کرتے تو کامل توجہ سے سنتے اور اصحاب رسول سے کہتے: آپ کی کیا رائے ہے؟ جب ان کی رائے اصحاب کی رائے کے مطابق ہوتی تو اس کے مطابق فیصلہ دے دیتے تھے۔ انھیں اس پر مزید غور کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ [1]

[1] شرح أدب القاضي للخصّاف: 305/1، وموسوعة علي بن أبي طالب، ص: 508.

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی فقہی بصیرت
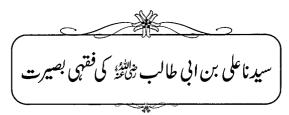
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے احکام عبادت بیان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، وہ فہم دین اور اپنی علمی وسعتوں کے اعتبار سے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، انھوں نے لوگوں کو جو احکام بتلائے وہ ایک بہت بڑی کتاب[1] کے متقاضی ہیں۔ ہم یہاں ان کے چند احکام پیش کرتے ہیں:

بے نماز، کافر ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: امیر المؤمنین! اس عورت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو نماز نہیں پڑھتی؟ انھوں نے فرمایا جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔[2] عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اعمال میں سے نماز کے سوا کسی اور عمل کے بارے میں یہ رائے نہیں رکھتے تھے کہ اسے ترک کرنا کفر ہے۔ اس لیے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کے ذریعے سے وہ اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، اسی طرح شہادتین ہیں جن کے ترک کرنے سے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔[3] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

''بے شک آدمی اور کفر وشرک کے درمیان فرق نماز ترک کرنا ہے۔''[4]

[1] بطور مثال دیکھیے! موسوعة فقه علي بن أبي طالب لمحمد قلعجي اور فقه الإمام علي لأحمد طٰه.
[2] مصنف ابن أبي شيبة: 47/11، وحديث: 31075، وكنز العمال: 13/8. [3] المغني: 44/2. [4] صحيح مسلم، حديث: 82.

ضعیفوں کے لیے مسجد میں نمازِ عید

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی اور کوفہ تشریف لے گئے، وہاں لوگ بڑی تعداد میں آباد تھے، انھوں نے کہا: اے امیر المؤمنین! شہر میں کچھ بوڑھے اور کمزور لوگ ہیں۔ ان کے لیے کھلے میدان تک پہنچ کر نمازِ عید ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک صاحب کو مقرر کر دیا کہ وہ مسجد میں لوگوں کو عید کی نماز پڑھائیں اور خود امیر المومنین صحرا میں تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں کو عید کی نماز پڑھائی۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے تھے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''تم پر میری اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے۔''[1] لہٰذا جس نے خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام لیا اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی۔[2]

شوہر بیوی کو غسل دے سکتا ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک آدمی کا اپنی بیوی کو غسل دینا جائز ہے۔ انھوں نے اپنی زوجہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خود ہی غسل دیا تھا۔[3]

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ انھیں غسل میت صرف میں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دیں۔ لہٰذا میں نے اور حضرت علی نے مل کر انھیں غسل دیا۔[4] اس مسئلے میں صحابہ کرام کا اجماع نقل کیا گیا ہے کیونکہ یہ واقعہ صحابہ کرام میں کافی مشہور تھا مگر کسی نے اس کا رد نہیں کیا۔[5] جمہور علمائے کرام کا بھی یہی موقف ہے اور ان کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے۔ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:

[1] جامع الترمذي، حديث: 2676، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ [2] الفتاوی: 113/24. [3] السيل الجرّار: 344/1، والمبسوط: 71/2. [4] مصنف عبدالرزاق: 410/3، والمحلى: 175/5. [5] المغني: 252/2، ونيل الأوطار: 58/4.

''اگر تم مجھ سے پہلے فوت ہو جاؤ تو کیا حرج ہے، میں تمھیں غسل دوں گا، کفن دوں گا اور تمھارا جنازہ پڑھ کر تمھیں خود دفن کروں گا۔''[1]

سبزیوں، پھلوں اور شہد پر کوئی زکاۃ نہیں

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سبزیوں پر کوئی زکاۃ نہیں ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق سبزیوں اور ساگ پات پر کوئی زکاۃ نہیں۔ جمہور علماء کا یہی قول ہے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک پھلوں میں بھی زکاۃ نہیں ہے۔ ابو اسحاق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: سیب اور اس جیسی دوسری چیزوں پر زکاۃ نہیں ہے۔ عاصم بن ضمرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ سبزیوں، ککڑی اور سیب وغیرہ پر زکاۃ نہیں ہے، وہ تمام لوگ جو چار اصناف ہی پر زکاۃ واجب سمجھتے ہیں ان سب کی بھی یہی رائے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان چیزوں کو زیادہ دیر تک ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔ مزید براں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک شہد پر زکاۃ واجب نہیں ہے۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا کہ شہد پر کوئی زکاۃ نہیں ہے۔[3]

ساری زکاۃ ایک ہی صنف کو دی جا سکتی ہے

قرآن کریم میں بیان کی گئی آٹھ اصناف میں سے کسی ایک صنف کو یا ساری کی ساری زکاۃ کسی ایک ہی آدمی کو دے دینا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں جائز ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آدمی ایک ہی صنف کو زکاۃ ادا کر دے۔ ان سے مروی ہے کہ ان کے پاس زکاۃ کا مال آیا تو انھوں نے وہ مالِ زکاۃ ایک ہی گھر کے لوگوں کو بھیج دیا۔[4]

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 1465، و صحيح البخاري، حديث: 5666. [2] مصنف عبدالرزاق، حديث: 7188، وسنن البيهقي منقول از فقه الإمام علي: 347/1. [3] جمع الجوامع: 95/2، 157، وفقه الإمام علي: 348,345/1، ومصنف عبدالرزاق، حديث: 7188. [4] فقه الإمام علي: 352/1 منقول از سنن بيهقي، والبدائع: 104/2.

والدین یا اولاد کو زکاۃ نہیں دی جا سکتی

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: فرض زکاۃ میں والد یا اولاد کا کوئی حق نہیں ہے، جس کی کوئی اولاد ہے یا والدین ہیں اگر وہ ان کے ساتھ صلہ رحمی نہیں کرتا تو وہ نافرمان ہے۔ اس پر علماء کا اجماع بھی منقول ہے۔ اس رائے کے مخالفین نے ممانعت کو نفلی صدقات و خیرات پر محمول کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ والدین اور اولاد کو زکاۃ دینے کا فائدہ خود زکاۃ دینے والے کو ہوتا ہے کیونکہ اس طرح وہ ان کے اخراجات سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے انھیں زکاۃ نہیں دے سکتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زکاۃ دینے والا ادائے زکاۃ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کرتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ زکاۃ اور نفقہ دونوں مستقل طور پر واجب ہیں ان میں سے کوئی ایک، دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتا جیسے روزہ، نماز، اور زکاۃ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس لیے یہ ایک عبادت ہے۔ جبکہ نفقہ بندوں کا حق ہے اور قرابت داری کے حوالے سے ایک ضروری سماجی سلوک ہے۔[1]

بہت بوڑھے شخص کے لیے روزہ نہ رکھنے کی اجازت

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی، فرمانِ الٰہی:

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾

''اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو اس کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔''[2]

کے بارے میں وہی رائے ہے جسے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ آیت بوڑھوں کے لیے ہے یعنی اتنے بوڑھے جو بڑی مشقت سے روزہ رکھتے ہیں یا رکھ ہی نہیں

[1] سنن البيهقي منقول از فقه الإمام علي بن أبي طالب: 355/1. [2] البقرة 2:184.

سکتے وہ فدیہ دیں، جو ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ بہت بوڑھا شخص جو روزہ نہیں رکھ سکتا، وہ روزہ نہ رکھے لیکن بطور فدیہ روزانہ ایک مسکین کو کھانا ضرور کھلائے۔ [1]

عرب عیسائیوں کا ذبیحہ کھانے کی ممانعت

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں عام عیسائیوں سے مستثنیٰ کرتے ہوئے عرب عیسائیوں کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں ہے۔ یہ بات امام طبری اور دیگر علمائے کرام نے ان سے نقل کی ہے۔ عبیدۃ السلمانی سے روایت ہے کہ عرب عیسائیوں کا ذبیحہ نہ کھایا جائے کیونکہ انھوں نے عیسائیت کے تمام عقائد اختیار نہیں کیے۔ یہ لوگ صرف شراب پیتے ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بنی تغلب کے عیسائیوں کا ذبیحہ نہ کھاؤ کیونکہ ان لوگوں نے شراب نوشی کے سوا عیسائیت کے عقائد مضبوطی سے نہیں تھامے۔'' [2]

اس سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ عرب عیسائی، حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دینے میں عیسائی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہیں، لہٰذا وہ ان میں سے شمار نہیں ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جب ان کے ذبح کردہ حلال جانور کو حلال قرار دیا تھا اس وقت وہ اصل عیسائی تعلیمات سے بلحاظِ عقیدہ و احکام منحرف تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ذبح شدہ کو حلال قرار دینے کی ممانعت نہیں کی، جمہور صحابہ اور فقہاء کا یہی مسلک ہے۔ [3]

ذبیحۂ فخر و مباہات حرام ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں فخر و مباہات کی بنیاد پر ذبح کیے گئے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ جارود بن ابی سبرہ کہتے ہیں: بنی ریاح میں سے ایک آدمی تھا اس کا نام ابن وثیل تھا۔ وہ کالے رنگ کا تھا۔ شاعری میں مقابلہ کرتا رہتا تھا، مشہور شاعر فرزدق نے کوفہ

---

[1] تفسیر الطبري: 81/2. [2] مصنف عبدالرزاق، حدیث: 10034، 10035 وتفسیر الطبري: 65/6، وکنز العمال: 15651. [3] تفسیر الطبري: 65/5، وبدایة المجتهد: 465/1.

کے قریب ایک چشمے پر اس سے شرط لگائی کہ اگر میرے اونٹ چشمے پر وارد ہوئے تو میں ایک سو اونٹوں کی کونچیں کاٹ دوں گا اور دوسرے کے اونٹ پانی پر وارد ہوئے تو وہ اپنے ایک سو اونٹوں کی کونچیں کاٹ ڈالے گا (یعنی ذبح کر دے گا) ہوا یوں کہ دونوں کے اونٹ چشمے پر پہنچ گئے اور وہ دونوں اپنے اپنے اونٹوں کی کونچیں کاٹنے لگے، لوگ گدھوں پر بیٹھ کر باہر نکلے[1] تاکہ گوشت حاصل کر سکیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں موجود تھے۔ آپ کو یہ خبر ملی تو فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر پر باہر نکل آئے اور پکار پکار کر فرمانے لگے: اے لوگو! یہ گوشت نہ کھاؤ، یہ اونٹ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے ہیں۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس مسئلے میں دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے جس نے غیر اللہ کے نام پر (جانور) ذبح کیا۔''[2]

اس حدیث سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ فخر و مباہات کی خاطر جانور ذبح کرنا درحقیقت غیر اللہ کی خاطر ذبح کرنے کے مترادف ہے۔[3]

مردہ مرغی کے پیٹ میں موجود انڈا نجس ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں مردہ مرغی کے پیٹ میں موجود انڈا نجس شمار ہوگا۔ اسے کھانا جائز نہیں چاہے اس کا چھلکا سخت ہو گیا ہو یا نہ ہوا ہو۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی یہ رائے ابن قدامہ نے نقل کی ہے۔[4]

مشرکین اور مجوس کا پکایا ہوا کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں

مجوس اور مشرکین کا تیار شدہ کھانا جس کا کسی ذبیح سے کوئی تعلق نہ ہو، کھانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حرمت ذبح شدہ جانور کے ساتھ مخصوص ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] فقه الإمام علي: 467/1. [2] صحيح مسلم، حديث: 1978. [3] فقه الإمام علي بن أبي طالب: 468/1.
[4] المغني: 75/1، والمجموع: 245/1.

فرماتے ہیں: مجوس کا پکایا ہوا کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ ان کا ذبح کیا ہوا گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے۔[1]

بالوں کو سفید حالت میں رکھنا جائز ہے

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک سفید بالوں کو سفید ہی رہنے دینا اور مہندی وغیرہ سے نہ رنگنا جائز ہے۔ ان کی یہ بات ابن حجر اور دیگر علمائے کرام نے نقل کی ہے۔[2] شعبی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کی داڑھی اور سر کے بال سفید تھے ان کی داڑھی سینے کو ڈھانپتی تھی۔ ابواسحاق کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے اور سر کے اگلے بال جھڑ گئے تھے۔[3] ابن الحنفیہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بار بالوں کو مہندی لگائی پھر چھوڑ دی۔[4]

نکاحِ متعہ کی ممانعت

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رمضان نے ہر قسم کے روزے کو منسوخ کر دیا ہے اور نکاح متعہ کو طلاق، عدت اور میراث نے منسوخ کر دیا ہے۔[5] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دلیل وہ روایت ہے جو انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے زمانے میں نکاح متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا۔[6]

بغیر ولی نکاح کی دو حالتیں

ابوقیس اودی سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: جس شخص نے ولی کی اجازت

[1] كنز العمال: 2576، وفقه الإمام علي: 476/1. [2] المنتقى: 270/7، وفقه الإمام علي: 495/1.
[3] مصنف ابن أبي شيبة: 427/9، حديث: 25562. [4] مصنف ابن أبي شيبة: 427/9. [5] فقه الإمام علي: 509/2. [6] صحيح مسلم، حديث: 1407.

کے بغیر شادی کی اور میاں بیوی کے تعلقات بھی قائم کر لیے ان دونوں کے درمیان علیحدگی نہیں کی جائے گی۔ اگر میاں بیوی کے تعلقات قائم نہیں ہوئے تو ان دونوں کے درمیان علیحدگی ہو جائے گی۔[1]

عورت کے جسمانی عیوب ناگوار ہوں تو اس سے علیحدگی جائز ہے

اگر شادی کرنے والا مرد اپنی بیوی میں کوئی عیب پائے کہ اس کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہو جائے، تو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ اگر ازدواجی تعلقات ثابت ہوں تو حق مہر واجب ہے۔ اس صورت میں آدمی کو طلاق دینے یا بیوی کو ساتھ رکھنے کا اختیار ہو گا۔ اگر تعلقات ثابت نہیں تو بغیر حق مہر کے ان کے مابین علیحدگی کر دی جائے گی۔[2]

حکمرانوں کے انعامات قبول کر لیے جائیں

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سلطانِ وقت کی طرف سے انعامات لینے میں کوئی حرج نہیں، وہ جو دیتے ہیں اس میں حرام کی مقدار معمولی اور زیادہ تر حلال ہوتا ہے۔ مزید فرمایا: سلطان سے کبھی کچھ نہ مانگو، اگر وہ کچھ دے تو لے لو۔ بیت المال میں جو کچھ ہے اس میں حرام کم اور زیادہ حلال ہے۔[3]

ظلم رکوانے اور حق دلوانے پر کوئی اجرت نہ لی جائے

جس نے کسی شخص کو اس کا حق لے کر دینے میں مدد دی یا اس پر ہونے والے ظلم کا سد باب کیا اس کے لیے جائز نہیں کہ اس نصرت پر کوئی ہدیہ قبول کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ نقطۂ نظر امام ابن حزم نے انھی سے نقل کیا ہے۔[4]

[1] مصنف عبدالرزاق: 196/6، حديث: 10477. [2] كنز العمال: 45664، ومصنف عبدالرزاق: 10677. [3] المغني: 444/6، وفقه الإمام علي: 716/2. [4] المحلي: 129/9.

ادھار دی گئی چیز کی ضمانت نہیں

عاریتاً کوئی چیز لینے والا، اگر وہ چیز کوئی بددیانتی یا زیادتی کیے بغیر ضائع کر بیٹھے تو یہ شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں ضامن نہیں ہے۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ ضامن نہیں ہے کیونکہ اسے عاریتاً دی گئی چیز نیکی کے جذبے سے دی گئی تھی، ہاں اگر وہ بددیانتی یا زیادتی کرے تو پھر ضامن ٹھہرے گا۔[2]

رکھی گئی امانت کی کوئی ضمانت نہیں

جس کے پاس کوئی چیز رکھی گئی ہے وہ امانت ہے، اگر ایسی چیز امین سے کسی غلطی کے بغیر ضائع ہو جائے تو وہ ذمہ دار نہیں ہوگا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں: عاریتاً یا امانتاً لی گئی چیز کی ضمانت نہیں ہے۔[3]

کفار کے ہاتھ مالِ غنیمت بیچنے کی ممانعت

جنگ میں کافروں سے حاصل کیے گئے مالِ غنیمت کو پھر انھی کفار کے ہاتھ بیچ دینا جائز نہیں۔ ام موسیٰ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عجمیوں کے برتنوں میں سے سونے کا ایک مخصوص برتن لایا گیا۔ انھوں نے اسے توڑنا چاہا تاکہ اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ کچھ کافر سوداگروں نے آپ سے کہا: اگر آپ اسے توڑ دیں گے تو اس کی قیمت ضائع کر دیں گے اسے ہمارے ہاتھ بیچ دیجیے ہم آپ کو اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت دینے کو تیار ہیں۔ یہ سن کر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمھیں تمھاری وہ چودھراہٹ اور ملکیت واپس کرنے کو تیار نہیں جو اللہ تعالیٰ نے تم سے چھین لی ہے۔ انھوں نے اس برتن کے ٹکڑے کر ڈالے اور لوگوں میں تقسیم کر دیے۔[4] امیر المومنین نے یہ اقدام اس لیے کیا

---

[1] فقه الإمام علي بن أبي طالب: 721/2. [2] مصنف عبدالرزاق: 14786. [3] مصنف عبدالرزاق: 14784. [4] فقه الإمام علي بن أبي طالب: 752/2.

تا کہ ان کا برتن انھیں اپنی عظمت وشوکت کی یاد نہ دلائے۔ یا یہ چیز دوبارہ ان کے لیے مفید نہ بن جائے۔

صنعت گر ضامن ہیں

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صنعت گروں کو ضامن ٹھہرایا تا کہ لوگوں کے مال ضائع ہونے سے محفوظ رہیں۔ شاطبی کہتے ہیں: خلفائے راشدین نے صنعت گرون کو ضامن قرار دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگوں کے لیے یہی طریقہ بہتر ہے۔ یہ شریعت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے اور وہ مقصد لوگوں کا مال ضائع ہونے سے بچانا ہے۔[1]

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے درزی اور رنگساز اور ان جیسے دیگر پیشہ وروں کو ضامن قرار دیا تا کہ وہ اپنے کام میں احتیاط سے کام لیں۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ذمیوں کے ساتھ معاہدے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے مال اور جان کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے مال و جان کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جزیے کی وصولی کے لیے نرمی اختیار فرماتے تھے اور اس کی مقدار میں بھی سہولت دیتے تھے۔ عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں: مجھے ثقیف قبیلے کے ایک آدمی نے بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھے عامل بنا کر بھیجا اور فرمایا: جزیے کی وصولی کے لیے کسی ذمی کو کوڑے نہ مارنا، ان کا راشن، گرمی اور سردی کے لباس ہرگز فروخت نہ کرنا، اگر انھوں نے دیت کی ادائیگی کے لیے کچھ جمع کیا ہو تو اسے مت چھیننا، اور درہم وصول کرنے کے لیے کسی کو ان پر مسلط نہ کرنا، میں نے عرض کیا امیر المؤمنین! اس طرح تو میں اسی طرح خالی ہاتھ واپس آ جاؤں گا جیسے گیا تھا، انھوں نے فرمایا: اگرچہ تم کچھ بھی نہ لاؤ پھر بھی ان سے صرف وہی وصول کرنا جو ان کی ضروریات سے زیادہ ہو۔[3]

---

[1] مقاصد الشريعة الإسلامية، لمحمد سعد اليوبي، ص: 602. [2] مصنف عبدالرزاق: 217/8، حديث: 14948، موسوعة علي بن أبي طالب، ص: 22. [3] المغني: 375/8، وفقه الإمام علي: 756/2، وكنز العمال: 14346.

حدود وتعزیرات

مرتد کی سزا

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مرتد سے تین بار توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ہے بصورت دیگر اسے قتل کر دیا جائے۔[1] اسے قتل کرنے کے بارے میں اس حدیث سے رہنمائی ملتی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اپنا دین تبدیل کر لے اسے قتل کر دو۔''[2] البتہ اس سے توبہ کرانے کی دلیل حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی یہ روایت ہے کہ ایک آدمی مرتد ہو گیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے چار بار توبہ کروائی۔[3] زندیق، جو بظاہر اسلام قبول کرتا ہے اور دل میں کفر چھپائے رکھتا ہے۔ ان سے توبہ کرانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو ارشادات منقول ہیں:

(ا) فرمایا: واضح مرتد اور اس زندیق سے توبہ کرانے میں کوئی فرق نہیں ہے جو بظاہر اسلام کا نام لیتا ہے لیکن اپنے دل میں کفر چھپائے ہوئے ہے اور اس کے خلاف دلیل بھی قائم ہو چکی ہے۔[4]

محمد بن ابی بکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو مسلمانوں کے بارے میں لکھا کہ وہ زندقہ اختیار

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 138/10. [2] صحيح البخاري، حديث: 3017. [3] مجمع الزوائد: 262/6، یہ روایت ضعیف ہے۔ [4] المغني: 126/8، وموسوعة فقه علي بن أبي طالب، ص: 273.

کر چکے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا: اگر وہ دونوں توبہ کر لیں تو ٹھیک ہے۔ بصورتِ دیگر دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ [1]

(ب) جس نے اپنا مرتد ہونا واضح طور پر ظاہر کر دیا ہے اس سے توبہ کرائی جائے مگر زندیق سے توبہ نہ کرائی جائے۔ اثرم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان کی خدمت میں ایک عربی شخص پیش کیا گیا۔ اس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی، اسے توبہ کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا۔ لہٰذا انھوں نے اسے قتل کرا دیا۔ پھر ان کے پاس ایک گروہ لایا گیا۔ یہ لوگ نماز تو پڑھتے تھے لیکن زندیق تھے اور ان کے خلاف عادل گواہوں نے گواہی دی تھی، انھوں نے زندیقیت سے انکار کیا اور کہا کہ ہم تو دینِ اسلام پر قائم ہیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کے اس اقرار کے باوجود انھیں قتل کرا دیا اور ان لوگوں سے توبہ نہیں کرائی، پھر آپ نے حاضرین سے فرمایا: کیا تمھیں معلوم ہے میں نے نصرانی سے توبہ کا مطالبہ کیوں کیا؟ اس لیے کیا کہ اس نے اپنا دین ظاہر کر دیا تھا۔ البتہ زندیقوں پر دلائل قائم ہو چکے تھے اور عادل گواہوں نے شہادت دے دی تھی اس کے باوجود وہ اپنے جرم کے انکاری تھے۔ اس لیے میں نے انھیں قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ [2]

شبہات کی وجہ سے حدود کا ساقط ہونا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے ہے کہ شکوک وشبہات کی موجوگی میں حدود نافذ نہیں ہوں گی۔ ضحاک بن مزاحم، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا: جب حدود کے معاملات میں ''ممکن ہے'' ''شاید'' اور ''ہوسکتا ہے'' جیسے الفاظ آ جائیں تو حد معطل کر دی جائے گی۔ [3]

[1] المصنف: 342/7، 170/10. [2] المغني: 4141/8، وموسوعة فقه علي بن أبي طالب، ص: 273.

[3] مصنف عبدالرزاق: 427/7، حديث: 13727، والمغني: 211/8.

حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک عورت ان کی خدمت میں پہنچی۔ اس نے کہا: میں نے بدکاری کا ارتکاب کیا ہے، انھوں نے فرمایا: شاید نیند کی حالت میں تمھارے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہوگا یا تمھیں مجبور کیا گیا ہوگا۔ عورت نے کہا: مجھ پر کسی نے جبر نہیں کیا۔ میں اپنی مرضی سے بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: شاید تمھیں خود اپنے اوپر غصہ ہے اور تم اپنے آپ سے بیزار ہو، اس نے کہا: نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ سن کر آپ نے اسے قید کر دیا۔ جب اس کے ہاں ولادت ہوئی اور بیٹا بڑا ہو گیا پھر اس پر حد نافذ کی۔[1] کیونکہ وہ شادی شدہ نہ تھی، اسی لیے اس پر کوڑوں کی حد لاگو کی گئی۔

عیسائی عورت کی بدکاری

اگر کوئی عیسائی عورت بدکاری کا ارتکاب کرے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقطۂ نظر کے مطابق اس پر حد نافذ نہیں کی جائے گی بلکہ اسے اس کے اہل مذہب کے سپرد کر دیا جائے گا۔ وہی اپنی شریعت کے مطابق اس پر حد قائم کریں گے۔[2] قابوس بن مخارق روایت کرتے ہیں کہ محمد بن ابی بکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں خط لکھا اور پوچھا کہ ایک مسلمان مرد نے عیسائی عورت سے زنا کیا ہو تو اس صورت حال میں ان دونوں کو کیا سزا دی جائے؟ انھوں نے جواب میں لکھا: مسلمان مرد پر حد قائم کرو اور عیسائی عورت کو اس کے اہل مذہب کے سپرد کر دو۔[3] زنا کی حد ایک تعبدی حکم ہے۔ اس کا مقصد مرتکب شخص کو گناہ سے پاک کرنا ہے۔ اور یہ بات ملتِ اسلام سے باہر والے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

حد قائم کرنا گناہوں کا کفارہ ہے

ابن ابی لیلیٰ ہذیل قبیلے کے ایک آدمی سے روایت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس کا

[1] فقه الإمام علي: 761/2. [2] فقه الإمام علي بن أبي طالب: 799/2. [3] مصنف عبدالرزاق: 342/7، حديث: 13416.

شمار قریشیوں میں ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا: جس شخص نے برائی کا ارتکاب کیا پھر اس پر حد قائم کر دی گئی تو یہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ انھی سے ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراحہ کو رجم کیا تو میں نے کہا ''یہ تو بڑی بری حالت میں مری ہے!'' یہ سن کر انھوں نے مجھے ایک ڈنڈے یا کوڑے سے جو ان کے ہاتھ میں تھا بڑی سخت ضرب لگائی۔ جس سے مجھے شدید تکلیف ہوئی۔ میں نے ان سے کہا: آپ نے مجھے بڑی دردناک ضرب لگائی ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس عورت سے اس کے اس گناہ کے بارے میں کبھی باز پرس نہیں ہوگی[1] جس طرح ادا شدہ قرض کے بارے مین کبھی باز پرس نہیں ہوتی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مجلس میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی برائی کا ارتکاب کیا پھر اسے اس کی سزا مل گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے، اور جس نے برائی کا ارتکاب کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اگر وہ چاہے تو اسے معاف فرما دے اور چاہے تو سزا دے۔''[2]

شرابِ خانہ خراب پینے والوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زبردست غیظ وغضب

رمضان میں شراب نوشی پر اضافی کوڑے

عطاء اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شاعر نجاشی حارثی کو رمضان میں شراب نوشی کی پاداش میں اسی کوڑے مارے۔ پھر اسے قید کر دیا، دوسرے دن اسے قید سے باہر نکالا اور بیس کوڑے مارے پھر فرمایا: یہ بیس کوڑے، رمضان میں روزہ نہ رکھنے اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں جرأت وجسارت کا رویہ اختیار کرنے پر مارے ہیں۔[3]

---

[1] مصنف عبدالرزاق: 13353. [2] صحیح مسلم، حدیث: 709. [3] کنز العمال: 13687، وفقه الإمام علي: 807/2.

شراب نوش کو ضرور سزا دوں گا چاہے وہ مر جائے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کوئی شخص ایسا نہیں کہ میں نے اس پر حد قائم کی ہو، نتیجتاً وہ مر گیا ہو اور میں اس پر افسوس کروں، ہاں شراب نوشی کی حد قائم کرنے پر اگر کوئی مر جائے تو میں اس کی دیت ادا کروں گا، کیونکہ یہ سزا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر نہیں فرمائی۔ [1]

یہ شرعی احکام دراصل انسانی عقل کی حفاظت کے لیے ہیں جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے انسان کو امتیازی شان اور عزت سے نوازا ہے۔ اور شراب کو حرام قرار دے دیا کیونکہ یہ عقل کو ماؤف کر دیتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○ ﴾

”اے ایمان والو! شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے کے تیر یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جوئے میں لگا کر تمھارے درمیان عداوت اور کینہ ڈال دے اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ بتاؤ کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟“ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر شراب حرام ہے۔“ [3] یہی وجہ ہے کہ شریعت نے نشے میں مدہوش شخص پر حد قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر قسم کی ان تمام منشیات کو حرام قرار دیا ہے جو عقل کی سلامتی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ [4]

بلاشبہ شریعت عقل کی حفاظت کو زبردست اہمیت دیتی ہے اور عقل و شعور کو مطلوب و

[1] مسند أحمد: 125/1، حدیث: 1024، اس کی سند شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ [2] المائدۃ 5:90-91.

[3] صحیح البخاري، حدیث: 5585. [4] الحکم و التحاکم في خطاب الوحي: 467/1.

مقصود گردانتی ہے کیونکہ اس پر تمام انسانی مسائل وضروریات کا دارومدار ہے۔ عقل کو گزند پہنچانے اور اہمیت نہ دینے سے بے شمار خرابیاں جنم لیتی ہیں۔[1]

مال کو محفوظ جگہ پر رکھنا ضروری ہے ورنہ چور کا ہاتھ نہیں کٹے گا

(ا) مال محفوظ جگہ پر ہونا ضروری ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے یہ شرط بیان فرمائی ہے کہ مال محفوظ جگہ پر ہونا چاہیے۔ اگر چور محفوظ مال میں سے چرائے گا تو سزا کا مستحق ہو گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چور کا ہاتھ اس وقت تک نہ کاٹا جائے جب تک وہ گھر سے مال نکال کر باہر نہ لے جائے۔[2]

(ب) جس مال میں چور کا حصہ ہو اس کی چوری پر ہاتھ نہیں کٹے گا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جس نے ایسے مال میں سے چوری کی جس میں اس کی ملکیت کا کوئی حصہ ہو۔[3] زید بن دثار کہتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ایسا آدمی لایا گیا جس نے خمس میں سے مال چرایا تھا۔ انھوں نے فرمایا: اس کا اس میں حصہ ہے، لہٰذا اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔ شعبی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیت المال میں سے چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔[4]

(ج) آزاد فرد کو چوری سے اُچکنے والے کا ہاتھ ضرور کٹے گا

جس نے کسی آزاد شخص کو بچپن میں چوری سے اُچک لیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک آزاد شخص کے فروخت کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا اور فرمایا: آزاد شخص کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔[5]

---

[1] مقاصد الشريعة لليوبي، ص: 243. [2] كنز العمال: 13911، وفقه الإمام علي: 810/2. [3] فقه الإمام علي: 811/2. [4] مصنف عبدالرزاق: 212/10، حديث: 18871. [5] مصنف عبدالرزاق: 195/10، حديث: 18806.

چونکہ انسان مال سے زیادہ قیمتی ہے، اس لیے انسانی چوری کے معاملے میں بالا ولیٰ چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔[1]

(د) چوری کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں دو گواہوں یا دو مرتبہ اعتراف کرنے سے چوری ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ بات ان سے ابن قدامہ نے نقل کی ہے۔[2] عکرمہ بن خالد کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ چور کا ہاتھ اس وقت تک نہیں کاٹتے تھے جب تک گواہ گواہی نہ دے دیں۔ وہ چوری کے ملزم کو قید میں ڈال دیتے تھے۔ جب گواہ گواہی دے دیتے تو ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔

اگر گواہ پیچھے ہٹ جاتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ملزم کو چھوڑ دیتے تھے، ایک مرتبہ ان کے پاس ایک چور لایا گیا۔ آپ نے اسے قید کر دیا، دوسرے دن اسے اور دونوں گواہوں کو بلایا، تو کسی نے کہا کہ دونوں میں سے ایک گواہ غائب ہو گیا ہے۔ اس پر آپ نے چور کو چھوڑ دیا۔ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔[3]

قاسم بن عبدالرحمٰن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو اس نے کہا: میں نے چوری کی ہے آپ رضی اللہ عنہ نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کی اور برا بھلا کہا، اس نے پھر کہا: میں نے چوری کی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس نے دو مرتبہ اقرار کیا ہے، اس لیے اس کا ہاتھ کاٹ دو...... انھوں نے مزید کہا کہ وہ منظر آج بھی میری نگاہوں میں گھوم رہا ہے اور میں چور کا گردن میں لٹکا ہوا ہاتھ دیکھ رہا ہوں۔[4]

(ہ) چوری سے پہلے چور کا معلوم ہونا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں محفوظ مقام سے مال چرانے سے پہلے اگر چور کے بارے

---

[1] فقه الإمام علي: 814/2. [2] المغني: 279/8. [3] مصنف عبدالرزاق: 18779، وكنز العمال: 13908. [4] مصنف عبدالرزاق: 191/10، حديث: 18784، والمغني: 280/8.

میں معلوم ہو جائے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، حارث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک ایسا آدمی لایا گیا جو نقب لگا رہا تھا اور اسی حال میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا،[1] اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے اسے بطور تعزیر صرف چند کوڑے مارے۔[2]

(و) عادی چور کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ دیا جائے

ابن المنذر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ جو شخص چوری کرے اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ دوسری مرتبہ پھر چوری کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے، پھر اگر تیسری اور چوتھی بار چوری کرے تو اسے تعزیری سزا دی جائے گی۔ اس کا دوسرا ہاتھ یا دوسرا پاؤں نہیں کاٹا جائے گا۔[3]

عبداللہ بن سلمہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک چور لایا گیا انھوں نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس نے دوبارہ چوری کی تو اسے پھر لایا گیا۔ انھوں نے اس کا پاؤں کاٹنے کا حکم دیا۔ اس نے تیسری دفعہ چوری کی تو تیسری بار آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں اس کا (دوسرا) ہاتھ بھی کاٹنے کا حکم دوں؟ پھر وہ کس طرح طہارت حاصل کرے گا؟ کس طرح کھائے گا؟ اور کس طرح پیے گا؟ پھر فرمایا: اگر میں اس کا دوسرا پاؤں کاٹنے کا حکم دوں تو وہ کیسے چل سکے گا؟ مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے، راوی کہتے ہیں کہ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اسے سزا دی اور ہمیشہ کے لیے قید کر دیا۔[4]

(ز) چور کا ہاتھ کاٹ کر لٹکا دیا جائے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک مستحب صورت یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کے بعد داغ دیا جائے اور جس ہاتھ پر چوری کی حد لاگو کی گئی ہے اسے اس کی گردن میں لٹکا دیا جائے۔[5]

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 477/9، حديث: 28699. [2] كنز العمال: 13911، وفقه الإمام علي: 817/2. [3] المحلى: 354/3، والمغني: 264/8. [4] البدائع: 4273/9، وفقه الإمام علي: 818/2. [5] فقه الإمام علي: 821/2.

جحیہ ابن عدی سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ چور کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔ پھر اسے داغنے کا حکم دیتے تھے اور پھر قید میں ڈال دیتے تھے، جب چور کا زخم ٹھیک ہو جاتا تو اسے قید سے بلا بھیجتے اور ارشاد فرماتے: اپنا ہاتھ اوپر اللہ کی طرف بلند کرو۔ وہ اونچا کر لیتا تو دریافت فرماتے: بتاؤ کس نے تمھارا ہاتھ کاٹا؟ وہ کہتا علی رضی اللہ عنہ نے۔ تو فرماتے: کس وجہ سے؟ وہ کہتا: میں نے چوری کی ہے۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سوئے فلک دیکھتے اور کہتے: اے اللہ گواہ رہنا! اے اللہ گواہ رہنا!![1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہاتھ داغنے کا حکم اس لیے دیتے تھے تاکہ خون نہ بہنے پائے اور چوری کرنے والا جلد صحت یاب ہو جائے، علاوہ ازیں وہ زخم کے بدن میں سرایت کر جانے یا جان تلف ہو جانے کے خوف سے مجرم کو بچانے کے لیے داغنے کا حکم دیتے تھے۔[2]

شریعت اسلامیہ کے مقاصد میں لوگوں کے مال کی حفاظت ترجیحی طور پر شامل ہے جو ان کی زندگی قائم رکھنے کا ایک اہم سبب ہے۔ اسلام نے ہر اس سبب اور وسیلے کو حرام قرار دیا ہے جس کی بدولت شرعی حق کے بغیر کسی کا مال لے لیا جائے، چوری کو حرام کر دیا ہے اور جس پر یہ جرم ثابت ہو جائے اس پر حد کا نفاذ واجب ٹھہرایا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾

''اور چور، چاہے عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہے۔''[3]

تمام خلفائے راشدین شریعت کے یہ احکام التزام سے لاگو کرتے اور ان کے نفاذ کی کڑی نگرانی کرتے رہے۔

---

[1] كنز العمال: 1326. [2] فقه الإمام علي: 821/2. [3] المائدة 38:5.

قصاص اور جرائم

شریعت اسلامیہ نے قصاص کے جو احکام دیے ہیں وہ نفسِ انسانی کی حفاظت، قتل ناحق، اور خون بہانے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مہلک خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ہیں۔

قتل، قصاص اور جملہ جرائم کے بارے میں احکام

(ا) قتل عمد میں اشتراک

اگر کسی شخص کے قتل عمد پر کوئی گروہ متفق ہو جائے اور متعلقہ شخص کو قتل کر دے تو اس صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ اس گروہ کے تمام افراد کو قتل کر دیا جائے گا۔[1] انھی سے مروی ہے کہ انھوں نے ان تین آدمیوں کو قتل کر دیا جنھوں نے باہم مل کر ایک آدمی کو ہلاک کر دیا تھا۔[2]

(ب) آقا غلام کو کسی کو قتل کرنے کا حکم دے

اگر کوئی آقا اپنے غلام کو یہ حکم دے کہ وہ کسی شخص کو قتل کر آئے، غلام اس حکم کی تعمیل کرے اور متعلقہ شخص کو قتل کر دے تو اس صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک آقا کو قتل اور غلام کو قید کر دیا جائے گا۔ ان سے یہ بات ابن المنذر اور دیگر علمائے کرام نے نقل کی ہے۔[3]

---

[1] فقه الإمام علي بن أبي طالب: 826/2. [2] المغني: 672/7. [3] المغني: 757/7.

خلاس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اس آقا کو جس نے اپنے غلام کو کسی کے قتل پر مامور کیا، اصل قاتل قرار دیا اور فرمایا: یہ غلام اپنے آقا کی تلوار یا کوڑے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آقا کو (قصاص میں) قتل کیا جائے گا اور غلام کو قید میں ڈالا جائے گا۔[1] ایک اور روایت میں ہے: جب آدمی اپنے غلام کو کسی شخص کو قتل کرنے کا حکم دے تو غلام کی مثال آقا کی تلوار اور کوڑے جیسی ہے، آقا کو مقتول کے بدلے قتل کیا جائے گا اور غلام کو قید کر دیا جائے گا۔[2]

(ج) بھیڑ میں قتل کیا جانے والا

جو شخص لوگوں کی بھیڑ میں قتل ہو جائے اور اس کے قاتل کا پتہ نہ چلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی دیت مسلمانوں کے بیت المال کے ذمے ہے۔[3] یزید بن مذکور ہمدانی سے روایت ہے کہ ایک آدمی جمعہ کے دن مسجد میں لوگوں کی بھیڑ میں قتل ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی دیت بیت المال سے ادا کرنے کا حکم دیا۔[4]

(د) سواری کے جانور کی زد میں آنے کا معاملہ

اس مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دو روایتیں منقول ہیں: پہلی روایت: اگر سواری کا جانور کسی کو روند ڈالے یا ٹانگ مار دے تو جانور کو چلانے والا اور اس کا سوار ضامن ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں اس تقصیر یا بے احتیاطی کا ذمہ دار اس جانور کو چلانے والا ہی ہو گا۔[5] خلاص روایت کرتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک جانور کو چلانے والا شخص ہی جانور کی زد میں آنے والے کے جانی نقصان کا ذمہ دار ہے۔[6]

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 371/9، حديث: 28367. [2] فقه الإمام علي بن أبي طالب: 836/2.
[3] فقه الإمام علي: 838/2. [4] الخلافة الراشدة، ليحيى اليحى، ص: 502. [5] فقه الإمام علي: 841/2. [6] مصنف بن أبي شيبة: 259/9، حديث: 27877.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک جانور کی زد میں آ کر ہلاک ہو جانے والے شخص کے قتل کی ذمہ داری جانور کو ہانکنے والے ہی پر عائد ہو گی، کیونکہ سواری کا جانور اس کے ہاتھ میں ایک آلے کی مانند ہے۔ وہ اپنی بے احتیاطی کے باعث ارتکابِ جرم کا ذمہ دار ٹھہرے گا۔ کیونکہ جب وہ سواری کے جانور کو ہانک رہا تھا اس کا فرض تھا کہ جانور کو احتیاط سے چلاتا۔[1]

دوسری روایت: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں اگر جانور کو ہانکنے والے کی طرف سے کسی تقصیر یا بے احتیاطی کا ثبوت نہ ملے تو وہ ذمہ دار نہیں ہو گا۔[2] انھی سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: جب راستہ کھلا ہو تو جانور کو چلانے والا ذمہ دار نہیں ہے۔[3] اس کی وجہ یہ ہے کہ جب راستہ کشادہ ہے اور راہگیر باخبر ہیں کہ سامنے سے سواری آ رہی ہے تو تمام راہگیروں پر احتیاط لازم ہے۔ اگر گزرنے والوں نے بے پروائی سے کام لیا اور انھیں کچھ ہو گیا تو گویا خود انھوں نے غلطی کی ہے اور وہی قصور وار ہیں، کسی اور پر اس معاملے کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی۔ ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ پہلی میں قصور ثابت ہونے کی بات ہے اور دوسری میں ثابت نہ ہونے کا ذکر ہے، اور گزرنے والوں کے قصور کا ثبوت ہے۔

(۶) اپنی حد سے ناحق تجاوز کیا تو ضرر کا باعث بنا

اگر کسی شخص نے کنواں کھودا یا کوئی چیز ڈال دی یا کوئی تعمیر کی حالانکہ اسے اس کا کوئی حق نہ تھا اور وہ کنواں، تعمیر، یا چیز کسی انسان کے نقصان یا ضائع ہونے کا سبب بنی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں یہ شخص ذمہ دار قرار پائے گا۔[4] وہ فرماتے ہیں: جس نے کنواں کھودا یا لکڑی گاڑ دی اور اس وجہ سے اور کوئی انسان نقصان کا شکار ہوا تو کنواں کھودنے یا تعمیر کرنے یا لکڑی گاڑنے والا شخص ضامن ہو گا۔[5]

---

[1] فقه الإمام علي: 841/2. [2] فقه الإمام علي: 842,841/2. [3] مصنف بن أبي شيبة: 259/9، حديث: 27881. [4] فقه الإمام علي: 842/2. [5] مصنف عبدالرزاق: 72/10، حديث: 18400.

(و) گواہی میں غلطی کرنے والا شخص نقصان کا ذمہ دار ہوگا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں گواہی میں غلطی کرنے والا آدمی ممکنہ نقصان کا ذمہ دار ہو گا۔ جس شخص نے کسی کے خلاف حد یا قصاص میں غلط گواہی دی تو وہ کسی عضو یا جان کے تلف ہونے پر دیت ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔[1] متعدد سندوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: دو آدمیوں نے ایک شخص کے خلاف چوری کی گواہی دی، چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ دوسرے دن وہ ایک اور شخص کو پکڑ لائے اور کہا پہلے آدمی کے بارے میں ہم سے غلطی ہوگئی، اصل چور یہ ہے تو انھوں نے دوسرے شخص کے خلاف گواہی کو غلط قرار دیتے ہوئے ان کی گواہی قبول نہیں کی اور پہلے شخص کے ہاتھ کٹنے کی دیت ان گواہوں کے ذمہ ڈال دی۔[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے فرمایا: اگر تم دونوں نے جانے بوجھے یہ غلط گواہی دی ہوتی تو میں تم دونوں کے ہاتھ کاٹ دیتا، پھر انھوں نے دوسرے کے خلاف گواہی کو غلط ٹھہرایا اور پہلے شخص کے ہاتھ کٹنے کی دیت ان کے ذمہ ڈال دی۔[3] اس میں دلیل یہ ہے کہ وہ لوگ ایک شخص کے عضو کے تلف ہونے کا باعث بنے، اور کسی جرم کا باعث بننا، اس جرم کی اصل ذمہ داری باعث بننے والے ہی کے سر ڈال دیتا ہے جیسے کسی نے راستے میں کنواں کھودا اور کوئی شخص بے خبری میں اس کنویں میں گر گیا تو اس کا ذمہ دار کنواں کھودنے والا ٹھہرے گا۔[4]

(ز) کسی شخص کے قتل میں غلطی سے گروہ کا اشتراک

اگر ایک جماعت یا گروہ غلطی سے کسی قتل میں شریک ہو جائے تو اس جرم کی ذمہ داری اس جماعت کے ہر فرد پر تقسیم ہو جائے گی۔[5]

[1] فقه الإمام علي بن أبي طالب: 843/2. [2] مصنف بن أبي شيبة: 408/9، حديث: 28470. [3] مصنف عبدالرزاق: 88/10، حديث: 18461. [4] فقه الإمام علي: 844/2. [5] فقه الإمام علي: 844/2.

(ح) کسی غلام یا چھوٹے بچے کو کام پر لگانے کا معاملہ

جس کسی نے سرپرست کی اجازت کے بغیر کسی چھوٹے بچے یا آقا کی اجازت کے بغیر کسی غلام کو کسی کام پر لگایا، یا اُسے سواری پر سوار کیا اور بعدازاں وہ مرگیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں وہی شخص اس کا ذمہ دار ہے۔ حَکَم سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے کسی قوم کے چھوٹے بچے یا بڑے مملوک کو کام پر لگایا، وہ اس کا پوری طرح ذمہ دار ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے کسی آزاد چھوٹے بچے کو کام پر لگایا وہ اُس کا ذمہ دار ہوگا اور جس نے کسی بڑے سے کام لیا وہ اُس کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔[1]

(ط) معنوی فعل

معنوی افعال مثلاً: ڈرانا دھمکانا اور اس سے مشابہ امور، کسی انسان کے قتل یا ہلاکت کا سبب بن جائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں یہ جرم فوجداری جرائم میں شامل ہے۔[2]

ابن جُریج سے روایت ہے کہ میں نے عطاء سے پوچھا کہ ایک آدمی نے ایک بچے کو جو دیوار پر بیٹھا تھا، پکارا اور اُس سے کہا کہ یہیں رُکو! لیکن وہ بچہ گر پڑا اور مرگیا، اس معاملے کا کیا حکم ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: وہ آدمی اس کا جرمانہ ادا کرے گا۔'' ایک روایت میں ہے کہ اس نے بچے کو ڈرایا تھا (جس کی وجہ سے وہ گر پڑا)۔[3] فعل معنوی پر ذمہ داری ڈالنے سے متعلق اجمالی طور پر جمہور علمائے امت کا قول ہے۔[4]

(ی) طبیب کی غلطی

اگر کوئی طبیب یا معالج مویشیاں، علاج کے ضابطوں اور شرائط کی خلاف ورزی کرے

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 277/9، حديث: 27973. [2] فقه الإمام علي بن أبي طالب: 846/2.
[3] كنز العمال: 83/15، حديث: 40196. [4] فقه الإمام علي: 846/2.

اور کسی انسان یا حیوان کی ہلاکت کا سبب بنے تو اُس پر اِس کی ذمہ داری عائد ہوگی۔[1]

ضحاک بن مزاحم سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطاب کیا اور فرمایا: اے گروہ اطباء و معالجین حیوانات! تم میں سے جو کسی انسان یا حیوان کا علاج کرے تو پہلے بری الذمہ ہونے کا معاملہ طے کرے۔ اگر کسی نے علاج کیا اور پیشگی طور پر بری الذمہ ہونے کا معاملہ طے نہیں کیا اور دورانِ علاج کوئی ہلاکت واقع ہوگئی تو یہ شخص اس معاملے کا ذمہ دار ٹھہرے گا۔[2]

مجاہد کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے طبیب کے بارے میں فرمایا: اگر اُس نے اُس مریض کے بارے میں کسی گواہی کا اہتمام نہ کیا جس کا وہ علاج کر رہا ہے تو پھر وہ عواقب کے بارے میں اپنے آپ ہی کو ملامت کرے، وہ فرماتے تھے کہ یہ طبیب ذمہ دار ہوگا۔[3]

(ک) قصاص اور حد کے نفاذ میں موت

جب کوئی حد قائم کی جائے یا قصاص کے مستحق پر قانون کا نفاذ ہو اور اس دوران وہ مرجائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں قصاص لینے والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔[4]

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص کتاب اللہ کے حکم سے قصاص نافذ کیے جانے کے نتیجے میں مرگیا اس کی کوئی دیت نہیں ہے۔[5]

مزید فرمایا: جو کسی حد کے نفاذ کے دوران مرگیا تو اُس کے مرنے کا سبب حد ہی ہے۔ حدود اللہ میں سے کسی حد کے دوران مرنے والے کی کوئی دیت نہیں ہے۔[6] انھوں نے یہ بھی فرمایا: اگر کسی شخص پر زنا، چوری یا تہمت کی حد نافذ کی جائے اور اس دوران وہ مرجائے تو اس کی کوئی دیت نہیں۔[7] اس کی دلیل یہ ہے کہ قصاص واجب ہے اور واجب

---

[1] فقه الإمام علي: 847/2. [2] مصنف عبدالرزّاق، حديث: 18047. [3] مصنف عبد الرزّاق، حديث: 18046. [4] فقه الإمام علي: 847/2. [5] فقه الإمام علي: 848/2. [6] فقه الإمام علي: 848/2.
[7] مصنف بن أبي شيبة: 342/9، حديث: 28245.

امر، سلامتی کے ساتھ مشروط نہیں ہوتا، لہٰذا اگر اس معاملے میں کسی کوتاہی یا غفلت کا ثبوت نہ ہو تو ادائے دیت کی کوئی ضمانت نہیں۔[1]

(ل) رہزن کی گرفتاری

اگر کوئی راہزن نہ کسی کا مال چھینے نہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو تو ایسے شخص کو توبہ کرنے تک قید میں رکھا جائے گا۔ ایسا رہزن جو کسی کا مال تو چھین لے مگر کسی کو قتل نہ کرے تو اُس کا ایک ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیا جائے گا، اگر وہ قتل بھی کرے اور مال بھی چھین کر لے جائے تو اُس کا ایک ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹا جائے گا پھر اُسے پھانسی دی جائے گی تا آنکہ اُسے موت آجائے۔ اگر گرفتاری سے پہلے توبہ کر لے تو مال وغیرہ کا ضامن ہوگا اور اُس سے قصاص لیا جائے گا مگر حد نافذ نہیں کی جائے گا۔[2]

حارث بن بدر ایک رہزن تھا۔ اس نے پکڑے جانے سے پہلے ہی توبہ کر لی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس کی توبہ قبول کر لی، اور اس پر رہزنی کی لاگو حد ساقط کر دی کیونکہ اس نے پکڑے جانے سے پہلے ہی توبہ کر لی تھی۔[3]

(م) بیگناہ مُلزَم سے تہمت دور کرنے کے لیے قاتل کا اعترافِ قتل

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک ویران جگہ سے ایک آدمی گرفتار کر کے لایا گیا۔ اس کے ہاتھ خون سے رنگین تھے اور چُھری اس کے ہاتھ میں تھی اور سامنے ایک مقتول تھا جس کا خون بہہ رہا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُس سے باز پرس کی۔ اُس نے اقرار کیا کہ اسے میں نے قتل کیا ہے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسے لے جاؤ اور اس کو قتل کر دو، جب اُسے وہاں سے لے جایا جا رہا تھا، ایک آدمی تیزی سے آیا اور بولا: اے لوگو!

---

[1] فقه الإمام علي: 848/2. [2] المحلى، حديث: 252، وعصر الخلافة الراشده للعمري، ص: 151.
[3] عصر الخلافة الراشدة، ص: 151.

جلدی نہ کرو، اسے واپس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے چلو۔ بعدازاں اِس آدمی نے کہا: اے امیر المؤمنین! قتل اس نے نہیں کیا۔ میں نے کیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے آدمی سے پوچھا: تم نے کیوں اعتراف کیا کہ میں قاتل ہوں جبکہ تم نے قتل نہیں کیا؟ اُس نے کہا: امیر المؤمنین! میں بے بس ہوگیا تھا۔ رات کے چوکیدار مقتول کے سر پر کھڑے تھے اور اُس کا خون بہہ رہا تھا اور میں اُن کے سامنے ہاتھ میں خون آلود چُھری لیے کھڑا تھا۔ یہ سب کچھ ویران جگہ پر رُونما ہوا۔ میں ڈر گیا کہ یہ لوگ میرا موقف تسلیم نہیں کریں گے اور قَسَامت کا معاملہ بن جائے گا (یعنی خاندان کے پچاس لوگوں کو قسم اُٹھانی پڑے گی کہ اُنھوں نے اس قتل کا ارتکاب نہیں کیا) اس لیے میں نے اُس فعل کا اعتراف کرلیا، جس کا میں مرتکب نہیں ہوا۔ میں نے اِس سارے معاملے کا اجر اللہ تعالیٰ سے لینے کے لیے ایسا کیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے بہت بُرا کیا۔ صحیح بتاؤ تمھارا اصل قصہ کیا ہے، اُس نے کہا میں قصاب ہوں، میں رات کے اندھیرے میں اپنی دکان پر گیا، میں نے گائے ذبح کی، اس کی کھال اُتاری، ابھی چھری میرے ہاتھ میں تھی کہ مجھے پیشاب آگیا، میں اس ویرانے کی طرف آنکلا۔ قضائے حاجت کے بعد اپنی دکان کی طرف لوٹ رہا تھا کہ اسی دوران اس مقتول سے آمنا سامنا ہوگیا۔ یہ خون میں لت پت تھا، مجھے بڑا خوف آیا، میں اُسے دیکھنے کے لیے کھڑا ہوگیا جبکہ چھری بھی میرے ہاتھ میں تھی، اسی دوران ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا، اور کہنے لگے اِسی نے اِس شخص کو قتل کیا ہے۔ اس کے سِوا یہاں کوئی اور قاتل نہیں ہے، مجھے یقین ہوگیا کہ آپ ان کی بات کو چھوڑ کر میری بات نہیں مانیں گے۔ میں نے جس جُرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا اُس کا اعتراف کرلیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسرے اقراری سے پوچھا: تمھاری کیا کہانی ہے؟ اُس نے کہا کہ مجھے ابلیس نے ورغلایا، میں نے مال و دولت کے لالچ میں اسے قتل کردیا، پھر میں نے رات کے چوکیداروں کی آواز سنی تو میں ویرانے سے باہر آیا تو میں نے اِس قصاب کو اِسی

حالت میں دیکھا جیسا کہ اس نے بیان کیا ہے، تو میں ویرانے میں جا کر چھپ گیا۔ اِدھر رات کے چوکیداروں نے اسے پکڑ لیا اور آپ کے پاس لے آئے، جب آپ نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ اُس مقتول کے علاوہ اِس آدمی کے قتل کا گناہ بھی میرے سر ہوگا، لہٰذا میں نے سچائی کا اعتراف کرلیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اس بارے میں کیا فیصلہ کریں؟ انھوں نے کہا: امیر المؤمنین! اِس شخص نے اگر ایک شخص کو قتل کیا ہے تو دوسرے شخص کی زندگی کا سبب بھی بنا ہے اور فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾

"اور جو شخص کسی ایک جان کو (ناحق قتل ہونے سے) بچائے، تو گویا اس نے تمام لوگوں کی جان بچائی۔"[1]

حضرت علی نے ان دونوں کو بری کر دیا اور مقتول کی دیت بیت المال سے ادا فرمائی۔ شاید انھوں نے یہ فیصلہ مقتول کے وارثوں کی طرف سے قصاص کے حق سے دستبردار ہونے کے بعد فرمایا۔[2]

(ف) شب عُروسی میں دولہا کو قتل کرنے والی دلہن

یہ واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آیا۔ ایک عورت نے اپنے عاشق کی موجودگی میں شبِ زفاف اپنے خاوند کو قتل کر دیا، اُسے قصاص میں قتل کرنے کی سزا ہوئی۔[3]

(س) اونٹوں کے متبادل دیت کی ادائیگی اور دیت کیسے ادا ہوگی؟

دیت کے معاملے میں اصل بنیاد اونٹوں کی ادائیگی ہے، اس کے متبادل ادائیگی کا جواز بھی ہے جبکہ اونٹ مطلوبہ تعداد میں میسر نہ ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہی نقطۂ نظر ہے۔

[1] المائدة 32:5. [2] الطرق الحكمية، ص: 56، والقضاء في الإسلام، ص: 154. [3] المغني: 376,362/9، و الطرق الحكمية، ص: 50، و عصر الخلافة الراشدة، ص: 153.

عامر، حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ اور حضرت زید سے روایت کرتے ہیں، اِن سب حضرات نے کہا: دیت سو اونٹ ہے۔[1] اور حضرت حسن سے روایت ہے کہ حضرت علی نے دیت میں چاندی کے بارہ ہزار درہم ادا کرنے کا فیصلہ سنایا۔[2]

ادائے دیت کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیتِ خطاً اور شبہ العمد میں قاتل کے وارثوں کے ذمّہ دیت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے جو تین سال میں قسطوں میں ادا کی جائے گی۔[3] اور اس کی دلیل مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی ادائیگی کے لیے قاتل کے رشتہ داروں کے خلاف فیصلہ دیا۔[4]

اور قسطوں میں ادائیگی کا مقصد یہ ہے کہ فوری طور پر بیک وقت ادائیگی مشکل ہوگی اس لیے اسے تین سال پر تقسیم کیا ہے کیونکہ اسلام نے آسانی پیدا کرنے کا حکم دیا ہے۔[5]

(ع) کتابی کی دیت

حَکَم بن عتیبہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہودی، نصرانی اور ہر قسم کے ذمّی کی دیت مسلمان کی دیت کی طرح ہے۔[6]

(ف) کمر کی دیت

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اگر کسی کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی جائے اور مضروب شخص جماع کی قوّت وصلاحیت سے محروم ہوجائے تو اس کی پوری دیت ہے۔[7]

(ص) کانے کی آنکھ

جب کوئی شخص کسی کانے کی آنکھ پھوڑ دے تو اُس میں پوری دیت ہوگی یا کانا شخص

[1] مصنف بن أبي شيبة: 128/9، حديث: 27268. [2] الأم للشافعي: 177/7. [3] فقه الإمام علي: 853/6. [4] سنن ابن ماجه، حديث: 3633. [5] فقه الإمام علي: 854/2. [6] مصنف عبد الرزّاق، حديث: 18494. [7] مصنف ابن أبي شيبة: 231/9.

قصاص لیتے ہوئے جرم کے مرتکب کی ایک آنکھ چھوڑے اور نصف دیت لے لے۔ اس ضمن میں ابنِ قدامہ رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ نقطۂ نظر بیان کیا ہے کہ۔[1] کانے کی آنکھ دیکھنے کی ضرورت پوری ہونے کے لحاظ سے بینا شخص کی دو آنکھوں کے برابر ہے، اسی لیے اس میں کامل دیت کا حکم دیا گیا ہے۔[2]

(ق) انگلیوں کی دیت

انگلیوں میں سے ہر ایک انگلی کی دیت پوری دیت کا دسواں حصہ ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اِسے دس اونٹوں کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔ عاصم بن ضمرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انگلیوں میں ہر ایک انگلی میں دیت کا دسواں حصہ ہے۔[3] اور ایک روایت میں انگلیوں میں دیت کے دسویں کا دسواں حصہ ہے۔[4]

تعزیر

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نافرمان کو ادب سکھاتے اور تعزیر کے ذریعے اُسے اُس کے جرم کی سزا دیتے، اُس وقت جب اُس کے جرم پر حد مترتب نہ ہو۔

چونکہ گناہ یا جرم پر تعزیر کسی متعین صورت میں نہیں ہوتی، لہٰذا امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں سزا اور گناہ کے درمیان مناسبت کا ہونا ضروری ہے، جرم اور مرتکبِ جرم کے مطابق تعزیر کے وسائل بھی مختلف ہوں گے۔[5]

اس کی کچھ مثالیں بیان کی جاتی ہیں:

① تھپڑ مارنا

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی

---

[1] المغني: 8/5. [2] فقه الإمام علي: 860/2. [3] مصنف بن أبي شيبة: 193/9، حديث: 27546.
[4] مُصنّف عبدالرزّاق، حديث: 17693. [5] منهج علي بن أبي طالب في الدعوة، ص:321.

اُن کے ساتھ طواف کررہے تھے، اسی دوران ایک آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے امیر المؤمنین! علی رضی اللہ عنہ سے میرا حق لے کر دیجیے۔ انھوں نے پوچھا: کیوں، کیا معاملہ ہے؟ اُس نے کہا اُنھوں نے میری آنکھ پر تھپڑ مارا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ٹھہر گئے، اتنی دیر میں علی رضی اللہ عنہ بھی آگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا: اے ابوالحسن! کیا آپ نے اس آدمی کی آنکھ پر تھپڑ مارا ہے؟ انھوں نے کہا: جی ہاں امیر المؤمنین انھوں نے پوچھا: کیوں؟ حضرت علی نے بتایا کہ یہ شخص طواف کے دوران مومنوں کی عورتوں کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابوالحسن! آپ نے بہت اچھا کیا۔[1]

② حد سے کم کوڑے مارنا

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اکثر اوقات کوڑے بطور تعزیر مارتے تھے، مثلاً: ایک شاعر جس کا نام نجاشی تھا۔ اُس نے شراب پی اور رمضان میں روزہ نہیں رکھا۔ اُسے شراب کی حد کے کوڑے مارے گئے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مزید بیس کوڑے مارے اور فرمایا: میں نے تمھیں بیس زائد کوڑے اس لیے مارے ہیں کہ تم نے اللہ کے حضور دلیری کا مظاہرہ کیا اور رمضان میں روزہ نہیں رکھا۔[2]

③ ذلیل و رُسوا کرنا

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جرم کے مرتکب کو رُسوا کیا اور لوگوں کو اس کا حال بتایا جیسا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے جھوٹی گواہی دینے والے کے ساتھ کیا تھا۔ اس میں معاشرے کے لیے مصلحت کا پہلو ہے، تاکہ کوئی شخص جھوٹی گواہی نہ دے اور لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہونے پائیں۔ علی بن الحسین سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کسی جھوٹے گواہ کی گرفت

[1] الرياض النضرة في مناقب العشرة: 165/2. [2] موسوعة فقه علي بن أبي طالب للقلعجي، ص: 153، وكنز العمّال: 484/5، حديث: 13688.

فرماتے تو اُسے اس کے قبیلے میں بھیج دیتے تھے اور فرماتے تھے یہ جھوٹا گواہ ہے اسے اچھی طرح پہچان لو، پھر اُسے چھوڑ دیتے تھے۔[1]

زید بن علی اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے جھوٹے گواہ کا مواخذہ کیا، اسے تعزیری سزا دی اور اُس کے محلے میں اُسے گھمایا اور رُسوا کیا اور آئندہ کے لیے اس کی گواہی قبول کرنے سے منع فرمادیا۔[2]

④ قید

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کبھی قید کی سزا بھی دیتے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ نے نجاشی شاعر کو قید کر دیا۔ جس نے رمضان میں روزہ نہیں رکھا اور شراب پی لی تھی۔[3]

⑤ قید میں بیڑیاں

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ بدکردار اور شریر قسم کے لوگوں کو بیڑیاں پہنا دیتے تھے اور کسی کو یہ ذمہ داری سونپی جاتی تھی کہ وہ نماز کے وقت کھول دیا کرے۔[4]

⑥ تعزیراً قتل کی سزا

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں تعزیر کا معاملہ قتل تک بھی پہنچ سکتا ہے، جب جرم بہت بڑا ہو اور اس کے منفی اثرات انتہائی اہمیت کے حامل ہوں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی من گھڑت حدیث کی نسبت کی جائے، کیونکہ اس عمل کا نتیجہ دین میں ایسی چیز داخل کرنا ہے جو اس میں شامل نہیں ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ کے پسندیدہ دین سے

[1] موسوعة فقه علي، ص: 49. [2] موسوعة فقه علي، ص: 148. [3] مصنف ابن أبی شيبة: 36/10.

[4] موسوعة فقه علي، للقلعجي، ص: 156.

لوگوں کا منحرف ہو جانا ہے۔[1] یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے جو شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ کی نسبت کرے اُس کی گردن اڑا دی جائے۔[2]

7 جرائم کے وسائل کی تلفی

ربیعہ بن زکّار سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بستی دیکھی تو پوچھا یہ کونسی بستی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس بستی کو زرارۃ کہا جاتا ہے۔ یہاں لڑائیوں کے مقابلے ہوتے ہیں اور شراب فروخت کی جاتی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے آگ لانے اور اُس بستی کو جلا دینے کا حکم دیا اور فرمایا: بُرا بُرے کو کھا جائے گا، آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ کر وہ ساری بستی جل گئی۔[3] دراصل امیر المؤمنین نے اس بستی میں شراب کے سٹاک، اس سے متعلقہ مواد اور شراب کی تیاری میں استعمال ہونے والی اشیاء کو جلانے کا حکم دیا تھا۔[4]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قصاص و حدود، جرائم اور تعزیرات میں اجتہادات کے ذریعے سے قضاء کے ادارے کو بہت ترقی دی۔ ان کے اجتہادات وسعتِ علم، زبردست فہم و فراست اور مقاصدِ شریعت پر ان کے مکمل عبور کی دلیل ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہادات کے ذریعے سے فقہی مکتبہ ہائے فکر بنانے میں اپنا حصہ ادا کیا۔

[1] منهج علي بن أبي طالب في الدعوة إلى الله، ص: 324. [2] موسوعة فقه علي، ص: 154.
[3] كنز العُمّال، حديث: 13744، و الأموال لأبي عُبيد، ص: 103. [4] منهج علي في الدعوة إلى الله، ص: 325.

امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دور میں ریاست کا ادارہ

پہلی بحث: ریاست کے صوبے

اوّل: مکہ مکرمہ

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو خالد بن سعید بن العاص مکہ کے والی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی معزولی کا فیصلہ صادر فرمایا اور ابوقتادہ انصاری کو مکہ کا والی مقرر کردیا۔[1] یوں لگتا ہے کہ اُن کی ولایت کا دورانیہ مختصر رہا، کیونکہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے عراق کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو قثم بن عباس کو مکہ کا والی بنا کر بھیجا۔[2] اور ابوقتادہ انصاری کو معزول کردیا۔ اس طرح حضرت ابوقتادہ کی حکمرانی تقریبا دو ماہ تک ہی جاری رہ سکی۔ اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر حالات نہیں ملتے۔ قثم بن عباس کے بارے میں اکثر مصادر یہ بتاتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں بیک وقت مکہ، طائف اور اُن کے ماتحت علاقوں کا والی مقرر کردیا تھا۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مکہ سے متعلق اِس واقعہ کے سوا اور ایسے حالات نہیں ملے جو موسم حج اور اس پر مقرر کیے جانے والے والیوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تاریخ میں یہ بات نہیں ملتی کہ وہ اپنے دورِ خلافت میں حج کے لیے تشریف لائے ہوں کیونکہ وہ اسلامی ریاست کے مختلف اطراف میں درپیش آنے

[1] الولاية على البلدان: 3/2، وتاريخ ابن خياط، ص: 201. [2] سير أعلام النبلاء: 440/3. [3] الكامل في التاريخ: 398/3، الولاية على البلدان: 4/2.

والے فتنوں کی سرکوبی میں مصروف رہے اور اس دوران حالات پُرسکون نہ ہو سکے۔ آپ رضی اللہ عنہ موسم حج میں امیر الحُجاج روانہ فرماتے تھے، یوں لگتا ہے کہ 37ھ میں صرف قثم بن عباس رضی اللہ عنہما ہی حج کے ذمہ دار تھے، جبکہ 36ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس کو امیر الحجاج مقرر فرمایا اور عبیداللہ بن عباس کو 38ھ میں۔ [1]

تاریخی طور پر ان دونوں برسوں کے تعین کے مصادر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ البتہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام سے ایک شخصیت کو شام کے حجاج کے ساتھ روانہ کیا اور انھیں مکہ مکرمہ میں حج کا ذمہ دار بھی مقرر کیا، قریب تھا کہ اُن کے مابین لڑائی چھڑ جاتی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اُن کے مابین صلح کرادی اور بنی شیبہ میں سے ایک شخصیت کو حج کا ذمہ دار مقرر کر دیا، اس طرح حج امن وسلامتی کے ساتھ مکمل ہوگیا اور لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ [2]

قثم بن عباس اُس وقت تک مکہ کے والی رہے، جب تک بُسر بن ارطاۃ کی قیادت میں حضرت معاویہ کا لشکر نہیں آن پہنچا، لشکر کے آتے ہی قثم اپنی جان کے خطرے کے باعث وہاں سے چلے گئے۔ مکہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمرانی ختم ہوگئی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مکہ میں حکمرانی دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور لشکر روانہ کیے۔ لیکن یہ مہم کامیاب نہیں ہوئی تھی کہ اسی دوران امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے۔ [3]

دوم: مدینہ منورہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تینوں خلفائے راشدین کے دور میں مدینہ منورہ اسلامی ریاست کا دار الخلافہ رہا، خلیفہ بھی وہیں مقیم رہے، اور اپنی موجودگی میں تمام امور مملکت انجام دیتے رہے، البتہ سفر کی حالت میں وہ کسی کو نائب بنا دیتے تھے جو ان کی غیر موجودگی میں امور مملکت کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلافت پر متمکن ہونے کے بعد حالات

---

[1] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 192,191، 198، والولاية على البلدان: 4/2. [2] الولاية على البلدان: 4/2، وتاريخ الطبري: 79/6. [3] تاريخ الطبري: 80/6، والولاية على البلدان: 5/2.

یکسر بدل گئے۔ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ خاص طور پر طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے عراق کی طرف روانگی کے بعد اور واقعہ جمل سے پہلے ایسے حالات رُونما ہوئے کہ امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ سے عراق منتقل ہوگئے۔[1] بعض روایات کے مطابق سیدنا علی نے مدینہ میں سہل بن حنیف انصاری کو اپنا جانشین مقرر کیا۔[2] یہ معلوم نہیں کہ سہل بن حنیف کتنا عرصہ مدینہ کے والی رہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہاں ایک سال سے زیادہ اُن کی حکمرانی قائم رہی، وہ سن 37 ھ میں مدینہ کے والی تھے۔[3]

بعدازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سہل بن حنیف کو معزول کر کے تمام بن عباس کو مدینہ میں والی مقرر کیا۔ بعدازاں ابو ایوب انصاری کو والی مقرر کیا۔ وہ سن 40 ھ تک اس منصب پر فائز رہے، جب بُسر بن ارطاۃ کی قیادت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کا لشکر مدینہ میں پہنچا۔[4] تو ابو ایوب انصاری مدینہ سے کوفہ چلے گئے۔ اس طرح مدینہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمرانی برقرار نہ رہی۔ ان کی جگہ وہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور ہی میں مدینہ منورہ خلافت اسلامیہ کے دار الخلافہ کی بجائے دیگر ریاستوں کی طرح ایک ریاست میں تبدیل ہوگیا، اور سیاسی واقعات وحوادث سے دور ہوتا چلا گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی مصادر میں اس زمانے کا زیادہ تذکرہ نہیں ملتا، تا آنکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے یہاں غلبہ پالیا۔

سوم: بحرین اور عمان

شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت بحرین، بصرہ کی ریاست کے تابع تھا اور ابن عامر وہاں اپنے عامل مقرر کرتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں انھوں نے بحرین پر اُمراء کی ایک جماعت مقرر کردی۔ ان میں اہم ترین عُمر بن ابی سلمہ تھے، وہ مدینہ سے عراق کی طرف

---

[1] تاریخ خلیفة بن خیاط، ص: 8. [2] تاریخ خلیفة بن خیاط، ص: 181-201. [3] تاریخ الطبري: 53/6.
[4] سیر أعلام النبلاء: 409/3، والولایة علی البلدان: 3/2.

سفر کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی عازم سفر ہوئے تھے، بعد ازاں امیر المؤمنین نے انھیں کچھ مدت کے لیے بحرین کا والی بنا کر بھیجا۔ پھر عراق میں اپنے پاس بُلایا۔ بحرین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عاملین میں قدامہ بن العجلان الأنصاری، نعمان بن عجلان الأنصاری اور عبید اللہ بن العباس[1] کا ذکر بھی ملتا ہے۔

ملحوظ رہے کہ عبید اللہ بن عباس یمن کے والی تھے، شاید اس دوران بحرین اور نجد دونوں علاقے ان کے زیر نگیں تھے۔ طبرانی کی تعبیر سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور خلیفہ بن خیاط کی تعبیر میں اِن والیوں کی کوئی معین ترتیب نہیں ہے۔[2] مورخین نے بعض اُن عاملین کے نام بتائے ہیں جنھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمان روانہ کیا، ان میں سے ایک کو والی کی حیثیت سے روانہ کیا اور دوسرے کو عمان میں بغاوتوں کے خاتمے کے لیے لشکر کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔[3] ایک صاحب کو یمامہ کا عامل بنا کر بھیجا۔[4] شاید وہ والیٔ بحرین کے زیر نگرانی تھا۔[5]

چہارم: یمن کی ریاست

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت مکمل ہوگئی تو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبید اللہ بن عباس کو یمن کا والی مقرر کیا۔[6] عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والی اور جملہ حکام عبید اللہ کے پہنچنے سے پہلے ہی یمن سے جا چکے تھے اُن میں سے بعض جنگ جمل میں طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ شریک رہے۔ جمل کے لشکر کی تیاری میں بھی ان کا ہاتھ کارفرما تھا۔[7] عبید اللہ بن عباس صنعاء اور اس کے مضافات میں اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ سرکاری ذمہ داریاں ادا کرنے میں سعید بن سعد بن عُبادہ الأنصاری بھی شریک تھے۔[8]

---

[1] الإصابة: 562/3، والولاية على البلدان: 5/2، وتاريخ الطبري: 90/6. [2] الولاية على البلدان: 6/2. [3] تاريخ اليعقوبي: 95/2. [4] الولاية على البلدان: 6/2. [5] الولاية على البلدان: 6/2. [6] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 6. [7] مروج الذهب للمسعودي: 357/2، والولاية على البلدان: 6/2.
[8] الإستبصار لابن قدامه المقدسي، ص: 99.

یمن کے مسلمانوں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بہت گہرا اثر تھا۔ وہ حضرت عثمان کے خون ناحق پر بے حد غضبناک تھے۔ بعض اہل یمن نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہی نہ کی۔ وہ قاتلینِ عثمان کو قتل کرنے کا مطالبہ کررہے تھے۔ جب اس معاملے میں تاخیر ہوئی تو انھوں نے تحکیم کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما سے خط کتابت کی، انھوں نے بُسر بن ابی ارطاۃ کو بھیجا۔ اُن کی مدد سے ان کے لیے یمن پر اپنی حکمرانی قائم کرنے کا موقع ملا، لیکن یہ حالت تھوڑی دیر قائم رہی۔[1] بعدازاں عبید اللہ بن عباس نے دوبارہ اپنی حکمرانی قائم کرلی اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک یمن کے والی رہے۔[2]

پنجم: شام کی ریاست

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، امیر المؤمنین حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے ادوار میں شام کے والی تھے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے اُنھیں معزول کرنے اور اُن کی جگہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے شام کی ولایت سے انکار کردیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ قریبی رشتہ داری کے باعث معذرت پیش کی، امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں مجبور نہیں کیا اور شام کی طرف نہ جانے کے سلسلے میں ان کی معذرت قبول کرلی۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کی معذرت کے بعد امیر المؤمنین نے ان کی جگہ سہل بن حنیف کو بھیجا، لیکن شام کے قریب پہنچتے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لوگوں نے ان کو پکڑ لیا اور کہا کہ اگر تمھیں عثمان رضی اللہ عنہ نے بھیجا ہے تو خوش آمدید، اور اگر کسی اور نے بھیجا ہے تو واپس چلے جاؤ۔[3]

شام کی ریاست، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پورے دورِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے تابع رہی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اُس پر غلبہ نہ پاسکے۔ نہ اپنے عاملین اور امراء کا وہاں تقرر

---

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد علي، ص: 109. [2] تاريخ الطبري: 81,80/6، والولاية على البلدان: 7/2. [3] تهذيب تاريخ دمشق: 39/4، وخلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد علي، ص: 110.

کر سکے۔ شام کے مشرقی علاقے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکروں کے درمیان مقابلہ آرائیاں ہوئیں، جن میں سے اہم ترین جنگ صفین ہے جو سن 37ھ میں ہوئی۔ اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں مد مقابل تھے۔ ان معرکوں کے باوجود شام پر معاویہ رضی اللہ عنہ کا غلبہ جاری رہا۔[1]

ششم: الجزیرہ کی ریاست

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں الجزیرہ، شام کے زیر نگیں علاقوں میں سے ایک تھا۔ اور پھر اُن کی شہادت کے بعد شام، معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اور عراق، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیر نگیں رہا۔ الجزیرہ دونوں فریقوں کے مابین جھگڑے کا مقام تھا، کیونکہ الجزیرہ جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے ایک طرف شام سے اور دوسری طرف عراق سے جُڑا ہوا تھا۔[2] اور دونوں طرف سے اُس پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا تھا، اِسی کے حصول کے لیے دونوں طرف کے لشکروں کے مابین متعدد معرکے ہوئے، یوں لگتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غلبہ حاصل کرلیا۔[3] اور وہاں ''اشتر'' کو والی مقرر کر دیا جو الجزیرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والیوں میں بہت مشہور شخصیت ہیں۔[4] الجزیرہ میں ان کی تعیناتی ایک سے زیادہ مرتبہ ہوئی۔ بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُنھیں سَن 38ھ میں مصر کا والی بنا کر مصر بھیج دیا۔[5] اس طرح الجزیرہ میں پھر اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی وہاں غلبہ حاصل کرنے میں سرگرم ہوگئے۔ بعد ازاں وہاں متعدد معرکے ظہور پذیر ہوئے۔[6]

معلوم ہوتا ہے کہ 39ھ کے آخر میں وہاں کسی حد تک امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے غلبہ حاصل کرلیا تھا۔[7] الجزیرہ اُن شخصیات کی پناہ گاہ تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

---

[1] الولاية على البلدان: 8/2. [2] معجم البلدان: 135/2. [3] الأخبار الطوال للدّينوري، ص: 154، والولاية على البلدان: 8/2. [4] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 200. [5] تاريخ الطبري: 54/6. [6] الفتوح لابن أعثم الكوفي: 45/4، و الكامل: 379/3. [7] الكامل: 380/3.

دونوں سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے اور ان حضرات نے اِس دوران جب تک نزاع چلتا رہا بیعت نہیں کی۔[1] شاید کہ اس علاقے کو اختیار کرنے کی ایک وجہ الجزیرہ کا محل وقوع بھی تھا۔ بعض شخصیات کے نام ملتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے الجزیرہ کے والی رہے، ان میں شبیب بن عامر[2] اور کمیل بن زیاد شامل ہیں۔ شام کی طرف سے جو لشکر الجزیرہ پر حملہ آور ہوئے انھیں ان دونوں شخصیات نے روکنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، بلکہ انھوں نے الجزیرہ کی جانب سے شام پر حملے بھی کیے۔[3]

ہفتم: مصر کی ریاست

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو اُس وقت مصر پر محمد بن ابی حذیفہ بطور والی قابض تھے، حالانکہ حضرت عثمان نے اُنھیں وہاں مقرر نہیں کیا تھا، شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں وہاں کچھ عرصے تک برقرار رکھا، لیکن حضرت معاویہ نے وہاں لشکر روانہ کیا جس نے محمد بن ابی حذیفہ کو گرفتار کیا، جیل میں ڈالا اور پھر قتل کر دیا۔[4]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی حذیفہ کو مصر کا والی متعین نہیں کیا تھا، بلکہ انھوں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا، جب وہ قتل ہو گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد انصاری کو مصر کا والی مقرر کر دیا[5] اور انھیں حکم دیا کہ تمھیں وہاں کا والی مقرر کر دیا ہے، با اعتماد ساتھیوں کو ساتھ لے لو اور جاتے جاتے ایک لشکر بھی تیار کر کے ساتھ لے جاؤ، اس طرح تمھارے دشمن پر رُعب پڑے گا، جب مصر پہنچ جاؤ تو حسنِ عمل والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو! مشکوک لوگوں پر سختی کرو اور عام اور خاص سب کے ساتھ نرمی کا روّیہ اختیار کرو، نرمی ہی میں برکت ہے۔[6]

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 3/ 414. [2] الولایة علی البلدان: 2/ 9. [3] الفتوح لابن أعثم الکوفي: 4/50-52، وتاریخ الطبري: 6/19. [4] وُلاة مصر للکندي، ص: 42,43. [5] وُلاة مصر، ص: 44، والنجوم الزاهرة: 1/94. [6] الکامل في التاریخ: 2/354.

بہت سے مواقع پر قیس کی ذہانت کے مظاہر اور اچھے فیصلے نظر آئے، جب وہ مصر روانہ ہوئے تو وہاں ایک گروہ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ لوگ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر غم و غصے کا شکار تھے، پھر انھیں ایسے گروہ کے لوگوں سے بھی سابقہ پڑا جو قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک تھے۔ مصر پہنچنے سے پہلے انھیں کچھ شہسوار ملے، انھوں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہم مظلوم عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے ہیں اور قاتلین عثمان کو ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ وہ جہاں بھی پناہ لیں ہم اُن سے انتقام لیں۔ اُنھوں نے پھر پوچھا: آپ کا نام کیا ہے؟ انھوں نے بتایا: قیس بن سعد! جواب ملا: جائیے آپ اندر جا سکتے ہیں۔ پھر وہ مصر میں داخل ہو گئے۔[1] یہ وہ حکمتِ عملی تھی جس نے مصر میں قیس بن سعد کا داخلہ ممکن بنا دیا بعد ازاں انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہ والیٔ مصر بن کر آئے ہیں۔ شام کی جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جس شخص کو والی بنا کر بھیجا تھا اُس کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا تھا کہ وہاں کی فوجوں نے انھیں شام میں داخل نہیں ہونے دیا۔[2]

قیس بن سعد فسطاط پہنچے، بعد میں منبر پر چڑھے، اہل مصر سے خطاب کیا، انھیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا فرمان پڑھ کر سنایا اور امیر المؤمنین کے لیے ان سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ یہ خطاب سُن کر اہل مصر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے، ایک فریق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اور قیس بن سعد کی بیعت کر لی جبکہ دوسرے فریق نے توقف اختیار کیا، اور اس معاملے سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ قیس بن سعد نے دونوں فریقوں کے ساتھ دانائی کا معاملہ کیا۔ بیعت نہ کرنے والوں کو بیعت پر مجبور نہیں کیا۔ اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا، انھوں نے صرف اِسی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کنارہ کشی کرنے والوں کو اُن کے علاقے میں جا کر تحائف پیش کیے، اُن کی جانب سے ایک وفد ان کی خدمت میں آیا تو اِن کا اکرام کیا اور حسنِ سلوک سے پیش آئے۔[3]

---

[1] الولایة علی البلدان: 10/2، منقول از نهایة الأرب في تاریخ العرب للنویري. [2] تهذیب تاریخ دمشق: 39/4. [3] الکامل في التاریخ: 354/2، و وُلاة مصر، ص: 44.

اس حسن معاملگی کے نتیجے میں ٹکراؤ سے بھی بچت رہی اور مصر کے حالات کو سازگار بنانے میں بھی مدد ملی۔ جس کے نتیجے میں والیٔ مصر کو امور مملکت منظّم کرنے میں آسانی ہوگئی انھوں نے لوگوں کو مختلف ذمہ داریاں تفویض کیں، خراج کے معاملات منظّم کیے اور پولیس میں کچھ لوگوں کی تعیناتی فرمائی۔[1]

اس طرح ان کے لیے مصر کے ریاستی امور کی تنظیم و ترتیب اور تمام اہل معاملہ کو راضی رکھنا آسان ہوگیا۔ یہاں قیس بن سعد، معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے شام میں عسکری خطرہ اور سیاسی لحاظ سے اہم شخصیت بن گئے۔ کیونکہ مصر، شام سے قریب تر ہے۔ قیس بن سعد اپنی دانشمندی اور حزم و احتیاط کے ساتھ اپنی فوجی نقل و حرکت کے ذریعے سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے خطرہ بنتے چلے گئے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد سے خط کتابت شروع کردی جس میں ایک طرف انھیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی اور دوسری جانب لالچ اور ترغیب سے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ اس بارے میں قیس بن سعد کے جوابات ایسی زبردست ذہانت و فطانت کے آئینہ دار تھے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ قیس کا موقف اور دل کا بھید نہ سمجھ سکے، ان کے مابین خط کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت معاویہ اور قیس بن سعد کے مابین خط کتابت کے حوالے سے بہت سی رافضی روایات مشہور ہوچکی ہیں جنھیں ابو مخنف نے تاریخی کتابوں میں درج کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہیں۔ یہ رافضی ان روایات کے بیان میں متفرد ہے۔ جرح و تعدیل کے علماء نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

ابن الاثیر، ابن کثیر، ابن خلدون اور ابن تغری بردی،[2] ان سب نے طبری سے ابو مخنف کی روایت حذف و اختصار کے بعد نقل کی ہے۔ کندی نے بھی عبدالکریم بن الحارث کے حوالے سے یہ بات بیان کی ہے کہ جب قیس بن سعد کا معاملہ، معاویہ رضی اللہ عنہ پر بوجھ بننے لگا تو انھوں نے مدینہ میں بنی امیہ کے ایک آدمی کو لکھا: اللہ تعالیٰ قیس بن سعد کو جزائے خیر

---

[1] الولایة علی البلدان: 11/2، و النجوم الزاهرة: 98/1. [2] تاریخ ابن خلدون: 1092/4، و النجوم الزاهرة: 97/1، و البدایة والنهایة: 251/7.

دے، یہ بات چھپائے رکھو، مجھے ڈر ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کو یہ بھید معلوم نہ ہو جائے کہ اُس کے اور ہمارے ساتھیوں کے درمیان تعلقات ہیں مُبادا وہ اسے معزول کر دیں۔

یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئی، اہل عراق اور اہل مدینہ کے رؤساء جو آپ کے ساتھ تھے کہنے لگے: قیس بدل گئے ہیں، ان میں تبدیلی آ گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تم پر رحم فرمائے! قیس ایسے نہیں ہیں، وہ کہنے لگے: قیس بدل گئے ہیں آپ کو انھیں ضرور معزول کرنا ہوگا۔ جب وہ مسلسل اصرار کرتے رہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد کو لکھا: اس وقت مجھے آپ کی قربت کی ضرورت ہے، کسی کو اپنا نائب بنا کر میرے پاس آ جایئے۔[1]

ولایتِ مصر میں محمد بن ابی بکر کا تقرر

بعض لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قیس بن سعد کے درمیان بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ انھیں معزول کر دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض مشیروں نے ان سے قیس کی معزولی کا مطالبہ بھی کر دیا۔ اور اُن کے بارے میں جو باتیں لوگوں میں پھیل گئی تھیں اُنھیں سچ گردانا اور ان کی معزولی پر اصرار کیا، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں لکھا کہ مجھے اس وقت آپ کی قربت کی ضرورت ہے، کسی شخص کو اپنا نائب مقرر کر کے میرے پاس آ جایئے۔[2]

یہ خط گویا قیس بن سعد کی ولایتِ مصر سے معزولی کے مترادف تھا۔ اکثر اقوال کے مطابق حضرت علی نے ان کی جگہ اشتر نخعی کو مقرر کیا۔[3] پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشتر نخعی کے مصر روانہ ہونے سے پہلے اُن سے ملاقات کی، اہل مصر کے حالات بیان کیے اور فرمایا: اللہ کا نام لو اور اُس کی مدد سے روانہ ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ میں تمھیں کوئی وصیت نہیں کر رہا، خود تمھاری رائے ہی کافی ہے، اہم امور میں اللہ سے مدد مانگو اور سختی و نرمی کے

[1] وُلاة مصر، ص:46,45، اس روایت میں مدائنی راوی ہے جسے صدوق کہا گیا اور باقی راوی ثقہ ہیں، البتہ یہ روایت مرسل ہے۔ [2] وُلاة مصر، ص:46,45۔ [3] فتوح البلدان، ص: 229، والولایة علی البلدان: 12/2.

ملے جلے انداز سے معاملات سلجھاؤ، وہاں نرمی اختیار کرو جہاں نرمی مناسب ہو اور وہاں پُر عزم رہو، جہاں سختی کے بغیر چارۂ کار نہ ہو۔

اشتر نخعی نے مصر کا رُخ کیا تو اُن کے ساتھ اُن کے اصحاب کا ایک گروہ بھی تھا، جب وہ بحر قلزم، بحر اَحمر کے اطراف میں پہنچے، تو مصر میں داخل ہونے سے پہلے ہی فوت ہو گئے، کہا جاتا ہے کہ اُنھیں شہد ملا کر زہریلا مشروب پلا دیا گیا، جس کی وجہ سے وہ وفات پا گئے۔ اہل خراج میں سے کچھ لوگوں نے یہ الزام لگایا کہ انھیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ترغیب پر زہر دیا گیا تھا۔[1]

اشتر نخعی کے قتل کا وہ الزام جس کا رُخ معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف تھا، صحیح سند سے ثابت نہیں ہو سکا۔ ابن کثیر نے اِسے بعید از حقیقت قرار دیا ہے۔[2] ابن خلدون کا بھی یہی کہنا ہے۔[3] ڈاکٹر یحییٰ نے بھی اُن سے موافقت کا اظہار کیا ہے،[4] اور میں بھی اسی قول کی طرف مائل ہوں۔

"اشتر نخعی، مصر میں اپنی ذمہ داری شروع کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے، اس کے باوجود تاریخی مصادر میں اُنھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے مصر میں مقرر کردہ والی کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کے بعد محمد بن ابی بکر مصر کے والی مقرر ہوئے۔"[5]

اس سے پہلے محمد بن ابی بکر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں مصر میں رہ چکے تھے، روایات سے پتہ چلتا ہے کہ محمد بن ابی بکر، سابق والی قیس بن سعد کی مصر سے روانگی سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے اور ان دونوں کے درمیان مکالمہ بھی ہوا، جس میں قیس بن سعد نے انھیں چند نصیحتیں بھی کیں۔ خاص طور پر شہادت عثمان کی بنیاد پر غم و غُصہ کا اظہار کرنے والے لوگوں اور ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے ابھی تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی، ضروری مشورے دیے۔

[1] النجوم الزاهرة: 104/1، وسير أعلام النبلاء: 34/4. [2] البداية والنهاية: 303/8. [3] تاريخ ابن خلدون: 1125/4. [4] مرويات أبي مخنف، ص: 224. [5] النجوم الزاهرة: 106/1.

قیس بن سعد نے کہا: اے ابو القاسم! تم امیر المؤمنین کے پاس سے آرہے ہو اور اُن کا مجھے معزول کرنا اس امر سے مانع نہیں کہ میں تمھیں نصیحت کروں۔ میں تمھارے امور کو علی وجہ البصیرت سمجھتا ہوں۔ ان لوگوں کو جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی، انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو ان کی طرف توجہ دو۔ اور اگر وہ پیچھے رہنا ہی پسند کریں تو اُن سے کچھ نہ مانگو، لوگوں سے اُن کے مرتبہ و مقام کے مطابق معاملہ کرو۔ اگر تم بیماروں کی عیادت کرو اور جنازوں میں حاضری دو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے آپ کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔[1]

محمد بن ابی بکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو عہد باندھا تھا، وہ ساتھ لے کر آئے، یہ عہد اہل مصر کو سُنایا اور ان سے خطاب کیا۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی بنانے کے بعد ایک خط لکھا۔[2]

یہ خط صرف ریاست کے سیاسی معاملات کے بارے میں نہیں تھا بلکہ اِس میں اللہ کی طرف دعوت دینے کی زبردست اہمیت اُجاگر کی گئی تھی، اس میں لکھا تھا: اے محمد! خوب اچھی طرح جان لو کہ تم دنیا میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے جتنے ضرورت مند ہو اُس سے کہیں زیادہ آخرت میں اپنا حصہ اور نصیب حاصل کرنے کے محتاج ہو، اگر تمھارے سامنے دو معاملے پیش آئیں، ایک کا تعلق آخرت سے ہو اور دوسرے کا تعلق دنیا سے ہو، تو آخرت کے امور سے اپنے کام کی ابتدا کرو، خیر و بھلائی کی جانب تمھاری رغبت زیادہ ہو، نیک نیت رہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندے کو اُس کی نیت کے مطابق عطا کرتا ہے۔

جب بندہ خیر و بھلائی والوں سے محبت کرے اور اس پر عمل نہ بھی کرے تو ان شاء اللہ وہ عمل کرنے والوں میں سے ہو جائے گا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر فرمایا تھا: ''مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم اللہ کی زمین پر کہیں بھی چلے ہو یا کسی بھی

[1] وُلاۃ مصر، ص: 50، والولایة علی البلدان: 13/2. [2] الکامل فی التاریخ: 356/2.

وادی میں تم نے پڑاؤ ڈالا ہو، وہ تمھارے ساتھ تھے، انھیں بیماری نے مدینہ میں رہنے پر مجبور کردیا ہے۔'' (حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) یعنی اُن کی نیت غزوہ میں جانے کی تھی۔[1]

اے محمد! خوب جان لو کہ میں نے تمھیں اپنے بہترین لشکروں پر والی بنایا ہے اور وہ اہل مصر ہیں۔ تمھارا فرض ہے کہ اُن کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور دین کے معاملات میں حزم و احتیاط سے کام لو، مخلوق کی خوشنودی کے بالمقابل اپنے رب کو ناراض نہ کرو، ظالم پر سختی کرو۔ اہلِ خیر کے ساتھ نرمی سے کام لو، انھیں اپنے قریب رکھو۔ انھیں اپنا ہم راز اور بھائی بناؤ۔ والسلام۔

محمد بن ابی بکر نے ریاست کے والی کی ذمہ داریاں نبھانی شروع کردیں، ان کی ذمہ داری کا پہلا سال اطمینان سے گزر گیا۔ لیکن معاملات میں تبدیلی آنے لگی، محمد بن ابی بکر نے قیس بن سعد کی نصیحت پر عمل نہ کیا۔ انھوں نے اُن لوگوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا شروع کیا جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی، انھیں خط لکھے کہ وہ بیعت کرلیں، جب اُن کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں آیا تو انھوں نے کچھ لوگوں کو یہ حکم دے کر روانہ کیا کہ اُن کے مکان گرادو، انھیں ان کے مال سے محروم کردو اور انھیں قید میں ڈال دو۔ اس اقدام کا رد عمل ہوا اور ان لوگوں نے محمد بن ابی بکر کے خلاف جنگ کا ماحول پیدا کردیا۔[2]

پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص کی قیادت میں ایک لشکر تیار کیا اور حکم دیا کہ مصر کے خلاف جنگ کرو۔ وہ محمد بن ابی بکر کے مخالفین کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح اُن کی قوت میں اتنا اضافہ ہوا کہ انھیں دس ہزار جنگجوؤں کی کمک مل گئی، اُن میں مَسلَمہ بن مخلد اور معاویہ بن خدیج بھی شامل تھے۔[3] اُن کے اور محمد بن ابی بکر کے مابین سخت معرکے ہوئے جن کا اختتام معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکروں کے مصر پر قابض ہونے اور محمد بن ابی بکر کی شہادت کی صورت میں سامنے آیا، اِس طرح سن اڑتیس (38) ھ میں مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔[4]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2839. [2] الكامل في التاريخ: 357/2. [3] تاريخ الطبري: 11/6. [4] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 19، و تاريخ الطبري: 5/6.

ہشتم: ریاستِ بصرہ

بصرہ کے سابق والی عبد اللہ بن عامر، جنھوں نے اپنی ذمہ داری چھوڑ کر مکہ مکرمہ کا رُخ کر لیا تھا، اُن کی جگہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عثمان بن حنیف انصاری کو بصرہ کا امیر مقرر فرما کر بھیجا۔ عثمان بن حنیف اُس علاقے سے آگاہ اور تجربہ کار تھے۔ اس سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو السواد کے علاقے پر پیمائش اور خراج کی مقدار کا اندازہ لگانے کے لیے عامل مقرر فرما چکے تھے۔[1] عثمان بن حنیف بصرہ کی طرف چل دیے اور پُر امن ماحول میں وہاں داخل ہوئے۔ لیکن اہل بصرہ تین گروہوں میں بٹ چکے تھے، ایک گروہ کے لوگ وہ تھے جنھوں نے بیعت کی اور اجتماعیت کا حصہ بن گئے، دوسرے گروہ نے علیحدگی اختیار کر لی اور کہا کہ ہم اہلِ مدینہ کا ردّ عمل دیکھیں گے، جو وہ کریں گے وہی ہم بھی کریں گے۔ اور تیسرے گروہ نے بیعت میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔[2]

اس ریاست میں عثمان بن حنیف زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکے، جمل کے معرکہ سے پہلے طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر بصرہ کی طرف آ گئے، اُن کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل تھے جو خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کر رہے تھے، حالات میں تبدیلی آئی اور لڑائی کی شکل پیدا ہو گئی، عثمان بن حنیف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ اِدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ کا رُخ کیا اور راستے میں اُن کی ملاقات ہو گئی۔ یہ جمل کے واقعہ سے کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ اس طرح عثمان بن حنیف کی ولایت ختم ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بصرہ پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور اِسی دوران جمل کا واقعہ پیش آ گیا جو تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ سے کوچ کرنا چاہا تو وہاں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو والی مقرر کر دیا۔

---

[1] سير أعلام النبلاء: 320/2. [2] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد علي، ص: 107، وتاريخ الطبري: 492/5.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ ساتھ زیاد بن ابیہ کو خراج کی ذمہ داری پر مامور کیا، اور ابن عباس کو حکم دیا کہ سرکاری معاملات میں اُس سے مشورہ کرتے رہیں اور اُس کی رائے لیتے رہیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے کام میں تجربہ کاری اور سیاسی امور میں ذہانت و فطانت کی روشنی دیکھ لی تھی۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کچھ نصیحتیں بھی فرمائیں، اُن میں سے چند یہ ہیں: میں تمھیں اللہ کا تقوی اختیار کرنے اور اپنے زیرنگیں لوگوں کے لیے انصاف کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اپنی شخصیت اور اپنے علم وحکمت سے کام لو۔ کُھلے دل کا مظاہرہ کرو، کینہ سے بچو، یہ دل اور حق کی موت کا سبب ہے، خوب جان لو کہ جو بات تمھیں اللہ کے قریب کردے گویا اُس نے تمھیں جہنم سے دور کردیا ہے، تمھارا جہنم سے قریب ہونا اللہ سے دوری کا باعث ہوگا، بہت کثرت سے اللہ کا ذکر کرو اور کبھی غافلوں میں سے نہ ہونا۔[2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی ولایت میں سرکاری ذمہ داریاں ادا کرنی شروع کر دیں۔ وہ ایک ایسے صحابی ہیں جن کا قرآن وتفسیر میں علم بہت وسیع ہے۔ انھوں نے بصرہ کے زیرسایہ سجستان میں امنِ عامہ کے مسائل یقینی بنیادوں پر حل کرکے اپنی انتظامی لیاقت بھی ثابت کردی۔ صوبۂ فارس میں زیاد بن ابی سفیان کو والی مقرر کیا، وہ جب بھی بصرہ سے باہر جاتے تھے اُنھی کو اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ انھوں نے امن عامہ کے مسائل پر خوب قابو پایا۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں ممتاز تھے۔ وہ تمام اہم واقعات میں ان کے ساتھ رہے، اُن کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کا سلوک کرتے رہے۔ اُن کا دفاع بھی کرتے رہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن پر اعتماد کرتے تھے، اُن سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ اُنتالیس (39) ہجری تک، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ کے والی کی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے، پولیس اور محکمۂ مال کے حکام نے اُن کے ساتھ تعاون

[1] تاریخ الطبري: 580/5. [2] وقعة صفین للمنقري، ص: 105، و الولایة علی البلدان: 15/2.

کا رویّہ رکھا۔ بعض روایات کے مطابق وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بصرہ کے والی رہے۔ سَن چالیس (40) ہجری کے واقعات کے حوالے سے طبری کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ سے نکلے اور مکہ چلے گئے، عام اہل سیرت کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما امیر المؤمنین کی شہادت تک بصرہ ہی میں اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے، اُن کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین صلح ہوگئی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما مکہ مکرمہ چلے گئے۔[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بصرہ کی ولایت کے دوران بہت اہم کام انجام دیے، جب سجستان کے والی کو سن چھتیس ہجری میں خارجیوں کے ایک گروہ نے قتل کر دیا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم پر بصرہ سے ایک لشکر روانہ کیا، اہل لشکر نے خارجیوں کو قتل کیا اور وہاں امن وامان قائم کر دیا۔[2]

صفین کے معرکہ میں بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بصرہ کے جنگجوؤں کا بڑا کردار ہے۔[3]

انھوں نے اپنی وِلایت کے ماتحت بعض صوبوں کے امور کو منظّم ومرتب کیا اور وہاں اُمراء کا تقرر کیا، فارس کی طرف زیاد بن ابیہ کو روانہ کیا، انھوں نے وہاں اصلاح وترتیب کا کام انجام دیا، وہاں کے رہنے والوں کو سرکشی پر سزائیں دیں۔[4] اُن کے دور میں اہل اِصطخر نے بغاوت کی تو اُن کی بھی سرکوبی کے انتظامات کیے۔[5]

سَن اڑتیس ہجری میں معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو بصرہ بھیجا، لیکن بصرہ میں ابن عباس کے نائب زیاد بن ابیہ نے اُس کا مقابلہ کیا، تا آنکہ وہ شخص بصرہ کے ایک محلے میں مارا گیا۔[6]

ابن عباس رضی اللہ عنہما عراق کے مضافات میں مختلف سرگرمیوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ

---

[1] تاريخ الطبري: 580/5. [2] الكامل في التاريخ: 352,351/2. [3] الولاية على البلدان: 16/1، وتاريخ الطبري: 595/5-615. [4] تاريخ الطبري: 53,52/6. [5] الأخبار الطوال،ص: 205، والولاية على البلدان: 16/2. [6] الولاية على البلدان: 16/2 منقول از تاريخ خليفة بن خياط.

رہتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب بصرہ میں موجود ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو مسلسل خط کتابت کے ذریعے مختلف امور سے مطلع کرتے رہتے اور اُن سے رائے لیتے۔ اسی طرح ابن عباس بھی اُمور وِلایت کے بارے میں خط لکھتے، حضرت علی نے سن اڑتیس ہجری میں اُنھیں اپنا نائب بنا کر امیر حج مقرر کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی بصرہ کے والی رہے۔ سابقہ گفتگو سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت لینے کے فوراً بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والیٔ بصرہ عامر کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ عثمان بن حنیف کو والی مقرر کیا لیکن جمل کے واقعات کے باعث بصرہ میں غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہوگئی اور بصرہ عثمان بن حنیف کے ہاتھ سے نکل گیا، لہٰذا انھوں نے مجبوراً وہاں سے کوچ کیا تا آنکہ جمل کے واقعات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہاں کے امور نئے سرے سے منظم و مرتب کیے۔[1]

خوارج کی تحریک کے نتیجے میں بھی بصرہ میں اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی، اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب بصرہ پر غلبہ پانے کی کوشش کی تب بھی حالات غیر یقینی تھے۔ ان تمام حالات وحوادث کے باوجود بصرہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پورے دور میں انھی کے تابع اسلامی ریاستوں میں سے ایک تھا اور اُن کے حریف اُس پر غلبہ نہ پا سکے۔[2]

بصرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قائدانہ صلاحیتیں اجاگر ہوئیں، انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مصاحبت سے بہت کچھ سیکھا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس شخصیت سے میں نے بھرپور استفادہ کیا وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھے خط لکھا: آدمی جو چیز پا نہیں سکتا اُس کا فوت ہو جانا اُسے بُرا لگتا ہے، اور جس چیز کا ملنا یقینی ہو اُسے پا لینے سے اُسے خوشی ہوتی ہے، آخرت کے حوالے سے جو حاصل ہوا اُس پر خوش ہو جاؤ۔ آخرت کے اعتبار سے

[1] الولایة علی البلدان: 2/17. [2] الولایة علی البلدان: 2/17.

اگر کچھ حاصل نہیں ہوا تو اس پر تمھیں افسوس ہونا چاہیے، دنیا میں جو کچھ حاصل ہو جائے اُس پر زیادہ خوش نہیں ہونا اور دنیا میں جو چیز نہیں ملی اُس پر ملال کی چنداں ضرورت نہیں، موت کے بعد کی زندگی کو اہمیت دینی چاہیے۔

نہم: ولایتِ کوفہ

جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اس وقت کوفہ میں اُن کے والی ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کی بیعت لینے کے بعد اُنھیں اسی منصب پر برقرار رکھا۔ اُنھوں نے اہلِ کوفہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں بیعت لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل کوفہ کا یہ موقف لکھ بھیجا کہ اکثریت نے بیعت کر لی ہے۔[1] جب امیر المؤمنین مدینہ سے عراق روانہ ہوئے تو خاص طور پر ابو موسیٰ کے بارے میں پوچھتے رہے۔ کوفہ کی طرف سفر کے دوران اُنھیں اہل کوفہ کا ایک آدمی ملا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس سے ابو موسیٰ کے بارے میں سوال کیا تو اُس نے کہا: اگر آپ کو مصالحت کا رویہ مطلوب ہے تو ابو موسیٰ اس کے لیے بہت مناسب آدمی ہیں اور اگر آپ کا لڑائی کا ارادہ ہے تو ابو موسیٰ اس کے لیے مناسب نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں تو اصلاح ہی چاہتا ہوں، اُس آدمی نے کہا: میں نے آپ کو صحیح بات بتا دی ہے۔[2] بعد میں یہی بات سامنے آئی کہ ابو موسیٰ اشعری، صلح پسند تھے، مفاہمت کے قائل تھے اور مسلمانوں کے مابین لڑائی کے خلاف تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر، عمار بن یاسر اور حسن بن علی رضی اللہ عنہم وغیرہ کو مختلف وفود کی شکل میں اہل کوفہ کی طرف بھیجا کہ وہ میدان میں نکل آئیں۔ یہ جمل کے واقعہ سے پہلے کی بات ہے۔ اس بارے میں تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ اہل کوفہ نے ابو موسیٰ اشعری سے اُن کا موقف معلوم کرنے اور میدان میں نکلنے کے بارے میں مشورہ کیا تو انھوں

[1] تاريخ الطبري: 467/5. [2] تاريخ الطبري: 511/5.

نے فرمایا: آخرت کا راستہ تو یہ ہے کہ تم یہیں قیام کرو (اور میدان میں نہ نکلو) اور دنیا کا راستہ یہ ہے کہ تم نکل کھڑے ہو، اب تم بہتر جانتے ہو۔[1]

اہل کوفہ اور حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے درمیان متعدد بار طویل مذاکرات ہوئے۔ بعد ازاں بہت سے اہل کوفہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلنے کے قائل ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے ساتھ تقریباً نو ہزار آدمی نکلے۔[2] بہت سی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمل کے واقعہ سے کچھ پہلے کوفہ میں ابوموسیٰ اشعری کی وِلایت ختم ہوگئی، بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشتر، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے سردارانِ لشکر میں سے ایک تھا، اُس نے ابوموسیٰ اور اُن کے بچوں کو کوفہ کے محل سے بھگا دیا اور خود غلبہ حاصل کر لیا۔[3]

دوسری طرف بعض اور روایات یہ کہتی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ کو اُن کی معزولی کا خط لکھا اور اُن کی جگہ قرظہ بن کعب انصاری کو کوفہ کا والی مقرر کیا۔[4]

پھر جمل کے واقعہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ تشریف لائے۔ اُس وقت کوفہ دار الخلافہ قرار پا چکا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ اور ماتحت امارات میں براہ راست خود ذمہ دار حکمران تھے۔ اُن کی خلافت کے بقیہ دور میں کوفہ کو خاص مقام حاصل رہا۔

امیر المؤمنین کوفہ ہی سے مملکت کے اطراف و اکناف کی نگرانی فرما رہے تھے۔ وفود بھی یہیں آتے تھے، لشکر بھی یہیں سے روانہ ہوتے۔ خلافتِ علی رضی اللہ عنہ کے پورے دور میں کوفہ میں تجارتی اور آباد کاری کی نشاط کاریوں کا بڑا کردار رہا۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ سے متعلقہ تمام کام اہتمام سے انجام دیتے تھے۔ اہل کوفہ کے مسائل کا جائزہ لیتے، مختلف ولایات میں والی کی عدم موجودگی کی صورت میں نائبین کا تقرر فرماتے۔ جب انھوں نے صفین کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو ابومسعود البدری کو کوفہ کا والی بنایا۔[5] جب نہروان میں خوارج سے لڑائی کا ارادہ کیا تو کوفہ کا والی ہانی بن ہوذۃ النخعی کو بنایا۔[6]

[1] تاريخ الطبري: 508/5. [2] تاريخ الطبري: 517/5. [3] تاريخ الطبري: 519/5. [4] الاستبصار لابن قُدامة، ص: 124، والولاية على البلدان: 19/2. [5] سير أعلام النبلاء: 493/2. [6] الولاية على البلدان: 20/2، وتاريخ خليفة بن خياط، ص: 187، 202.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کوفہ ہی میں رہے تا آنکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی۔[1]
اندازہ ہوتا ہے کہ کوفہ کے والی اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے مگر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُسے دار الخلافہ بنایا تو وہاں کی وِلاء کے وہ خود ہی ذمہ دار بن گئے۔ اپنی غیر موجودگی کے دوران وہ کسی نہ کسی کو نائب ضرور مقرر فرماتے تھے، امیر المؤمنین کے قیام کے باعث کوفہ کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔[2]

دہم: مشرقی ریاستیں

① فارس: تاریخی مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سہل بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ کو فارس کا والی بنایا۔ وہ کچھ عرصہ وہاں والی رہے۔ پھر اہل فارس نے اُن کی اطاعت سے انکار کیا اور سینتیس ہجری کے لگ بھگ اُنھیں نکال دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رابطہ کیا اور فارس کے بارے میں گفتگو کی، اُس وقت ابن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ میں تھے، لوگوں کی ایک جماعت کے مشورے سے یہ طے پایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے معاون زیاد بن ابی سفیان کو فارس بھیج دیں۔[3]
معلوم ہوتا ہے کہ ولایتِ بصرہ اور صوبہ فارس کے درمیان واضح رابطے موجود تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما ولایت بصرہ کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ صوبہ فارس کی ذمہ داری کا بھی احساس رکھتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے خاص معاون زیاد کو وہاں بھیجا تا کہ وہاں کے امور منظّم کیے جاسکیں۔ زیاد نے چار ہزار افراد کے لشکر کے ساتھ فارس کا رُخ کیا۔ وہاں سے فتنے کا خاتمہ کیا اور اُس پر مکمل کنٹرول کرلیا۔[4]
زیاد اپنی سیاسی اہلیت وصلاحیت کے باعث شہرت پاگئے کہ انھوں نے کم سے کم نقصان کے ساتھ ان علاقوں پر دوبارہ قابو پالیا۔ طبری کہتے ہیں کہ جب زیاد فارس آئے تو

[1] الولاية على البلدان: 20/2. [2] الولاية على البلدان: 20/2. [3] تاريخ الطبري: 71/6. [4] تاريخ الطبري: 53/6.

وہاں کے سرداروں کو بُلا بھیجا، مدد کرنے والوں سے وعدے وعید کیے اور دیگر لوگوں کو ڈرایا دھمکایا اور ان میں پھوٹ ڈال دی، ایک فریق کو دوسرے کے عیب بتائے، ایک گروہ بھاگ گیا۔ دوسرا ڈٹا رہا۔ یہی عمل اُنھوں نے کرمان میں کیا۔[1]

پھر واپس فارس آگئے، بعض لوگوں کو منایا اور بعض لوگوں کے مطالبے پورے کردیے، اس طرح لوگ پُرسکون ہوگئے اور شہروں کے شہر اُن کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔[2] زیاد نے فارس کے معاملات بہترین طریقے سے منظّم و مُرتّب کیے اور کچھ قلعے بھی تعمیر کیے۔ خراج کے معاملات کو ترتیب دیا۔ ماتحت علاقوں میں انضباطی کارروائیاں کیں اس طرح تمام علاقے پُرسکون ہوکر زیرنگیں آگئے۔[3]

زیاد، خلافتِ علی رضی اللہ عنہ کے بقیہ دور میں والی کے منصب پر قائم رہے۔ مختلف والیانِ فارس میں سب سے زیادہ مشہور یہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اعلیٰ سیاسی اور انتظامی لیاقت اور صلاحیت کے حکمران تھے۔[4] صوبہ فارس کو انتظامی طور پر تقسیم کردیا گیا تھا۔ صوبے کے اندر مختلف علاقوں میں مختلف والی رہے۔ اس سلسلے میں اصطخر کا ذکر ملتا ہے کہ وہاں کے والی منذر بن جارود تھے۔[5] اُن کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان خط کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔[6] زیاد اس صوبے میں سکونت پذیر رہے، شہادتِ علی رضی اللہ عنہ کے بعد یہاں قلعہ بند ہوگئے۔[7]

فارس کے شہروں میں اصبہان (اصفہان) کا نام بھی ملتا ہے۔ یہ یہاں کا بڑا ضلع شمار ہوتا ہے۔[8] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے وہاں والی محمد بن سلیم تھے۔[9] اصفہان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ ایک اور مشہور والی ''عمر بن سلمہ'' بھی تھے، وہ اصفہان سے امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بہت سا مال اور غلّہ لے کر آئے تھے۔[10] سن

[1] تاریخ الطبري: 53/6. [2] تاریخ الطبري: 52/6. [3] تاریخ الطبري: 53/6. [4] الولایة علی البلدان: 21/2. [5] الطبقات الکبری: 561/5. [6] تاریخ الیعقوبي: 203/2، والولایة علی البلدان: 22/2. [7] الأخبار الطوال، ص: 219، والولایة علی البلدان: 22/2. [8] معجم البلدان: 207/1. [9] الأخبار الطوال، ص: 153. [10] الکامل في التاریخ: 442/2.

اُنتالیس ہجری میں فارس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران درہم بنانے والی ایک ٹکسال بھی تھی، اُن میں سے بعض درہم آج بھی عراقی عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ اُن پر عربی عبارات اور تاریخ درج ہے۔[1]

2 خراسان

خراسان وسیع وِلایت شمار ہوتا ہے، خلفائے راشدین کے دور میں یہ علاقہ براہ راست یا بالواسطہ ولایتِ بصرہ سے مربوط تھا۔ خلافت علی رضی اللہ عنہ میں بہت سے ایسے واقعات کا تذکرہ ملتا ہے جو اِس دور میں اس علاقے میں وقوع پذیر ہوئے، وہاں کے ضلعوں اور شہروں کے حوالے سے بعض والیوں اور اُمراء کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ خراسان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے پہلے والی عبد الرحمٰن بن ابزی تھے۔[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی طرف سے خراسان کے ایک والی جَعدہ بن ہُبَیرہ بن ابی وہب تھے۔[3]

حضرت علی نے صفین کے معرکے سے واپسی پر سن سینتیس ہجری میں اُنھیں خراسان روانہ کیا۔ اہل خراسان مرتد ہو گئے تھے، انھوں نے اُنھیں سرزنش کی اور حالات کو از سر نو منظّم و مرتب کیا۔[4]

لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہوئے اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر کے سردار کو خراسان روانہ کیا، انھوں نے وہاں رہنے والے لوگوں کے ساتھ مفاہمانہ رویّہ اختیار کیا، اور تمام انتظامات صحیح بنیادوں پر قائم کر دیے۔[5] سجستان بھی خراسان کا ایک پڑوسی صوبہ تھا۔ اور یہ دونوں صوبے بڑی حد تک والی بصرہ کے ماتحت تھے اور ان دونوں صوبوں کے مابین انتظامی روابط بھی تھے۔

---

[1] الدراهم الإسلامية للخلفاء الراشدين لوداد القزاز، ص: 5. [2] فتوح البلدان، ص: 399. [3] تهذيب الكمال: 191/1، و الولاية على البلدان: 23/2. [4] فتوح البلدان، ص: 399، والولاية على البلدان: 23/2. [5] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 199، والولاية على البلدان: 23/2.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران سجستان کے بعض والیوں کا تذکرہ ملتا ہے، ان میں سے ایک عبد الرحمٰن بن جزء الطائی ہیں۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُنھیں جمل کے واقعہ کے بعد سجستان بھیجا، عرب کے چوروں نے انھیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور شہر میں فتنہ و فساد پھیلایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کو لکھا کہ وہ سجستان کی طرف کسی اور کو امیر بنا کر بھیجیں۔ انھوں نے رِبعی بن کا ٔس العنبر ی کو روانہ کیا، رِبعی بن کا ٔس نے عرب چوروں کے سرغنے کو قتل کر کے فساد کا خاتمہ کر دیا۔

اور صوبے کی باگ ڈور سنبھال لی، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک وہاں اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔[2]

ہمذان مشرقی سرحد پر ہے۔ شہادتِ عثمان کے وقت وہاں کے والی جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کی بیعت لینے اور عراق پہنچنے کے بعد ہمذان میں جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا۔ انھیں اپنی خلافت کے لیے لوگوں سے بیعت لینے کا حکم دیا۔ پھر اپنے پاس بلایا۔[3]

یہ پیغام ایک خط کی صورت میں ایک قابل اعتماد آدمی کے ذریعے بھیجا اور فرمایا: میں آپ کی طرف فلاں آدمی کو بھیج رہا ہوں، اُس سے جو پوچھنا ہو پوچھ لو اور میرا یہ خط عام مسلمانوں کو پڑھ کر سُنا دو۔[4]

جریر، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کوفہ گئے تو انھوں نے انھیں معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف شام بھیج دیا، بعد ازاں جریر واپس آ گئے۔ ایک موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سے بعض افراد نے جن میں اشتر وغیرہ شامل تھے اُن سے توہین آمیز سلوک کیا، جریر رضی اللہ عنہ نے

[1] الولاية على البلدان: 23/2. [2] فتوح البلدان، ص: 387، و الأخبار الطوال، ص: 153، و الولاية على البلدان: . [3] تاريخ الطبري: 599/5. [4] الفتوح لا بن أعثم الكوفي: 363/2، والولاية على البلدان: 167/2.

اپنی ولایت کی ذمہ داریاں چھوڑ دیں اور معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے، یہ صفین کے واقعہ سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔[1]

③ آذر بائیجان

جس وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اُس وقت اشعث بن قیس آذر بائیجان میں اُن کے مقرر کردہ عامل تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعتِ خلافت ہوئی تو اُنھوں نے اشعث بن قیس کو لکھا کہ وہ اُن کی بیعت کریں اور اُن کے لیے لوگوں سے بھی بیعت لیں۔[2]

لگتا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشعث بن قیس کو اپنے پاس آنے کا حکم دیا تھا، چنانچہ وہ کوفہ میں اُن کی خدمت میں پہنچے، پھر اُن کے ساتھ تمام معرکوں میں شریک رہے، خوارج کے خلاف اور صفین میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔[3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس دوران سعید بن ساریہ الخزاعی کو آذر بائیجان کا والی بنایا، پھر وہاں دوبارہ اشعث بن قیس کو بھیج دیا، اور آرمینیا کی وِلایت بھی اُنھی کے سپرد کردی۔ علامہ بلاذری نے اِس کی صراحت کی ہے۔[4]

آذر بائیجان کی ولایت کی ذمہ داریوں کے دوران اشعث نے بعض اہم کام انجام دیے، ایک یہ کہ اردبیل نامی شہر[5] میں عرب گروہوں کو بسایا، شہر کو آباد کیا اور وہاں اسلام کی دعوت پھیلانے کے بعد مساجد تعمیر کرائیں۔[6] مشرق کی طرف بعض دیگر علاقوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والیوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ اِن میں اہواز کے کچھ والیوں کا ذکر ہے اِن میں سے ایک خرّیت بن راشد ہیں، وہ صفین کے واقعہ سے پہلے اہواز کے

---

[1] تاریخ الطبري: 601,600/5. [2] تاریخ الطبري: 599/5. [3] تاریخ خلیفة بن خیّاط، ص: 193، والولایة علی البلدان: 23/2. [4] فتوح البلدان، ص: 207، والولایة علی البلدان: 24/2. [5] أردبیل، آذر بائیجان کا ایک مشہور شہر ہے جو اسلام سے پہلے وہاں کا دار الخلافہ تھا، آج کل تبریز کے مشرق میں واقع ہے۔ (معجم البلدان: 145/1) [6] فتوح البلدان، ص: 324، والولایة علی البلدان: 25/2.

بعض علاقوں میں والی تھے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ صفین سے واپس آئے تو خرّیت نے لشکروں کو جمع کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا اور بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی تو اُنھوں نے اس کے تعاقب میں لشکر روانہ کیا جس نے خرّیت بن راشد کی تحریک کا خاتمہ کر کے اُنھیں قتل کر دیا۔[1]

خلیفہ بن خیاط نے سندھ کے علاقوں میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ ایک والی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اُنھوں نے سارے لوگ اکٹھے کیے اور سندھ کا رُخ کیا، لیکن ایک معرکہ میں وہ خود اور اُس کے ساتھی ناکام ہوگئے، اور اُن کے لشکر میں گنتی کے چند افراد ہی باقی رہ گئے۔[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والیوں میں سے ایک یزید جیہ تمیمی بھی ہیں۔ آپ نے اُسے صفین کے معرکے کے بعد الرَي کا عامل مقرر کیا، پھر اُس پر الزام لگا کہ وہ جمع شدہ خراج کا کچھ حصہ لے اُڑا ہے تو اُسے کوفے میں قید کر دیا، بعد ازاں وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف بھاگ کر شام چلا گیا۔[3]

مدائن میں سعد بن مسعود الثقفی والی مقرر تھے۔ خوارج کا مقابلہ کرنے میں اُن کا بہت بڑا کردار ہے، اس بارے میں اُن کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین خط کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکروں کے سرداروں نے مدائن پہنچنے کی کوشش کی۔ سعد کے بارے میں مشہور ہے کہ اُنھوں نے اپنی غیر موجودگی میں اپنے بھتیجے مختار بن ابی عبید الثقفی کو مدائن کا والی بنا دیا۔[4] پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خراج کے مال میں غیر شرعی تصرف کرنے پر مختار ثقفی سے ناراضی کا اظہار کیا۔[5] سعد، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ مشہور قائدین جیش میں سے ہیں، وہ اکثر و بیشتر مواقع پر حضرت علی کے ساتھ رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اُن کی وِلایت کوفے کے قریب تر تھی۔ مؤرّخ ابوحنیفہ الدینوری نے بعض دیگر علاقوں میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والیوں کے نام لکھے ہیں۔

[1] تاريخ اليعقوبي: 95/2، وتاريخ الطبري: 6/27-47. [2] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 200، والولاية على البلدان: 25/2. [3] نهاية الأرب: 197/20. [4] تاريخ الطبري: 690/5. [5] التمهيد والبيان، ص: 186، و الولاية على البلدان: 26/2.

ان مثالوں سے یہ حقیقت اُجاگر ہوجاتی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مختلف ولایات کی تنظیم وترتیب کے لیے سخت جدو جہد کی اور اس سلسلے میں اُنھیں سخت مشکلات اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یمن، حجاز اور مصر جیسی متعدد ولایات اُن کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ انھوں نے ابتدائی طور پر شام، فلسطین اور اُن کی پڑوسی ولایات پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، جن علاقوں اور شہروں میں اُن کا حکم جاری ہوا، جیسے عراق اور فارس وغیرہ تو وہاں بھی انھیں بڑی مشکلات پیش آئیں، سرفہرست خوارج کا مسئلہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کے آخری برسوں میں اِنھی علاقوں میں اُن کا ظہور ہوا اور مشرقی علاقوں فارس، خراسان اور سجستان وغیرہ کے اصل باشندوں نے کئی مقامات پر فتنہ وفساد برپا کیا اِس کے نتیجے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض والی بھی شہید ہوگئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو انتہائی سنگین دشواریاں پیش آئیں ان میں سے چند یہ ہیں: بعض والیوں نے آپ رضی اللہ عنہ کی مخالفت پر کمر باندھ لی، اور بعض ولایات کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے جیسے ہمذان کے والی جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور اہواز کے والی مفصلہ بن ہبیرہ۔

اس طرح واضح ہوجاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مُدتِ خلافت داخلی کشمکش ہی کی نذر ہوگئی۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ مختلف علاقوں میں انتظامی اصلاحات اور تنظیم وتعمیر کا کام نہ ہوسکا۔ ان مشکلات نے اُن کی قوت کو کمزور کردیا، مؤرخین نے ان باتوں پر خُوب روشنی ڈالی ہے۔[1]

[1] الولایة علی البلدان: 27/2، اس بحث میں زیادہ تر ڈاکٹر عبدالعزیز العمری کی مذکورہ کتاب ہی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

سرکاری عہدیداروں کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نگاہِ احتساب اور اہم ہدایات

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال اور مختلف والیانِ ریاست کی کڑی نگرانی فرمائی اور ان کی کارگزاری اور حالات کی رفتار سے ہر آن باخبر رہے۔ امیر المومنین ماتحت حکام کے بارے میں تفتیش و جستجو کرتے رہتے تھے۔ ان کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مختلف طریقے اختیار کیے۔ وہ ولایات میں مختلف تفتیشی کارندے بھیجتے تھے جو لوگوں سے حکام کے طرز عمل کے بارے میں پوچھتے، کبھی ایک عامل سے دوسرے عامل کے متعلق معلومات حاصل کرتے اور انھیں حکم دیتے کہ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری کا خاص دھیان رکھیں۔ انھوں نے کعب بن مالک کو لکھا کہ کسی کو اپنا نائب مقرر کرو، چند لوگوں کو اپنے ساتھ لو اور کورۃ السواد نامی علاقے میں جاؤ، وہاں لوگوں سے میرے عُمّال کے بارے میں پوچھ گچھ کرو، اُن کے رویّوں اور کردار کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ مختلف حالات سے آگہی کے لیے خفیہ رپورٹیں بھی منگواتے تھے اور انھیں اصلاح احوال کی بنیاد بناتے تھے، والیانِ ریاست کو اِس معاملے کا علم ہی نہیں ہوتا تھا۔[2] یہ تفتیشی افسر کبھی تو اُن والیوں کے ماتحت ملازمین میں سے ہوتے یا بعض نامعلوم شخصیات ہوتی تھیں، کبھی بعض تفتیشی افسر اُسی ولایت کے مقیم ہوتے تھے اور کبھی ایک

﴿1﴾ تاريخ اليعقوبي: 2/204. ﴿2﴾ الولاية على البلدان: 2/33.

ولایت سے دوسری وِلایت کے مابین آنے جانے والے ہوتے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان خفیہ رپورٹوں کا بغور جائزہ لیتے اور ان کی بنیاد پر مختلف حکام کو احکام و ہدایات صادر فرماتے تھے۔

امیر المؤمنین اور بعض گورنروں کے مابین اس صورتحال کی وجہ سے بے لطفی پیدا ہوگئی اور انھوں نے اپنا عہدہ چھوڑ کر کام کرنے سے انکار کردیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جریر بن عبداللہ البجلی کے درمیان اشتر کی دخل اندازی سے یہی حالت پیش آئی۔ یہی معاملہ علی رضی اللہ عنہ اور مصقلہ بن ہُبیرہ کے مابین پیش آیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ عوام کی داد رسی کے لیے اپنا دروازہ ہر وقت کھلا رکھتے تھے۔ جب بھی کسی والی کے متعلق شکایت پہنچتی تو فرماتے تھے: اے اللہ! میں نے اُنھیں یہ حکم نہیں دیا کہ تیری مخلوق پر ظلم کریں اور تیرا حق ادا کرنے میں کوتاہی کریں۔[2] آپ رضی اللہ عنہ نے شکایت ملنے اور تہمت ثابت ہونے پر ایک والی کو تادیباً قید کردیا۔ پھر اُسے کوڑے بھی مارے۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ والیان ریاست کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار فرماتے تھے۔ انھوں نے قیس بن سعد کو مصر کا والی مقرر کیا تو اُنھیں اور دیگر والیوں کو نصیحت فرمائی کہ اپنی ولایت کی طرف جاتے ہوئے اپنے ساتھ لشکر لے لو، یہ عمل تمھارے دشمن کو مرعوب کرے گا اور تمھارے لیے عزت کا باعث ہوگا، جب تم اپنی ذمہ داری کی بجا آوری کے لیے آؤ تو حسنِ عمل والے انسان سے حسنِ سلوک کرو اور غلط کار لوگوں سے سختی سے کام لو۔ عوام و خواص کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو! نرمی ہی میں برکت ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک خط میں قیس بن سعد کو لکھا: حق پر مبنی خراج وصول کرو۔ اپنے لشکر کے ساتھ انصاف کرو۔ جو علم اللہ نے تمھیں عطا کیا ہے وہ دوسروں کو سکھاؤ۔[4]

مختلف علاقوں میں والیان ریاست کو بھیجے جانے والے خطوط نہایت اہم نصیحتوں اور

---

[1] تاریخ الطبري: 601,600/5. [2] الفتاوی: 151/28. [3] الولایة علی البلدان: 34/2، منقول از الکامل فی التاریخ لابن الأثیر. [4] الولایة علی البلدان: 36/2.

ہدایات پر مشتمل ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک وہ خط ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو ولایتِ مصر کے دوران بھیجا، یہ خط محمد بن ابی بکر نے لوگوں کو بھی پڑھ کر سنایا، یہ مکتوب گرامی عوام اور والی دونوں کے لیے نہایت مفید نصیحتوں اور ہدایات پر مشتمل تھا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے والیوں سے کسی نہ کسی صورت رابطے میں رہتے تھے، زبانی پیغامات، تحریری مراسلات یا براہِ راست رابطہ بہر صورت قائم رکھتے تھے، خاص طور پر جب والی حضرات کوفہ تشریف لاتے یا خارجیوں کے خلاف لڑائی میں ان کے ساتھ شریک ہوتے تھے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس قسم کے مواقع پر والیوں کو نہایت گرانقدر نصیحتوں سے نوازتے، سرکاری امور کے سلسلے میں ضروری ہدایات جاری فرماتے اور رعایا کی خدمت پر زور دیتے تھے۔

یہ بات کہیں نقل نہیں کی گئی کہ امیر المؤمنین بیعت کے بعد کبھی حج کے دوران اپنے والیوں سے ملے ہوں، جیسا کہ سابق خلفائے راشدین کرتے تھے، ہاں اس بارے میں ان کی نیابت کا دستور تھا۔ حضرت عباس کے بیٹے اور مشرقی علاقوں کے والی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اکثر و بیشتر رابطے میں رہتے تھے، کیونکہ وہ کوفے سے قریب تر تھے، لہٰذا اُن کے وفود بار بار آتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن وفود کے ذریعے نصائح اور ہدایات پر مبنی حُکم نامے لکھ بھیجتے تھے۔ اِن میں وہ حکام کو کام کرنے کا طریقہ اور سلیقہ بتاتے تھے۔ اپنے عُمال کے نام انھوں نے لکھا:

تم رعیت کے نگہبان ہو، امت کے وکیل ہو اور ائمہ کے سفیر ہو، کسی کی ضرورت پوری کرنے میں کوتاہی سے کام نہ لو، خراج میں سے سردی یا گرمی کے موسم کا کوئی لباس فروخت مت کرو، کار آمد جانور یا غلام کو نہ بیچو۔ محض ایک درہم کی وجہ سے کسی کو کوڑا نہ مارو۔ کسی مسلمان یا ذمی کا مال اپنے قبضے میں نہ لو۔[2]

بعض علاقوں کے معززین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بعض عُمال کی شکایت

---

[1] تراثُ الخلفاء الراشدین، ص: 156. [2] نهج البلاغة: 155/2.

کی، انھوں نے اس عامل کو لکھ بھیجا کہ تمھارے علاقے کے معززین نے تمھارے بارے میں شدّت، سختی اور حقارت کا پہلو اختیار کرنے کی شکایت کی ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ ایسے سلوک کے سزاوار نہیں۔ اُن کے لیے نرمی کا ایسا لبادہ اوڑھو، جس میں تھوڑی سی شدت کا عنصر بھی موجود ہو۔ سختی اور شفقت کا ملاجلا رویہ اختیار کرو، اُنھیں اپنے قریب کرنے کی کوشش کرو، تم اس میں تھوڑی سی دُوری رکھنے کا انداز بھی اختیار کر سکتے ہو۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں والیوں کے اختیارات

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمام اختیارات کسی ایک فرد کے ہاتھ میں نہیں دیے، اُن کا مقصد اختیارات کی تقسیم اور انھیں ایک متعین شکل دینا تھا، انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بصرہ کا والی بنایا تو زیاد کو خراج اور بیت المال کا ذمہ دار مقرر کیا۔

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ وہ زیاد کی بات سنیں اور اطاعت کریں۔ [2] یہ بات انتظامی امور پر گرفت رکھنے کی بہت بڑی پہچان ہے۔ زیاد، بصرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ولایت کے دائرے میں ان کی اطاعت کر رہے تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما زیاد کے میدانِ عمل میں ان کی اطاعت میں مشغول تھے۔ عدل و انصاف کے معاملات کی ذمہ داری ابو الأسود الدؤلی کے سپرد تھی۔ [3]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مالک بن اشتر کو جو خط لکھا، اُس میں والیانِ ریاست کو دیے گئے اختیارات کا بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اب یہی بات قدرے تفصیل سے پڑھ لیجیے:

[1] نهج البلاغة: 155/2. [2] تاريخ الطبري: 580/5. [3] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 200.

① وزراء کی تعیناتی

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ، مالک بن اشتر کے نام لکھے گئے خط میں فرماتے ہیں: تمھارے وزراء میں بدترین شخص وہ ہوگا جو تم سے پہلے شریر لوگوں کا ساتھی اور ان کے گناہوں میں اُن کا شریک رہا ہو، اُسے تمھارے خواص میں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ لوگ دراصل گناہ گاروں کے مدد گار اور ظالموں کے بھائی ہوتے ہیں۔ یہ تمھارے لیے اچھے لوگوں کا نعم البدل نہیں ہوسکتے۔ اچھے لوگوں کے ساتھ رہو۔ وہ تمھیں اچھے مشوروں سے نوازیں گے۔ وہ تمھارا بوجھ بھی اُٹھائیں گے، ظلم سہہ لیں گے مگر ظالم کی مدد نہیں کریں گے، یہ تمھارے لیے ساز گار اور مدد گار رہوں گے۔ وہ دوسروں سے محبت والفت رکھنے کی بجائے تمھارے ساتھ زیادہ شفیق ومہربان ہوں گے...........

تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وزراء کی تعداد کا تعین نہیں فرمایا، جمع کے صیغے پر اکتفا کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وزراء کی تعداد کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ والی کو کتنے معاونوں کی ضرورت ہے کیونکہ وزیر کا کام ذمہ داریاں نبھانے میں والی کی مدد کرنا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وزیر کے تقرر کی کچھ شرائط بھی بتائی ہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ وہ پہلے کسی شر پسند والی کا وزیر نہ رہا ہو، اور والی اپنے وزیروں میں سے ایک ایسا وزیر بھی منتخب کرے جو اس کی نیابت کر سکے اور انتظامی مسائل حل کرنے میں اُس کا خاص مدد گار ہو، اور امیر المؤمنین کے مطابق حق کی راہ پر چلنے والا ہو۔ وزیروں کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی؟ یہ تعاون کے دائرے میں ہوں گی۔ اس دائرۂ تعاون کی تفصیلات کیا ہوں گی؟ یہ سب کچھ والی کے سپرد ہوگا کہ حسبِ ضرورت وہ ان کی ذمہ داریوں کا تعین کریں، اور وزراء کا والی سے براہ راست تعلق ہوگا۔[1]

[1] الإدارة والنظام الإداري عندالإمام علي للدكتور محسن الموسوي، ص:261.

② مجالسِ شوریٰ کی تشکیل

یہ کام علماء اور دانشوروں کی مدد سے تشکیل پاتا ہے اور وہ اصحاب حل وعقد اور تجربہ کار حضرات ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ملک کے معاملات صحیح بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے علمائے کرام اور دانشوروں سے مذاکرات اور تبادلۂ خیال کرو۔ ایسے کام انجام دو جن سے ریاست کو تقویت ملے۔[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مجالسِ شوریٰ اور مجالس منتظمہ میں علماء اور حکماء کو یکجا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ علماء اور دانشوروں کی نامزدگی والی کریں یا عوام اُن کا انتخاب عمل میں لائیں۔ امیر المؤمنین کی طرف سے اس طرح کی کسی پابندی کا کوئی ذکر نہیں ہے، انھوں نے کوئی قطعی فیصلہ نہیں دیا بلکہ حالات و واقعات کے مطابق ان کے تعین کا طریقہ کار اختیار کرنے کی راہ کھلی رکھی۔ البتہ اس مجلس کی ذمہ داریاں اور عمومی پالیسی طے کرنے کے لیے باہم مذاکرات اور بحث ومباحثہ ضرور ہوگا، جس میں یہ دو باتیں خاص طور پر پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

① ریاست اور عام لوگوں کے مفادات ومصلحت کا خاص خیال رکھنا اور یقینی بنانا۔

② والی کی پالیسیوں کے مطابق چلنے والے معاملات کا تسلسل برقرار رکھنا۔

③ فوج بنانے کی تیاری

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے مالک بن اشتر نخعی سے کہا: لشکر کا رئیس بناتے ہوئے ترجیحی طور پر یہ دیکھو کہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری میں کون بہتر ہے۔ اُس میں فراخ دلی کا جذبہ کتنا ہے۔ رئیس اپنے ماتحتوں کے غم اور مسائل کو خود اپنا مسئلہ سمجھے تاکہ سب مل کر دشمن

[1] الإدراة والنظام الإداري عند الإمام علي رضی اللہ عنہ، ص: 161.

کے خلاف جہاد میں یک جان ہوجائیں۔ تمھارا اُن کے ساتھ مشفقانہ رویہ ان کے دلوں کو تمھاری طرف مائل کردے گا۔[1]

اس بیان سے درج ذیل باتیں اخذ ہوتی ہیں:

(ا) عسکری قوت کا حصول شرطِ لازم ہے تاکہ ریاست کا دفاع ہوسکے۔

(ب) عسکری قوت کی تیاری والیٔ ریاست کی ذمہ داری ہے اور اس کے اخراجات بیت المال سے پورے کیے جائیں۔

(ج) لشکر کا کمانڈر مقرر کرنا والی کی ذمہ داری ہے۔ لشکروں کے کمانڈروں کے انتخاب کی کچھ شرائط ہیں جن پر والی کو عمل کرنا ہوگا۔ ان امور کا اہتمام اور خیال رکھنا ریاست کی ذمہ داری ہے تاکہ اہل لشکر متحد اور یک جان ہوجائیں اور دشمن کے خلاف خوب ڈٹ کر جہاد کا فریضہ انجام دے سکیں۔[2] والیٔ ریاست اہل لشکر سے مہربانی کا سلوک کرے گا تو ان کے دل اُس کی طرف مائل ہوجائیں گے۔[3]

④ جنگ، امن اور خارجہ پالیسی کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نظریات

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے مقرر کردہ والی مالک بن اشتر سے مخاطب ہوکر فرمایا: دشمن کی طرف سے پیش کردہ ایسی صلح سے انکار نہ کرو جس سے اللہ راضی ہو، بیشک صلح میں تمھارے لشکروں کے لیے سکون و اطمینان ہے۔ اس طرح تمھیں زیادہ فکر و اندیشے سے نجات ملے گی اور ایسی صورتحال تمھارے ملک کے لیے باعثِ امن ہوگی۔ لیکن صلح کرنے کے بعد دشمن کی طرف سے بہت چوکس رہو۔ ہر قسم کے حزم و احتیاط سے کام لو، بسا اوقات دشمن قریب ہوکر بظاہر غافل نظر آتا ہے لیکن وہ پھر وار کر دیتا ہے۔ زیادہ حسنِ ظن

[1] نهج البلاغة شرح محمد عبده، ص: 613. [2] الإدارة والنظام الإداري عندالإمام علي رضي الله عنه، ص: 265. [3] نهج البلاغة شرح محمد عبده، ص: 613.

سے کام نہ لو اگر تمھارے اور دشمن کے مابین کوئی پیچیدگی ہے یا تم نے اُس سے کوئی عہد کیا ہے تو عہد کی پاسداری کرو۔ جُدا جُدا آراء اور خواہشات کے مختلف ہونے کے باوجود، اللہ تعالیٰ کے فرائض میں عہد پورا کرنے سے بڑی اور کوئی چیز نہیں۔ عہد کی پابندی مسلمان تو مسلمان مشرکوں نے بھی کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مشرکوں نے عہد کی پاسداری اُس وقت کی جب انھیں بدعہدی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

لٰہذا کیا گیا عہد کبھی نہ توڑو، کسی کو دھوکا نہ دو، دشمن کے سامنے کبھی اکڑ فوں اور تکبر نہ دکھاؤ، اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں وہی جرأت سے کام لیتا ہے جو جاہل اور بدبخت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان کو باعثِ امن قرار دیا ہے۔ جو اُس نے اپنے بندوں کے مابین رحمت کے طور پر بھیجا ہے۔ یہ بڑی حرمت والی بات ہے، اُس کی طاقت سے سکون ملتا ہے اور لوگ اُس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ لٰہذا فساد اور خیانت دونوں باتوں سے بچو۔ ایسی پیچیدگیوں سے بھی بچو جو آگے جا کر مشکلات کا باعث بنیں۔ قول و قرار کی پختگی کے بعد غلط بات کا سہارا نہ لو۔ اگر عہد کی تکمیل میں کہیں کوئی تنگی پیش آ جائے تو ناحق فراخی یا آسانی کے طلبگار نہ ہو۔ تنگی اور مشکل پر صبر کرنے کا انجام اُس فراخی سے بہتر ہے جو بدعہدی کی طرف لے جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی مطالبہ ہو، اس پر دنیا و آخرت کا مستقبل دیکھے بغیر لبیک کہو۔[1]

⑤ داخلی امن کی حفاظت

یہ عمل پُر امن پالیسیوں کی راہ پر گامزن ہونے کے نتیجے میں ممکن ہوگا۔ امیر المؤمنین نے اپنے بعض عُمال کو لکھا: آپ کے اہل علاقہ میں سے کچھ معززین نے آپ کی طرف سے سختی، شدت اور حقارت کے رویے کی شکایت کی ہے، ان کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرو جس میں تھوڑا سا سختی کا پہلو بھی ہو۔ یعنی شدت اور شفقت کی مِلی جُلی کیفیت ہو۔ انھیں کسی قدر اپنے قریب اور قدرے فاصلے پر رکھو![2]

---

[1] نہج البلاغة، ص: 627. [2] الولایة علی البلدان: 37/2، منقول از شرح نہج البلاغة: 230/2.

یہ پالیسی داخلی امن کے استحکام کے لیے ہے۔ جب بھی کوئی ایسا حادثہ وقوع پذیر ہو جو ان اہم مقاصد میں رکاوٹ کا باعث بنے تو والی کی ذمہ داری ہے کہ طاقت کی پالیسی سے دور رہتے ہوئے مشکلات حل کرنے کی پُر امن کوشش کرے اور عوام کے خلاف طاقت کے استعمال کا طریقہ مسترد کر دے۔ [1]

امیر المومنین نے مالک بن اشتر کے نام خط میں تحریر فرمایا: اپنے اقتدار کو تقویت دینے کے لیے وہ خون نہ بہاؤ جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، یہ بات تقویت کی بجائے اقتدار کو کمزور کرنے بلکہ اُس کے زوال کا باعث بنے گی۔ [2]

⑥ محکمۂ عدل و انصاف

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لوگوں کے مابین فیصلہ دینے کے لیے رعیت میں سے ایسی افضل ترین شخصیت کا انتخاب کرو جس کی موجودگی میں مسائل و معاملات میں گڑ بڑ پیدا نہ ہو۔ کسی متنازعہ شخصیت کو جج نہ بناؤ۔ جج اپنی غلطی پر اصرار کرنے والا نہ ہو، جب وہ حق بات پا جائے تو اُس کی طرف رجوع کرنے میں اُسے کوئی عار نہ ہو۔ لالچ کی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ وہ بات کی گہرائی تک پہنچے۔ ادنیٰ بات پر اکتفا نہ کرے۔ مشتبہ امور پر رُک کر غور کرنے والا ہو۔ دلائل سے نتیجہ اخذ کرنے والا ہو، مخالف فریق بار بار بولے تو زِچ نہ ہو، معاملات منکشف ہونے پر بڑے صبر سے کام لے، اپنی خوشامد یا تعریف کے باوجود بے لچک رہے اور مبنی برحق اٹل فیصلہ کر دے۔

کوئی کتنا ہی واویلا کرے، فساد مچائے یا مشتعل کرے لیکن اُس کے فیصلے میں جھول نہ آئے۔ وہ ان تمام امور میں بڑا ابلغ النظر ہو۔ [3]

---

[1] الإدارة والنظام الإداري عندالإمام علي رضی اللہ عنہ، ص: 257. [2] شرح نهج البلاغة، ص: 627. [3] شرح نهج البلاغة، ص: 615.

⑦ مالی اخراجات

اسلامی مملکت میں اخراجات کے لیے مال کی فراہمی کا سرچشمہ زکاۃ وصدقات، مال غنیمت، مال فیٔ، خراج اور عُشر وغیرہ ہیں۔ ان سب ذریعوں سے حاصل شدہ مال بیت المال میں جمع کرنا ہوگا۔ یہی مسلمانوں کا بنیادی خزانہ ہے۔ یہیں مسلمانوں کا مال جمع ہوتا ہے۔ بیت المال میں ایک عامل ہوتا ہے وہ جمع اور خرچ ہونے والے سارے مال کا حساب رکھتا ہے۔ ادارے کی عدم مرکزیت میں بیت المال اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جو مال بھی جمع ہوتا ہے وہ سب سے پہلے ریاست کے ملازمین، عمال، قاضیوں، محتاجوں اور بے خانماں لوگوں یا اراضی کی آبادکاری کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اور جو کچھ بچ رہتا ہے وہ دارالخلافہ بھیج دیا جاتا ہے۔ درحقیقت بیت المال، ریاست کا وہ دل ہوتا ہے جو سرکاری ڈھانچے کی شریانوں میں خون کی تقسیم وترسیل کرتا ہے۔[1]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

کڑی نگاہ رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مال جمع ہو اُسے عیال داروں، بھوکوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کرو۔[2] جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے، ان اموال کا ایک حصہ خراج سے حاصل ہوتا ہے، یہ زرعی زمینوں کی آمدنی سے لیا جاتا ہے، ریاست کے ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے کا یہ پہلا ذریعہ ہے۔ جو اِس سے بچ جائے وہ فقراء ومساکین میں تقسیم کردیا جانا چاہیے۔

امیر المؤمنین مزید فرماتے ہیں:

''کفالت کے لیے لوگ خراج اور اہل خراج کی طرف دیکھتے ہیں۔''

یہاں لوگوں سے مراد عام ملازمین اور مجاہدین ہیں جن کے بارے میں امیر المؤمنین کا یہ

[1] الإدارة و النظام الإداري عندالإمام علي رضی اللہ عنہ، ص: 258. [2] شرح نهج البلاغة، ص: 647.

کہنا ہے کہ فوج کو قائم دائم رکھنے کا ذریعہ وہ مال ہے جو اللہ تعالیٰ خراج کے ذریعے عطا فرماتا ہے۔ امیر المؤمنین نے یہ رہنمائی دی ہے کہ زمین کی پیداوار اور اُس کی آبادکاری پر خاص توجہ دی جائے، وہ فرماتے ہیں: خراج کی وصولی پر نظریں گاڑنے کی بجائے تمھاری توجہ زیادہ تر زمین کی پیداوار بڑھانے پر ہونی چاہیے۔ یہ کام آبادکاری کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ جس عامل نے آبادکاری کے عمل پر خصوصی توجہ دینے کی بجائے خراج کی وصولی پر نگاہ رکھی اس نے شہر ویران کیے اور اللہ کے بندوں کی ہلاکت کا باعث بنا۔[1]

زمین کی آبادکاری سے نئے ذرائع پیداوار اور آمدنی کے نئے وسائل میں اضافہ ہوگا، ولایت کے لیے ضروری مقدار نکالنے کے بعد باقی مال دارالخلافہ روانہ کردیا جائے گا۔ امیر المؤمنین فرماتے ہیں۔ جو زائد مال بچ جائے وہ ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم یہاں موجود ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کرسکیں۔[2]

ریاست کے اہم اخراجات کا بڑا حصہ نہروں کی کھدائی، دریاؤں کی مرمت اور بے کاشت اراضی کی آبادکاری پر صرف ہوتا ہے۔ امیر المؤمنین نے قرظہ بن کعب انصاری کو لکھا کہ ذمیوں میں سے کچھ لوگوں نے اپنی سرزمین میں کسی نہر کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اِس نہر کا نام و نشان مٹتا جارہا ہے، تم سب مل کر اس معاملے کو دیکھو اور اُس نہر کی بحالی اور اصلاح کا کام کرو۔ اس نہر کی آبادکاری ہماری نظر میں خراج کی وصولی سے زیادہ اہم ہے، ملک کی بہتری کے لیے کسی کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اصلاحِ احوال واجب ہے،[3] والسلام۔

⑧ ریاست کے ماتحت عمال

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اپنے عمال کے معاملات پر نظر رکھو، ذمہ داریاں سونپنے سے پہلے اُن کا امتحان لو۔ ذاتی پسند و ناپسند یا ایسی ہی کسی بنیاد پر اُنھیں کسی عہدے پر مامور نہ کرو، یہ ظلم و خیانت کے

[1] شرح نهج البلاغة، ص: 647. [2] شرح نهج البلاغة، ص: 618، والإدارة والنظام، ص: 258.
[3] تاريخ اليعقوبي: 203/2، والولاية على البلدان: 37/2.

مترادف ہوگا۔ عہدیداروں کے انتخاب کے وقت اہل تجربہ کار، باحیا، نیک گھرانوں اور اسلام میں اولیت کا اعزاز رکھنے والوں کو پیش نظر رکھو۔ یہی لوگ بلند اخلاق ہیں۔ عزّت دار ہیں۔ لالچ سے بالاتر ہیں۔

یہی لوگ مسائل و معاملات کے انجام پر نظر رکھنے والے ہیں، اُن پر رزق الٰہی کے دروازے کھول دو۔ اِس کے ذریعے معاملات کو صحیح خطوط پر اُستوار کرنے میں مدد ملے گی اور وہ حاجات میں مستغنی ہو جائیں گے۔ اگر انھوں نے آپ کے حکم کی خلاف ورزی کی یا امانت پر دھبہ لگایا تو یہ چیز اُن کے خلاف حجت قائم کرے گی۔ اُن کے تمام کاموں پر نگاہ رکھو۔ ان کی نگرانی کے لیے اصحاب اہل صدق و وفا کو مامور کرو، ان کی خفیہ نگرانی کرو، یہ بات امانتوں کے صحیح استعمال اور رعیت کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی استواری میں مددگار ثابت ہوگی۔ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو اور کوئی خیانت کا مرتکب ہو تو اُسے سخت سزا دو اس نے جو کچھ کمایا ہوا ہے واپس لو، اسے ذلت سے ہمکنار کرو اور عار دلاؤ تاکہ وہ باعثِ عبرت بن جائے۔

حکام کی لیاقت اور مطلوبہ صفات

(ا) وہ اہلِ صدق میں سے ہوں تاکہ اُن کی رپورٹیں مبنی بر حقیقت اور بے لاگ ہوں۔

(ب) اہل وفا ہوں تاکہ اُن کا مقصد ریاست کے ساتھ اخلاص و وفاداری کے سوا کچھ نہ ہو۔ والی کی خدمت میں یہ رپورٹیں پیش کرنے کے بعد ان کا بغور جائزہ لیا جائے۔

متعلقہ افراد کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

خفیہ نگرانوں کی ذمہ داری لگائی جائے کہ وہ تاجروں اور صنعت کاروں وغیرہ کی صحیح نگرانی کریں، تاکہ وہ ذخیرہ اندوزی کر کے عوام کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں۔ اس بارے میں امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خط میں اشتر کو لکھا کہ خلافت راشدہ پر مبنی ریاست کا

فرض یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اور براہ راست رعیت کے حالات کا خیال رکھے۔ عام لوگوں کے معاملات پر نظر رکھے، فرد اور جماعت کے درمیان ہر قسم کا خلا پُر کیا جائے اور اُس کا مکمل احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

⑨ طبقاتِ معاشرہ

امیر المؤمنین فرماتے ہیں: خوب اچھی طرح جان لو کہ رعیت مختلف طبقات پر مشتمل ہے، ان کا باہمی تعلق ہے جو ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتا۔ کچھ تو اللہ کے مجاہد ہیں، کچھ عام اور خاص شعبوں میں حساب کتاب رکھنے والے ہیں، بعض عدل قائم کرنے والے قاضی ہیں کچھ جزیہ ادا کرنے والے ذمی ہیں، کچھ اہل خراج ہیں، کچھ مسلمان ہیں۔ بعض اہل تجارت وصنعت ہیں، اور ایک طبقہ حاجتمندوں اور مسکینوں کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک پر ذمہ داری کا حصہ مقرر کردیا ہے۔ اور کتاب وسنت میں ہر ایک کے فرائض بیان کردیے گئے ہیں، ان تمام شعبوں اور طبقوں کا قیام اور بحالی تاجروں اور صنعت کاروں پر منحصر ہے۔[1] انھی کے ذریعے اہل حاجت کی مدد ہوسکتی ہے اور انھیں اُن کا حق ملتا ہے۔

پھر تاجروں اور صنعت کاروں کو خیر و بھلائی کی وصیت کی، فرمایا کہ اُن کا خیال رکھو، کڑی نظر سے یہ بھی دیکھو کہ اُن میں سے کون تنگ نظری اور قبیح ترین بخل کا مظاہرہ کررہا ہے، کون ذخیرہ اندوز ہے، یہ بات عوام الناس کے لیے پریشانی اور ریاست کے لیے باعثِ عیب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ذخیرہ اندوزی سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ خرید وفروخت میں عدل وانصاف کا پورا پورا اہتمام ہونا چاہیے۔ قیمتوں کے تعین پر خصوصی نگاہ رکھو، اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والون کو سزا دو اور سزا دینے میں اعتدال ملحوظ رکھو۔[2]

⑩ سزا اور جزا پر مبنی تربیت

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے والیوں اور جملہ عمال سے فرمایا: نیکو کار اور بُرا شخص

[1] شرح نہج البلاغة، ص: 611. [2] شرح نہج البلاغة، ص: 620.

تمھاری نظر میں برابر نہیں ہونا چاہیے۔ حسنِ عمل والوں کی حوصلہ افزائی مطلوب ہے اور برے لوگوں کی سرزنش کے ساتھ ساتھ اُن کی تربیت بھی ضروری ہے۔

(11) نظام ولایات کی پختگی میں سرداری نظام کا کردار

مسلمانوں نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر پہلی دفعہ نُقَبَاء کا عنوان سنا اور پہچانا، رسول اللہ ﷺ نے انصار میں سے اُن کی قوم پر بارہ نقیب مقرر فرمائے، تین اوس میں سے اور نو خزرج سے۔[1] نُقباء کے عنوان سے یہ سرداری نظام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مختلف اسلامی لشکروں میں منظّم انداز سے جاری رہا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں قادسیہ میں لوگوں کو اسی طریقے پر منظّم کیا گیا۔ مختلف قبائل جمع ہوئے، ہر دس آدمیوں پر ایک نقیب (سردار) مقرر کیا گیا، یہی طریق کار نبی اکرم ﷺ کے دور میں بھی تھا۔ بعد ازاں صاحبِ وسائل لوگوں میں سے ہر دس آدمیوں پر ایک آدمی بطور سردار مقرر کیا گیا۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہروں میں لوگوں کی انتظامی تقسیم منظّم کرنے میں سبقت حاصل ہے، ان کے دور میں یہ نُقَبَاء یعنی سردار اپنے قبائل اور مجموعے کی طرف سے والی کے حضور ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی یہی نظام جاری رہا، وہ اِن نُقباء (سردارانِ قبائل) کو جمع کرتے، اُن کے حصے کا مال اُنھیں دے دیتے تھے تاکہ وہ اپنے اپنے ماتحت لوگوں میں جا کر تقسیم کریں۔[4]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 443/2. [2] الولاية على البلدان: 106/2، وتاريخ الطبري: 87/5.
[3] النظم الإسلامية لصبحي صالح، والولاية على البلدان: 106/2. [4] الأموال لقاسم بن سلام، ص: 345، والولاية على البلدان: 106/2.

جمل اور صفین کے معرکے اور قضیۂ تحکیم

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○﴾

''اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرادو، پھر اگر (ان) دونوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے، تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، حتی کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر وہ لوٹ آئے تو تم ان دونوں کے درمیان عدل (حق) کے ساتھ صلح کرادو، اور تم انصاف کرو، بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو، اور تم اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''[1]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ، علی بن ابی طلحہ سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ

[1] الحجرات 49:9،10.

فرمان الٰہی بڑا واضح ہے: ''اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کراؤ، پھر اگر اُن میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

اس فرمانِ الٰہی میں اللہ تعالیٰ نے رسالت مآب ﷺ اور مومنوں کو حکم دیا ہے کہ اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُنھیں اللہ کے حکم کی طرف بلائیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کریں، اگر وہ مان لیں تو اللہ کی کتاب کے مطابق اُن کے مابین فیصلہ کر دیں، تا آنکہ مظلوم اور ظالم کے مابین انصاف قائم ہو جائے، اگر اُن میں سے کوئی انکار کرے تو وہ باغی شمار ہوگا۔ اس صورت میں مومنوں کے امام پر لازم ہے کہ وہ اُن کے خلاف جہاد اور قتال کرے، تا آنکہ وہ سب اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئیں، اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ مان لیں۔ [1]

امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر محدثین نے یہ استدلال کیا ہے کہ معصیت چاہے کتنی ہی بڑی ہو، ایمان سے خارج نہیں کرتی، بخلاف خوارج کے جو اس بات کے قائل ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر اور جہنمی ہے۔ صحیح بخاری میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز خطاب فرمایا۔ اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ منبر کے اوپر حسن بن علی رضی اللہ عنہما بھی تھے، آپ ﷺ حسن رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھتے اور پھر لوگوں کی طرف دیکھتے اور فرماتے تھے کہ میرا یہ بیٹا سردار ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرا دے گا۔'' [2]

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اُسی طرح ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذریعے سے اہلِ عراق اور اہل شام کے درمیان جنگوں کے بعد صلح کرا دی۔ [3]

فرمانِ الٰہی ہے:

[1] التفسير الصحيح، لحكمت البشير: 4/369. [2] صحيح البخاري، حديث: 7109. [3] التفسير المنير: 26/238.

''پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک فریق زیادتی کرے اور حد سے تجاوز کرے، اللہ کے حکم اور اُس کی نصیحت تسلیم نہ کرے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس باغی گروہ کے خلاف لڑیں تا آنکہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے اور بغاوت چھوڑ دے۔ اس صورت میں لڑائی اسلحہ کے ساتھ اور اسلحہ کے بغیر بھی ہوسکتی ہے۔ ثالثی کا فرض ادا کرنے والا صلح کو یقینی بنائے گا۔ اس کا مطلب ہے پلٹ آنا۔ اگر ہتھیار اُٹھائے بغیر یہ مقصد حاصل ہوتا ہے تو ایسا ہی کرنا ہوگا لیکن اسلحہ کا استعمال ناگزیر ہوجائے تو باغیوں کے واپس آنے تک اُس کا استعمال کرنا ہوگا۔

فرمانِ الٰہی ہے: ''پھر اگر پلٹ آئے تو اُن کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو، اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ باغی گروہ لڑائی سے پلٹ آیا اور اللہ کے حکم پر راضی ہوگیا تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں گروہوں کے درمیان عدل پر مبنی فیصلہ کرادیں یعنی، ظالم گروہ کا ہاتھ پکڑیں تا آنکہ وہ ظلم سے باز آجائے اور اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ صلح کرانے والوں کو عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو عدل کرنے والے ہی پسند ہیں۔ اسی وجہ سے زندگی کے تمام امور میں عدل ہی کا حکم ہے۔ [1]

اس آیت کے مفہوم میں بالاولی تمام مومنوں کے سردار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، چاہے جمل کا واقعہ ہو یا صفین کا، امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اِس آیت کا پورا عملی انطباق فرمایا اور فریقین کے مابین صلح کی بھرپور کوشش کی، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ نے اُن کی آواز پر لبیک کہا، مگر عبداللہ بن سبا کے پیروکاروں نے دونوں فریقوں کے درمیان جنگ

[1] التفسیر المنیر: 238/26.

کے حالات پیدا کردیے۔ اس پر ان شاء اللہ آگے بات ہوگی۔ امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اہل شام کے ساتھ صلح کی فضا اور پُر امن حالات پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ خاص طور پر ایسی اصلاحی جدوجہد مسلسل جاری رکھی جس کے زیر اثر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سمع و اطاعت اور وحدتِ خلافتِ اسلامیہ کی طرف لوٹ آئیں لیکن اپنی مساعی جمیلہ میں ناکام ہونے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجبوراً تلوار سونت لی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شرط یہ تھی کہ قاتلینِ عثمان اُن کے حوالے کردیے جائیں۔ اُنھوں نے اجتہادی غلطی کی، حق امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ افسوس! لڑائی ہوکر رہی۔

فرمان ربانی ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾

''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔''[1]

مسلمانوں کے آپس میں لڑنے والے سب گروہوں کے بارے میں اخوت ایمانی ثابت ہوگئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے مابین جمل میں جو کچھ ہوا اور صفین میں اُن کے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جو کچھ پیش آیا، اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جمل اور صفین دونوں سانحوں میں دونوں طرف مومن ہی تھے اور ان تاریخی حادثات کی وجہ سے صحابہ کرام کو مطعون کرنے کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں۔ نہ ان کے ایمان سے خارج ہونے کی کوئی بات کی جاسکتی ہے۔ نہ اُن تمام حضرات کے بارے میں کوئی نامناسب اور انحراف پر مبنی کوئی عبارت نشر کرنا جائز ہے، ان سب باتوں کو رَد کرنے کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے کہ مذکورہ آیات نے اُن کے لیے اخوتِ ایمانی ثابت کی ہے۔ ان کے مابین لڑائی کے حوالے سے جو کچھ ہوا اُس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے بیان کی جائے گی۔

[1] الحجرات 10:49.
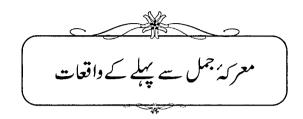
شہادت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا فتنۂ عظیم تھا جس کے بطن سے دیگر بہت سے فتنے پھوٹ پڑے۔ شہادتِ عثمان کے فتنے کے اسباب میں بہت سے عوامل کام کررہے تھے، ان میں سے چند یہ ہیں: خوشحالی اور معاشرے پر اس کے اثرات، اُن کے عہد میں اجتماعی تبدیلی کا مزاج، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد برسر اقتدار آنا، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مدینہ سے چلے جانا، جاہلی عصبیت، فتوحات کا رُک جانا، جہالت پر مبنی اللہ کا خوف، کینہ پرور لوگوں کی سازشیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بعض معاملات و مسائل بھڑکانے کی ٹھوس تدابیر، لوگوں کو اشتعال دلانے کے حربے اور فتنے میں عبداللہ بن سبا کا مذموم کردار وغیرہ۔ ان اسباب کی پوری تفصیل میں نے اپنی کتاب ''تیسیر الکریم المنان فی سیرۃ عثمان بن عفان'' میں بیان کی ہے۔[1]

لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کی وجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کا نہایت قریبی تعلق، آپ کا حُسنِ سیاست، آپ رضی اللہ عنہ کی مدح وثنا میں احادیث، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں سے یکے بعد دیگرے آپ کا نکاح ہے اسی وجہ سے آپ ذوالنورین کہلائے۔ آپ اُن کِبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنھیں اسی دنیا میں جنت کی بشارت دی گئی۔ آپ کو اپنی زندگی میں ہولناک ظلم کا سامنا کرنا پڑا، آپ رضی اللہ عنہ فسادیوں اور ظالموں کا خاتمہ کرسکتے تھے لیکن اس ڈر کے مارے رُکے رہے مبادا مجھے

---

[1] عثمان بن عفان للصّلابی، ص: 311-340.

محمد ﷺ کی اُمت میں خون بہانے والا پہلا فرد کہا جائے۔

فتنہ گروں کے ساتھ اُن کے معاملات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی بُردباری، عدل، انتظار کرنے اور مہلت دینے پر مبنی تھی۔ انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فسادی لوگوں کے ساتھ لڑنے سے منع کر دیا تھا۔ اُن کی تڑپ یہ تھی کہ وہ اپنے معاملے میں مسلمانوں کا خون نہ بہنے دیں اور ان کی جانیں بچائیں۔ اسی لیے اُن کی شہادت بہت سے نہ ختم ہونے والے فتنوں کا سبب بن گئی۔ اُن کی شہادت مسلمانوں کے لیے بہت بڑا المیہ تھی، اسلامی معاشرہ اتنے بڑے سانحے سے ہل کر رہ گیا، آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگ تقسیم ہو گئے، البتہ اُن کے مقام و مرتبہ، عظمت و جلالت اور اُن کی بے گناہی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ پوری امت کا اجماع تھا کہ انھیں بے خطا ہونے کے باوجود شہید کیا گیا ہے، انھوں نے اُن کے خون کا بدلہ لینے پر اتفاق کیا لیکن کیفیت میں اُن سب کے موقف ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس بات کی صراحت آگے آ رہی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ سرِدست اس میں عبد اللہ بن سبا کے گھناؤنے کردار پر روشنی ڈالیں۔

اول: فتنہ پیدا کرنے میں سبئیت کے اثرات

① سبئیت حقیقت ہے یا خیال؟ عبد اللہ بن سبا کی حقیقت

کسی استثنا کے بغیر قُدَما کا اس کے وجود پر اتفاق ہے، معاصرین میں سے کچھ لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اِن کی اکثریت کا تعلق شیعہ سے ہے، اُس کی شخصیت کا انکار کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ عبد اللہ ابن سبا سیف بن عمر التمیمی کی خیالی شخصیت ہے۔ رجال کے بعض علماء نے روایتِ حدیث میں اُس پر تنقید کی ہے، جبکہ اخبار و تاریخ میں اُسے حجت سمجھتے ہیں۔ ابن عساکر سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں عبد اللہ بن سبا کا تذکرہ ہے مگر اُس کے راویوں میں سیف بن عمر نہیں ہے۔ مشہور محدث البانی رحمہ اللہ

نے اُن میں سے بعض کو سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیا ہے۔ [1]

یہ اُن کثیر روایات کے علاوہ ہیں جو کتبِ شیعہ میں ابن سبا کے بارے میں ہیں، وہ روایات اُن کے ہاں کُتبِ فِرَق، رجال اور حدیث کی کتابوں میں ہیں، اُن میں دور ونزدیک اِس سیف کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ عبداللہ بن سبا کی موجودگی کے بارے میں تشکیک [2] کی ابتدا اُن کی جانب سے کینہ پرور یہودی عنصر کے اس فتنے میں کردار کی نفی کرنے کی کوششوں کے نتیجہ میں ہوئی۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ صحابہ کرام پر تہمت لگائی جائے کہ وہ اس فتنے کا سبب ہیں تاکہ صحابہ کرام کے روشن چہروں اور عظمت و جلالت کو داغدار کیا جائے۔ عبداللہ بن سبا کے وجود کی نفی میں شیعہ طبقے کی متابعت اُن چند معاصرین نے کی ہے جو سب کے سب رافضی شیعوں میں سے ہیں۔ اس امر سے اُن کا مقصد اپنے مذہب کے حقیقی مؤسس سے عدم تعلق ظاہر کرنا ہے مگر یہ اُن کی ناکام کوشش ہے اس حقیقت پر بشمول شیعہ تمام قُدَماء کا اِجماع ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اہل سنت میں شمار ہونے والوں میں سے جن لوگوں نے عبداللہ بن سبا کے وجود کا انکار کیا ہے وہ مستشرقین کے چیلے ہیں یا اُن سے متأثر ہیں۔ یہ اُن کی جہالت اور قلتِ حیا کی وجہ ہے کہ وہ اس حد تک چلے گئے ہیں۔ اُس کے حالاتِ زندگی تو تاریخ اور مختلف فرقوں کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں، اُس کے کرتوت راویوں نے نقل کیے ہیں اور اُس کی خبریں دنیا کے آخری کناروں تک پہنچ چکی ہیں۔ مؤرخین، محدثین کُتبِ فِرَق و مذاہب اور کُتبِ طبقات وادب وانساب میں سے جو مؤلفین بھی سبئیت کو زیرِ بحث لائے ہیں، وہ عبداللہ بن سبا کے وجود پر متفق ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ فتنے کی خبروں میں اُس کا ذکر واضح طور پر موجود رہا۔ ابن سبا کے کردار کا تذکرہ صرف تاریخ

[1] دعاوی الانقاذ للتاریخ الإسلامي للعودة، اس میں انھوں نے وہ تمام سندیں بیان کی ہیں جو البانی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔ [2] تحقیق مواقف الصحابة: 284/1، وعبداللّٰه بن سبا وأثره في أحداث الفتنة في صدر الإسلام، للعودة.

طبری تک ہی نہیں بلکہ اس میں عمر بن سیف التمیمی کے حوالہ سے جو روایات ہیں وہ متقدمین کی روایات میں منتشر خبروں کی صورت میں موجود ہیں۔

یہ تمام روایات اسلامی تاریخ اور فِرَق و مذاہب کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، البتہ دوسروں پر تاریخ طبری کی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ اُس میں بھرپور واقعات اور کثرت سے تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

لٰہذا اِن واقعات کے بارے میں تشکیک بلا دلیل ہے جس کی کوئی سند نہیں۔ جبکہ وہ واقعات صحیح روایات سے ثابت ہیں اور جن روایات میں عمر بن سیف بھی نہیں ہے، اُن سے بھی عبد اللہ بن سبا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ کثیر روایات اور نصوص کے بالمقابل عقلی استدلال کی کوئی اہمیت نہیں۔ نہ تاریخی حقائق کو جھٹلایا جا سکتا ہے نہ علماء و محدثین کو غلط کہا جا سکتا ہے۔[1]

فتنہ بھڑکانے میں عبد اللہ بن سبا کا کردار

خلافت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری برسوں میں وہ تبدیلیاں ظہور میں آئیں جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، اُن کے نتیجے میں اسلامی معاشرے میں اضطراب کی نشانیاں نمودار ہو گئیں، بعض یہودی ظہورِ فتنہ کے مواقع کا انتظار کر رہے تھے تاکہ فتنے کے عوامل کا استحصال کر سکیں، وہ خود کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے ''تقیہ'' کا استعمال کر رہے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں عبد اللہ بن سبا ہے جسے ابن السوداء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

فتنے کے پس منظر میں ابن سبا کے کردار کو بعض غالی مزاج لوگوں نے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، اُسے اتنا ہولناک بنا کر پیش کرنا صحیح نہیں،[2] اسی طرح اُس کے بارے میں تشکیک پیدا کرنا یا اُس کے کردار کو معمولی بنا کر پیش کرنا بھی غلط ہے، یہی شخص تھا جس نے

---

[1] دعاوي الإنقاذ للتاريخ الإسلامي للعودة، و تحقيق مواقف الصحابة: 1/70. [2] جیسے سعید الأفغانی کی کتاب ''عائشة والسياسة''۔

فتنہ بھڑکایا۔ پھر دیگر عوامل نے اُس کے لیے راہ ہموار کی، ابن سبا نے جو کچھ پیش کیا وہ ایسی آراء اور نظریات تھے جنھیں اس نے خود گھڑا اور خود ہی دعویٰ کیا اور کینہ پرور یہودی ذہنیت نے ان نظریات پر عمل کیا، پھر مخصوص اہداف کے ساتھ اُن کی ترویج کی، اس شخص نے اسلامی معاشرے میں انتشار پیدا کیا۔ فتنے کی آگ بھڑکائی۔ اس طرح معاشرے میں اختلافات کے بیج پھوٹ پڑے، یہی وہ عوامل ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنے، اور امت گروہوں میں بٹ گئی۔[1]

ان سب امور کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن سبا نے سچ کی بنیاد پر مقدمات قائم کیے اور پھر ان کی بنیاد پر مفسدانہ اصول وضع کیے، جنھیں مفسدوں اور ہوائے نفس کے پجاریوں کے علاوہ سادہ مزاج کے غالی لوگوں میں بھی پذیرائی ملی، پھر اُس معاملے نے پیچ در پیچ راستے اختیار کیے، ابن سبا نے معاملات کو خلط ملط کرتے ہوئے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرلیا، اُس نے اپنے زعم فاسد کی بنیاد پر قرآن کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا: بڑے تعجب کی بات ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو اس دنیا میں واپس آئیں گے اور جو شخص کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئیں گے اس کو جھٹلا دیا جائے؟

جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾

''بلاشبہ وہ (اللہ) جس نے آپ پر قرآن نازل کیا، یقیناً وہ آپ کو (اچھے) انجام تک پہنچانے والا ہے۔''[2]

اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں واپس آنے کے زیادہ حق دار ہیں۔[3] مزید برآں اُس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرا کر اس دعوت کو ثابت کرنے کے لیے قیاسِ فاسد کا راستہ اختیار کیا، اُس نے کہا: ایک ہزار نبی ہو

[1] تحقیق مواقف الصحابة: 327/1. [2] القصص 85:28. [3] تاریخ الطبري: 347/5.

گزرے ہیں، ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، پھر کہا کہ محمد ﷺ خاتم الأنبیاء اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خاتم الأوصیاء ہیں۔ [1]

جب اُس کے معاملات نے اس کے پیروکاروں کے دلوں میں جگہ بنالی، تو پھر وہ اپنے اصل ہدف کی طرف متوجہ ہوا، یہ ہدف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگوں کا خروج تھا، اُس نے شدت سے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی وصیت کی پروانہیں کی اور آپ ﷺ کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی کے باوجود خلافت کے لیے (نعوذ باللہ) کود پڑا اور اُمت کی حکمرانی خود اپنے ہاتھ میں لے لی، بھلا اُس سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے؟

پھر وہ لوگوں سے علی الاعلان کہنے لگا: عثمان رضی اللہ عنہ نے بغیر استحقاق خلافت سنبھالی ہے۔ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے وصی ہیں، لہٰذا اُٹھ کھڑے ہو، وقت کے حکمرانوں پر کیچڑ اچھالو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سہارا لے کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرو۔ [2]

پھر اُس نے ہر طرف اپنے ہرکارے روانہ کردیے۔ اس نے اس تخریب کاری کے لیے خط کتابت بھی کی۔ اپنی سازش کا جال پھیلانے کے لیے جابجا اپنے جاسوس بھی دوڑائے۔ یوں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ اپنے سازشی منصوبے پہنچائے، وہ اپنا اصل بھید ظاہر نہ کرتے اور لوگوں کو بہکانے اور بھڑکانے کی کوشش کرتے لیکن ہر جگہ لوگ یہی جواب دیتے تھے کہ ہم تو عافیت کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ [3]

ابن سبا نے طریق کار یہ اختیار کیا کہ لوگوں کی نگاہوں میں کبار صحابہ میں سے دو شخصیات کے مابین اختلاف کی تشہیر کی، ایک کو غاصبِ حق اور دوسرے کو مظلوم ظاہر کیا مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا گیا کہ اُن کا حق غصب کیا گیا ہے۔ خاص طور پر کوفہ میں یہ بات خوب اُچھالی گئی۔ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر اُن کے اُمراء کے خلاف بھڑکایا گیا، وہ معمولی سی بات پر مختلف والیانِ ریاست کے خلاف بھڑک اُٹھتے

---

[1] تاريخ الطبري: 347/5. [2] تاريخ الطبري: 348/5. [3] تاريخ الطبري: 348/5.

تھے، اُس نے اپنے اس منصوبے کی تکمیل و تنفیذ کے لیے دور دراز کے اعراب کو ورغلایا، اُس نے ان کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کرلیا تھا اور پڑھے لکھے لوگوں کو معروف و منکر کے زیر عنوان گمراہ کر رہا تھا۔

اس نے لالچی لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ کہہ کر اُکسایا کہ انھوں نے اقربا پروری کی ہے، مسلمانوں کے بیت المال میں سے بہت سا مال غلط کاموں پر ضائع کر دیا ہے۔ اور ایسی ایسی تہمتیں اور طعنہ زنی کی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیگناہ ہونے کے باوجود فسادیوں کو اُن کے خلاف خروج پر آمادہ کرلیا۔

بعدازاں اُس نے اپنے پیروکاروں کو ترغیب دی کہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک بُری اور المناک خبریں بھیج کر خوب نشر کریں تا کہ معاملات کی سنگینی میں اور اضافہ ہو، تا آنکہ سب لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ معاملات اس قدر کنٹرول سے باہر ہو چکے ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔ اِس ساری صورتِ حال سے سبائیوں ہی نے فائدہ اٹھایا، کیونکہ لوگوں کی طرف سے افواہوں کی تصدیق کے نتیجے میں اسلامی معاشرے میں فتنوں کے شرارے پھوٹتے رہے اور سبائی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے رہے۔[1]

اس ساری صورتحال کے پیش نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محسوس فرماتے تھے کہ مختلف علاقوں اور شہروں میں کچھ اُتھل پتھل ہو رہی ہے اور فتنے سر اُٹھا رہے ہیں اِس صورتحال پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم فتنے کی چکی چل رہی ہے، عثمان کے لیے خوش بختی ہوگی کہ جان تو دے دے مگر فتنے کو نہ بھڑکنے دے۔[2]

مصر ابن سبا کے لیے سازگار چراہ گاہ تھی، اُس نے وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ترغیب و تنظیم کا کام کیا، وہ فتنہ بھڑکانے کے لیے لوگوں کو مدینہ کی طرف خروج کے لیے اُکساتا تھا۔ اور دعوی اور دلیل یہ پیش کرتا تھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت پر ناحق قبضہ کیا اور

---

[1] الدولة الأموية ليوسف العشي، ص: 168، ومواقف الصحابة: 330/1. [2] تاريخ الطبري: 250/5.

رسول اللہ ﷺ کے وَصی کے خلاف کود پڑا، اُس کی مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔[1]

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگوں میں ایسے جعلی خطوط پھیلا دیے گئے جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ کبار صحابہ نے لکھے ہیں۔ تا آنکہ یہ اعراب (بدو) جب مدینہ منورہ پہنچے اور صحابہ کرام سے ملے تو اُن کی طرف سے انھوں نے مطلق کوئی تائید نہیں پائی بلکہ انھوں نے اپنی طرف منسوب اُن خطوط سے بریت اور بیزاری کا اظہار فرمایا۔[2] بدوؤں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو سب لوگوں کے حقوق کی پاسداری کررہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اُن لوگوں کی افتراء پردازی کو رَد کردیا اور عثمان رضی اللہ عنہ کے اقوال و اعمال کی سچائی ظاہر فرمائی۔ حتی کہ ایک بڑی شخصیت مالک بن اشتر النخعی بول اٹھے۔ اے لوگو! اُن (عثمان رضی اللہ عنہ) کے اور تمھارے خلاف سازش کی گئی ہے۔[3]

امام ذہبی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ عبداللہ بن سبا نے پہلے مصر میں فتنہ بھڑکایا پھر مختلف ولایات میں بدبختی اور انتقام کے بیج بوئے، پھر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر حملہ آور ہوا۔[4]

ابن سبا اکیلا نہ تھا، اس نے سازشیوں کا جال پھیلا رکھا تھا، وہ مکر و فریب، دھوکا بازی اور حیلہ سازیوں کا پُتلا تھا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مختلف گروہوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مجتمع کرنے والا درحقیقت ابن سبا ہی ہے۔ اُسی نے مصر پہنچ کر افترا پردازیوں کا طوفان اُٹھایا اور اہل مصر کی بڑی تعداد اُس کے ورغلانے میں آگئی۔[5]

ملتِ اسلامیہ کے سلف و خلف اور مشہور مؤرخین و علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں میں ابن سبا کا ظہور ایسے تخریبی افکار و نظریات اور منصوبوں کے ساتھ ہوا کہ جو مسلمانوں کو اُن کے دین اور اُن کے امام و قائد سے بیزار اور اُن کے مابین افتراق و انتشار پیدا کرنے کا موجب بنے۔ کچھ فسادی لوگ اُس کی حمایت میں کھڑے ہوگئے، یہی لوگ بعد میں

---

[1] تاريخ الطبري: 348/5، وتحقيق مواقف الصحابة: 330/1. [2] تاريخ الطبري: 248/5، و تحقيق مواقف الصحابة: 330/1. [3] تحقيق مواقف الصحابة: 331/1. [4] تحقيق مواقف الصحابة: 338/1.
[5] البداية والنهاية: 168,167/7.

سبائی گروہ کی شکل اختیار کر گئے، یہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فتنے کا اصل سبب تھے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے نتیجے میں جمل اور صفین جیسے سانحات پیش آئے۔ اس گروہ نے بصرہ، کوفہ اور مصر میں اپنی شاخیں قائم کر دی تھیں۔ ان لوگوں کا سب سے کارگر ہتھیار یہ تھا کہ انھوں نے قبائلی عصبیت کو دوبارہ بیدار کر دیا تھا۔ [1]

[1] تحقیق مواقف الصحابة في الفتنة: 339/1.

وہ اختلاف جو ایک طرف امیر المؤمنین علی اور طلحہ و زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے مابین پیدا ہوا، اور دوسری طرف علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین رُونما ہوا، اُس کا ہرگز یہ سبب نہ تھا کہ یہ حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کے زیادہ حق دار ہونے کے معترف نہ تھے بلکہ یہ اعتراف تو اُن کے مابین اِجماع کی حیثیت رکھتا ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت اور خلافت کے حق پر کبھی اعتراض نہیں کیا لیکن اُن کی اجتہادی رائے یہ تھی کہ بیعت سے پہلے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیا جائے اور انھوں نے اپنے آپ کو عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کا مطالبہ کرنے کا زیادہ حق دار سمجھا۔[1] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت کے دَرپے نہیں ہوئے اور انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اس لیے لڑائی نہیں کی کہ وہ خلافت کے حق دار نہیں ہیں بلکہ وہ تو اس کا اقرار و اعتراف کرتے تھے۔ نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کی ابتدا کرنا چاہتے تھے، نہ عملاً انھوں نے ایسا کیا۔[2] ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: شیعیت اختیار کرنے والا ہر فرقہ تسلیم کرتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت کے معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمسر نہیں تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے امکان کے پیش نظر وہ خلیفہ نہیں بن سکتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت، اُن کی سبقت، اُن کا علم، دین داری، دلیری اور دیگر تمام فضائل اُن کے پیش

[1] الفصل في الملل والأهواء والنحل: 160/4. [2] مجموع الفتاوى: 72/35.

نظر تھے جیسا کہ ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی فضیلت مسلمہ حقیقت تھی۔[1]

اختلاف کی بنیاد امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ اصل وجہ قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے کا مسئلہ تھا۔ اس حوالے سے قصاص لینے یا نہ لینے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اصل اختلاف اس مسئلے کے حل کے طریق کار پر تھا، اُدھر امیر المومنین رضی اللہ عنہ اصولی طور پر قصاص لینے پر متفق تھے، تاہم اُن کی رائے صرف یہ تھی کہ حالات کے پُر سکون اور اُمت کے متحد ہونے تک اس مقدمے کو ملتوی کر دیا جائے۔[2]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خوب اچھی طرح جان لو کہ اِن لڑائیوں کا سبب یہ تھا کہ مسائل میں شبہات اُبھر آئے تھے، ان شبہات کی شدت کے باعث اُن کے اجتہاد میں بھی اختلاف ہوگیا اور وہ لوگ تین اقسام میں تقسیم ہوگئے: ایک قسم تو وہ تھی کہ اجتہاد کی بِنا پر اُنھوں نے یہ سمجھا کہ حق اُن کے ساتھ ہے اور اُن کا مخالف باغی ہے، انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا ضروری سمجھا، اُن کے خیال میں باغی سے لڑنا ضروری تھا، لہٰذا اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ اُن کی نظر میں باغیوں سے لڑنا مطلوب ہے اور امام عادل کی مدد سے پیچھے ہٹنا جائز نہیں۔

دوسری قسم وہ تھی جو اِن کے برعکس تھی، اجتہاد کی بنیاد پر اُنھوں نے دوسروں کو برحق سمجھا، اُن کی مدد کو اپنے آپ پر واجب قرار دیا، اور جو لوگ اس سوچ کے باغی تھے اُن کے خلاف لڑنا ضروری سمجھا۔

تیسری قسم ان حضرات کی ہے جو زیرِ نظر مسئلہ میں اشتباہ کا شکار ہوگئے۔ حیرانی و پریشانی میں پڑ گئے، کوئی ایک گروہ بھی ان کی نظر میں قابلِ ترجیح قرار نہیں پایا، لہٰذا انھوں نے دونوں سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ان کے خیال میں معاملے سے علیحدگی اختیار کرنا ہی برحق تھا۔ کیونکہ کسی مسلمان کے خلاف اُس وقت تک لڑائی کا اِقدام جائز نہیں جب تک یہ واضح

[1] مجموع الفتاوی: 72/35. [2] أحداث و أحاديث فتنة الهرج، ص: 158.

نہ ہو جائے کہ وہ واقعی اس کا مستحق ہے۔ اگر ان لوگوں پر واضح ہو جاتا کہ از روئے حق فلاں گروہ کا پلہ بھاری ہے تو اُن کے لیے اُن کی مدد سے گریز اور باغیوں کے خلاف لڑائی سے پیچھے ہٹے رہنا جائز نہیں تھا۔[1]

خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کا مطالبہ

① ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ واپس جاتے ہوئے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شہادتِ عثمان کی خبر سنی تو آپ مکہ لوٹ گئیں، مسجد حرام میں داخل ہوئیں اور پھر حطیم میں خیمہ زن ہو گئیں، لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا:

اے لوگو! مختلف شہروں کے فسادی، دیہاتی اور اہل مدینہ کے غلاموں نے اپنی اغراض کے پیشِ نظر اس معصوم مقتول کے خلاف عیب جوئی کی اور پھر چند لونڈوں کو اُن کے خلاف استعمال کیا، بغیر دلیل اور بغیر عذر کے انھوں نے اضطرابی کیفیت پیدا کی، زیادتی سے کام لیا، حرمت والا خون بہایا، بلد حرام کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا، مال حرام لیا اور حرمت والے مہینے کی بے حرمتی کی اللہ کی قسم! عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک انگلی روئے زمین کے رہنے والے اِن جیسے سب لوگوں سے بہتر ہے، تم سب متحد ہو جاؤ تو اس صورتِ حال سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔ ان لوگوں کو عبرت کا نشان بنا دو، ان کی اجتماعیت میں پھوٹ ڈال دو۔ ہمارے لیے اس گناہ سے اسی طرح چھٹکارا ممکن ہے جس طرح سونے کو بھٹی میں جلا کر کھوٹ نکال دی جاتی ہے یا جس طرح میل کپڑے سے نکال دی جاتی ہے۔[2]

ایک روایت میں آیا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب یہ خبر سن کر واپس مکہ کی طرف لوٹیں تو اُن کی خدمت میں امیرِ مکہ عبداللہ بن عامر الحضرمی حاضر ہوئے انھوں نے پوچھا: اُم المؤمنین!

---

[1] شرح النووي على صحيح مسلم: 149/15. [2] تاريخ الطبري:5/474,473.

آپ کو واپس کیوں آنا پڑا؟ اُنھوں نے فرمایا: میں اس لیے واپس آئی ہوں کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو مظلومیت کی حالت میں شہید کر دیا گیا ہے، اور فسادیوں کا معاملہ ٹھیک ہونے والا نہیں، عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ اور اسلام کی عزت کا سامان کرو۔[1]

صحیح اور صریح نصوص سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان کی مدح اور تعریف کی اور قاتلوں پر لعنت بھیجی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں ان سے بہت سی احادیث منقول ہیں۔ فاطمہ بنت عبدالرحمٰن الیشکریہ اپنی والدہ سے روایت کرتی ہیں کہ انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: آپ کا ایک بیٹا آپ کو سلام کہتا ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ سے سوال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بہت باتیں کی ہیں...... یہ سن کر وہ کہنے لگیں: اللہ اس پر لعنت کرے جو عثمان پر لعن طعن کرے، اللہ کی قسم! عثمان رضی اللہ عنہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف پیٹھ کیے ہوئے تھے، جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی وحی لا رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: عثمان (رضی اللہ عنہ)! یہ لکھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ مقام و مرتبہ اس وجہ سے دیا تھا کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھے۔[2]

مسروق، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے موقع پر فرمایا: تم نے مَیل سے پاک صاف، شفاف کپڑے کی مانند کردار والے انسان کو اس طرح ذبح کر دیا جس طرح مینڈھے کو ذبح کیا جاتا ہے۔ مسروق کہتے ہیں میں نے اُن سے کہا: یہ تو آپ ہی کا کیا دھرا ہے، آپ ہی نے لوگوں کو خط لکھ کر عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کے لیے ابھارا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ہرگز نہیں، اُس اللہ کی قسم جس پر مومن ایمان لائے ہیں اور کافروں نے اُس کا کفر کیا ہے، میں نے آج تک انھیں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔[3]

---

[1] تاریخ الطبري: 475/5. [2] المسند: 250/6-260، وتحقیق مواقف الصحابة: 378/1. [3] فتنة مقتل عثمان: 391/1، وتاریخ خلیفة بن خیاط، ص: 176، عائشہ رضی اللہ عنہا تک اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

② طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما

حضرت طلحہ، زبیر اور اُن کے ساتھی صحابہ رضی اللہ عنہم نے امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں پر قصاص کی حد فوری نافذ کرنے کا مطالبہ کیا، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے عزیز بھائیو! میں اُس معاملے سے ناواقف نہیں جس کا آپ مجھ سے مطالبہ کر رہے ہیں، لیکن میں اُن لوگوں کا کیا کروں جو ابھی تک ہم پر حاوی ہیں، ہم اُن پر حاوی نہیں، تمھارے غلام اور تمھارے جاہل بدو لوگ بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ ہم سے من مانا سلوک کرتے ہیں۔ کیا فی الحال آپ کا مطالبہ پورا کیا جاسکتا ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: نہیں! یہ سن کر امیر المؤمنین نے فرمایا کہ میری رائے بالکل وہی ہے۔ جو آپ کی ہے ان لوگوں نے بھی کوئی نہ کوئی بنیاد قائم کر رکھی ہے، شیطان کی مرضی اس زمین پر مستقلاً قائم نہیں رہے گی۔ اس معاملے میں تین آراء سامنے آچکی ہیں۔ ایک گروہ کی رائے آپ کی رائے کے مطابق ہے، دوسرا گروہ آپ کی رائے کے برعکس ہے۔ اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ ماحول پُر سکون ہو جائے، لوگوں کے دل صحیح رُخ اختیار کر لیں، پھر حقوق کا مطالبہ کیا جائے، اب آپ اس معاملے پر غور کر لیں، اور واپس آ کر مجھے اپنی رائے بتائیں۔ [1]

یہ سیاسی حکمت عملی بعض لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکی، لوگ ابھی تک غصے کی حالت میں تھے اور جذبات کی رُو میں بہہ رہے تھے۔ انھیں ان معاملات کا صحیح ادراک تھا نہ اُن کے اندازے صحیح تھے، وہ فوری طور پر ناممکن کو ممکن سمجھ رہے تھے، اسی لیے انھوں نے کہا: یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے، ہم اسے مؤخر نہیں کر سکتے، [2] اس سے اُن کی مراد یہی تھی کہ قاتلین عثمان پر حد نافذ کی جائے۔ [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ موجود حالات وہ کچھ نہیں کر سکتے، لہٰذا آپ نے اعلان فرمایا: ہر غلام اپنے آقا کے پاس واپس

[1] تاريخ الطبري: 460/5. [2] تاريخ الطبري: 460/5. [3] الدور السياسي، ص: 378.

لوٹ جائے وگرنہ اس کا ذمہ ختم سمجھا جائے گا۔

یہ سن کر باغی سبائی اور دیہاتی آپس میں الجھنے لگے کہ حالات جیسے آج ہیں، کل بھی ویسے ہی رہیں گے پھر ہم ان کے بارے میں کیا فیصلہ کر پائیں گے۔ گویا کہ فتنے کے سرغنے سبائی گروہ کو یہ محسوس ہوا کہ خلیفہ اُنھیں ان کے اعوان و انصار سے الگ کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے دیہاتیوں کو اپنی حالت پر برقرار رہنے کی ترغیب دی، وہ لوگ مان گئے اور اپنی اپنی جگہوں پر برقرار رہے۔ بیعت کے تیسرے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور اُن سے (قاتلینِ عثمان سے) کہا کہ اعراب کو اپنے ہاں سے نکال دو۔ پھر اعراب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: تم اپنے اپنے علاقوں میں چلے جاؤ، سبائی لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کیا اور اعراب بھی اُنھی کے کہنے پر عمل کرتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر تشریف لائے، اُن کے ساتھ ہی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی دیگر صحابہ کرام کی معیت میں اُن کے گھر میں داخل ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ انتقام کے جذبات کم کرو۔ انھوں نے کہا کہ یہ لوگ (قاتلینِ عثمان) اندھے ہوگئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آج کے بعد یہ مزید اندھے اور نافرمان ہوجائیں گے۔

حضرت علی، حضرت طلحہ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم دیگر صحابہ کی معیت میں اس پر متفق نظر آتے تھے کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کی اجتماعیت میں تفریق ڈالی، مخالفانہ رویہ اختیار کیا اور خلیفۂ راشد کو شہید کردیا، اُن پر قصاص کی حد فوری طور پر نافذ ہونی ضروری ہوگئی ہے، تاکہ دین اسلام کو اُن کے شر سے محفوظ رکھا جاسکے، وہ اس معاملے میں باہمی تعاون کرنے والے تھے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ اِن فسادیوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں جو حاوی ہوچکے تھے، وہ لوگ غلاموں اور اعراب (بدوؤں، دیہاتیوں) کو بھی متحرک کرچکے تھے، اور اہل مدینہ سے اپنی مرضی کا برتاؤ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اُن لوگوں کے خلاف لڑائی کی قدرت نہ تھی۔ [1]

[1] فتح الباري: 12/360.

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے اِن سبائی لوگوں کے مقابلے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک تجویز پیش کی۔ طلحہ نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا: میں بصرہ چلا جاتا ہوں اور وہاں سے لاؤ لشکر تیار کر کے لاتا ہوں۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں کوفہ چلا جاتا ہوں اور ان فسادیوں کے خلاف لڑنے کے لیے لاؤ لشکر تیار کر کے لاتا ہوں۔[1] لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس معاملے پر مزید انتظار کرنے کا خیال ظاہر فرمایا اور اُن سے کہا کہ اس معاملے پر سوچ و بچار کرتے ہیں۔[2]

شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ فتنہ و فساد سے خائف تھے اور یہ محسوس فرماتے تھے کہ مَبادا یہ معاملہ مدینہ منورہ میں خانہ جنگی تک جا پہنچے اور اُس کا انجام بُرا ہو، لہٰذا انھوں نے طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کا مطالبہ قبول نہیں کیا۔[3]

طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تجویز پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس موقف کے قائل ہو گئے تھے کہ فسادی لوگ دیگر مسلمانوں پر حاوی ہیں، جبکہ دیگر مسلمان اُن پر حاوی نہیں ہیں۔ اُن دونوں کی کوشش تھی کہ حد شرعی کے نفاذ کے تعطل کا وقت مزید مختصر کیا جائے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے تقویت کا سامان پیدا کیا جائے تاکہ وہ حد قائم کر سکیں۔

صحابہ کرام نے انتظار کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس معاملہ پر غور و فکر کر لیں۔ وہ خود یہ رائے رکھتے تھے کہ فتنے کے مکمل خاتمے تک یہ معاملہ ممکن نہیں، اور یہ ایک ایسا فتنہ ہے کہ جوں ہی اسے چھیڑا گیا یہ مسلسل بڑھتا چلا جائے گا۔[4]

جب زبیر، طلحہ رضی اللہ عنہما اور اُن سے متفق صحابہ کرام نے دیکھا کہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ پر چار ماہ بیت چکے ہیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان پر قصاص کی حد قائم نہیں کر سکے، کیونکہ جیش علی رضی اللہ عنہ میں انھی لوگوں کا غلغلہ اور شان و شوکت ہے، چنانچہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے حضرت

---

[1] تاريخ الطبري: 361/5. [2] تاريخ الطبري: 361/5. [3] تحقيق مواقف الصحابة: 108/2. [4] تاريخ الطبري: 367/5، و دور المرأة السياسي، ص: 380.

علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ہمیں اجازت دے دیجیے کہ ہم مدینہ سے چلے جائیں، یا تو آپ حالات کو کنٹرول کرلیں یا ہمیں جانے دیں تو انھوں نے فرمایا: جس حد تک ممکن ہوگا میں معاملات کنٹرول کرنے کی کوشش کروں گا، اگر اور کوئی چارۂ کار نہ ہوگا تو آخری علاج گرم لوہے سے داغنا ہوگا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ خوب سمجھتے تھے کہ اُن دونوں کا مدینہ سے چلے جانا اُن دونوں کی طرف سے اس مسئلہ کے حل کی ایک کوشش ہے، لہٰذا اُنھیں جانے سے منع نہیں کیا، کیونکہ وہ بھی کسی حل تک پہنچنے کے آرزومند تھے بلکہ وہ اپنے مخصوص طریقے سے اس امر کی کوشش بھی کررہے تھے۔[2]

طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے بصرہ وکوفہ جانے کی اجازت طلب کرنے اور وہاں سے لشکر لاکر فسادیوں پر کنٹرول کرنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس پر متفق نہ ہونے کے حوالے سے دورِ حاضر کے بعض محققین میدان میں کود پڑے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں شخصیات کے سلسلے میں ڈرتے تھے مبادا معاملہ کسی پریشانی کا پیش خیمہ بن جائے اور وہ دونوں اُس سنت کو زندہ نہ کردیں جو اہل مصر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ روا رکھی یوں ان کے سامنے بھی یوم الدار کا منظر حقیقت بن جائے۔[3] ان دونوں حضرات صحابہ کے طلبِ اجازت کو اس قسم کا رنگ دینا ظلم اور اُن جیسے پاکباز صحابہ کے حق میں حد سے تجاوز کرنے والی بات ہے۔[4]

زبیر و طلحہ رضی اللہ عنہما دونوں مکہ مکرمہ گئے۔ ان کے پاس مسلمانوں کا جم غفیر جمع ہوگیا جو قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کا مطالبہ کررہے تھے۔ اِس بارے میں ان شاء اللہ مفصل گفتگو آگے آرہی ہے۔

---

[1] تاريخ الطبري: 368/5، و دور المرأة السياسي، ص: 380. [2] دور المرأة السياسي، ص: 381,380.
[3] الخلفاء الراشدون، ص: 372. [4] خلافة علي بن أبي طالب رضي الله عنه لبعد الحميد علي، ص: 118.

③ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

قدیم و جدید ادوار کے لوگوں میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا سبب یہ تھا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے دل میں خلافت کے حصول کی طمع رکھتے تھے اور اُن کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج اور بیعت کرنے سے انکار کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ولایتِ شام سے معزول کردیے گئے تھے۔ ایک مشہور کتاب ''الإمامة والسیاسة'' جو ابن قتیبہ دینوری کی تصنیف بیان کی جاتی ہے اس میں ایک روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت کے مُدّعی تھے۔ اسی روایت میں ہے کہ ابن الکواء نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا: جان لو کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اسلام کے آزاد کردہ ہیں (فتح مکہ کے موقع پر جنھیں عام معافی دی گئی تھی یہ بھی ان میں شامل تھے) ان کے والد گروہوں کے سردار تھے، انھوں نے بغیر مشورہ کے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اگر یہ بات صحیح ہے تو اُنھیں اس عہدے سے ہٹانا درست ہے اور اگر جھوٹ ہو تو تمھارا اُن سے کلام کرنا حرام ہے۔[1]

یہ بات امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ یہ رافضیوں کی بنائی ہوئی بات ہے۔ تاریخی حقائق کی اصل شکل کو بگاڑنے میں اس کتاب ''الإمامة والسیاسة'' کا جو کردار ہے اُس کا تذکرہ مناسب مقام پر آئے گا۔ کتبِ تاریخ و ادب، اُن من گھڑت اور ضعیف روایات سے بھی بھری پڑی ہیں جن میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اقتدار، سرداری اور حکومت کے حصول کے متمنی تھے۔[2]

صحیح بات یہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلاف کی اصل وجہ، اُن کی طرف سے قاتلین عثمان سے قصاص لینے کے ساتھ بیعت کو مشروط کرنا تھا، حضرت

[1] الإمامة والسياسة: 113/1. [2] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنة: 145/2.

معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی اہل شام یہ کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیں تو وہ بیعت میں داخل ہوجائیں گے۔[1]

قاضی ابن العربی کہتے ہیں: اہل شام اور اہل عراق کے درمیان لڑائی کا سبب اُن دونوں کے موقف میں اختلاف تھا۔ اہل عراق، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی طرف بُلاتے اور اُن کے حق میں آواز بلند کرتے تھے جبکہ اہل شام، قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے پر اصرار کررہے تھے اور کہتے تھے کہ جو اِن قاتلوں کو پناہ دے، ہم اُس کی بیعت نہیں کرسکتے۔[2]

امام الحرمین الجوینی، لمع الأدلۃ میں فرماتے ہیں: ہر چند حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالمقابل آن کھڑے ہوئے تھے لیکن وہ اُن کی امامت وقیادت کے مخالف نہ تھے، نہ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ خلافت کے حق دار وہ ہیں، وہ تو عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص کا مطالبہ کررہے تھے، ان کا خیال تھا کہ وہ صحیح موقف پر قائم ہیں حالانکہ اُن کا موقف غلط تھا۔[3]

اور علامہ ابن حجر ہیتمی کہتے ہیں کہ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جو لڑائی تھی وہ معاویہ کے خلافت کے حق دار ہونے کے دعوی پر نہیں تھی، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس پر اجماع تھا۔ فتنے کا سبب یہ نہیں تھا، فتنے کی اصل وجہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا یہ مطالبہ تھا کہ قاتلین عثمان کو ان کے حوالے کیا جائے کیونکہ حضرت معاویہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے چچا زاد بھائی تھے اور ان کے وارث ہونے کی وجہ سے قصاص کا مطالبہ کررہے تھے۔

جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن کے مطالبے پر فوری عمل کرنے سے قاصر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قاتلین عثمان کے قبائل اس وقت حاوی ہیں اور ان کے تعلقات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ بھی ہیں۔ اگر انھیں فوری طور پر حضرت معاویہ کے حوالے کیا گیا تو زبردست فسادات پھوٹ پڑیں گے۔[4]

---

[1] البدایة والنهایة: 129/8، و فتح الباري: 92/13. [2] العواصم من القواصم، ص: 162. [3] لمع الأدلّة في عقائد أهل السنة والجماعة، ص: 115. [4] الصواعق المحرقة: 622/2.

اکثر روایات اس بات کا اشارہ دیتی ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کے لیے تیار تھے، وہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کر رہے تھے، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قصاص کا مطالبہ دراصل اقتدار کی طمع کی خاطر تھا تو کیا اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص کا حکم نافذ کر دیتے تو کیا معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی بیعت نہ کرتے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن کی بیعت و اطاعت کے لیے لازماً تیار ہو جاتے، کیونکہ اُنھوں نے واضح طور پر اپنا یہ موقف پیش کیا تھا، اُن کے ساتھی بھی بیعت کو قصاص کے ساتھ مشروط قرار دے رہے تھے۔ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اقتدار کی طمع کرنے والا مان لیا جائے تو پھر یہ ساری داستان مہم جوئی کے سوا کچھ نہ تھی۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی اور افضل صحابہ میں سے تھے، ان کے لہجے میں سچائی تھی، وہ حلم اور بُردباری والے تھے۔ یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ شرعی خلیفہ کے خلاف لڑائی کریں اور زوال پذیر اقتدار کے لیے مسلمانوں کا خون بہائیں، اُن کا اپنا کہنا یہ ہے: مجھے جب بھی دو باتوں یعنی اللہ تعالیٰ اور غیر اللہ کے درمیان انتخاب کی بات کہی گئی تو میں نے اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ اُنھوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: اے اللہ! اُسے ہدایت یافتہ اور باعثِ ہدایت بنا دے۔[3]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: ”اے اللہ! اُسے کتاب کا علم عطا فرما اور اُسے عذاب سے بچا۔“[4]

البتہ اُن کے موقف میں غلطی کی توجیہ یہ ہے کہ انھوں نے قصاص سے قبل بیعت سے انکار کر دیا کہ اِن فسادیوں کے بارے میں انھیں اپنے سابقہ موقف کے باعث ڈر تھا کہ وہ اُنھیں قتل کر دیں گے، یہی وجہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے قاتلینِ عثمان کو اُن کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا، جبکہ قصاص کا طلبگار خود حکم دینے کا مجاز نہیں۔ اُسے پہلے حلقۂ اطاعت میں

---

[1] تحقيق مواقف الصحابة: 150/2. [2] سير أعلام النبلاء: 151/3. [3] جامع الترمذي، حديث: 3842.
[4] فضائل الصحابة: 913/2، اس کی سند حسن ہے۔

داخل ہو جانا چاہیے پھر حاکم کی خدمت میں مقدمہ پیش کرنا اور اپنا حق مانگنا چاہیے تھا۔[1]

اہل فتویٰ ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شخص از خود کسی سے قصاص کی صورت میں بدلہ یا اپنا حق نہیں لے سکتا۔ وہ اپنے حق کا مطالبہ حکمران یا اُس کے مقرر کردہ نائب سے کرے گا، بصورت دیگر فتنہ و فساد پھیل جائے گا۔[2]

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کیا اور وہ تاویل سے کام لے رہے تھے، اُنھیں گمان تھا کہ وہ حق پر ہیں، لہٰذا اُنھوں نے اہل شام کو جمع کیا، اُن سے خطاب کیا اور اُنھیں اپنے بارے میں یاد دلایا کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وارث ہوں۔ یعنی اُن کا چچا زاد ہوں اور عثمان رضی اللہ عنہ مظلومیت کی حالت میں شہید کیے گئے ہیں۔ پھر انھوں نے لوگوں کے سامنے یہ آیت پڑھی:

﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴾

''اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو غلبہ دیا ہے، چنانچہ وہ قتل (قصاص) میں زیادتی نہ کرے، بے شک وہ مدد کیا ہوا ہے۔''[3]

بعد ازاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطاب جاری رکھتے ہوئے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ شہادتِ عثمان کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ یہ بات سن کر اہل شام اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص طلب کرنے کی تائید کی۔ اِس بات پر اُن کی بیعت کی اور عہد کیا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے مرتے دم تک اپنی جان اور مال قربان کریں گے۔[4] اگر ہم طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین تقابلی جائزہ لیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ اول الذکر، چار توجیہات کی بنیاد پر دوسرے فریق کی

[1] تحقیق مواقف الصحابة: 151/2. [2] تفسیر القرطبي: 256/2. [3] بني إسرائيل 33:17. [4] وقعة صفين لابن مزاحم، ص: 32، و تحقيق مواقف الصحابة: 152/2.

نسبت صحیح نقطۂ نظر کے حامل تھے:

اول: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت تسلیم کرتے ہوئے دونوں نے اُن کی بیعت کی لیکن معاویہ رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ماننے کے باوجود ان کی بیعت نہیں کی۔ [1]

دوم: وہ دونوں، اسلام اور مسلمانوں کی نظر میں بلند مقام رکھتے تھے اور سبقت فی الاسلام پر قائم تھے، جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بلحاظِ فضیلت بہرحال اُن دونوں سے کم تھے۔ [2]

سوم: اُن دونوں نے فقط حضرت عثمان کے خلاف باغیوں کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور جمل کے واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف جان بوجھ کر لڑائی میں شریک نہیں ہوئے۔ [3]

لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف جنگ پر اصرار کیا۔ [4]

چہارم: حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما دونوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ قصاص کے معاملے میں قاتلینِ عثمان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں نے صریحاً یہ الزام لگایا تھا۔ [5]

فتنے سے کنارہ کشی کرنے والوں کا موقف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان ''عنقریب فتنے برپا ہوں گے، جن میں بیٹھ جانے والا، کھڑے رہنے والے سے زیادہ بہتر ہوگا، اور اُس میں کھڑا رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا، جو اُس کی طرف جھانک کر دیکھے گا، تو (یہ فتنہ) اُسے گلے لگا لے گا۔ ایسی صورت حال میں جسے جہاں بھی جائے پناہ ملے وہ وہاں پناہ حاصل کرلے۔ [6]

---

[1] البداية والنهاية: 129/8، وفتح الباري: 92/13. [2] طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ [3] تحقيق مواقف الصحابة: 113/2، و تاريخ الطبري: 475/5. [4] تاريخ الطبري: 612/5-615. [5] تحقيق مواقف الصحابة: 139/2، والبداية والنهاية: 259/7. [6] صحيح البخاري، حديث: 7081.

اس فرمان کو بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بنیاد بنایا اور یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ انھیں مذکورہ فتنے سے علیحدگی ہی اختیار کر لینی چاہیے۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس حدیث میں فتنے سے خوف دلایا گیا ہے اور ترغیب دی گئی ہے کہ اُس سے بچا جائے۔ اس سے جتنا تعلق ہوگا اُتنا ہی شر اور بُرائی کا ساتھ رہے گا۔ [1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے: ''عنقریب فتنے ہوں گے لیٹا ہوا شخص ان میں بیٹھنے والے سے بہتر ہوگا، اور بیٹھنے والا کھڑے آدمی سے زیادہ بہتر ہوگا، اور کھڑا ہوا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے زیادہ بہتر ہوگا۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا کوئی اونٹوں (کا باڑہ) ہے وہ وہاں چلا جائے اور جس کے پاس بکریاں ہوں وہ اُن کے پاس جا کر رہے، اور جس کی کوئی زمین ہو وہ وہاں چلا جائے۔ لوگوں نے پوچھا: جس کے پاس اِن میں سے کوئی چیز نہ ہو، وہ کیا کرے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اپنی تلوار کی دھار کو سیاہ پتھروں پر مارے (اسے ناکارہ بنا دے) اور جس طرح ممکن ہو اُس سے نجات حاصل کرے۔'' [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: ''قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریوں (کا ریوڑ) ہوگا، جنھیں لے کر وہ پہاڑوں کی گھاٹیوں اور جہاں پانی ہو وہاں چلا جائے اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے فتنوں سے دور بھاگ کھڑا ہو۔'' [3]

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے بالکل واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فتنہ و فساد اور لڑائی کے معاملات میں گُھسنے سے منع کیا گیا ہے۔ امام جُوَینی کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی بہت بڑی تعداد لڑائی اور فتنے سے پیچھے ہٹی رہی، انھوں نے پُر امن اور پُر سکون رہنے کو ترجیح دی، وہ مصائب اور ہلاکت کے تھپیڑوں سے دور رہے، اُن میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہما

[1] فتح الباري: 31/13. [2] صحيح مسلم، حديث: 2887. [3] صحيح البخاري، حديث: 7088.

بھی تھے۔ [1]

یہ دونوں صحابی عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ اِن فتنوں سے پیچھے رہنے والے صحابہ کرام میں ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عمر، اُسامہ بن زید اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم جیسی شخصیات بھی شامل تھیں، صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد نے ان کی پیروی کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اِن حضرات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ [2]

امام ابن حجر رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ وہ صحابہ کرام جو فتنے سے الگ تھلگ رہے وہ قلیل تعداد میں تھے، اسی طرح جن صحابہ نے جمل اور صفین میں لڑائی سے توقف اختیار کیا وہ لڑنے والوں کی نسبت کم تعداد میں تھے، البتہ اُن میں سے ہر ایک کے پاس اپنے موقف کی کوئی تاویل یا جواز موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے لیے اجر ہے، برخلاف اُن لوگوں کے جو بعد کے ادوار میں آئے اور انھوں نے طلبِ دنیا کی خاطر جنگ کی۔ [3]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اکابر صحابہ کرام کی اکثریت لڑائی میں شریک نہیں ہوئی، نہ اِس جانب سے، نہ اُس طرف سے اور قتال کو ترک کرنے والوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اُن احادیث سے استدلال کیا جو فتنے کے زمانے میں لڑائی نہ کرنے کے بارے میں ہیں۔ ان حضرات نے واضح کیا کہ یہ لڑائی، فتنے کا باعث ہے۔ [4]

امام قرطبی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ صحابہ کرام کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی میں شرکت سے توقف اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ امام عادل کی اطاعت سے نکلنے والی جماعت کے خلاف قتال فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ جیسی شخصیات لڑائی کے میدان سے پیچھے رہیں۔ [5]

آیئے! اب اُن صحابہ کرام کے کچھ اقوال پیش کرتے ہیں جنھوں نے فتنے سے کنارہ

---

[1] سعید بن زید بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ان کی وفات 51 ھ میں ہوئی۔ تهذيب التهذيب: 30/4. [2] غياث الأمم في التياث الظلم، ص: 86,85. [3] فتح الباري: 34/13. [4] مجموع الفتاوى: 55/35. [5] تفسير القرطبي: 319/16.

کشی اختیار کی:

① سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

صفین کے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد صحابہ کرام میں سعد رضی اللہ عنہ افضل ترین شخصیت تھے جب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا آپ لڑائی میں شریک نہیں ہوں گے، حالانکہ آپ اہل شوریٰ میں سے ہیں، اور دوسروں کی نسبت آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں؟ انھوں نے فرمایا: میں اُس وقت تک لڑائی نہیں کروں گا جب تک مجھے ایسی تلوار نہ پیش کی جائے جس کی دو آنکھیں ہوں، ایک زبان اور دو عدد ہونٹ ہوں اور وہ مومن اور کافر کے مابین پہچان کر سکے، میں نے جہاد کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ جہاد کیا ہے۔ [1]

امام مسلم نے عامر کی حدیث میں بیان کیا ہے کہ اُنھوں نے کہا: سعد بن ابی وقاص اپنے اونٹوں کے درمیان موجود تھے کہ اُن کا بیٹا عُمر اُن کے پاس آیا تو انھوں نے کہا: میں اِس سوار کے شر سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، وہ نیچے اترا اور اپنے والد سے پوچھنے لگا: کیا آپ اپنے اونٹوں اور بکریوں کے مابین موجود رہیں گے جبکہ لوگوں کو اقتدار کے تنازع میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ سن کر سعد رضی اللہ عنہ نے اُس کے سینے پر تھپڑ مارا اور فرمایا: چُپ رہو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ فرماتے تھے: ''بیشک اللہ تعالیٰ متقی پرہیزگار، غنی اور چھپ کر رہنے والے بندے سے محبت کرتا ہے۔'' [2]

② محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ کو بُلا بھیجا وہ آئے تو فرمایا: آپ اِس معاملے سے پیچھے کیوں رہ گئے؟ انھوں نے کہا: آپ کے چچازاد۔ یعنی

---

[1] مجمع الزوائد: 299/7، اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ [2] صحیح مسلم، حدیث: 2965.

نبی اکرم ﷺ نے مجھے تلوار دی تھی اور فرمایا تھا: اس کے ساتھ دشمن کے خلاف لڑو، اور جب تم دیکھو کہ تمھارے ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں تو کسی چٹان پر اسے مار کر بے کار بنا دینا، پھر اپنے گھر میں بیٹھ رہنا، تا آنکہ تمھیں موت آ جائے یا غلط ہاتھ تم تک آن پہنچے۔'' یہ سن کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''انھیں چھوڑ دو۔''[1]

③ ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ

زید بن وہب کہتے ہیں جب ہمیں شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر ملی تو لوگ انتہائی غم زدہ تھے۔ میں اپنے ایک ساتھی کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ ہمارے درمیان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت موجود ہے، آؤ اُن کے پاس چلتے ہیں، ہم ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، وہ کوفے کے امیر تھے، ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فتنے میں پڑنے سے منع کیا، اور گھروں میں بیٹھ رہنے کا حکم دیا۔[2]

کوفہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اشتر کی آمد اور لوگوں کو جنگ کے لیے نکالنے کی کہانی بیان کرتے ہوئے طبری نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کوفہ کے امیر تھے، وہ کھڑے ہو گئے، خطاب فرمایا اور انھوں نے لوگوں کو اپنے گھروں کے اندر ہی رہنے کی تاکید کی اور کہا کہ لوگ اپنی تلواریں نیاموں میں رکھیں۔ اُسی روز خطاب کرتے ہوئے فرمایا: یہ ایسا فتنۂ عظیم ہے کہ اس میں سو رہنے والا بیدار سے زیادہ بہتر ہے اور بیدار، بیٹھ رہنے والے سے بہتر ہے۔ اور بیٹھنے والا، کھڑے ہونے والے سے بہتر ہے، اور کھڑے رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہے، تم اصل عربی بنو، تلواریں میان میں رکھو، تیروں کے پیکان زائل کر دو، تانت کاٹ دو، اور مجبور و مظلوم کو پناہ دو، تا آنکہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے اور یہ فتنہ ختم ہو جائے۔[3]

[1] مسند أحمد: 225/4، یہ حدیث منقطع ہے، ایک اور سند سے بھی مروی ہے۔ المعجم الکبیر للطبراني: 178,177/12، علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد: (301/7) میں اس کے راویوں کو ثقہ بتایا ہے۔ [2] تاریخ ابن عساکر، ص: 488,487۔ [3] تاریخ الطبري: 513/5۔

انھوں نے یہ بھی فرمایا: جب فتنہ آتا ہے تو لوگ شبہات میں پڑے ہوتے ہیں اور جب فتنہ ختم ہو جاتا ہے تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے، فتنہ کھل جائے تو پیٹ کی بیماری کی مانند ہو جاتا ہے۔ شمال، جنوب اور مشرق و مغرب ہر طرف رُخ کر لیتا ہے، بسا اوقات کچھ وقت کے لیے تھم جاتا ہے، پتہ نہیں چلتا کہ یہ کدھر سے آیا ہے، یہ دانا انسان کو کل کے بچے کی مانند بنا دیتا ہے، اپنی تلواریں نیام میں رکھو، اپنے نیزے توڑ دو، اپنے تیر ہٹالو، تانت توڑ دو، اور اپنے گھروں میں رہو۔ [1]

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اپنے موقف پر وہ حدیث بیان کرتے تھے جو خود انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ جس میں فتنے میں پڑنے سے منع کیا گیا ہے کمان کو توڑنے، تانت کو کاٹ دینے، تلوار کو پتھر پر مارنے، اور آدم علیہ السلام کے مقتول بیٹے کا مرتبہ پالینے کا حکم ہے۔ [2]

ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت سے پہلے فتنے رُونما ہوں گے، جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کی مانند ہوں گے، صبح کے وقت بندہ، مومن ہوگا اور شام کو کافر، شام کو مومن ہوگا اور صبح کو کافر، اس میں بیٹھنے والا کھڑا رہنے والے سے بہتر، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ کمانیں توڑ ڈالو، تانتیں کاٹ ڈالو، اپنی تلواریں پتھر پر مار کر توڑ ڈالو، اگر کوئی شخص تمھیں مارنے کے لیے آئے تو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے اچھے بیٹے (ہابیل) کا کردار ادا کرو۔ [3]

④ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسا کوئی شخص نہیں جانتی کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] تاريخ الطبري: 515/5. [2] أحداث و أحاديث فتنة الهرج، ص: 181. [3] سنن ابن ماجه، حديث: 3961، وجامع الترمذي، حديث: 2204.

نے اُسے لوگوں کے معاملات سے محفوظ رکھا ہو، اور وہ اپنے سے پہلوں کے طریقے پر استقامت کے ساتھ قائم ہو۔ ⁽¹⁾

سعید بن جُبیر سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمارے پاس تشریف لائے، ہم پُر امید تھے کہ وہ ہم کو کوئی بہترین حدیث سنائیں گے، ہم سے پہلے ہی ایک شخص نے ان سے سوال کیا: اے ابوعبد الرحمٰن! ہمیں فتنے کی صورتحال میں قتال کے بارے میں بتائیں جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ ''تم اُن سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔'' ⁽²⁾

اُنھوں نے فرمایا: ارے بھولے آدمی! تم جانتے بھی ہو کہ فتنہ کیا ہے؟ محمد ﷺ تو مشرکین کے خلاف لڑتے تھے، اُن کے دین میں داخل ہونا فتنہ کہلاتا تھا، تمھاری طرح اقتدار کی خاطر لڑائی کرنا (فتنہ کے خلاف لڑائی) نہیں ہے۔ ⁽³⁾

حضرت نافع سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: اے ابوعبد الرحمٰن! کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنا ہے؟

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾

''اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرادو۔'' ⁽⁴⁾

اُنھوں نے فرمایا میں اِس آیت سے نصیحت حاصل کرتے ہوئے لڑائی کرنا پسند نہیں کرتا

ابن عمر نے مزید کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے:

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا ﴾

''اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔'' ⁽⁵⁾

⁽¹⁾ مصنف ابن أبي شيبة: 508/13، حديث: 36377. ⁽²⁾ البقرة 193:2. ⁽³⁾ صحيح البخاري، حديث: 7095. ⁽⁴⁾ الحجرات 9:49. ⁽⁵⁾ النسآء 93:4.

ابن عمر نے یہ بھی فرمایا: تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾

''اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔''[1]

ہم نے رسول اللہ ﷺ کے دور میں اس پر عمل کیا، جب مسلمان کمزور تھے اور آدمی اپنے دین کے بارے میں فتنے میں مبتلا ہوتا تھا، یا لوگ اُسے قتل کر دیتے تھے یا غلام بنا لیتے تھے، تا آنکہ اسلام کو قوت حاصل ہوگئی، پھر فتنہ باقی نہ رہا۔''[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو لوگوں میں انتشار پیدا ہوگیا، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک صالح انسان تھے، وہ مکہ چلے گئے اور فتنے سے دور رہے، تا آنکہ لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر مجتمع ہوگئے، ابن عمر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے تھے اور اُنھی کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے، اُن کی تعظیم کرتے تھے اور جو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کرتا اُس کی مذمت کرتے تھے لیکن مسلمانوں کی باہمی لڑائی میں داخل ہونا صحیح نہیں سمجھتے تھے، وہ فتنے کے دوران لڑائی کے علاوہ کہیں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موافقت سے پیچھے نہ رہے۔[3]

⑤ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ مقام ربذہ کی طرف چلے گئے، وہاں ایک خاتون سے شادی کی، جس سے اُن کے کچھ بچے بھی ہوئے۔ پھر وہیں رہے تا آنکہ وفات سے چند راتیں قبل وہ مدینہ آگئے۔[4]

⑥ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ

امام ذہبی رحمہ اللہ ان کے بارے میں کہتے ہیں، وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو فتنے سے

[1] البقرة 2:193. [2] سير أعلام النبلاء: 3/228،229. [3] منهاج السنة: 6/285. [4] صحيح البخاري، حديث: 7078.

کنارہ کش رہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں لڑائی نہیں کی۔[1] حمید بن ہلال کہتے ہیں: جب فتنے بھڑک اُٹھے تو عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے حجیر ابن الربیع العدوی سے کہا: اپنی قوم کے لوگوں کے پاس جاؤ، انھیں فتنہ پردازی سے منع کرو، میرا پیغام اُن تک پہنچاؤ، اُنھیں فتنے سے روکو، انھوں نے جواب میں کہا کہ میں اُن لوگوں کے مابین گمنام حیثیت رکھتا ہوں اور زیادہ اہمیت والا نہیں ہوں، راوی کہتے ہیں: میں نے عمران بن حصین رحمہ اللہ کو قسم اُٹھا کر یہ کہتے ہوئے سنا: کاش کہ میں سیاہ رنگ کا حبشی غلام ہوتا جو دور دراز پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چرا رہا ہوتا اور وہیں مجھے موت آجاتی، یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں دو گروہوں میں سے کسی ایک کی طرف سے تیر چلاؤں میرا تیر نشانے پر لگے یا خطا جائے۔

7 سعید بن العاص الأموی رضی اللہ عنہ

امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: انھوں نے بہت اچھا کردار ادا کیا کہ فتنے سے کنارہ کش رہے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت میں لڑائی نہیں کی۔ جب معاملات معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں واضح ہوئے (اور اُنھیں اقتدار مل گیا) تو سعید بن العاص اُنھیں ملنے آئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کا احترام کیا اور انھیں بہت سا مال دے کر رخصت کیا۔[2] ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو حضرت سعید فتنے سے کنارہ کش رہے، جمل یا صفین کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے، جب معاملات نے معاویہ کے حق میں قرار پکڑا تو اُن کے پاس آئے۔[3] سعید اکیلے فتنے سے کنارہ کش نہیں رہے بلکہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے جمل اور صفین کے واقعات ختم ہونے تک اُن کا ساتھ دیا۔[4]

8 اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ

امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ کے اس فرمان

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 15/10، حديث: 38272، والمعجم الكبير للطبراني: 105/18، اس کے راوی صحیح کے ہیں۔ [2] سير أعلام النبلاء: 446/3. [3] البداية والنهاية: 91/8. [4] سير أعلام النبلاء: 446/3.

سے صحیح استفادہ کیا، جبکہ آپ ﷺ نے انھیں فرمایا تھا: ''اُسامہ، لا الہ اِلا اللہ کا کیا جواب دو گے؟'' اُسامہ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ انھوں نے اچھا کردار ادا کیا۔[1]

امام ذہبی رحمہ اللہ کی اس روایت سے مراد یہ ہے کہ اُسامہ بن زید فرماتے ہیں: مجھے (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے فوج کے ایک دستے کے ساتھ روانہ فرمایا، میں اور میرا ایک ساتھی دشمن کی طرف آگے بڑھتے چلے گئے، میں ایک آدمی پر حملہ آور ہوا، جب اُس کے قریب آیا تو اُس نے ''لا اِلٰہ اِلا اللہ'' کے الفاظ پڑھے، میں نے اُسے نیزہ مار کر قتل کر دیا، میں یہ سمجھا کہ اُس نے جان بچانے کے لیے ایسا کیا۔'' پوری حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اے اُسامہ! تم نے اسے کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کر ڈالا، تم (قیامت کے روز) لا اِلٰہ اِلا اللہ کا کیا جواب دو گے؟''

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اُس نے جان کے ڈر سے ایسا کہا تھا۔ آپ ﷺ نے پھر یہی فرمایا: ''اے اُسامہ! لا اِلٰہ اِلا اللہ کا کیا جواب دو گے؟'' آپ ﷺ بار بار یہی فرماتے رہے۔[2] تا آنکہ اُسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں یہ پسند کرتا ہوں کہ بحیثیت مسلمان میری جو زندگی گزری ہے، وہ نہ ہوتی کاش! میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا اور میں نے اُسے قتل نہ کیا ہوتا۔ پھر فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ میں کسی ایسے شخص کو کبھی قتل نہیں کروں گا جو زبان سے لا اِلٰہ اِلا اللہ پڑھتا ہو۔'' اُس وقت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اُسامہ! کیا میرے بعد بھی یہ عہد پورا کرو گے؟ اُنھوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ کے بعد بھی ان شاء اللہ یہ عہد پورا کروں گا۔''[3]

حرملہ کہتے ہیں: مجھے اُسامہ بن زید نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ وہ تم

[1] سیر أعلام النبلاء: 2/501,500. [2] صحیح البخاري، حدیث: 4269، و صحیح مسلم، حدیث: 96، و دلائل النبوة للبیهقي: 4/297. [3] سیر أعلام النبلاء: 2/505، اس کے راوی ثقہ ہیں۔

سے پوچھیں گے کہ اُسامہ کیوں پیچھے رہ گئے؟ تم کہنا کہ وہ کہہ رہے تھے: اگر آپ شیر کے جبڑوں میں ہوں تو اُسامہ چاہے گا کہ وہ بھی آپ کے ساتھ ہو، البتہ موجودہ معاملے (فتنے) میں اُن سے متفق نہیں ہوں۔[1]

ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اُسامہ رضی اللہ عنہ کے معذرت پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پیچھے نہیں رہے، نہ اُن سے محبت میں کوئی کمی آئی۔ اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی شدید مشکل میں ہوتے تو میں اُن کے ساتھ ہوتا، میرے پیچھے رہنے کی وجہ یہ ہے کہ میں مسلمانوں کی باہمی لڑائی کو پسند نہیں کرتا۔[2] امام ذہبی نے ایک اور روایت امام زُہری سے نقل کی ہے۔ زُہری کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے ملے تو فرمایا: اُسامہ! ہم تو آپ کو اپنا ساتھی سمجھتے تھے، آپ ہمارے ساتھ شامل کیوں نہیں ہوئے؟ انھوں نے کہا: اے ابوالحسن! اگر آپ نے شیر کے جبڑے کی ایک جانب کو پکڑا ہوتا تو میں آپ کا ساتھ دیتے ہوئے دوسری جانب کو دبوچ لیتا، تا آنکہ ہم دونوں موت کا شکار ہوتے یا دونوں زندگی پاتے۔ لیکن یہ معاملہ جس میں آپ ہیں، اللہ کی قسم! میں اس میں کبھی دخیل نہ ہوں گا۔[3]

⑨ صہیب بن سنان الرومی رضی اللہ عنہ

امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں، یہ اُن لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے فتنے سے کنارہ کشی اختیار کی اور صرف اپنے کام سے کام رکھا۔[4] میمون بن مہران نے مختلف قسم کے لوگوں کا تذکرہ کیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق، طلحہ، زبیر اور معاویہ رضی اللہ عنہم کے اختلافات بیان کیے اور کہا کہ اس معاملے میں سعد بن ابی وقاص، ابوایوب انصاری، عبداللہ بن عمر، اُسامہ بن زید، حبیب بن سلمہ الفہری، صہیب بن سنان اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم جیسے دس ہزار سے زیادہ

[1] صحيح البخاري، حديث: 7110. [2] فتح الباري: 13/67. [3] سير أعلام النبلاء: 2/504.
[4] سير أعلام النبلاء: 2/18.

صحابہ کرام اور اُن کے ساتھی گوشہ نشین ہو گئے اور سب نے یہی کہا: ہم عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتے ہیں، اُن سے براءت کا اظہار نہیں کرتے، ان کے اور اُن کے ساتھیوں کے بارے میں ایمان کی گواہی دیتے ہیں، اُن کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے ہیں اور اُن کے لیے بہتری کی اُمید کرتے ہیں۔ [1]

(10) ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ

علامہ ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں، خلیفہ بن خیاط نے اپنی کتاب تاریخ خلیفہ میں اور ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات میں شعبہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے حکم سے پوچھا: کیا ابو ایوب رضی اللہ عنہ صفین میں شریک ہوئے تھے؟ اُنھوں نے کہا: نہیں، لیکن وہ نہروان کے موقع پر موجود تھے۔ [2]

(11) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جمل اور صفین میں شرکت نہیں کی۔ وہ فتنہ میں پڑنے سے ممانعت والی احادیث کے راوی بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عنقریب فتنے رُونما ہوں گے، بیٹھ رہنے والا اُن میں کھڑے ہونے والے سے بہتر، اور کھڑا رہنے والا، چلنے والے سے بہتر، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور جس نے (فتنے کو) جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی وہ اُس کے دَرپے ہو جائے گا، جہاں بھی جائے پناہ ملے وہاں پناہ لے لو۔ [3]

(12) عبداللہ بن سعد بن ابی السرح رضی اللہ عنہ

امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے مصر کے والی تھے، کہا جاتا

[1] دُول الإسلام: 29/1، و تاریخ دمشق، ص: 503، 505. [2] مصنف ابن أبي شيبة: 303/15 وتاريخ خليفة بن خياط، ص: 196، و الطبقات: 249/3. [3] صحيح مسلم، حديث: 2886.

ہے کہ وہ صفین میں حاضر تھے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے فتنے سے کنارہ کشی اختیار کی اور رَملہ میں گوشہ نشین ہوگئے۔[1]

وہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو فتنے کے واقعات میں غیر جانبدار اور کنارہ کش رہے، یہ اُن کا انتہائی مختصر تذکرہ ہے جو یہاں پیش کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے فتنے کے ان معاملات میں شرکت نہیں کی بلکہ دوسروں کو بھی اس سے منع کرتے رہے۔ اِن صحابہ کرام نے خوارج کے خلاف قتال، اور جمل وصفین کے قتال میں فرق و امتیاز کیا ہے، اُن میں سے بعض ابو برزہ اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم جیسے حضرات نے جو جمل وصفین میں کنارہ کش رہے، خوارج کے خلاف لڑائی میں باقاعدہ شرکت کی۔

اسی طرح بعد میں جوں ہی حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے خلافت سے دستبرداری کا اعلان کیا، وہ تمام صحابہ جو کنارہ کش تھے انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اُمت کے مابین متفقہ اجتماعیت کا مظاہرہ کیا۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابن عمر، سعد بن ابی وقاص اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم جیسے اُن تمام حضرات نے جو گوشہ نشین ہوگئے تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔[2]

معاملات کے صحیح صورتِ حال اختیار کرنے تک قصاص کے نفاذ میں انتظار کا موقف

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی معاملات کے ٹھہراؤ پر آنے تک قصاص لینے میں انتظار کے قائل تھے کہ بعد ازاں قاتلینِ عثمان کا معاملہ دیکھا جائے گا۔ جب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور اُن کے ساتھیوں نے قصاص کی حد نافذ کرنے کا مطالبہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاتلینِ عثمان کے کثیر تعداد میں ہونے کا عذر پیش فرمایا کہ اُن کی طاقت کو کم اہم قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لیے اُن سے حالات کی بہتری تک صبر کرنے کا کہا اور فرمایا کہ حالات

[1] سیر أعلام النبلاء: 33/3. [2] أحداث و أحادیث فتنه الهرج لبعد العزیز دخان، ص: 212.

جوں ہی سازگار ہوں گے حق دار کو اُس کا حق ملے گا، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے کم تر برائی، (قصاص کو مؤخر کرنے) کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا، کیونکہ قتال اور افتراق و انتشار زیادہ بڑی برائی ہے۔[1]

امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ قصاص کو مؤخر کر دیا جائے نہ کہ اسے ترک کر دیا جائے۔ واقعہ اِفک سے استدلال کرتے ہوئے انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بہت سے لوگوں نے باتیں کیں، اور اِس واقعہ کا بڑا ذمہ دار عبد اللہ بن ابی ابن سلول تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے اور فرمایا: اس آدمی کے بارے میں میری کون مدد کرے گا جس کی طرف سے اذیت کا سلسلہ میرے اہل خانہ تک پہنچ چکا ہے؟ یعنی عبد اللہ بن ابی ابن سلول۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اُس کے خلاف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کو تیار ہوں، اگر وہ ہمارے قبیلہ اوس سے ہے تو ہم اُسے قتل کر دیں گے، اگر وہ ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے ہے تو آپ ہمیں اُسے قتل کرنے کا حکم دیجیے۔ سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر حضرت سعد بن معاذ کو جواب دیا۔ پھر حضرت اسید بن حضیر کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے تو سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے اُن کو جواب دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن سب کو چپ کرانے لگے۔[2]

آپ کو علم ہو گیا کہ یہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ وہ اِس طرح کہ مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے اوس اور خزرج دونوں قبیلے اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ عبد اللہ بن ابی ابن سلول کو اپنا بادشاہ بنا لیں کیونکہ ان کی نظر میں اس کا بڑا مقام تھا، اور یہ وہی شخص ہے جو معرکہ اُحد سے ایک تہائی فوج کو واپس لے گیا تھا (اور اب جبکہ واقعہ اِفک رونما ہوا ہے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحت کے پیش نظر اُس پر حد کا نفاذ ترک کر دیا، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے

[1] تاريخ الطبري: 460/5. [2] صحيح البخاري، حديث: 4141.

یہ تھی کہ اُس پر حد کا نفاذ، ترکِ نفاذِ حد کی نسبت زیادہ بڑے فساد کا موجب ہوگا۔ اِسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ جلدی کرنے کی بجائے قصاص میں تاخیر، فساد کے اسباب کو کم کردے گی کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ قاتلین عثمان کو قصاص میں قتل کریں، کیونکہ بڑی تعداد میں قبائل ان کے دفاع کے لیے تیار تھے، اس طرح امن قائم نہیں ہوسکے گا اور فتنہ جوں کا توں برقرار رہے گا۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کبھی قتل نہیں کرسکتے، تو بعد میں انھی لوگوں نے اِنھیں شہید کیا تھا۔ [1]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان کو اُن کے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتے تھے، البتہ وہ امن کے قیام اور اجتماعیت کے اتحاد کا انتظار کررہے تھے، ان کا خیال تھا کہ خون کے وارثین مقدمہ قائم کریں، طالب اور مطلوب دونوں عدالت میں آئیں، گواہ پیش ہوں، پھر اُس پر فیصلہ دیا جائے۔ [2]

اُمت میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب قصاص فتنے کے پھیل جانے اور امت میں انتشار کا باعث ہو تو خلیفہ کے لیے اسے مؤخر کرنا جائز ہے۔ البتہ یہ سوال کہ قاتلین عثمان امیر المؤمنین کے لشکر میں شامل تھے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ اس بات پر رضامند ہوں؟ [3] امام طحاوی نے اس شُبہے کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ایسے سرکش خوارج موجود تھے جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، لیکن بعینہ اُن کی ٹھیک ٹھیک پہچان مشکل تھی، کچھ ایسے بھی تھے کہ اُن کے جرم کے خلاف کوئی واضح حجت قائم نہیں ہوسکی تھی اور کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے دل میں نفاق چھپا ہوا تھا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرسکتے تھے۔ [4]

بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف اُن کے حوالے سے محتاط ہی تھا، وہ اُن کے اعمال سے

---

[1] حقبة من التاريخ، ص: 102. [2] تحقيق مواقف الصحابة: 156/2. [3] أحكام القرآن لابن العربي: 1718/2. [4] شرح الطحاوية، ص: 546.

براءت کا اظہار کررہے تھے اور ممکنہ صورت میں وہ اُن سے قصاص بھی لینا چاہتے تھے۔
یہ بات دو طرح سے واضح اور ثابت ہوتی ہے:

① قاتلین عثمان کے بارے میں اُن کا موقف

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت عثمان کو ہمیشہ غلط کہا اور اُن کے خون سے بری الذمہ ہونے کی بات کی، وہ حلفاً کہتے تھے کہ اُنھوں نے قتل کیا، نہ انھوں نے اُن کے قتل کا حکم دیا، نہ وہ اس طرف کبھی مائل ہوئے اور نہ آج وہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ پر راضی ہیں۔ یہ بات اُن کی طرف سے قطعی الثبوت ہے،[1] رافضیوں کے برعکس جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ شہادتِ عثمان پر راضی تھے۔[2] امام حاکم نے شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے سے منقول روایات بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ مبتدعین کا یہ دعوی کہ قاتلین عثمان کو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد حاصل تھی، سفید جھوٹ اور بہتان ہے۔ متواتر احادیث و روایات میں اس کے برعکس بیان موجود ہے۔[3]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف مذکورہ ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ ہیں اور اُن کے خلاف بہتان طرازی کے سوا کچھ نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک تھے نہ اس کا حکم دیا، نہ وہ اس پر راضی تھے۔ یہ خود انھی سے مروی ہے۔ اور اُن کی سچائی میں ہرگز کوئی شک نہیں۔[4] اُن کا کہنا ہے: اے اللہ! میں تیرے حضور خونِ عثمان سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔[5]

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ قیس بن عُبادہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں، میں نے جمل کے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''اے اللہ میں تیری بارگاہ میں خونِ

[1] البداية والنهاية: 202/7. [2] العقيدة في أهل البيت بين الإفراط والتفريط، ص: 229. [3] المستدرك: 103/3. [4] منهاج السنة: 406/4. [5] البداية والنهاية: 202/7. اس کی سند حسن ہے۔

عثمان سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کرتا ہوں، شہادت عثمان کے روز میرے ہوش اُڑ گئے، لوگ میرے پاس بیعت کے لیے آئے تو میں نے اُنھیں کہا، اللہ کی قسم! مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اُن لوگوں سے بیعت قبول کروں جنھوں نے اُس شخصیت کو قتل کیا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اُس سے حیا کیوں نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''

مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں اس حالت میں لوگوں سے بیعت لوں کہ عثمان رضی اللہ عنہ حالتِ شہادت میں زمین پر پڑے ہوں، ابھی تک اُن کی تدفین بھی نہ ہوئی ہو۔ لوگوں نے یہ سنا تو واپس چلے گئے، جب اُن کی تدفین ہوچکی تو لوگ واپس آئے اور مجھ سے بیعت لینے کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا: اے اللہ! میں ابھی اس بارے میں ڈرتا ہوں، بعد ازاں عزیمت کی راہ اختیار کرتے ہوئے لوگوں سے بیعت لی۔ جب انھوں نے مجھے مخاطب کیا: یا امیر المؤمنین! تو یوں لگا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا، اور میں نے کہا: اے اللہ! عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے سے مجھے ایسی توفیق عطا فرما کہ تو مجھ سے راضی ہوجائے۔''[1]

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن الحنفیہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خبر ملی کہ عائشہ رضی اللہ عنہا مربد کے مقام پر قاتلین عثمان پر لعنت بھیج رہی تھیں،[2] راوی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے یہاں تک کہ وہ اُن کے چہرے تک پہنچ گئے اور انھوں نے کہا: میں بھی قاتلین عثمان پر لعنت بھیجتا ہوں، وہ جہاں بھی ہوں میدان میں یا پہاڑوں میں، اللہ تعالیٰ اُن پر لعنت کرے۔ یہ بات انھوں نے دو یا تین مرتبہ کہی۔[3]

---

[1] المستدرك: 95/3، شیخین کی شرط کے مطابق صحیح حدیث ہے۔ [2] بصرہ سے تین میل کے فاصلہ پر یہ مقام ہے۔ [3] فضائل الصحابة: 555/1، حدیث: 733، اس کی سند صحیح ہے۔

② قاتلین عثمان کی خدمات قبول کرنے سے گریز

حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن کی طرف سے ہر دم کسی خطرے کا احساس رکھتے ہوئے اُن کے ساتھ بہت محتاط انداز میں پیش آتے۔ اُن میں سے کسی کو بھی شام کی طرف روانگی کے وقت کوئی ذمہ داری نہیں سونپی، جبکہ اپنے بیٹے محمد بن الحنفیہ کو بلایا اور جھنڈا اُس کے حوالے کیا، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو لشکر میں دائیں طرف اور مقدمۃ الجیش میں ابولیلیٰ بن عمر بن الجراح[1] اور مدینہ میں قُثم بن عباس رضی اللہ عنہما کو اپنا جانشین بنایا۔[2]

یہ ان کا اولین فیصلہ تھا تاکہ وہ باغیوں سے براءت کا اظہار کرسکیں اور اُن کی مدد کے بغیر مسلمانوں کے امور و مسائل پر کنٹرول کی اہلیت وصلاحیت ثابت کرسکیں۔ مسلمان معاشرے میں اُن کے وفادار اور خلافت کے معاملہ میں اُن کی حمایت کرنے والے موجود تھے، لہٰذا اُنھیں باغیوں اور فسادیوں کی طرف سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اس گروہ کے خلاف زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے تھے، اُن کی جانب سے یہی کافی تھا، کیونکہ وہ لوگ سینکڑوں کی تعداد میں تھے اور اُن کے لشکر کے لوگوں کے ساتھ اُن کی قرابت داریاں اور رشتہ داریاں تھیں، اگر وہ ان کے ساتھ اس سے زیادہ سخت معاملہ کرتے تو ڈر تھا کہ امت اسلامیہ میں فتنے کی رسی دراز تر ہوتی چلی جائے گی۔[3] جب قعقاع بن عمرو کے ذریعے امیر المؤمنین حضرت علی اور طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے مابین صلح کا عمل مکمل ہوگیا۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے اُسی روز شام کو خطاب فرمایا: جاہلیت کا تذکرہ کیا، اُس کی بدبختیوں اور کارستانیوں کو واضح کیا، اُلفت ومحبت اور اجتماعیت کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں کی خوش بختی کا تذکرہ کیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگوں کو خلیفہ اول حضرت

---

[1] تاریخ الطبري، و تحقیق مواقف الصحابة: 158/2. [2] تاریخ الطبري: 470/5. [3] إفادة الأخبار للتباني: 52/2، منقول از تحقیق مواقف الصحابة: 159/2.

ابوبکر رضی اللہ عنہ پر مجتمع رکھا، بعدازاں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اجتماعیت قائم رکھی، پھر یہ حادثہ ہوا جسے اِن لوگوں (قاتلین عثمان) نے اُمت پر مسلط کیا، یہ دنیا کے طلبگار تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام یافتہ لوگوں سے حسد کرنے والے تھے، انھوں نے دین اسلام اور اُمور دین کو روبہ زوال کرنے کی کوشش کی، اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے کو نافذ کرنے والا ہے۔ [1]

اس کے بعد فرمایا: سنو! میں کل (شام کی طرف) روانہ ہوجاؤں گا، تم بھی میرے ساتھ چلو اور جس نے شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ میں کسی طور پر بھی مدد کی ہے اُن میں سے کوئی ہمارا شریکِ سفر نہ ہو۔ احمق لوگ کسی صورت ہمارے آڑے نہ آئیں۔ [2]

امام باقلانی، قاتلین عثمان پر قصاص کی حد نافذ کرنے کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اپنی یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ ممکنہ مدت تک قصاص کے نفاذ کے معاملہ کو مؤخر کیا جائے۔ وہ اس بات کو صحیح نہیں سمجھتے تھے کہ بعینہ قاتلین عثمان کے علاوہ کسی کو بغیر شہادت اور دلیل کے قتل کردیں۔

اُن کی رائے یہ تھی کہ مقتول کے وارث بھی موجود ہوں، وہ قصاص کا مطالبہ کریں اور خلیفۂ وقت اپنا یہ اجتہاد بھی پیش کریں کہ اِس قصاص کے نتیجے میں کوئی بڑا فتنہ وفساد یا قتل و غارت برپا نہیں ہوگا، کہ اُس کے نتیجے میں شہادت عثمان جیسا یا اُس سے بھی بڑا سانحہ پیش نہ آئے۔ حد نافذ کرنے کے معاملے کو ممکنہ وقت تک مؤخر کرنا اور اس بارے میں حق کی جستجو کرنا امت کے حق میں زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا۔ فساد اور امت کے انتشار سے بچاؤ کا یہی راستہ ہے۔ [3]

اگر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلیتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے حق لینے میں قوت حاصل ہوجاتی اور صحیح بات یہ ہے کہ اختلاف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] تاریخ الطبري: 525/5. [2] تاریخ الطبري: 525/5. [3] التمهيد للباقلاني، ص: 231، و تحقيق مواقف الصحابة: 159/2.

کے لیے نفاذِ حق کا معاملہ کمزور کردیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اُن پر حق کو نافذ کرتے جیسا کہ انھوں نے عبد اللہ بن خباب کے قاتلوں پر حق کو نافذ کیا تھا۔ اُس وقت انھیں اُن کے قاتلوں پر حق نافذ کرنے کی قدرت واہلیت حاصل تھی۔ [1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں اس طرح پیش کرتے ہیں: اُن کی رائے تھی کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں پر اُن کی اطاعت اور بیعت واجب ہے لیکن وہ اِس واجب سے انکاری تھے اور قوت و طاقت والے بھی تھے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ وہ اُن کے خلاف لڑائی کریں تا آنکہ وہ اس واجب کو ادا کریں اور اس طرح عراق میں اطاعت اور اجتماعیت کا قیام ممکن ہوسکے۔ [2] حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتلین عثمان سے قصاص کو مؤخر کرنا ایک ضرورت کے تحت تھا، پھر جب آپ مدینہ سے عراق منتقل ہوئے تاکہ آپ شام کے قریب ہوجائیں تو اس وقت قاتلین عثمان اُن کے لشکر میں گھس گئے، وہ کثیر تعداد میں تھے، خاص طور پر کوفہ اور بصرہ کے لوگ اُن میں زیادہ تھے، وہ اپنی پوری قوت اور قبائلی توانائی میں تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ اُن پر حد کا نفاذ ایک ایسا دروازہ کھول دے گا جسے بعد میں بند کرنا دُشوار ہوجائے گا۔ اسی حقیقت کی طرف عظیم صحابی قعقاع بن عمرو التمیمی رضی اللہ عنہ کا خیال گیا، چنانچہ انھوں نے امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا نمائندہ بن کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما سے بات کی۔ انھوں نے یہ بات مان لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عذر تسلیم کرلیا اور سمجھ گئے کہ دانائی پر مبنی پالیسی وہی ہے جس طرف امیر المومنین دعوت دے رہے ہیں، اور وہ ہے انتظار اور صبر وتحمل کو کام میں لانے اور جلد بازی نہ کرنے کی پالیسی، کیونکہ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ یکساں موقف اختیار کیا جائے کیونکہ امت کی صفوں کو وحدت اور اتحاد کی اشد ضرورت تھی۔ چونکہ اختلافات نے خلافت کے مرکز کو کمزور کردیا تھا، لہٰذا انھوں نے قصاص لینے کے معاملے کو مؤخر کرنے کا فیصلہ کیا۔ [3]

[1] الفصل في الملل والنحل: 162/4. [2] مجموع الفتاوی: 72/35. [3] تحقیق مواقف الصحابة: 163/2.

ایسے بہت سے قوی دلائل موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ، زبیر اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ حق بجانب تھے۔

① امام بخاری نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ عمار پر رحم فرمائے اُسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔'' [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

اس حدیث میں علامات نبوت میں سے ایک کا ذکر ہے اور اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی فضیلت بڑی واضح نظر آتی ہے۔ انھوں نے ان ناصبیوں کا رد کیا ہے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی جنگوں میں صحیح نقطۂ نگاہ پر نہیں تھے۔ [2]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول صحیح روایات میں یہ صراحت موجود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحیح رائے رکھتے تھے اور حق پر تھے۔ اور دوسرا گروہ جو معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی ہیں وہ تاویل کی بنیاد پر تھے لیکن باغی تھے اور ان روایات میں یہ صراحت بھی ہے کہ دونوں گروہ مومن تھے، لڑائی کے باعث وہ ایمان سے خارج ہوئے نہ فاسق قرار پائے۔ [3]

② ایک اور صحیح حدیث جسے امام مسلم نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کے لوگوں کا ذکر کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہوں گے، جو ایک فرقہ (خوارج) بنا کر خارج ہوجائیں گے اُن کی نشانی سر منڈانا ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ مخلوق میں بدترین لوگ ہوں گے اُنھیں دونوں گروہوں میں سے حق سے قریب تر لوگ قتل کریں گے۔ [4]

اس حدیث میں بڑی واضح دلیل موجود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ جمل اور صفین میں اپنے مخالفین کے بالمقابل حق سے قریب تر تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 447. [2] فتح الباري: 542/1. [3] صحيح مسلم مع شرح النووي: 168/7. [4] صحيح مسلم، حديث: 1065.

جنگ جمل اور اُس کا پس منظر
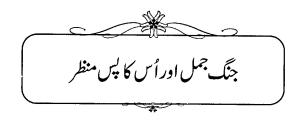
سیدنا زبیر، طلحہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم کی بغرضِ اصلاح بصرہ روانگی

طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما مکہ آئے، دونوں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملے، مکہ میں اُن کی یہ آمد سن 36ھ ربیع الثانی میں شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے تقریباً چار ماہ بعد ہوئی۔[1] مکہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے خروج کے لیے اہم بات چیت ہوئی۔ وہ لوگ جنھوں نے مظلوم خلیفہ کے قتل کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا، اُن کے اعصاب پر بڑا بوجھ اور بہت زیادہ دباؤ تھا، وہ اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے کہ وہ مظلوم خلیفہ کی رسوائی کا باعث بنے اور اب اُن کے اس گناہ کا...... اُن کے بقول......خون عثمان کے مطالبے کے لیے خروج کے سوا اور کوئی کفارہ نہیں تھا، اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن لوگوں کو جو اُن کا دفاع کرنا چاہتے تھے دفاعی لڑائی سے منع کر دیا تھا۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کا کہنا تھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا ہے، اللہ کی قسم! میں اُن کے خون کا مطالبہ کروں گی۔[2] طلحہ رضی اللہ عنہ یہ کہتے تھے کہ میری طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے میں کچھ سستی ہوئی ہے، اب میری توبہ کی یہی شکل ہے کہ اُن کے خون کا مطالبہ کرتے ہوئے میرا خون بہا دیا جائے۔[3] زبیر رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا کہ ہم لوگوں کو اس مقصد کے لیے برانگیختہ کریں گے تاکہ خونِ عثمان ضائع نہ ہو جائے، کیونکہ ان کے

---

[1] تاریخ الطبري: 469/5. [2] تاریخ الطبري: 485/5. [3] سیر أعلام النبلاء: 34/1.

خون کے ضیاع میں، اللہ کی قدرت و طاقت کی توہین ہے اگر اس قسم کے واقعات بند نہ ہوئے تو کسی بھی خلیفہ یا امام کو مارا جاتا رہے گا۔[1] لوگوں کے اعصاب پر اس قسم کا دباؤ یہی تقاضا کر رہا تھا کہ عام لوگوں کو متحرک کیا جائے، اُنھیں اُن کی آرام گاہوں سے نکال کر باہر لا کھڑا کیا جائے۔ ہر آدمی اپنے گھر سے نکل پڑے۔ آگے پیش آنے والے ہولناک حالات و واقعات بھی نظر آ رہے تھے اور غیر متوقع احوال کا اندیشہ بھی تھا۔ لوگ یہ خیال کر رہے تھے کہ اب وہ اپنے گھر واپس نہیں آسکیں گے، اُن کی اولادوں نے انھیں روتے ہوئے الوداع کہا، اور اُس روز مکہ سے بصرہ کی طرف جانے والے دن کو یوم النخیب (آہ و بُکا) کے دن سے تعبیر کیا جانے لگا، اسلام کی خاطر رونے والوں کو اُس دن کے بعد پھر کبھی اس طرح روتے نہیں دیکھا گیا۔[2]

مکہ میں ایسے بہت سے عوامل جمع ہو گئے جن کے باعث وہ اپنا مطلوبہ مقصد پورا کرنے کے لیے سنجیدہ طریقوں پر غور کرنے لگے۔ ان عوامل میں سے ایک یہ تھا کہ بنواُمیہ مدینہ سے بھاگ کر مکہ پہنچے اور عبداللہ بن عامر جو عہد عثمانی میں امیر بصرہ تھے وہ بھی مکہ میں تھے۔ وہ لوگوں کو خروج کی ترغیب دے رہے تھے اور مادی امداد کی پیش کش بھی کر رہے تھے۔ اسی یعلی بن امیہ جو یمن سے شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر سن کر مدد کے لیے آئے وہ مکہ پہنچ چکے تھے، اُن کے پاس مناسب مال، اسلحہ اور جانور بھی تھے، اُنھوں نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے بھر پور امداد کی پیش کش کی۔ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف منصوبہ بندی کرنے والوں کے لیے یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ اس طرح خونِ عثمان کا مطالبہ کرنے والوں کی قوت مجتمع ہوتی چلی گئی، اب مسئلہ یہ تھا کہ شروع کہاں سے کریں؟ ان سب کے مابین مذاکرات ہوئے اور اس امر پر غور کیا گیا کہ خروج کے لیے رُخ کس طرف ہو، بعض لوگوں کا یہ کہنا تھا ......جس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سرفہرست تھیں......

[1] تاريخ الطبري: 487/5. [2] دراسات في عهد النبوة والخلافة الراشدة للشجاع، ص: 417.

کہ ان کا رُخ مدینہ کی جانب ہو، دوسری رائے یہ سامنے آئی کہ شام کا رخ کیا جائے تا کہ وہاں قاتلین عثمان کے بالمقابل قوت کو مجتمع کیا جائے۔ طویل غور وخوض کے بعد طے پایا کہ بصرہ کا رُخ کرنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ مدینہ میں تو قاتلین عثمان کی کثیر تعداد موجود ہے اور ہم تھوڑی تعداد کے باعث اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے جبکہ شام تو پہلے ہی معاویہ رضی اللہ عنہ کی موجودگی کے باعث محفوظ ہے۔ اس لیے بصرہ کی طرف جانا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہاں فسادیوں کی قوت و طاقت زیادہ نہیں ہے، اس لیے وہاں رہ کر وہ اپنے منصوبے پر عمل کر سکتے ہیں۔ [1]

خروج سے پہلے، راستے میں سفر کے دوران اور بصرہ پہنچنے کے بعد بہرصورت اُن کا مشن اور اُن کی دُھن ایک ہی تھی، اور وہ تھی خونِ عثمان کا مطالبہ، اصلاحِ احوال، فسادیوں کے بارے میں لوگوں کو باخبر کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ [2] یہ مقصد دراصل اللہ کی حدود میں سے ایک حد کو نافذ کرنا ہے۔ [3]

بصرہ جانے والی برگزیدہ شخصیتوں کو ہر آن یہ احساس تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کا مؤاخذہ نہ کیا گیا تو اُن کی طرح ہر امام وخلیفہ قتل و غارت گری کا شکار ہوتا رہے گا۔ [4]

اُن کا جو طریقِ کار طے ہوا وہ یہ تھا کہ پہلے بصرہ جائیں پھر کوفہ کا دورہ کریں اور وہاں کے رہنے والوں اور دیگر لوگوں سے قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اجتماعی طور پر مدد کا مطالبہ کیا جائے، بعد ازاں اردگرد کے دیگر علاقوں کے لوگوں کو اسی غرض و غایت کی دعوت پیش کی جائے، تا آنکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود قاتلینِ عثمان کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ کم سے کم انسانی جانوں کی قربانی دینی پڑے۔ [5]

بصرہ کی طرف خروج، شدید غصے اور ناراضی کی وہ کیفیت تھی جس نے صحابہ کو متحرک کیا۔

---

[1] تاريخ الطبري: 476/5. ودراسات في عهد النبوة، ص: 418. [2] تاريخ الطبري: 489/5. [3] دراسات في عهدالنبوة، ص: 419. [4] تاريخ الطبري: 487/5. [5] دراسات في عهد النبوة، ص: 419.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا انتقام لینا کوئی سادہ بات نہیں تھی، وہ عام انسان نہیں تھے، اگرچہ وہ حدود اللہ میں سے ایک حد کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت، خلیفہ کے طور پر ان کا مقام مرتبہ اور اُنھیں شہید کیے جانے کا سفاکانہ انداز یہ سب کچھ خلافت پر حملہ تھا جسے مسلمان دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست کے حوالے سے صاحبِ شریعت کا نائب سمجھتے تھے۔[1] بلاوجہ خلیفۂ عادل پر چڑھ دوڑنا ان کے اقتدار کو کمزور کرنے اور مسلمانوں کے نظام کی تباہی کے مترادف تھا۔[2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما اور اُن کے ساتھی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے بدطینت سبائی گروہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک عمومی اسلامی نقطۂ نظر پیدا کرنا چاہتے تھے، یہ گروہ طاقت کا مالک تھا اسے کمزور نہیں کہا جاسکتا۔ یہ لوگ خود کو مسلمان کہلاتے ہوئے مختلف علاقوں اور قبائل کے لوگوں، چند اعراب اور غلاموں کو اپنا ہمنوا بنا چکے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سبائی فسادی لوگوں کا وجود باقی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اُن سے مقابلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا، لہٰذا اب عام مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش اور حد نافذ کرنے کا مطالبہ کرنے والوں کو تقویت پہنچانا مطلوب تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بے گناہوں کی حفاظت بھی مقصود تھی۔ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مذکورہ امور کی انجام دہی کے آرزومند تھے۔

سیدنا زبیر و طلحہ رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین جو مذاکرات ہوئے ان کے بارے میں اطلاعات و روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، انھیں اس امر کا بھرپور ادراک تھا کہ سبائی عام لوگوں کی سوچوں کے ساتھ کس طرح کھیل رہے ہیں، لہٰذا افکار و نظریات کے میدان میں بھی اُن کا مقابلہ مطلوب تھا، صحیح روایات سے یہ بات بہت نُمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔[3] طبری نے روایت کیا ہے کہ عثمان بن حنیف، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے

---

[1] مقدمة ابن خلدون، ص: 191. [2] دور المرأة السياسي، ص: 391. [3] دور المرأة السياسي، ص: 394.

بصرہ کے والی تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بصرہ تشریف لائیں تو عثمان بن حنیف نے پوچھا: ام المؤمنین آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میرے جیسا کوئی فرد کوئی ڈھکا چھپا خفیہ معاملے لے کر نہیں چلتا، نہ اپنے بیٹوں سے کوئی خبر چھپاتا ہے۔ فتنہ گر فسادی، حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ منورہ) کے خلاف صف آرا ہیں۔ انھوں نے وہاں طرح طرح کے حوادث کو جنم دیا ہے، دین میں نت نئی باتیں گھسانے والوں کو پناہ دی ہے، اب وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لعنت کے مستحق ہیں، اُنھوں نے امام المسلمین کو بلا دلیل اور بلا عذر شہید کیا، انھوں نے حرام خون کو حلال سمجھا اور بے دریغ بہایا، مال واسباب چھین کر لے گئے، حرمت والے شہر اور حرمت والے مہینے کی حرمت کو پامال کیا، انھوں نے عزتوں پر حملہ کیا اور اُس قوم کے گھر پر قبضہ کرلیا جو اُنھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یہ لوگ ہر حال میں شدید ضرر رساں ہیں، میں اس لیے باہر نکل آئی ہوں تاکہ مسلمانوں کو بتاؤں کہ اِن لوگوں نے کیا کیا کرتوت کیے ہیں۔ میں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ ہمارے مقصد کے حامی قدم بقدم ہمارے ساتھ چل رہے ہیں تاکہ اصلاح احوال کا یہ عظیم کام بخوبی انجام دیا جائے پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی:

﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾

''ان کی اکثر خفیہ سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی مگر جو شخص صدقے یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے (تو یہ اچھی بات ہے) اور جو کوئی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے، تو ہم اسے جلد بہت بڑا اجر عطا کریں گے۔''[1]

اب اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے حکم سے سب چھوٹے اور بڑے عورتیں اور مرد اُٹھ

[1] النسآء 4:114.

کھڑے ہوئے ہیں، ہم معروف کا حکم دینے، برائی سے روکنے اور اس کی اصلاح کی دعوت دینے آئے ہیں۔ [1]

ابن حبان راوی ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابوموسیٰ اشعری کو، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفے کے والی مقرر تھے، خط لکھا کہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کا سانحہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ اب میں لوگوں کے مابین اصلاح احوال کے مقصد کے لیے نکل آئی ہوں، لوگوں سے کہیے کہ وہ اپنے گھروں میں سکون سے رہیں تا آنکہ اُنھیں اصلاح بین المسلمین کے معاملات کی اطلاع پہنچ جائے۔ [2]

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قعقاع بن عمرو کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے ساتھیوں کے پاس اُن کی آمد کا سبب جاننے کے لیے بھیجا تو قعقاع نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام کیا اور عرض کیا: اماں جان! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ اور اس شہر میں آپ کی آمد کا سبب کیا ہے؟ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میرے بیٹے! میں صرف لوگوں کے مابین اصلاح کی خاطر آئی ہوں۔ [3]

جمل والے روز جنگ کے اختتام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آئے اور کہا: اللہ آپ کو معاف فرمائے! وہ کہنے لگیں: آپ کو بھی! میں تو فقط اصلاح کے ارادے سے آئی ہوں۔ [4]

لہٰذا یہ بات طے ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا لوگوں کے درمیان اصلاح احوال ہی کی خاطر نکلی تھیں۔ اس بات میں اُن رافضی شیعوں کے طعن کا جواب بھی موجود ہے جو حضرت عائشہ کے بارے میں کہتے ہیں: وہ اپنے گھر سے نکل کھڑی ہوئیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے (قرآن میں) اُنھیں گھر کو جائے قرار بنانے کا حکم دیا ہے جیسا کہ سورۃ الأحزاب آیت:33 میں ہے:

---

[1] تاريخ الطبري: 489/5. [2] الثقات لابن حبان: 282/2. [3] تاريخ الطبري: 520/5. [4] شذرات الذهب: 42/1.

﴿ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجٰهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی ﴾

''اور تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو، اور گزشتہ دورِ جاہلیت کی زیب و زینت کی نمائش کے مانند (اپنی) زیب و زینت کی نمائش نہ کرتی پھرو۔''[1]

اس بات پر اجماع ہے کہ اطاعت کا سفر، گھر میں ٹک کر رہنے کے منافی نہیں ہے۔ اصلاح بین المسلمین کی خاطر گھر سے باہر نکلتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہی رائے تھی اور اُن کے ساتھ اُن کے محرم یعنی اُن کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس مسئلے پر رافضیوں کا رَد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سابق دور جاہلیت کی طرح اپنی سج دھج نہیں دکھاتی پھرتی تھیں۔ اور گھر کو جائے قرار بنانے کا حکم اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور حکم کی مصلحت کی خاطر باہر نکلنے کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ وہ حج و عمرے کے لیے سفر کرسکتی ہیں یا اپنے کسی بھی سفر میں شوہر کے ساتھ باہر جاسکتی ہیں۔ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ سفر کرتے تھے، جس طرح حجۃ الوداع کے موقع پر عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج کے ساتھ سفر کیا، عائشہ رضی اللہ عنہا کو اُن کے بھائی عبدالرحمٰن کے ساتھ بھیجا، اُس نے اُنھیں سواری پر اپنے پیچھے بٹھایا اور مقامِ تنعیم سے اُنھیں عمرہ کرایا، حجۃ الوداع کا واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کم از کم تین ماہ پہلے اور نزول آیت کے بعد پیش آیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج آپ کے بعد بھی حج کا سفر اختیار کرتی رہیں، خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے دوران بھی وہ حج کے لیے گھر سے نکلیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے اونٹوں پر سفر کے دوران عثمان رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ذمہ داری سونپتے تھے۔ لہٰذا عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ خیال تھا کہ ان کا یہ سفر مسلمانوں کی مصلحت اور مفاد کی خاطر ہے۔[3]

ابن العربی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جنگ جمل کی طرف نکلنا، جنگ کے

[1] الأحزاب 33:33. [2] الانتصار للصحب والآل، ص: 444. [3] منهاج السنة: 4/317، 570.

لیے نہیں تھا، اصل بات یہ ہوئی کہ لوگوں نے اُن کی خدمت میں اس ہولناک فتنے کی شکایت کی، پھیلتی ہوئی قتل و غارت گری کی طرف توجہ دلائی اور اصلاح کے لیے اُن کا نکلنا باعثِ برکت قرار دیا، لہٰذا انھوں نے سورۃ النساء آیت 114.

﴿لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَیْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ○﴾

''ان کی اکثر خفیہ سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی مگر جو شخص صدقے یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے (تو یہ اچھی بات ہے) اور جو کوئی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے، تو ہم اسے جلد بہت بڑا اجر عطا کریں گے۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی حکم ربانی پر عمل کرتے ہوئے خروج کیا۔ اور اصلاح کرنے کا حکم تو مردوں اور عورتوں، آزاد اور غلاموں سب کے لیے یکساں ہے۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خروج کے چند اہم پہلو

① کیا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو خروج پر مجبور کیا گیا؟

یعقوبی کا دعوی ہے کہ زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو خروج پر مجبور کیا۔[3] ''الإمامة والسیاسة'' کے مؤلف[4] اور ابن ابی الحدید[5] نے بھی یہی لکھا ہے۔ اور الدینوری[6] کا بھی یہی کہنا ہے۔ امام ذہبی نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ان کی ہمشیرہ اسماء رضی اللہ عنہا کے بیٹے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے انھیں مجبور کیا۔[7]

محمد سید الوکیل[8] جیسے کئی اور محققین بھی انھی روایات کی راہ پر چلے ہیں۔ اُس کا کہنا

[1] النسآء 114:4. [2] أحكام القرآن: 570,569/4. [3] تاريخ اليعقوبي: 180/2، 209. [4] الإمامة والسياسة: 58/1، 69. [5] شرح نهج البلاغة: 18/9. [6] الأخبار الطوال، ص: 145. [7] سير أعلام النبلاء: 193/2. [8] جولة تاريخية في عصر الخلفاء الراشدين، ص: 526.

ہے کہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر لوگوں کی خروج کے لیے حوصلہ افزائی کی...... یہ سب کچھ صحیح نہیں ہے۔ [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شہادت عثمان کی خبر ملتے ہی طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما و دیگر کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مکہ پہنچنے سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کا مطالبہ کر دیا تھا۔ جب وہ (یہ الم انگیز خبر سن کر) واپس مکہ آئیں تو حضرت عبداللہ بن عامر الحضرمی ان کی خدمت میں آئے اور کہا: اے ام المؤمنین! آپ کیوں لوٹ آئیں؟ انھوں نے فرمایا: میں اس لیے واپس آئی ہوں کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو مظلومیت کی حالت میں شہید کر دیا گیا ہے، جب تک یہ فسادی لوگ موجود ہیں معاملہ ٹھیک نہیں ہوگا، تم لوگ عثمان کے خون کا بدلہ لینے کا مطالبہ کرو اور اسلام کو عزت دو۔ عبد اللہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس صدا پر لبیک کہا۔ [2] ابھی تک طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے مدینہ سے کوچ نہیں کیا تھا، وہ تو مدینہ سے اُس وقت نکلے جب شہادتِ عثمان پر چار ماہ بیت گئے تھے۔ [3]

② کیا وہ اپنے ساتھیوں پر غالب پوزیشن میں تھیں؟

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ صحابہ کرام کی ایک جماعت روانہ ہوئی۔ [4] اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، جیسا کہ بروکلمین نے دعویٰ کیا ہے [5] کہ انھوں نے لوگوں کو ہر طرف سے متحرک کر کے ساتھ نہیں لیا تھا۔ طبری کی روایات میں تاکیداً یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں دیگر اُمہات المؤمنین کی تائید حاصل تھی اور اُن کا مقصد اصلاح کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہ تھا، انھیں اہل بصرہ کی تائید بھی حاصل تھی، اور یہ لوگ تعداد میں کم نہیں تھے، جیسا کہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے اُن کی یہ خوبی بیان کی ہے کہ وہ لوگ اہل بصرہ میں سے منتخب روزگار اور شرفاء تھے۔ [6] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اُن کے بارے میں فرمایا کہ وہ نیک لوگ تھے۔ [7] اور صالحین کی اتنی

[1] عائشة أم المؤمنين، ص: 184. [2] تاريخ الطبري: 475/5. [3] دور المرأة السياسي، ص: 383، وتاريخ الطبري: 469/5. [4] دور المرأة السياسي، ص: 384. [5] تاريخ الشعوب الإسلامية، ص: 111، 114، 117. [6] تاريخ الطبري: 475/5. [7] تاريخ الطبري، منقول عن دور المرأة السياسي، ص: 385.

بڑی اکثریت کا اپنے خروج پر بڑا ٹھوس اعتقاد تھا کہ اُن کا مقصد صحیح ہے۔ اور یہ بات امیر المؤمنین بھی جانتے تھے۔ وہ خود بعض لوگوں کے اس دعوی کی تردید فرماتے تھے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکل کھڑے ہونے والے لوگوں میں بیوقوف، فسادی یا اوباش لوگ شامل ہیں۔ [1]

امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ جمل کے واقعہ کے بعد، عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھیوں میں سے کچھ مقتولین کے بیچ میں کھڑے ہو گئے۔ وہ اُن کے حق میں رحمت کی دُعا کر رہے تھے اور اُن کی فضیلت بیان کر رہے تھے۔ [2] ان شاء اللہ! اس کی تفصیل آگے آئے گی، لہٰذا اِس خروج میں فسادی عناصر شامل نہیں تھے بلکہ یہ سمجھ دار لوگوں کی جماعت تھی جس میں کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ [3]

③ خونِ عثمان کے مطالبے کے لیے خروج سے متعلق ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا موقف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات فتنے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اس سال حج کے لیے چلی گئیں، جب اُنھیں مکہ میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے تو وہیں قیام کیا۔ بعد ازاں عازم سفر ہو کر نکلیں لیکن دوبارہ واپس آ گئیں تاکہ جب حالات سازگار ہو جائیں تب مدینہ روانہ ہوں۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو گئی تو بہت سارے صحابہ کرام نے مدینہ میں موجود، مختلف علاقوں کے فسادیوں کے باعث وہاں قیام کرنا گوارا نہ کیا، اُن میں سے صحابہ کی بہت بڑی تعداد اور اُمہات المؤمنین سب مکہ میں جمع ہو گئے۔ امہات المؤمنین میں سے بعض نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مدینہ جانے کی حمایت کی۔ لیکن جب عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے ساتھی صحابہ رضی اللہ عنہم بصرہ جانے پر متفق ہوئے تو مذکورہ امہات المؤمنین نے وہاں جانے سے

[1] دیکھیے: الإمامة والسياسة: 57/1. [2] تاريخ الطبري: 574/5. [3] دور المرأة السياسي، ص: 385.

انکار کیا اور فرمایا کہ ہم مدینے کے سوا کہیں نہیں جائیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے میں خروج پر امہات المؤمنین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن مدینے کی طرف رُخ کرنے کی بجائے بصرہ جانے پر اختلاف ہوا۔ تاہم حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بصرہ جانے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ متفق تھیں لیکن اُن کے بھائی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اُنھیں بصرہ جانے سے روک دیا۔ اُن کا اس مقصد کے لیے بصرہ نہ جانا اپنی مرضی پر موقوف نہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ عبد اللہ میرے اور میرے خروج کے مابین حائل ہو گئے ہیں۔ اس لیے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں معذرت پیش کر دی۔[1]

لوگوں کے مابین عام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا بصرہ کی طرف خروج کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے ساتھی صحابہ کی رائے سے متفق نہیں تھیں، اُن کی رائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔[2]

لیکن زیادہ صحیح روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے عمر بن ابی سلمہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے بھیجا کہ: اللہ کی قسم! میرا یہ بیٹا مجھے خود اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز ہے، یہ ہر معرکے میں آپ کے ساتھ نکلے گا، وہ نکل کھڑا ہوا اور ہمیشہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا۔[3] اس روایت کی مزید تحقیق سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بیٹے کو روانہ کرتے ہوئے، اصلاح بین المسلمین کے مشن میں دیگر امہات المؤمنین کی مخالف تھیں۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے ساتھیوں کی منشا یہ نہیں تھی کہ وہ اس مشن کے لیے نکلتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ہیں یا وہ اُن کی خلافت کے مقابلے میں خروج کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن خوب جانتی تھیں کہ یہ خروج مسلمانوں کے مابین اصلاح کے لیے

[1] تاريخ الطبري: 5/487. [2] أنساب الأشراف: 4/224. [3] أسدالغابة: 4/169، والإصابة: 4/484، و دور المرأة السياسي، ص: 387، و المستدرك، و مرويات أبي مخنف، ص: 257.

ہے جو فرض کفایہ کے حکم میں داخل ہے، اس کا عام ضابطہ یہ ہے کہ تمام مکلفین سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا، یہ مطالبہ صرف ان سے ہے جو اسے انجام دینے کے اہل ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے مقام و مرتبہ اور علم و فضل کی بنیاد پر اس مقصد کی پوری طرح اہل تھیں۔ جمہور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ وہ تفقہ فی الدین میں سب سے بڑھ کر تھیں۔[1] وہ عام لوگوں کے مسائل پر نظر رکھتی تھیں اور وسیع النظر ثقافت پر قائم بے مثل شخصیت تھیں۔ اُن کی پرورش عربوں کی جنگوں اور اُن کے نسب ناموں کے اجل عالم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر میں ہوئی اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ مبارک میں زندگی بسر کی۔

جہاں سے اسلامی ریاست و سیاست کی بنیادیں اُٹھیں اور استوار ہوئیں پھر وہ مسلمانوں کے خلیفۂ اول کی صاحبزادی ہیں۔ علماء نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس درجے کو تاکیداً بیان کیا ہے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں: میں سیدہ عائشہ کی خدمت میں رہا، میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو کسی آیت قرآنی، کسی فرض، کسی سنت، شاعری، عرب جنگوں، علم انساب، قضاء اور طب کے بارے میں اُن سے بڑھ کر صاحب علم ہو۔[2]

امام شعبی اُن کے تفقہ اور علم پر حیران رہ جاتے اور مخاطب فرماتے تھے: تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ آداب نبوت جاننے والا کوئی بھی تھا؟ عطاء کہتے ہیں: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تمام لوگوں سے بڑھ کر دین کا تفقہ رکھنے والی اور عوامی رائے کو خوب اچھی طرح سمجھنے والی تھیں۔[3]

احنف بن قیس جو بنوتمیم کے سردار اور عربوں میں فصاحت و بلاغت کے دھنی تھے، کہتے ہیں: میں نے ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم اور بعد میں آنے والے خطباء کے خطبے سُنے لیکن میں نے سیدہ عائشہ سے بڑھ کی کسی کو اعلی اور عمدہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اسی سے ملتی جلتی بات کہتے تھے۔[4] جب

[1] سیر أعلام النبلاء: 183/2. [2] سیر أعلام النبلاء: 183/2. [3] سیر أعلام النبلاء: 185/2. [4] سیر أعلام النبلاء: 183/2.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بصرہ روانگی کا سفر شروع کیا، تمام امہات المؤمنین اُنھیں الوداع کہنے کے لیے آئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُنھیں اُن سب کی طرف سے تائید و تعاون اور حوصلہ افزائی نصیب ہوئی۔ [1]

4 سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا حوأب کے چشمے سے گزرنا

صحیح روایات سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا حوأب کے چشمے کے پاس سے گزرنا ثابت ہے، یحییٰ بن سعید ابن القطان، اسماعیل بن ابی خالد سے، وہ قیس بن حازم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ازواج مطہرات) سے فرمایا: اُس وقت تمھارا کیا حال ہوگا، جب تم میں سے کسی ایک پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔ شعبہ کی اسماعیل کے واسطے سے جو روایت ہے اُس میں شعبہ کے روایت کردہ الفاظ یہ ہیں: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب حوأب پر پہنچیں تو وہاں کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی، فرمانے لگیں: میرا خیال ہے میں واپس چلی جاؤں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا تھا: ''تم میں سے کسی ایک پر حوأب کے کتے بھونکیں گے''، اس موقع پر زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ واپس کیوں جاتی ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح کر دے۔ [2]

اِنھی الفاظ کے ساتھ یعلی بن عُبید نے اسماعیل سے روایت کیا ہے جسے امام حاکم نے نقل کیا ہے۔ [3] البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کی سند بالکل ٹھیک ہے اور یہ کہا ہے کہ اس حدیث کو پانچ بڑے ائمہ حدیث نے صحیح قرار دیا ہے جن میں ابن حبان، ذہبی، ابن کثیر اور ابن حجر وغیرہ شامل ہیں۔ [4] یہ وہ صحیح روایات ہیں جن میں تدلیس اور جھوٹ کا شائبہ تک نہیں ہے۔ جبکہ وہ ضعیف روایات جو اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں، صحابہ کا مقام و مرتبہ اُن سے بالاتر ہے۔ [5]

وہ روایات جنھیں علماء نے صحیح قرار دیا ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی قسم کی نہی یعنی ممانعت پر مبنی نہیں۔ نہ اُن میں ایسا کوئی حکم موجود ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

[1] دور المرأة السياسي، ص: 389. [2] مسند أحمد: 97/6. [3] المستدرك: 120/3. [4] سلسلة الأحاديث الصحيحة: 767/1، حديث: 474. [5] دور المرأة السياسي، ص: 405.

کو یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ ان روایات سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی کو ایسا واقعہ پیش آسکتا ہے کہ وہ حوأب کے چشمے کے قریب سے گزریں۔ وہاں جانے سے ممانعت کی روایات میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ''اے حمیرا! تم وہاں نہ جانا۔''[1] علماء نے اس روایت کو صحیح قرار نہیں دیا، بلکہ اُسے ضعیف بتایا ہے۔

اب صحیح بات یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوأب کے چشمے سے گزرنے کے کوئی منفی اثرات نہیں ہوئے جیسا کہ ضعیف روایات سے تأثر ملتا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر اس کے کوئی نفسیاتی اثرات بھی نہیں کہ وہ واپس جانے پر سنجیدگی سے غور کریں، کیونکہ ان کا سفر تو مسلمانوں کے مابین اصلاح اور اُن کے معاملات ٹھیک کرنے کے لیے تھا۔ اس سے واپس جانے کا گمان یا رجحان پیدا نہیں ہوتا۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں مسلمانوں کے مابین اصلاح کا کام لے لے۔

⑤ بصرہ میں اُن کی سرگرمیاں

سیدنا طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہما، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے ساتھی صحابہ بصرہ پہنچے۔ انھوں نے خریبہ[2] کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ وہیں سے پیغام بھیج کر مختلف قبائل کے معززین کو بُلوایا اور ان سے کہا کہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنی امداد و تعاون پیش کریں۔ بصرہ میں ایسے مسلمانوں کی اکثریت تھی جو قاتلین عثمان سے بدلہ لینا چاہتے تھے، لیکن اُن میں سے بعض کی رائے یہ تھی کہ یہ معاملہ صرف خلیفہ ہی پر موقوف اور اُنھی کے ساتھ مخصوص ہے۔ خلیفہ کے حکم اور اجازت کے بغیر اس حوالے سے خروج باعث گناہ ہے۔ لیکن اِن صحابہ کا خروج جنھیں جنت

[1] امام ذہبی کہتے ہیں کہ یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر وہ حدیث جس میں ''یا حمیراء'' کے الفاظ ہوں صحیح نہیں ہے۔ سیر أعلام النبلاء: 167/2. (یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ''یا حمیراء'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ (السنن الکبریٰ للنسائي: 181/8، والسلسلة الصحيحة: 80/13، حديث: 3277، وفتح الباري: 44/2)) [2] خریبہ، بصرہ کے قریب ایک مقام ہے۔ دیکھیے: خطط البصرة ومنطقتها لصالح محمد: 114-122.

کی خوش خبری دی گئی، ارکان شوریٰ اور اُن کے ساتھ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین شخصیت اور بالاطلاق تمام خواتین سے زیادہ فقیہہ تھیں، اور ان کے شرعی مقاصد پر کوئی اعتراض نہیں تھا، ایک صحابی بھی ان حقائق کے انکاری نہ تھے، ان سب باتوں نے بصرہ کے مختلف قبائل کے لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اِن کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے احنف بن قیس سعدی تمیمی کو پیغام بھیجا کہ وہ خونِ عثمان کے بدلے کا مطالبہ کرنے والوں کا ساتھ دیں۔ احنف قبیلۂ تمیم کے بڑوں میں سے تھے اور اُن کی بات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

احنف اس موقف کی ہولنا کی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ معاملہ اس قدر شدید ہولناک ہے کہ اس جیسے معاملے سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا، میرے لیے ان لوگوں کو انکار کر دینا جب کہ ام المؤمنین اور حوارِیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہیں، بہت مشکل فیصلہ ہے۔[1] البتہ انھوں نے اس معاملے سے علیحدگی ہی کو ترجیح دی اور اُن کی قوم کے چھ ہزار افراد نے علیحدگی اختیار کرنے میں ان کا ساتھ دیا۔ تاہم بہت سے لوگوں نے اُن کی بات نہ مانی اور طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہما اور اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کی اطاعت قبول کر لی۔''[2]

امام زہری کہتے ہیں کہ اکثر اہل بصرہ نے ان کا ساتھ دیا۔[3]

اس طرح طلحہ، زبیر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم جس مقصد کے لیے نکل آئے تھے، اس کی تائید میں اُنھیں نئے انصار و مددگار مل گئے۔ ابن حنیف نے حالات کو پُر سکون کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے مقدور بھر کوشش کی، لیکن معاملات اُن کے ہاتھ سے نکل گئے حتی کہ ان میں سے ایک شخص نے بصرہ کے بارے میں یہ کہا کہ یہ اہل شام کا ایک ٹکڑا ہے جو ہمارے ہاں ٹپک پڑا ہے۔[4] بعدازاں معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ کے تعاون سے وہاں غلبہ حاصل

---

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد، ص: 133. [2] طبقات ابن سعد: 456/5، اس روایت کی تائید میں دیگر شواہد ہیں جو اسے تقویت دیتے ہیں۔ [3] مصنف عبد الرزاق: 456/5 زہری تک صحیح سند کے ساتھ مرسل روایت ہے۔ [4] الطبقات: 333/6.

کرنے کی کوشش کی۔[1] اور بعض غیر معتبر ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ عثمان بن حنیف نے حکیم بن جبلہ کو لڑائی کی اجازت دے دی، یہ بات ثابت نہیں ہے اور صحیح مصادر سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔[2]

⑥ حُکَیم بن جبلہ اور اُس کے ساتھیوں کا قتل

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اہل بصرہ سے خطاب فرمایا تو حُکَیم بن جبلہ آیا اور اس نے لڑائی شروع کر دی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھی صحابہ اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہ نے اپنے نیزے تان لیے۔ مقصد یہ تھا کہ فریق مخالف باز آ کر لڑائی سے رُک جائے لیکن حُکَیم اور اُس کے ساتھی باز نہیں آئے۔ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور اصحابِ عائشہ رضی اللہ عنہا اُن کے خلاف اپنا دفاع کرنے کی حد تک لڑتے رہے۔ اُدھر حُکَیم اپنے گھوڑوں اور لشکر کو مہمیز دیتا رہا اور اُن کی حوصلہ افزائی سے باز نہ آیا۔[3]

ان احوال کے باوجود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مسلسل یہی کوشش رہی کہ لڑائی شروع نہ ہو۔ لٰہذا انھوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ لڑائی کرنے والوں سے دور رہیں، وہ اسی حالت میں رہے تا آنکہ رات کی تاریکی پھیل گئی۔[4]

صبح ہوئی تو حُکَیم بن جبلہ بُڑ بڑاتا ہوا آیا، اُس کے ہاتھ میں نیزہ تھا، اُس کا رُخ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے ساتھیوں کی طرف تھا، راستے میں وہ جس عورت یا مرد سے ملتا، اُسے عائشہ رضی اللہ عنہا کو بُرا بھلا کہنے کے لیے اُکساتا اور انکار پر اُسے قتل کر دیتا تھا۔[5]

اس صورتحال سے قبیلہ عبدالقیس کے لوگ غضبناک ہوگئے انھوں نے حُکَیم سے کہا: کل بھی تم نے یہی کچھ کیا۔ آج پھر اُسی عمل کو دہرا رہے ہو؟ اللہ کی قسم ہم تمھیں اُس وقت تک

[1] فتح الباري: 26/13، وخلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد، ص: 137. [2] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد، ص: 138,137. [3] تاريخ الطبري: 494/5. [4] تاريخ الطبري: 494/5. [5] تاريخ الطبري: 495/5.

نہیں چھوڑیں گے جب تک اللہ کی طرف سے قصاص کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ بعدازاں وہ سب اُسے وہیں چھوڑ کر واپس چلے گئے اور حکیم بن جبلہ اپنے اُن جھگڑالو ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو گیا جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب بصرہ میں اُن کی دال نہیں گلے گی۔ وہ سب اکٹھے ہو کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھیوں کے ساتھ آن کھڑے ہوئے اور شدید لڑائی کی۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے (مُنادی) پکارنے والا اُن کے ساتھیوں کو پکارتا رہا اور لڑائی سے باز رہنے کی تلقین کرتا رہا لیکن انھوں نے رُکنے سے انکار کر دیا۔[2] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرما رہی تھیں کہ صرف اُس سے لڑائی کرو جو آگے بڑھ کر تم سے لڑے، لیکن حکیم نے اس نصیحت کی پروا نہیں کی۔ وہ لڑائی کے شعلے بھڑکاتا رہا۔ جب ان لڑنے والوں کا مقصد زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما کی سمجھ میں آ گیا کہ انھیں کسی کی پروا ہے نہ حُرمت کا خیال ہے، اُن کا مقصد صرف لڑائی کرنا ہے تو اُن دونوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے اہل بصرہ میں سے ہمارے زیر انتقام لوگوں کو یہاں جمع کر دیا، اے اللہ! اُن میں ایک بھی باقی نہ رہے، آج ہی اُن سے قصاص لے لے، اور انھیں ہلاکت کی راہ پر ڈال دے، انھوں نے پکار کر کہا: تم میں سے جو قاتلین عثمان میں سے نہیں ہے، ہماری اُس سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ہم ان سے لڑائی شروع نہیں کریں گے، بعدازاں اُن کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا۔[3] اہل بصرہ میں موجود قاتلین عثمان میں سے ایک کے سوا وہاں سے کوئی بچ نہ سکا۔ زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما نے پکار کر کہا کہ تمھارے قبائل میں سے جو بھی ایسا شخص ہو جس نے مدینہ کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا ہو اُسے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔[4]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بقول اِن جاہلوں اور فسادیوں میں سے ایک فریق صبح کے اندھیرے میں اُنھیں شہید کرنے آیا۔ یہ لوگ اُن کے گھر کی دہلیز تک پہنچے تھے، راستہ

[1] تاریخ الطبري: 499/5. [2] تاریخ الطبري: 499/5. [3] تاریخ الطبري: 499/5. [4] تاریخ الطبري: 501/5.

دکھانے والا اُن کے ساتھ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ذریعے سے انھیں اُس وقت پیچھے کی طرف دھکیل دیا جب کہ انھوں نے اُن کے گھر کا گھیراؤ کر لیا تھا، ان کی منصوبہ بندی انھی کے گلے پڑ گئی اور مسلمانوں نے اُنھیں گھیر کر قتل کر ڈالا۔ [1]

اس طرح زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما کے لیے بصرہ پر غلبہ پانا ممکن ہو گیا، اب اُنھیں کھانے کے لیے غذائی سامان کی ضرورت تھی۔ اُن پر کئی ہفتے ایسے بیت گئے کہ وہ کسی کی مہمان نوازی سے مستفید نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا زبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر نے دار الحکومت کا رُخ کیا اور وہاں سے وہ بیت المال کی طرف مُڑ گئے تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کے لیے کھانے پینے کا اہتمام کریں۔ انھوں نے عثمان بن حنیف کا راستہ چھوڑ دیا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے۔ [2] اس طرح طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہما اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کا بصرہ پر غلبہ مکمل ہو گیا۔ انھوں نے مدینہ پر حملہ آور لوگوں میں سے بہت سوں کو قتل کر دیا جن کی تعداد تقریباً ستر کے قریب تھی۔ ان میں بصرہ کے فسادیوں کا سرغنہ حُکیم بن جبلہ بھی شامل تھا جو لڑائی چاہتا تھا اور جنگ کے شعلے بھڑکانے والا تھا، وہاں زبیر رضی اللہ عنہ کی کمان میں لڑائی ہوئی اور اس پر ان کی بیعت بھی کی گئی۔ [3]

⑦ دیگر علاقوں کی طرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خطوط

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا چاہتی تھیں کہ اہل بصرہ کے ساتھ جو لڑائی پیش آ گئی ہے اُس کی حقیقی صورت حال واضح کریں، لہٰذا اُنھوں نے شام، کوفہ اور یمامہ کی طرف خطوط بھیجے۔ اہل مدینہ کو بھی خط لکھا اور صورت حال بیان کی، انھوں نے اہل شام کو لکھا: ہم ایمرجنسی کی حالت میں نکلے تھے اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ کم ہوں یا زیادہ، معزز ہوں یا کم تر بہر حال اللہ کی کتاب اور اس کی بیان کردہ حدود قائم و نافذ کی جائیں۔ اہل بصرہ میں سے معززین اور

[1] تاريخ الطبري: 503/5. [2] تاريخ الطبري: 493/5، وخلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 138. [3] أنساب الأشراف: 93/2، اس کی سند حسن ہے، وخلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 139.

اچھے لوگوں نے بیعت کر لی اور اُن کے بُروں اور فسادیوں نے ہماری مخالفت کی۔ انھوں نے مسلح ہوکر ہمارا راستہ روکا، انھوں نے جو کہنا تھا کہا، انھوں نے کہا کہ ہم ام المؤمنین کو اپنے پاس قیدی بنا کر رکھیں گے کیونکہ میں نے انھیں حق کا حکم دیا تھا اور اس کی ترغیب دلائی تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ وہ سلوک کیا جو مسلمانوں کی سنت ہے۔ حتی کہ جب کوئی دلیل اور عذر باقی نہ رہا تو قاتلین عثمان نے جنگ بھڑکا دی، پھر اُن میں سے صرف ایک شخص حُرقوص بن زہیر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ اُس سے بھی قصاص لے گا۔ ہم تمھیں اللہ کی قسم دے کر کہتے ہیں کہ تم اس طرح اُٹھو جس طرح ہم اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں، پھر جب ہماری اور تمھاری اللہ سے ملاقات ہوگی تو ہم اپنے خلاف ہر قسم کے عذر کا خاتمہ کر چکے ہوں گے اور اپنی ذمہ داری پوری طرح ادا کر چکے ہوں گے۔ [1]

(8) عثمان بن حنیف اور لشکر طلحہ و زبیر و عائشہ رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف

طبری ابو مخنف سے، وہ یوسف بن یزید سے اور وہ سہل بن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: جب انھوں نے عثمان بن حنیف کو پکڑا تو صحابہ نے ابان بن عثمان بن عفان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا کہ اُس کے بارے میں مشورہ کریں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اُسے قتل کر دو، یہ سُن کر اُسی لمحے ایک عورت نے اُن سے کہا: اے ام المؤمنین! میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتی ہوں کہ عثمان بن حنیف کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصاحبت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجیے۔ چنانچہ حضرت عائشہ نے فوراً کہا: ابان کو واپس بلاؤ، وہ انھیں واپس لائے تو سیدہ نے فرمایا: اُسے قتل نہ کرو، بلکہ قید کر دو (ابان نے) کہا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ نے مجھے اس بات کے لیے بلایا ہے تو میں واپس نہ آتا۔ مجاشع بن مسعود نے انھیں کہا: اُسے مارو اور اُس کی داڑھی کے بال نوچ لو تو انھوں

[1] تاريخ الطبري: 501/5.

نے اُسے چالیس کوڑے مارے، داڑھی اور سر کے بال پھر اُس کے ابرو اور پلکوں کے بال نوچے اور اُسے قید کر دیا۔

اس روایت کی سند میں ابومخنف ہے جو بڑا سخت شیعہ اور رافضی ہے۔ یہ روایت ایسی صحیح سند سے ثابت نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے، اور صحابہ کرام اس قسم کے قبیح مثال سے منزہ ہیں۔ سیف کی روایت سے لگتا ہے کہ فسادیوں ہی نے یہ سب کچھ کیا اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے اسے بہت بُرا کہا، بڑی غلطی قرار دیا اور اس کی خبر عائشہ رضی اللہ عنہا کو دی تو اُنھوں نے فرمایا: اسے واگزار کر دو، یہ جہاں چاہے چلا جائے۔[1] یہ روایت اُن تفصیلات کے برعکس ہے جو ابو مخنف نے بیان کی ہیں، عائشہ رضی اللہ عنہا نے اُس کے قتل، قید، یا چہرے کے بال نوچنے کا ہرگز کوئی حکم نہیں دیا۔ حافظ ابن کثیر اور نویری نے اس روایت کو اختیار کیا ہے۔[2] اور امام ذہبی نے ذکر کیا ہے کہ مجاشع بن مسعود تو عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی قتل ہو چکا تھا۔[3] اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مجاشع قتل نہیں ہوا تھا، تو وہ قیادت کے منصب پر فائز نہیں تھا کہ وہ اس قسم کے احکام جاری کرے۔[4]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی

امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مدینہ میں تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے وہاں سے کسی اور جگہ جانے کی تائید نہیں کرتے تھے، یہ بات اُس وقت واضح ہوئی جب انھوں نے شام کی طرف جانے کا ارادہ کیا، تا کہ وہاں کے لوگوں سے ملیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے معلوم کرنے کے علاوہ یہ جان سکیں کہ اُن کا آگے کیا ارادہ ہے؟ اُن کا خیال تھا کہ موجودہ صورت حال میں مدینہ میں رہتے ہوئے اُنھیں وہ قوت و شوکت حاصل نہیں جو بعض دیگر

[1] تاريخ الطبري: 497/5. [2] نهاية الأرب: 38/20، والبداية والنهاية: 233/7. [3] تاريخ الإسلام للذهبي، و مرويات أبي مخنف في تاريخ الطبري، ص: 359. [4] مرويات أبي مخنف في تاريخ الطبري، ص: 359.

شہروں اور علاقوں میں ہے، انھوں نے فرمایا: افرادی قوت اور مال و دولت سب کچھ عراق میں ہے۔ جب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو اُن کے اِس طرف میلان و رُجحان کا پتہ چلا تو انھوں نے کہا: اے امیر المؤمنین! اگر آپ اسی شہر میں رہیں تو یہ مضبوط مرکز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہجرت ہے، یہیں اُن کی قبر اور منبر ہے، یہ شہر اسلام کا مرکز ہے اگر عرب آپ کے حق میں قائم رہے تو آپ اپنے آپ کو پہلے کی طرح ہی محسوس کریں گے۔ اگر قوم انتشار کا شکار ہو جائے تو اسے دشمن کے مدمقابل کھڑا کر دیجیے۔ اگر آپ کو جانے پر مجبور ہی کر دیا جائے تو آپ چلے جائیں۔ آپ کے پاس یقیناً اِس کا عذر ہوگا۔ خلیفہ نے اُن کا مشورہ مان لیا اور مدینہ ہی میں قیام کا عزم ظاہر کیا اور عمال کو مختلف علاقوں کی طرف روانہ کر دیا۔[1]

لیکن بعد ازاں ایسے سیاسی واقعات پیش آئے جنھوں نے خلیفہ کو مدینہ سے رخصت ہونے پر مجبور کر دیا، انھوں نے کوفہ جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ وہ اہل شام کے قریب رہیں۔[2] اُن کے کوفہ جانے کی تیاری کے دوران معلوم ہوا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے بصرہ کی طرف خروج کیا ہے۔[3] انھوں نے اہل مدینہ کو نکل کھڑے ہونے کی صدا لگائی اور اپنی مدد کے لیے پکارا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں بعض فسادیوں کی موجودگی کی وجہ سے اہل مدینہ کے دل بوجھل تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ فتنہ ابھی تک جاری ہے، معاملات واضح نہیں ہوئے صورتحال کے مزید واضح ہونے کا انتظار کیا جائے۔ وہ کہتے تھے:

اللہ کی قسم! ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ ہم کیا کریں، معاملہ ہمارے لیے اشتباہ کا شکار ہے، جب تک معاملات روشن نہ ہو جائیں ہم یہیں رہیں گے۔ طبری روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پوری تیاری کے ساتھ شام کی طرف نکلے۔ کوفیوں اور بصریوں کے ہٹے کٹے سات سو آدمی بھی اُن کے ساتھ نکل پڑے۔[4]

---

[1] الثقات لابن حبان: 383/2، والأنصار في العصر الراشدي، ص: 161. [2] استشهاد عثمان ووقعة الجمل، ص:183. [3] تاريخ الطبري: 507/5. [4] تاريخ الطبري: 481/5.

اہل مدینہ بے حد غمگین تھے۔ امیر المؤمنین نے خروج کے لیے پکارا تو انھوں نے لبیک نہ کہا۔ خلیفہ نے خطاب کیا تو اس دوران اس بات کی شکایت بھی کی۔[1] یہ پہلے ہی واضح ہو چکا ہے کہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اکثر صحابہ معاملات سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔ اہل بدر میں سے کچھ لوگ اپنے گھروں ہی میں پناہ گزیں ہو گئے۔ قبرستان کے سوا وہ کہیں نہ جاتے تھے۔[2] ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہیں، وہ شہادتِ عثمان کے المناک واقعہ پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے اللہ! میرا تجھ سے وعدہ ہے کہ تجھ سے ملاقات کے وقت تک میں کبھی نہیں ہنسوں گا۔[3] حضرات صحابہ اس مرحلے پر مدینہ سے خروج کے متعلق یہ کہتے تھے کہ ہم بُرے انجام کے خوف سے اس فتنے کے گڑھے میں گرنا نہیں چاہتے۔

یہ سب کچھ انھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شرکت کی سلامتی کے برعکس نظر آ رہا تھا۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خلیفہ کے ساتھ صحابہ میں سے کوئی بھی شریک نہیں ہوا، بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ صحابہ کرام شامل ہوئے البتہ وہ کم تعداد میں تھے۔

امام شعبی کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے علی، عمار، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے سوا جنگ جمل میں کوئی شریک نہیں ہوا، اگر کوئی پانچواں صحابی بتا دے تو میں جھوٹا ہوں گا۔[4] ایک اور روایت میں ہے: جو تمھیں کہے کہ بدری صحابہ میں سے چار سے زیادہ صحابہ نے اس معاملے میں شرکت کی اُسے جھٹلا دو۔ بس ایک طرف علی اور عمار رضی اللہ عنہما تھے اور دوسری جانب طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما تھے۔[5]

[1] الطبقات: 237/3، والأنصار في العصر الراشدي، ص: 163. [2] البداية والنهاية، منقول عَن الأنصار في العصر الراشدي، ص: 164. [3] تاريخ الإسلام، عهد الخلفاء الراشدين: 480/3. [4] تاريخ ابن خياط، ص: 16، ومصنف ابن أبي شيبة: 710/8. [5] العثمانية للجاحظ، ص: 175، والأنصار في العصر الراشدين، ص: 165.

ایک اور روایت میں ہے: بصرہ کی طرف روانگی کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ چھ بدری صحابہ کے سوا کوئی نہیں گیا، ان میں ساتواں کوئی نہ تھا۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے پچھلی روایت میں صحابہ کی تعداد سے مراد بدری صحابہ ہیں، بہرحال فتنہ میں شریک انصار قلیل تعداد میں تھے۔

ابن سیرین اور شعبی کہتے ہیں: مدینہ میں فتنہ وقوع پذیر ہوا۔ اس وقت صحابہ کرام دس ہزار سے زیادہ تھے اور جو اس فتنے کا شکار ہوئے وہ صرف بیس آدمی ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ جمل اور جنگ صفین فتنہ کہلائیں،[2] جنگ جمل میں شرکاء کی صحیح تعداد یقینی طور پر نہیں بتائی جاسکتی۔ اس معاملے کی شدت حادثات اور واقعات کی کثرت کے باعث مختلف مصادر نے صحابہ میں شرکاء، شہداء اور زخمیوں کی تعداد نہیں بتائی۔[3] ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفیوں اور بصریوں میں سات سو تنومند لوگ ان کے ساتھ نکلے۔[4] اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس مرحلے میں یہ بات حقیقتِ واقعہ کے زیادہ قریب ہے اور جو واقعات رُونما ہورہے تھے ان کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ اور اہلِ مدینہ کے موقف کے بھی قریب تر ہے جو ذہنی طور پر بوجھل تھے اور ان واقعات میں شرکت سے علیحدگی اختیار کیے ہوئے تھے۔[5]

① عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی نصیحت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے بڑی کوشش کی کہ امیر المومنین خروج کا ارادہ بدل دیں، جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ روانگی کے لیے پابہ رکاب تھے تو وہ اُن کے پاس آئے، اُنھیں تمام خطرات سے آگاہ کیا۔ اُنھیں عراق جانے سے منع کیا اور کہا: میں ڈرتا

[1] الخلافة الراشدة من تاريخ ابن كثير لكنعان، ص: 356. [2] الخلافة الراشده من تاريخ ابن كثير لكنعان، ص: 356. [3] الأنصار في العصر الراشدي، ص: 165. [4] تاريخ الطبري: 481/5. [5] الإنصاف فيما وقع في تاريخ العصر الراشدي من الخلاف، ص: 388.

ہوں، مبادا آپ پر تلوار کی دھار چل جائے اگر آپ نے منبرِ رسول ﷺ کو چھوڑ دیا تو پھر اسے کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کے زیر اثر یہ ساری باتیں خوب جانتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے یہ ساری باتیں رسول اکرم ﷺ نے بتائی تھیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو بصری اور کوفی تھے انھیں اتنی جرأت ہوگئی کہ وہ علی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ہمیں چھوڑو، ہم انھیں قتل کر دیتے ہیں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ عبداللہ بن سلام نیک آدمی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فسادیوں کے لیے مسلمانوں کو قتل کرنا اور اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا آسان ہوگیا تھا۔ انھیں خوف خدا بالکل نہیں تھا۔ وہ صحابہ کرام کو وہ مقام و مرتبہ نہیں دے رہے تھے جس کا رسول اللہ ﷺ نے امت کو حکم دیا تھا۔[1]

② حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی نصیحت

امیر المؤمنین مدینہ سے روانہ ہوئے، جب وہ مقام ربذہ پر پہنچے،[2] اور اپنے لشکر کو پڑاؤ ڈالنے کو کہا تو اُن کے پاس دو سو مسلمان آئے۔[3] پھر اُن کے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ وہ رو رہے تھے۔

مسلمانوں کے افتراق و انتشار کی وجہ سے اُنھیں شدید غم لاحق تھا۔ حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے والد گرامی رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے آپ سے عرض کیا تھا، آپ نے میری بات نہیں مانی، کل کو آپ کسی ویرانے میں شہید کر دیے جائیں تو آپ کا کوئی مددگار نظر نہیں آئے گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم ابھی تک لڑکیوں کی طرح آہ و بُکا کر رہے ہو۔ آخر تم نے مجھ سے کیا

---

[1] مسند أبي يعلى: 381/1، اس کے محقق کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [2] یہ مقام مدینہ منورہ کے مشرق کی جانب 204 کلومیٹر دور ہے۔ [3] أنساب الأشراف: 45/2، وخلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد، ص: 143.

کہا تھا، جو میں نے نہیں مانا؟ انھوں نے کہا: جس روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کیا گیا، میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ مدینہ سے باہر چلے جائیں، آپ کی موجودگی میں اُنھیں شہید نہ کیا جائے، پھر میں نے آپ کو اُن کی شہادت کے روز کہا تھا کہ آپ لوگوں سے اُس وقت تک بیعت نہ لیں جب تک تمام علاقوں سے لوگوں کے وفود نہ آ جائیں، پھر جب اُن دو لوگوں نے (طلحہ، و زبیر رضی اللہ عنہما) جو کچھ بھی کیا، میں نے آپ سے کہا کہ جب تک یہ لوگ آپس میں کچھ طے نہ کرلیں آپ اپنے گھر میں بیٹھے رہیں تاکہ اگر فساد ہو تو کسی اور ہی کے ہاتھوں رُونما ہو آپ نے ان سب مواقع پر میری بات نہیں مانی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے بیٹے! تمھارا یہ کہنا کہ عثمان کا گھیراؤ کرلیا گیا ہے آپ مدینہ سے نکل جائیں تو اللہ کی قسم! جس طرح اُن کا گھیراؤ کیا گیا اُسی طرح ہمارا گھیراؤ کیا گیا۔ رہا تمھارا یہ کہنا کہ تمام علاقوں کے وفود آنے تک کسی کی بیعت نہ لیں، بنیادی طور پر تو یہ معاملہ اہل مدینہ سے متعلق تھا۔ ہمیں اس بات کا خطرہ تھا کہ معاملات زیادہ خرابی کی طرف رُخ نہ کرلیں۔ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے خروج سے متعلق تم نے جو کچھ کہا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر میں کچھ نہ کرتا تو یہ اہل اسلام کو کمزور کرنے کے مترادف تھا، اللہ کی قسم! جب سے خلافت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آئی ہے میں مجبور و مقہور ہو گیا ہوں، اور تمھارا یہ کہنا کہ میں گھر میں بیٹھ رہوں تو میری ذمہ داریوں کی موجودگی میں بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اُس بجو کی طرح بن جاؤں جسے گھیر لیا گیا ہو اور وہ اپنے ساتھیوں کو آواز دے رہا ہو حتی کہ اُس کی کونچیں کاٹ دی جائیں، اگر میں اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کروں گا تو پھر کون کرے گا؟ میرے بیٹے! مجھے اسی حال میں چھوڑ دو۔[1]

ان انتہائی سنگین حالات میں امیر المؤمنین کا موقف بڑا واضح اور دانشمندی پر مبنی تھا۔ اُنھیں اُن کے عزم سے کوئی نہ ہٹا سکا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ربذہ سے پیغام بھیجا جس میں

[1] تاريخ الطبري: 482/5.

انھوں نے اہل کوفہ کو باہر نکلنے کی دعوت دی اور اپنی مدد کے لیے بلایا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پیامبر محمد بن ابی بکر اور محمد بن جعفر رضی اللہ عنہما تھے لیکن وہ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کوفے میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو روک دیا، انھوں نے خروج کی مخالفت کی اور فتنے میں لڑائی لڑنے کی ممانعت کر دی اور اُنھیں وہی بات سنائی جو اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتنے میں شرکت سے اجتناب کے بارے میں سُنی تھی۔[1]

بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص کو روانہ کیا۔ مگر وہ بھی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اپنے مشن میں ناکام رہے۔[2]

③ ذی قار مقام سے امیر المؤمنین کا اہل کوفہ کو (میدان جنگ میں) نکلنے کے لیے کہنا

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کو لے کر مقام ذی قار پر خیمہ زن ہوئے تو مدینہ سے روانگی کے بعد آٹھ راتیں بیت چکی تھیں،[3] تقریباً نو سو آدمی آپ کے ساتھ تھے۔[4] اس مرتبہ آپ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو کوفہ بھیجا، مگر اہل کوفہ نے دیر کر دی تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے عمار بن یاسر اور حسن بن علی رضی اللہ عنہم کو بھیجا، اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے اُن کی جگہ قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ کو والی مقرر کر دیا۔[5]

اہل کوفہ کو قائل کرنے میں قعقاع کا بہت بڑا کردار تھا، وہ لوگوں سے خطاب کے لیے کھڑے ہو گئے اور کہا: بے شک میں تمھارا خیر خواہ ہوں، تم پر شفیق ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ عقلمندی سے کام لو، میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، وہ حق بات ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ایسی امارت و قیادت کی اشد ضرورت ہے جو لوگوں کو منظّم کرے،

[1] تاريخ الطبري: 514/5، و مصنف بن أبي شيبة: 15/12، اس کی سند حسن ہے۔ [2] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد، ص: 144، و سير أعلام النبلاء: 486/3. [3] یہ کوفہ سے قریب بکر بن وائل کا چشمہ ہے، معجم البلدان: 393/4. [4] تاريخ الطبري: 519/15، 521. [5] فتح الباري: 53/13، و التاريخ الصغير: 109/1.

ظالم کو نکال باہر کرے، مظلوم کو عزت بخشے۔ یہ علی بن ابی طالب ہیں، یہ خلافت پر متمکن ہیں، انھوں نے جس طرف پکارا ہے اور جو دعوت دی ہے وہ اصلاح کی راہ ہے، فوراً نکل پڑو اور اس معاملے میں اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھو۔[1]

حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا لوگوں پر واضح اثر تھا، انھوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! اپنے امیر کی پکار پر لبیک کہو، اپنے بھائی بندوں کی طرف نکلو! عقلمند لوگ اس معاملے میں اُن کا ساتھ دیں، یہ دنیا میں بہتری اور آخرت میں خیر و بھلائی کا موجب ہوگا، ہم اور تم سب آزمائش کا شکار ہیں، اس میں ہماری مدد کرو، ہمارا ساتھ دو۔[2] اہل کوفہ میں سے اکثر لوگوں نے اُن کی پکار پر لبیک کہا۔ وہ عمار اور حسن رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شانہ بشانہ آ کھڑے ہوئے، ان کی تعداد چھ اور سات ہزار کے درمیان تھی، پھر اہل بصرہ میں سے قبیلہ عبد القیس کے دو ہزار آدمی اُن کے ساتھ آن ملے۔

بعد ازاں دیگر قبائل نے بھی اُن کا ساتھ دیا، تا آنکہ معرکے کے وقت اُن کے لشکر کی تعداد تقریباً بارہ ہزار نفوس تک پہنچ گئی۔[3]

جب اہل کوفہ مقام ذی قار پر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے آ ملے تو انھوں نے ارشاد فرمایا: اے اہل کوفہ! تم عجم کی دولت و امارت کے وارث ہو، تم نے عجم کی اجتماعیت بکھیر کر رکھ دی حتی کہ ان کی جائیدادیں تمھارے قبضے میں آ گئیں۔ تم نے اپنے اہل علاقہ کی مدد کی اور دشمنوں سے غنیمتیں حاصل کیں۔ میں نے تمھیں بلایا ہے تاکہ تم ہمارے ساتھ ہمارے بصرہ کے بھائی بندوں سے مِلو، اگر وہ ہم سے جھگڑا کریں تو ہم نرمی سے اُن کا علاج کریں اور لڑائی سے دور رہیں اگر وہ ہم پر ظلم کرنے کی ابتدا کریں تب بھی ہم ان شاء اللہ بہر صورت فساد پر صلح جوئی ہی کو ترجیح دیں گے۔ قوت و طاقت تو بس اللہ ہی کے پاس ہے![4]

---

[1] تاريخ الطبري: 516/5. [2] تاريخ الطبري: 516/5. [3] مصنف عبدالرزاق: 457,456/5، زہری تک یہ روایت مرسل اور صحیح ہے، وخلافة علي بن أبي طالب، ص: 146، اس کی سند حسن لغیرہ ہے جیسا کہ عبدالحمید علی کا کہنا ہے۔ [4] تاريخ الطبري: 519/5.

④ اختلافِ رائے، تعلقاتِ محبت پر اثر انداز نہیں ہوتا

یہ قول، فتنے کے اُن حالات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر صادق آتا ہے کہ اختلاف رائے کے باوجود، اُن میں سے کسی کے دل میں اپنے کسی بھائی کے خلاف کینہ و بغض پیدا نہیں ہوا، اُس دور میں پیش آنے والے بہت سے واقعات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ کوفہ میں پیش آیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ ابووائل سے روایت کرتے ہیں: جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمار رضی اللہ عنہ کو اہل کوفہ کی طرف بھیجا کہ وہ اُنھیں لڑائی کے لیے تیار کریں اس وقت ابوموسیٰ اشعری، ابومسعود، اور عقبہ بن عمرو الانصاری رضی اللہ عنہم اُن کے پاس آئے اور کہا: جب سے تم اسلام لائے ہو، تم نے ہمارے نزدیک اس سے زیادہ ناپسندیدہ کام کبھی نہیں کیا۔ اس معاملے میں تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اُن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: جب سے آپ نے اسلام قبول کیا ہے میں نے اس سے زیادہ ناپسندیدہ بات کوئی نہیں دیکھی کہ آپ اس معاملے میں تاخیر کا شکار ہیں۔ ابومسعود رضی اللہ عنہ بڑے خوشحال تھے۔ انھوں نے اپنے غُلام کو بلایا اور کہا: کپڑوں کے دو سوٹ لاؤ ایک ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اور دوسرا عمار رضی اللہ عنہ کو دے دو۔ پھر فرمایا تم دونوں یہ پہن کر جمعے کی نماز ادا کرنے جاؤ۔[1] آپ نے دیکھا کہ ابومسعود اور عمار رضی اللہ عنہما دونوں ایک دوسرے کو غلطی پر سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ابومسعود رضی اللہ عنہ نے عمار کو کپڑوں کا سوٹ پیش کر دیا تاکہ وہ یہ پہن کر نماز جمعہ ادا کر سکیں، کیونکہ وہ اس وقت سفر کے لباس اور جنگی حالت میں تھے، ابومسعود رضی اللہ عنہ کو اچھا نہ لگا کہ وہ اس حالت میں جمعہ کی نماز پڑھیں۔ یہ سلوک اُن کے مابین محبت کا تعلق ظاہر کرتا ہے، جبکہ وہ فتنے کے متعلق ایک دوسرے کو غلط قرار دے رہے تھے اور ہر ایک نے دلیل کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کی تھی۔

جس نے تاخیر سے کام لیا، اس کے دل میں یہی خیال کام کر رہا تھا کہ فتنے کی صورت میں لڑائی سے باز رہنا مطلوب ہے اور اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں اُن پر عمل کرنا

[1] صحيح البخاري، حديث: 7101.

ضروری ہے، ایسا اس لیے بھی لازم ہے کہ مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی وعید آئی ہے۔ دوسری طرف حضرت عمار رضی اللہ عنہ باغیوں اور بدعہد لوگوں کے خلاف لڑائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہم نوا تھے اور قرآن کے حکم ﴿فَقٰتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ﴾ پر عمل کر رہے تھے۔ یعنی جو بغاوت کرے اُس کے خلاف لڑو، آیت کے اس حصے میں لڑائی سے متعلق وعید کو انھوں نے اس امر پر محمول کیا کہ جو اپنے مسلمان بھائی پر زیادتی کرے اور حد سے تجاوز کرے، یہ اُس کے لیے ہے۔ فریقین میں سے کوئی بھی دوسرے مسلمان ساتھی کے قتل کا خواہش مند نہیں تھا، وہ اختلاف اور لڑائی کے سخت خلاف تھے، دونوں فریق لڑائی کے امکانی اسباب سے دور رہنا چاہتے تھے۔

⑤ راستے میں امیر المؤمنین کے ساتھ سوال و جواب

(ل) ابو رفاعہ بن رافع بن مالک العجلانی الانصاری نے جب ربذہ سے نکلنے کا ارادہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے امیر المؤمنین! آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ ہمیں کہاں لے جائیں گے؟ انھوں نے فرمایا: ہم جو چاہتے ہیں اور جو ہماری نیت ہے وہ صرف اصلاح کرنا اور صلح سے کام لینا ہے۔ دوسرا فریق ہماری طرف سے یہ بات قبول کرلے گا۔ ابو رفاعہ نے پوچھا: اگر اُس نے قبول نہ کیا؟ یہ سن کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اُنھیں معذور سمجھتے ہوئے چھوڑ دیں گے، انھیں اُن کا حق دیں گے پھر صبر سے کام لیں گے۔ ابو رفاعہ نے سوال کیا: اگر پھر بھی وہ اس پر راضی نہ ہوئے؟ انھوں نے فرمایا: اگر وہ ہمیں چھوڑ دیں گے تو ہم بھی اُنھیں چھوڑ دیں گے۔ ابو رفاعہ نے کہا: اگر انھوں نے ہمیں نہ چھوڑا تو پھر؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اُن کے آڑے نہیں آئیں گے۔ ابو رفاعہ نے کہا: پھر ٹھیک ہے۔ انھوں نے یہ تسلی بخش جوابات سنے تو خوش دلی سے روانگی کے لیے تیار ہوگئے اور عرض کی میں آپ کو عملی طور پر راضی کروں گا، جیسا کہ آپ نے مجھے اپنے جوابات سے خوش کیا ہے۔

(ب) اہل کوفہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مکالمہ

جب اہل کوفہ مقام ذی قار پر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اُن سے اُن کی آمد کا سبب پوچھا تو اُن میں اعور بن بُنان المنقری بھی موجود تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا میرا ذمہ اصلاح کرنا اور دشمنی کی آگ بُجھانا ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اُمت کو اجتماعیت پر قائم کردے اور جنگ برپا نہ ہو۔ اُس نے کہا: اگر وہ آپ کی بات نہ مانیں تو پھر؟ انھوں نے فرمایا: اگر وہ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم بھی انھیں چھوڑ دیں گے۔ اُس نے کہا: اگر وہ ہمیں نہ چھوڑیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اپنا دفاع کریں گے۔ اعور بن بنان نے پوچھا: اُن کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ کیا اُن کا کوئی حق بھی ہے؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں، ہے۔[1]

(ج) امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے سوال کرنے والوں میں ایک شخص ابوسلامہ الدالانی بھی ہے۔ اُس نے پوچھا: امیر المؤمنین! یہ لوگ جو خون کے بدلے کا مطالبہ کر رہے ہیں، اگر ان کا مطالبہ اللہ کی رضا کے لیے ہے تو کیا ان کے پاس کوئی دلیل بھی ہے؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جی ہاں، ہے۔ اُس نے کہا: بہت اچھا، کیا آپ کے پاس بھی تاخیر کی کوئی دلیل ہے؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں، اگر ایک چیز کا حصول ممکن نہ ہو تو اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ زیادہ محتاط پہلو اور عمومی طور پر لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش راستہ اختیار کیا جائے۔ اُس نے کہا: اگر آزمائش آہی جائے تو کل ہمارا اور اُن کا کیا حال ہوگا؟ امیر المؤمنین نے فرمایا: میں پُر امید ہوں کہ اگر ہم میں سے یا اُن میں سے کوئی صاف دل اور نیک نیت آدمی شہید ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اُسے یقیناً جنت میں داخل فرمائے گا۔[2]

(د) مالک بن حبیب نے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: اگر آپ کا ان لوگوں سے ٹکراؤ ہوجائے تو آپ کیا کریں گے؟ انھوں نے فرمایا: ہمارے اور اُن کے سامنے یہ بات

---

[1] البداية والنهاية: 250/7، وتاريخ الطبري: 529/5. [2] البداية والنهاية: 250/7.

واضح ہے کہ اصلاح کا راستہ دراصل اس ٹکراؤ سے گریز کا راستہ ہے۔ اگر وہ ہماری بیعت کرلیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر وہ بھی اور ہم بھی قتال کے سوا ہر بات کے انکاری ہوں تو یہ ایک ایسا شگاف ہے جو کبھی پُر نہیں ہوسکے گا۔ اُس نے پوچھا اگر ہم پر آزمائش آن پڑی تو ہمارے مقتولین کا کیا ہوگا؟ انھوں نے فرمایا: جس کے متعلق اللہ تعالیٰ چاہے گا اُس کے لیے یہ نفع بخش ہوجائے گا۔ اور اس کی نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔[1]

امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا اصل ہدف اصلاح تھا۔ وہ فتنے کو ختم کرنے کے متمنی تھے۔ ان کی تدابیر میں قتال نہیں تھا کیونکہ اگر یہ شروع ہوجائے تو یہ ایک ایسی بیماری ہے جس سے شفا کی کوئی امید نہیں۔ دونوں جانب سے جو بھی قتل ہوجائے وہ اپنی نیت کے ساتھ مرہون ہے، چاہے وہ امیر المؤمنین کا ساتھی ہو یا اُن کا مخالف، یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین نے فرمایا: شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جو لوگ گھروں سے نکل کھڑے ہوئے ہیں وہ اصلاح ہی چاہتے ہیں اور فتنے کو ختم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اُن کا اجر اُن کی نیتوں کے اخلاص اور دلوں کی صفائی کے مطابق ہوگا۔[2]

صلح کے لیے کوششیں

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ کی طرف اپنے لشکر کو متحرک کرنے سے پہلے چند روز ذی قار میں قیام کیا، اُن کا مقصد یہ تھا کہ امن کے ذرائع اختیار کرتے ہوئے اس فتنے کا خاتمہ کیا جائے اور انتہائی کوشش کرکے مسلمانوں کو باہم قتال کی برائی اور مسلح تصادم سے بچایا جائے۔ اُدھر طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے سامنے بھی یہی معاملات تھے۔ صلح کی کوششوں میں متعدد صحابہ کرام اور کبار تابعین میں سے وہ حضرات شریک ہوئے جو پہلے ان امور و معاملات سے بالکل علیحدہ تھے۔ اُن میں چند حضرات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

[1] تاریخ الطبري: 52/5، والإنصاف فيما وقع في تاريخ العصر الراشدي من خلاف، ص: 406.
[2] الإنصاف للدكتور حامد، ص: 406.

① عمران بن حصین رضی اللہ عنہ

انھوں نے متعدد پیغام بھی بھیجے جو لوگوں کو دونوں فریقوں سے الگ ہونے پر آمادہ کرتے تھے۔ پھر بنی عدی قبیلہ کے لوگوں کی طرف سے جن کی بڑی اکثریت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دے رہی تھی، ایک ایلچی بھیجا۔ اُس نے مسجد میں آکر کہا: صحابی رسول حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے مجھے آپ کی طرف خیر خواہی کے پیغام کے ساتھ بھیجا ہے۔ وہ معبود حقیقی کی قسم اُٹھا کر کہہ رہے تھے کہ مجھے ایک کان کٹے حبشی غلام کی طرح موت آجائے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چرا رہا ہو، تو مجھے یہ حالت اُس صورتِ حال سے زیادہ پسند ہے کہ میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دیتے ہوئے تیر اندازی کروں۔ میرا تیر نشانے پر لگے یا خطا جائے۔ میرے ماں باپ تم پر قربان ہو جائیں تم سب قتال سے باز رہو۔ لوگوں نے جواب دیا: ہمیں اسی حالت میں چھوڑ دو، ہم رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی مدد کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں۔ [1]

② کعب بن سور رحمہ اللہ

یہ کبار تابعین میں سے ہیں، انھوں نے اس مقصد کے لیے پوری کوشش کی، اپنی استطاعت سے زیادہ تکلیف اٹھائی اور وہ کردار ادا کیا جو بہت سارے لوگ اجتماعی طور پر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ وہ صلح کی کوششوں میں لگے رہے حتی کہ یہ الم انگیز سانحہ پیش آگیا کہ وہ دونوں فریقوں کے مابین کھڑے ہو کر سب کو ہتھیار رکھ دینے اور کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کی نصیحت کر رہے تھے کہ اسی دوران شہید کر دیے گئے۔ [2]

③ القعقاع بن عمرو التمیمی رضی اللہ عنہ

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قعقاع بن عمرو التمیمی کو طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی جانب صلح کے

[1] الطبقات لابن سعد: 87/4، خلافة علي لعبد الحمید، ص: 148. [2] الطبقات لابن سعد: 92/7. دونوں سندوں سے یہ صحیح روایت ہے، و خلافة علي لعبد الحمید، ص: 149.

مشن پر روانہ کیا اور فرمایا: ان دونوں سے جا کر ملو، انھیں الفت و محبت اور اجتماعیت کی دعوت دو، اور افتراق و انتشار کی سنگینی کا احساس دلاؤ۔ قعقاع رضی اللہ عنہ بصرہ گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہنچے اور ان سے اس سلسلے کی ابتدا کی۔ انھوں نے عرض کیا: اماں جان! آپ یہاں کیوں تشریف لائی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: میں لوگوں کے مابین صلح اور اصلاح کی خاطر آئی ہوں۔ قعقاع رضی اللہ عنہ نے ان سے درخواست کی کہ آپ پیغام بھجوا کر طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو بلوالیں، میں آپ کی موجودگی میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ قعقاع رضی اللہ عنہ کی گفتگو

جب وہ دونوں آگئے تو قعقاع رضی اللہ عنہ نے اُن سے بصرہ میں آنے کا سبب پوچھا۔ انھوں نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح کہا کہ ہم لوگوں کے مابین اصلاح کی خاطر آئے ہیں۔ پھر اُنھوں نے پوچھا: آپ دونوں حضرات بتائیں کہ اصلاح کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ اللہ کی قسم! اگر آپ ہمیں اصلاح کی کوئی صورت بتائیں گے تو ہم اُسے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اُن دونوں حضرات نے قعقاع سے کہا: قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا جائے، اگر اُنھیں بغیر قصاص چھوڑ دیا گیا تو یہ بات قرآن کو چھوڑ دینے اور اللہ کے احکام کو معطل کر دینے کے مترادف ہوگی۔ اگر اُن سے قصاص لیا گیا تو یہ قرآن کو زندہ کرنا ہوگا۔ قعقاع رضی اللہ عنہ نے کہا: بصرہ میں چھ سو کی تعداد میں قاتلین عثمان موجود تھے، ان میں سے ایک کے سوا آپ نے سب کو قتل کر دیا ہے اور وہ ایک جو بچ گیا، وہ حرقوص بن زہیر السعدی تھا۔ جب وہ آپ کے پاس سے نکل بھاگا تو اپنی قوم بنی سعد کے ساتھ مل کر سرگرم عمل ہوگیا، جب آپ نے اس کی قوم کو اُسے آپ کے حوالے کرنے کے لیے کہا، اُس کی قوم نے اسے روک لیا اور چھ ہزار لوگوں نے آپ سے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کر لی۔ جب آپ نے حرقوص کو چھوڑ دیا اور اُسے قتل نہیں کیا تو اب جو کچھ آپ کہتے ہیں، جس چیز کا مطالبہ آپ علی رضی اللہ عنہ سے

کرتے ہیں اور جس بات کا آپ نعرہ لگاتے ہیں گویا آپ اُسی کی نفی کر رہے ہیں۔ اگر آپ حرقوص کی خاطر بنی سعد سے قتال کرتے ہیں اور وہ آپ کو شکست دے کر آپ پر غالب آجاتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے غلط اقدام کیا، اور اُنھیں تقویت دی اور وہ نتیجہ آپ کے سامنے آیا جو آپ کو پسند نہیں، مزید یہ کہ آپ نے حرقوص کا مطالبہ کر کے ربیعہ اور مضر قبیلوں کو بھی ناراض کر لیا ہے، وہ بنی سعد کی حمایت میں اکٹھے ہو کر آپ کے خلاف جنگ کریں گے اسی صورت حال کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سامنا ہے جبکہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود ہیں۔

قعقاع رضی اللہ عنہ کی نظر میں مسئلے کا حل

ام المؤمنین اور اُن کے ساتھی صحابہ قعقاع رضی اللہ عنہ کی گفتگو اور دلیل سے متاثر ہوئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اُن سے فرمایا: اے قعقاع! اب آپ ہی بتائیے، آپ کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ اس مسئلے کا حل قرار وسکون اور قاتلین عثمان کے بارے میں انتظار کی پالیسی ہے۔ جب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور اُمتِ اسلامیہ امیر المؤمنین پر متحد ہو جائے گی تو ان کے لیے قاتلین عثمان کی طرف توجہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ ایسا اُس وقت ہوگا جب آپ لوگ قاتلین عثمان کے حوالے سے معاملات میں امیر المؤمنین کی بیعت کر لیں اور ان کی پالیسی پر چلیں گے، اور اُن سے متفق ہوں گے تو یہ بات خیر وخوبی کی نشانی اور باعثِ رحمت خوش خبری ہوگی۔

اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اُن سے انتقام لینے کی قدرت حاصل ہو جائے گی۔ اگر آپ لوگ اس سے انکاری ہیں اور لڑائی پر مُصر ہیں تو یہ شر کی علامت ہوگی جو اس ملک کے نظام کا خاتمہ کر دے گی۔ آپ حضرات عافیت کو ترجیح دیں اور پہلے کی طرح خیر کے علمبردار بن جائیں، نہ ہمیں آزمائش میں ڈالیں نہ خود آزمائش میں پڑیں۔ اللہ کی قسم! میں

آپ کو خیر کی دعوت دے رہا ہوں اور ڈر بھی رہا ہوں کہ اگر معاملہ اس طرح طے نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ کی حجت اس اُمت پر پوری ہو جائے گی اور اُس پر مصائب ٹوٹ پڑیں گے، ابھی تک معاملہ کی جو نوعیت ہے، یہ بھی بہت بُری ہے لیکن یہ حال ایک آدمی کا دوسرے آدمی کو قتل کرنے، ایک گروہ کا کسی آدمی کو قتل کرنے اور ایک قبیلے کا دوسرے قبیلے کو قتل کرنے کی طرح سنگین نہیں ہے، لہٰذا آپ سچے اور مخلص قعقاع رضی اللہ عنہ کی بات مان لیں اور اُس کی طرف سے صلح کی دعوت قبول کر لیں۔ اُن سب نے قعقاع رضی اللہ عنہ سے کہا:

آپ نے بڑی اچھی اور صحیح گفتگو کی ہے، آپ واپس چلے جائیں، اب حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائیں اور اُن کی رائے بھی یہی ہو تو ان شاء اللہ یہ معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ قعقاع رضی اللہ عنہ مقام ذی قار پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس چلے گئے، وہ اپنے مشن میں کامیاب تھے۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساری بات سُنائی، اُنھیں بھی یہ ساری باتیں پسند آئیں۔ اب یہ لوگ باہم صلح کے قریب تھے، البتہ کسی نے یہ معاملہ پسند کیا اور کسی کو یہ صورت حال پسند نہیں آئی۔[1]

فریقین کے مابین اتفاق کے خوشگوار آثار

جب قعقاع رضی اللہ عنہ واپس آئے اور انھوں نے اپنی کارروائی بیان کر دی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا، زبیر رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کے پاس دو ایلچی بھیجے[2] تاکہ قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی کارروائی کی تصدیق ہو سکے۔ اُن دونوں ایلچیوں نے واپسی پر اس کی تصدیق کر دی، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہاں سے کوچ کیا اور اُن کے سامنے پہنچ کر پڑاؤ ڈالا، ہر قبیلے کے لوگ اپنے قبیلے کے سامنے اُترے، مضر، مضر کے سامنے، ربیعہ، ربیعہ کے سامنے اور یمنی، یمنیوں کے سامنے، اُنھیں صلح کے اقدامات میں کوئی شک نہیں تھا، وہ سب خاموش

[1] البداية والنهاية: 739/7، و تاريخ الطبري: 521/5. [2] تاريخ الطبري: 521/5.

تھے کچھ نہیں بول رہے تھے، ان کی نیت صلح کے سوا اور کچھ نہ تھی۔[1] امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے جب وہاں سے کوچ کا ارادہ کیا تو اپنے اہم فیصلے کا اعلان بھی کر دیا: اے لوگو! سنو! کل میں یہاں سے کوچ کرنے والا ہوں، اُن کی مراد بصرہ کی جانب جانے کی تھی۔ اُنھوں نے خبردار فرمایا کہ کل کوچ کرتے ہوئے ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص نہ آئے جس نے کسی بھی سطح پر شہادتِ عثمان میں کوئی مدد دی ہو۔[2]

قتال کی ابتدا
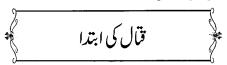
جنگ شروع کرنے میں سبائیوں کا کردار

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں وہ سرکش خوارج موجود تھے جو شہادت عثمان کا باعث بنے تھے مگر واضح طور پر اُن کی اور اُن کے قبیلے کی پہچان نہیں ہوسکی تھی، اُن کے خلاف کوئی دلیل اور حجت بھی قائم نہیں ہوسکی تھی، ان میں سے کچھ ایسے تھے جن کے دل میں نفاق تھا، جو ظاہر نہیں تھا۔ ابن سبا کے پیروکار فتنہ کی آگ بھڑکانے پر تُلے بیٹھے تھے تاکہ وہ قصاص سے چھوٹ جائیں۔[3]

جب لوگوں نے وہاں پڑاؤ ڈالا اور آرام کرنے لگے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ باہر نکلے، طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی آگئے۔ ان سب حضرات نے اختلافی امور میں کھل کر گفتگو کی اور باہم اس بات پر اتفاق کیا کہ جنگ ترک کرنے اور صلح اختیار کرنے سے زیادہ اچھی اور کوئی بات نہیں۔ خاص بات یہ تھی کہ بے یقینی کے بادل چھٹ رہے تھے۔ اسی اتفاق رائے پر جب یہ اکابر وہاں سے اُٹھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کی طرف چلے گئے اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اپنے لشکر کی طرف لوٹ گئے۔ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے سرکردہ ساتھیوں کو بُلا بھیجا، اُدھر

[1] تاریخ الطبري: 539/5. [2] تاریخ الطبري: 525/5. [3] تاریخ الطبري: 526/5، 527، وتحقیق مواقف الصحابة: 120/2.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے خصوصی مشیروں کو بُلا لیا۔ اُنھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنے والوں میں سے کسی کو بھی نہیں بلایا۔ لوگوں نے صلح و عافیت کی نیت کے ساتھ رات بسر کی، انھیں صلح کے معاملات میں اب کوئی شک نہ تھا لوگ ایک دوسرے کے قریب خیمہ زن تھے اور ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرر ہے تھے۔ صرف صلح ہی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ جبکہ اُدھر فتنہ بھڑکانے والوں نے رات گزاری، یہ لوگ ہلاکت و بربادی کے خوف سے ساری رات مشورہ کرتے رہے، اُن میں سے ایک آدمی بولا: طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو تو ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے معاملات واضح نہیں۔ انھوں نے لوگوں کو بصرہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا ہے اور قاتلین عثمان کو منع کر دیا ہے۔ اور دونوں گروہوں کی ہمارے بارے میں رائے ایک ہوگئی ہے۔ لہٰذا اب اگر وہ لوگ (طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کر لیتے ہیں تو ایسا ہماری لاشوں ہی پر ممکن ہوگا۔ [1]

ان کے مابین سیاہ عورت کا بیٹا عبداللہ بن سبا کھڑا ہوگیا اور وہی ان کا مشیر خاص تھا۔ وہ کہنے لگا: اے لوگو! تمھاری عزت اسی میں ہے کہ تم لوگوں کے اندر گھس کر گڈ مڈ ہو جاؤ اور کل جب لوگ آپس میں ملیں تو تم اچانک لڑائی شروع کر دو۔ انھیں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دو، اس طرح تم جن کا ساتھ دے رہے ہو، وہ خود بخود رُک جائیں گے۔ اُن سب کو اپنی پڑ جائے گی اور تم صاف بچ جاؤ گے۔ خوب دھیان سے بات سمجھو، لوگوں کے مابین اس طرح پھیل جاؤ کہ کسی کو کچھ پتہ ہی نہ چلے۔ [2] یوں انھوں نے خفیہ طور پر جنگ کے شعلے بھڑکانے کا مقصد پورا کرلیا۔ پھر وہ صبح سویرے منہ اندھیرے ہی نکل پڑے۔ اُن کے ہمسایوں کو بھی ان کی نقل و حرکت کا پتہ نہ چلا، اُن میں سے مضر، مضریوں کے سامنے ربیعہ، اپنے ربیعہ قبیلے کے سامنے اور یمانی، یمانیوں کے بالمقابل آ گئے اور تلوار چلانے لگے، یہ دیکھ کر اہل بصرہ بھڑک اُٹھے۔ حملہ آوروں کے مدمقابل لوگ نکل آئے۔ زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما

[1] تاريخ الطبري: 526/5. [2] تاريخ الطبري: 527/5.

نے کچھ ساتھیوں کو دائیں جانب میمنہ کی طرف مقرر کیا، وہ ربیعہ سے تھے اُن کی قیادت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے کی اور میسرہ کی قیادت عبدالرحمٰن بن عتاب بن اسید کر رہے تھے۔ وہ دونوں خود درمیان (قلب) میں ثابت قدم رہے انھوں نے پوچھا کہ یہ لڑائی کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا: اہل کوفہ نے ہم پر شب خون مارا ہے، ان دونوں حضرات نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خون بہا کر ہی دم لیں گے، لگتا ہے انھوں نے ہماری بات نہیں مانی، پھر وہ اہل بصرہ کو ساتھ لے کر آگے بڑھے اور اہل بصرہ نے اہل کوفہ کو واپس اُن کے معسکر میں پہنچا دیا۔[1] ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل کوفہ نے آوازیں سنیں۔ سبائیوں نے اپنے ایک آدمی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریب رکھا تاکہ وہ وہاں کے حالات کی خبر دے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آواز سنی تو پوچھا کہ یہ کیا ہوا ہے؟ اُس آدمی نے کہا: رات کو اچانک کچھ لوگوں نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ ہم نے اُنھیں پیچھے دھکیل دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میمنہ پر مقرر آدمی سے کہا کہ اپنی جگہ پہنچو اور میسرہ والے سے کہا کہ تم اپنی جگہ پہنچ جاؤ۔ البتہ سبائی جنگ شروع کرنے کے بعد پیچھے ہٹنے والے لوگ نہیں تھے۔[2]

جنگ کے ان ابتدائی حالات کے باوجود دونوں فریق انتظار کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی اس بات پر متفق تھے کہ اُس وقت تک جنگ کی ابتدا نہ کی جائے جب تک کوئی دلیل واضح ہو کر سامنے نہ آ جائے لیکن سبائی جنگ شروع کرنے سے پیچھے ہٹنے والے نہ تھے۔[3] دوسری جانب طلحہ رضی اللہ عنہ اپنی سواری پر سوار لوگوں کے مابین یہ پکار لگانے لگے: خاموش ہو جاؤ، چپ ہو جاؤ۔ جبکہ لوگ ان کے گرد ہجوم کیے ہوئے تھے اور خاموش ہو کر ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ انھوں نے فرمایا: ہائے! ہائے یہ جہنمی پتنگے اور لالچ و ہوس کی پروردہ مکھیاں۔ یہ آگ بھڑکانے اور فتنے جگانے والے لوگ، سبائیوں کے سوا کون ہو سکتے ہیں؟[4] جنگ کے آخری لمحوں تک صلح کی

---

[1] تاريخ الطبري: 541/5. [2] تاريخ الطبري: 541/5. [3] تاريخ الطبري: 541/5. [4] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 182.

کوششیں جاری رہیں۔ اس ساری صورتحال میں ابن سبا اور اُس کے مددگار سبائیوں کا جنگ میں کردار اور اُن کے اثرات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صلح وآشتی اور اتحاد واتفاق کے خوگر تھے، نصوص سے یہی ثابت ہوتا ہے اور مومنوں کے دل بھی اسی بات پر مطمئن تھے۔ [1]

جنگ کے مختلف حالات وواقعات پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جمل کے معرکہ میں سبائیوں کے اثرات وکردار پر تقریباً تمام علماء کا اتفاق ہے، چاہے آپ اُن کا نام فسادی رکھیں یا انھیں ان کے اصل نام سبائی کی معرفت سے پکاریں، یہی لوگ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل تھے اور جمل میں جنگ کی آگ انہی سفاک لوگوں نے بھڑکائی تھی۔ [2]

اب ہم آپ کی خدمت میں بعض ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جو مذکورہ گفتگو کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں:

(ا) عمر بن شبہ کی تالیف اخبار البصرہ میں ہے کہ جن لوگوں کو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کہا گیا وہ ڈرتے تھے مبادا دونوں فریق صلح کر کے اس بات پر اتفاق کرلیں کہ اُنھیں قتل کردیا جائے، لہٰذا اُنھوں نے جنگ کے شعلے بھڑکا دیے حتی کہ وہ کچھ ہوکر رہا جو اب تاریخ کا حصہ ہے۔ [3]

(ب) امام طحاوی کہتے ہیں: جمل کا فتنہ علی اور طلحہ رضی اللہ عنہما کی خواہش کے خلاف پھوٹ پڑا۔ ان دونوں بزرگوں کی رائے کے برعکس فسادیوں نے جنگ بھڑکا دی۔ [4]

(ج) باقلانی کہتے ہیں: صلح کی سب باتیں طے پا گئی تھیں۔ علی رضی اللہ عنہ اور فریق ثانی کے بزرگ بہت اچھے ماحول میں جُدا ہوئے۔ قاتلین عثمان کو ڈر تھا کہ اب انھیں دھر لیا جائے گا

---

[1] عبد اللّٰه بن سبا و أثره في أحداث الفتنة في صدر الإسلام، ص: 193,192. [2] عبداللّٰه بن سبا وأثره في أحداث الفتنة في صدر الإسلام، ص: 194. [3] فتح الباري: 13/56. [4] شرح العقيدة الطحاوية، ص: 546.

اور اُن کا گھیراؤ کرنے کی کوشش کی جائے گی، وہ چپکے سے اکٹھے ہوئے، باہم مشورہ کیا، شروع میں کچھ اختلاف ہوا، پھر اُنھوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ دو گروہوں میں بٹ جائیں۔ پھر دونوں فریقوں میں گھس کر گڈمڈ ہوجائیں، پھر اُن کی ایک ٹولی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کھڑے ہوکر پکارے کہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے غداری کی ہے (نعوذ باللہ) اور دوسری ٹولی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر میں کھڑی ہوکر پکارے کہ (نعوذ باللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غداری کی ہے، اُن کی تدبیر کا تیر نشانے پر بیٹھا اور جنگ شروع ہوگئی، دونوں فریق اپنا دفاع کرنے اور خون ریزی سے بچنے کے لیے کوشاں تھے۔ فریقین کے حوالے سے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ دونوں فریق اللہ کی اطاعت میں خون ریزی سے اجتناب کی کوشش کر رہے تھے۔ یہی صحیح اور مشہور بات ہے، ہماری بھی یہی رائے ہے۔[1]

(د) قاضی ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ کا کہنا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ بصرہ تشریف لے گئے تو فریقین باہم قریب ہوئے اور سوچ بچار کرنے لگے: لیکن خواہشات کے پجاریوں نے اُنھیں کچھ نہ کرنے دیا، اور وہ خون بہانے پر اتر آئے۔ جنگ چھڑ گئی، سبائیوں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تاکہ قاتلین عثمان پر پردہ پڑا رہے، لشکر میں ایک آدمی بھی اپنی سازشی تدبیر سے فساد برپا کرسکتا ہے، کجا یہ کہ یہاں ایک ہزار سے زیادہ فتنہ پرور لوگ سبائیوں کی شکل میں موجود تھے۔[2]

ڈاکٹر سلیمان بن حمد العودہ کہتے ہیں: طبری کی روایت جمل کے واقعہ میں سبائیوں کا کردار صراحت سے بیان کرتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان فسادیوں کا سبائیوں سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا تب بھی اس قسم کے مواقع پر سبائیوں جیسے سازشی لوگ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

---

[1] التمہید، ص: 233. [2] العواصم من القواصم، ص: 157,156.

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس قسم کے حوادث میں فتنہ جو قسم کے لوگ اپنا حصہ ضرور ڈالتے ہیں اور اس قسم کے فتنوں میں بعض اوقات حقیقی صورتِ حال پر پردہ پڑ جاتا ہے۔[1]

دور نہ جایئے، یہ احنف بن قیس ہیں۔ وہ جمل کے واقعات میں شریکِ حال رہے، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت کا ارادہ کرتے تھے، اسی مقصد کے لیے وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، راستے میں ابوبکرہ[2] سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے پوچھا: احنف کہاں جا رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی کی نُصرت کا ارادہ رکھتا ہوں، انھوں نے کہا: احنف! واپس چلے جاؤ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

> ''جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے کے مد مقابل آ جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔'' عرض کیا گیا: قاتل کی بات تو ٹھیک ہے، مقتول کا کیا معاملہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک وہ اپنے مقابل کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔''[3]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں اُن کے ساتھ مل کر قتال کرنا برحق اور صحیح ہے، اس راہ میں جو شہید ہوئے، ان کے لیے دُہرا اجر ہے لیکن ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کو بغیر سیاق وسباق محمول کیا ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو باغیوں کے خلاف لڑائی کی۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخالفین کے بالمقابل جنگ میں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس کی مثال مذکورہ فتوے جیسے فتاویٰ ہیں جو سیاق وسباق سے ہٹ کر دیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی بنیاد ورع اور تقوی تھا۔[4]

---

[1] عبداللّٰه بن سبا للعودة، ص:195، 196. [2] اہل طائف میں سے فاضل صحابی ہیں، جمل اور صفین میں فتنے سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ ان کا نام نفیع بن حارث یا نفیع بن مسروح ہے۔ اپنی کنیت ابوبکرہ سے مشہور ہیں۔ بکرہ عربی زبان میں چرخی کو کہتے ہیں۔ چونکہ جنگ طائف میں ایک چرخی کے ذریعے سے قلعے سے اتر کر مسلمانوں سے آملے تھے، اس لیے ان کی کنیت ابوبکرہ مشہور ہوگئی۔ [3] صحيح مسلم، حديث: 2888.

[4] الأساس في السنة و فقهها، و السيرة النبوية: 1711/4.

احنف بن قیس، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جانے سے باز آ گئے اور جمل میں کسی بھی فریق کی حمایت میں شریک نہیں ہوئے۔[1] آیئے اس مسئلے کو ذرا باریک بینی سے دیکھتے ہیں، زبیر رضی اللہ عنہ اس معرکے کے ایک باقاعدہ فریق تھے وہ اس معاملے کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ وہی فتنہ ہے جسے ہم بیان کیا کرتے تھے، اُن کے غلام نے اُن سے کہا: آپ اسے فتنہ کہتے ہیں، پھر اس میں قتال بھی کر رہے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے فرمایا: تیرا بھلا ہو۔ ہم معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہمیں یہ معاملہ سلجھتا دکھائی نہیں دیتا۔ جب بھی کوئی معاملہ درپیش ہوا مجھے خوب معلوم ہوتا تھا کہ میرے دونوں پاؤں کہاں پڑ رہے ہیں لیکن اس معاملے میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں پیش قدمی کروں یا پیچھے ہٹ جاؤں۔[2]

طلحہ رضی اللہ عنہ اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہم مخالفین کے بالمقابل نہایت متحد تھے کہ اچانک ہم لوہے کے دو پہاڑ بن گئے ہر ایک دوسرے کا دشمن بن گیا۔[3]

دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی بھی مُصِر ہیں کہ یہ ایک فتنہ تھا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کوفہ میں خروج عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرماتے تھے: وہ دنیا اور آخرت میں تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ ہیں لیکن یہ تمھاری ابتلاء کی ایک شکل تھی۔[4]

جنگ جمل

سبائیوں نے دونوں لشکروں سے لڑائی شروع کرنے کے لیے اپنی کوششوں میں اضافہ کر دیا، وہ ہر فریق کو اُس کے مخالف کے بالمقابل لڑائی کے لیے برانگیختہ کر رہے تھے، معرکہ شدید تر ہوتا چلا گیا، اسے جمل کے نام سے موسوم کیا گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس جنگ کے دوسرے مرحلے میں بصرہ کے لشکر کے بیچ میں اس اونٹ

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي: 18/10. [2] تاريخ الطبري: 506/5. [3] تاريخ الطبري: 506/5.
[4] تاريخ الطبري: 516/5.

پر سوار تھیں جو یعلی بن اُمیہ نے اُنھیں مکہ میں پیش کیا تھا، اسے اُنھوں نے یمن سے خریدا تھا۔ مکہ سے بصرہ تک وہ اسی اونٹ پر سوار ہو کر آئی تھیں، پھر جنگ کے دوران اس پر سوار ہوگئیں۔ اس جنگ کا واقعہ بروز جمعہ سولہ جمادی الثانیہ سن چھتیس ہجری کو بصرہ کے قریب ''زابوقہ'' نامی علاقے میں پیش آیا، جو کچھ بھی ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ اُس پر سخت غم زدہ تھے۔ اُن کی طرف سے ایک مُنادی نے کہا: اے لوگو! لڑائی سے رُک جاؤ لیکن کسی نے بھی اُس کی پکار نہیں سُنی، ہر شخص اپنے مدّ مقابل کے خلاف قتال میں مشغول رہا۔ [1]

جمل کا معرکہ دو مرحلوں میں ہوا

پہلا مرحلہ: بصرہ کے لشکر کی قیادت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کر رہے تھے۔ لڑائی فجر کے بعد سے دو پہر تک جاری رہی۔ [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر میں اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اپنے حامیوں کو پکار پکار کر یہ کہہ رہے تھے کہ جو شخص پیٹھ دکھا کر واپس جا رہا ہو اُسے قتل نہ کرو، کسی زخمی کو موت سے ہمکنار نہ کرو اور جو شخص جنگ کو چھوڑ کر باہر جا رہا ہو اُس کا پیچھا نہ کرو۔ [3]

زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو اپنے ذمے قرض ادا کرنے کی وصیت کی اور فرمایا: آج ظالم قتل ہوگا یا مظلوم اور میرا خیال ہے کہ میں مظلومیت کی حالت میں قتل کر دیا جاؤں گا لیکن مجھے زیادہ فکر اپنے ذمے قرض کی ادائیگی کی ہے۔ [4] اسی دوران ایک آدمی زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف آیا اور کہنے لگا: کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں اُن کے لشکر میں گھس جاؤں گا اور جونہی انھیں بے دھیان پاؤں گا ...... اُنھیں شہید کر دوں گا۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے اُسے سختی سے منع کیا اور فرمایا: ایمان نے دھوکے سے قتل کرنے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ لہٰذا کسی مومن کو دھوکے سے اس کی بے دھیانی میں قتل کرنا جائز نہیں۔ [5]

---

[1] تاريخ الطبري: 541/5. [2] تاريخ الطبري: 541/5-543، والخلفاء الراشدون للخالدي، ص: 245.

[3] تاريخ الطبري: 541/5. [4] مصنف بن أبي شيبة: 279/15، والطبقات: 108/3، اس کی سند صحیح ہے۔

[5] سنن أبي داود، حديث: 2769، و مسند أحمد: 167/1، محقق احمد شاکر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو کیا وہ کسی بھی ایسے شخص کو قتل کرنے کے ہرگز روادار نہ تھے جو خونِ عثمان سے بری تھا۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بلایا، اُن سے بڑے مشفقانہ لہجے اور بڑے خوشگوار ماحول میں بات کی اور کہا جاتا ہے کہ اُنھیں وہ حدیث یاد دلائی جو انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ تم علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی کروگے اور تم اس وقت ظالم ہوگے۔ [1] اس حدیث کی سند صحیح نہیں ہے۔ [2] اور بعض روایات میں زبیر رضی اللہ عنہ کے معرکے سے پیچھے ہٹ جانے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ معرکے سے کچھ دیر پہلے اُنھیں معلوم ہوا کہ مخالف سمت میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔'' [3] یہ حدیث انھوں نے خود براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سُنی ہو، مگر اس حدیث کی شہرت کے سبب صحابہ میں سے کسی اور سے سُنی ہوگی۔ [4] بعض روایات میں اُن کے جنگ سے پیچھے ہٹنے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس فتنے میں انھیں، جیسا کہ خود اُنھوں نے اسے فتنے سے موسوم کیا ہے، اپنے موقف کی صحت پر شک ہوگیا تھا۔ [5]

ایک اور روایت میں اُن کے پیچھے ہٹنے کی وجہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اُن کی گہری رشتہ داری اور قرابت بتائی گئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے انھیں کہا کہ آپ اپنے ماموں زاد بھائی اور عبدالمطلب کے پوتے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کیسے لڑیں گے؟ [6] یہ سُن کر زبیر رضی اللہ عنہ معرکے سے باہر نکل گئے، انھیں راستے میں جرموز ملا، اس شخص نے اُنھیں شہید کر ڈالا۔ [7] اس کی تفصیل ان شاء اللہ عنقریب آئے گی۔

---

[1] استشهاد عثمان ووقعة الجمل، ص: 201، مؤلف نے اس حدیث کے مختلف طرق کی تخریج کرنے کے بعد اس پر ضعیف حدیث کا حکم لگایا ہے۔ [2] المدينة النبوية فجر الإسلام: 328/2، و المطالب العلية، حديث: 4468. [3] صحيح البخاري، حديث: 447، و مسند أحمد: 90/3، 91 احمد شاکر کی تحقیق کے مطابق اس کی سند صحیح ہے۔ [4] خلافة علي بن أبي طالب، ص: 154. [5] خلافة علي بن أبي طالب، ص: 154، وتاريخ الطبري: 506/5. [6] الطبقات: 110/3، اس کی سند صحیح ہے، وخلافة علي بن أبي طالب، ص: 155. [7] الطبقات: 110/3، و تاريخ خليفة بن خياط، ص: 186.

زبیر رضی اللہ عنہ اپنے اصل مقصد اور ہدف اصلاح پر قائم رہے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اصلاح کی جگہ ''سلاح'' (اسلحہ) نے لے لی ہے تو وہ واپس چلے گئے اور لڑائی سے اجتناب کیا۔ یہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول ''کیا آپ اپنی تلوار اُٹھا کر علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑیں گے؟'' اس میں سے کچھ محذوف ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کیا آپ اصلاح اور اجتماعیت کے قیام کے لیے آئے ہیں یا مرنے مارنے کے لیے؟[1] اس گفتگو کے بعد زبیر رضی اللہ عنہ نے میدانِ جنگ چھوڑ دیا، البتہ لشکرِ بصرہ کے دوسرے قائد طلحہ بن عُبید اللہ رضی اللہ عنہ معرکے کے شروع ہی میں نامعلوم جگہ سے آنے والے تیر کا شکار ہوگئے، اُن کا بہت زیادہ خون بہہ گیا۔ لوگوں نے کہا: اے ابومحمد! آپ زخمی ہیں۔ گھر چلے جائیے تاکہ آپ کا علاج کیا جاسکے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام سے کہا: مجھے یہاں سے اُٹھا کر کسی مناسب جگہ لے چلو۔ انھیں بصرہ لے جایا گیا اور ایک گھر میں اُن کا علاج شروع کیا گیا، لیکن اُن کے زخم سے خون بہنا بند نہیں ہوا۔ وہ اس زخم سے جانبر نہ ہوسکے۔ اسی گھر میں وفات پا گئے اور پھر اُنھیں بصرہ میں دفن کیا گیا۔[2]

وہ روایت جس میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی طرف سے قتال کی ترغیب کا اشارہ ملتا ہے، پھر جب انھوں نے اہل بصرہ کی شکست محسوس کی تو وہ معرکہ چھوڑ کر چلے گئے، وہ روایت صحیح نہیں ہے۔[3] صحابہ کے عادل ہونے کے بارے میں جو کچھ ثابت ہے، یہ روایت اس کے منافی ہے۔

مزید برآں یہ کہ یہ اُن صحیح روایات کے بھی برخلاف ہے جن میں واضح طور پر کہا گیا کہ اصحابِ جمل فقط اصلاح کی خاطر نکلے تھے۔ لہٰذا زبیر رضی اللہ عنہ سے اس بات کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے؟ جبکہ مکہ سے بصرہ کی طرف روانگی کے وقت ہی ان کا مقصود لوگوں کے مابین اصلاح کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور آخری لمحے تک ان کا موقف یہی رہا۔ امام حاکم نے

---

[1] المدينة النبوية فجر الإسلام: 248/2. [2] البداية والنهاية: 253/7. [3] تاريخ الطبري: 540/5.

ابو حرب بن ابی الاسود الدیلی کی سند کے ساتھ یہی بات بیان کی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ نے انتہائی کوشش کی لیکن اس کے باوجود اختلافات قائم رہے اور جنگ شروع ہوگئی، آخر کار زبیر رضی اللہ عنہ قتال کو چھوڑ کر چلے گئے۔ [1]

اسی طرح طلحہ رضی اللہ عنہ بھی اصلاح ہی کے لیے آئے تھے اور ان کی شہادت بھی قتال کے ابتدائی مرحلہ ہی میں ہوگئی تھی جیسا کہ احنف بن قیس نے بیان کیا ہے۔ [2]

زبیر رضی اللہ عنہ کے میدان جنگ سے چلے جانے، طلحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اور دونوں جانب سے مرنے والوں اور زخمیوں کے گر جانے کے ساتھ جنگ جمل کا پہلا مرحلہ ختم ہوا، اس میں غلبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کو ملا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ کے حالات و واقعات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دونوں طرف کے مقتولین اور زخمیوں کا جائزہ لے رہے تھے اور اپنے شدید رنج و غم کا اظہار بھی فرما رہے تھے۔ علی رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اُنھیں اپنے سینے سے لگایا اور رونے لگے، وہ فرما رہے تھے: میرے بیٹے! کاش تمھارے والد آج سے بیس برس پہلے وفات پا چکے ہوتے۔ حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: ابا حضور! میں نے تو آپ کو پہلے ہی اس سے منع کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ معاملہ اس حد تک پہنچے گا آج کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔ بھلا اب کس خیر کی اُمید رکھی جائے؟ [3]

دوسرا مرحلہ

قتال سے متعلق تمام خبریں اُم المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچیں وہ اپنے اونٹ پر باہر نکل کر کھڑی ہوگئیں۔ ازدی قبائل نے آپ کو گھیر رکھا تھا۔ آپ کے ساتھ کعب رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کے ہاتھ میں آپ نے قرآن پاک کا ایک نسخہ دیا تھا تاکہ وہ لوگوں کو جنگ بندی کی دعوت دیں۔ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا آگے بڑھیں۔ سیدہ پُر امید تھیں کہ لوگ ان کے مقام و مرتبہ

[1] المستدرك: 366/3، و استشهاد عثمان، ص: 200. [2] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 185، و استشهاد عثمان، ص: 202. [3] البداية والنهاية: 521/7.

کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی بات سنیں گے، اور شعلہ زن ہونے والا یہ فتنہ بجھ جائے گا۔[1] کعب بن سور قرآن پاک کا نسخہ لیے ہوئے لشکرِ بصرہ کی طرف آگے بڑھے، انھوں نے لشکرِ علی رضی اللہ عنہ کو آواز دی اور کہا: اے لوگو! میں بصرہ کا قاضی کعب بن سور ہوں۔ میں تمھیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ اُس پر عمل کرو، اُس کی بنیاد پر باہم صلح کرلو۔ لشکرِ علی رضی اللہ عنہ میں وہ سبائی جو آگے آگے تھے اُنھیں خطرہ محسوس ہوا مبادا کعب کی کوشش کامیاب ہوجائے، انھوں نے فوراً ان پر تیروں کی اس قدر بوچھاڑ کی کہ وہ فوراً اللہ کو پیارے ہوگئے، حالت یہ تھی کہ قرآن پاک کا نسخہ اُن کے ہاتھ میں تھا۔[2] سبائیوں کی طرف سے آنے والے تیر عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ اور کجاوے کو بھی لگے۔ وہ پکارنے لگیں: میرے بیٹو! اللہ سے ڈرو، اللہ کو یاد رکھو، یوم حساب کو ہرگز نہ بھولو، لڑائی سے رُک جاؤ۔ یہ مقدس صدا بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ سبائی لڑنے سے باز نہیں آئے۔ وہ لشکرِ بصرہ پر مسلسل حملے کرتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیچھے موجود تھے وہ بھی جنگ سے باز رہنے اور بصریوں پر حملہ نہ کرنے کی تلقین کررہے تھے لیکن سبائی آگے آگے تھے وہ نہیں مانے اور آگے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ وہ لوگ اُن کی بات نہیں مان رہے اور کعب بن سور کا قتل بھی اُن کے سامنے ہوا تھا تو وہ فرمانے لگیں: اے لوگو! قاتلین عثمان اور اُن کے گروہ پر لعنت بھیجو۔ پھر وہ قاتلین عثمان کو بددُعائیں دینے لگیں، اور انھیں لعنت ملامت کرنے لگیں، پھر تمام اہل بصرہ بیک آواز بہت بلند آہنگی سے قاتلین عثمان اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف بددُعا کرنے لگے۔ لشکر بصرہ کی طرف سے یہ بلند آواز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی سُنی۔ انھوں نے پوچھا: یہ کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان کے خلاف بددُعا کررہی ہیں اور لوگ ان کے ساتھ ہم آواز ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! تم بھی میرے ساتھ قاتلین عثمان کے لیے بددُعا کرو،

[1] مصنف عبدالرزاق: 456/5، امام زہری تک اس کی سند صحیح ہے۔ [2] البداية والنهاية: 253/7.

اُن پر لعنت بھیجو، پھر لشکرِ علی رضی اللہ عنہ میں بھی لعنت اور بد دعا کے یہ الفاظ گونج اُٹھے۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ! قاتلین عثمان میدانوں میں ہوں یا چٹانوں میں ان پر لعنت نازل فرما![2] اس کے نتیجے میں لڑائی میں شدت پیدا ہوگئی اور جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے، نیزوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ پھر لوگ تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مد مقابل آگئے، پہلے نیزے ٹوٹے، پھر تلواریں چٹخنے لگیں۔[3] اور لوگ ایک دوسرے کے بالکل رُو برُو آگئے۔[4]

اب سبائیوں نے اپنی تمام تر کوششوں کا رُخ اونٹ کی کونچیں کاٹنے اور ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کو شہید کرنے کی طرف پھیر دیا۔ لشکر بصرہ نے تیزی سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے اونٹ کی حفاظت کا بندوبست کیا، وہ اونٹ کے آگے ڈھال بن کر لڑتے رہے، جو بھی اونٹ کی نکیل پکڑتا تھا قتل کر دیا جاتا تھا۔ اونٹ کے بالکل آگے جنگ میں بڑی شدت آگئی، ہودہ کی شکل مسخ ہوگئی، کیونکہ اس پر مسلسل تیر برسائے جارہے تھے جو اس میں پیوست ہوگئے تھے۔[5] اونٹ کے ارد گرد ازد، بنی ضبہ اور قریشی قبائل کے بہت سے نوجوان شجاعت کے جوہر دکھانے کے بعد شہید ہوگئے۔[6] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس امر پر شدید حیرانی اور پریشانی ہوئی کہ وہ ہرگز جنگ نہیں چاہتیں اور یہ سب کچھ اُن کی خواہش کے خلاف ہورہا ہے۔

وہ لڑائی ختم کرنے کی تاکید کررہی تھیں مگر کوئی ان کی بات سننے والا تھا نہ ماننے والا، جو بھی اُن کے اونٹ کی نکیل پکڑتا تھا مارا جاتا تھا۔

محمد بن طلحہ (السجاد) آئے اور اونٹ کی نکیل تھام کر اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا سے کہا: اماں جان! آپ کیا حکم دیتی ہیں؟ انھوں نے فرمایا: تم آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے اچھے بیٹے کی

[1] البداية والنهاية: 253/7. [2] مصنف بن أبي شيبة: 268/15. اس کی سند صحیح ہے، و سنن سعيد بن منصور: 236/2. اس کی سند بھی صحیح ہے۔ [3] مصنف بن أبي شيبة: 258/15، اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ [4] الطبقات: 92/5، اس کی سند حسن ہے۔ [5] البداية والنهاية: 253/7. [6] البداية والنهاية: 254/7.

طرح بن جاؤ۔ یعنی اپنا ہاتھ روکے رکھو۔ انھوں نے تلوار کو سونت لینے کے بعد اُسے میان میں ڈالا اور پھر شہید کر دیے گئے، اللہ ان پر رحم فرمائے۔[1] وہاں عبدالرحمٰن بن عتاب بن اسید بھی اُس وقت شہید کر دیے گئے جب انھوں نے اشتر کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہوا یہ کہ انھوں نے اس سے کشتی کی۔ دونوں اکٹھے زمین پر گر پڑے۔ ابن عتاب نے اردگرد کے لوگوں سے کہا کہ مجھے اور مالک کو قتل کر دو،[2] اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں آخرالذکر کے خلاف شدید غصہ تھا، کیونکہ اُس نے قاتلین عثمان کو بھڑکانے میں بڑا کردار ادا کیا تھا، لیکن اشتر مالک کے نام سے مشہور نہیں تھا اور اُس کی موت کا وقت بھی نہیں آیا تھا، اگر وہ اشتر کا نام لیتے تو بیک وقت بہت ساری تلواریں اس پر چمکتیں اور اس کا خاتمہ کر دیتیں۔[3]

البتہ زبیر رضی اللہ عنہ نے ایسی لڑائی لڑی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی گویا اُنھوں نے اپنے آپ کو تلواروں کی چھاؤں میں پھینک دیا، جب مقتولین میں انھیں اُٹھایا گیا تو اُن کے جسم پر چالیس سے زیادہ زخم پائے گئے ان میں شدید ترین زخم وہ تھا جو اشتر نے اپنی تلوار کی ضرب سے لگایا تھا۔ اُس کے دل میں زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف شدید کینے کا زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اس نے بیٹھے ہوئے وار کرنا کافی نہ سمجھا حتی کہ رکاب میں کھڑے ہو کر اس نے زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اُسے یہ یقین ہو گیا کہ زبیر رضی اللہ عنہ کا کام تمام ہو گیا ہے۔[4]

بنی عدی، بنی ضبہ اور ازد قبیلوں میں بھی بہت قتل ہوئے۔ بنو ضبہ نے بہادری کے جوہر دکھائے، ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے لیے اپنی فدا کاری کا ثبوت دیا۔[5]

---

[1] نسب قریش، ص: 281، و التاريخ الصغير للبخاري: 110/1، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] مصنف بن أبي شيبة: 228/15، اس کی سند صحیح ہے، و مرويات أبي مخنف، ص: 268. [3] خلافة علي بن أبي طالب، لعبد الحميد، ص: 159. [4] مصنف بن أبي شيبة: 228/15. ابن حجر نے فتح الباری میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے: 58,57/13. [5] تاريخ خليفة، ص: 190، سند حسن ہے، وخلافة علي لعبد الحميد، ص: 159.

امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے اپنی بصیرت، بے مثل عسکری مہارت سے اِس بات کا ادراک کرلیا کہ جمل کی جنگ جاری رکھنا لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہے اور جب تک عائشہ رضی اللہ عنہا میدان میں رہیں گی اصحابِ جمل شکست تسلیم کریں گے نہ جنگ سے پیچھے ہٹیں گے، پھر یہاں موجود رہنے میں خود عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کو بھی خطرہ ہے، وہ ہودہ جس میں وہ بیٹھی ہیں، تیروں کی کثرت کے باعث چھلنی ہو گیا تھا۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کے چند افراد کو، جن میں اُم المؤمنین کے بھائی محمد بن ابی بکر اور عبداللہ بن بدیل شامل تھے، حکم دیا کہ اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں اور عائشہ رضی اللہ عنہا کو اُن کے ہَودہ سے نکال کر نیچے لے آئیں۔[2] اُن کے بھائی محمد بن ابی بکر اور عبداللہ بن بدیل نے ہودہ اُٹھایا اور آرام سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھ دیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو عبداللہ بن بدیل کے گھر لے جایا گیا۔[3] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عسکری تدبیر (ذہانت) صحیح ثابت ہوئی۔ جونہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو میدان جنگ سے نکالا گیا، لشکرِ بصرہ واپس چلا گیا۔ وہ سبب ختم کر دیا گیا جس کی بنیاد پر بصری، پورے حوصلے اور ولولے کے ساتھ موت کو گلے لگا رہے تھے۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ اقدامات نہ کرتے تو جنگ جاری رہتی یوں سارا لشکرِ بصرہ ختم ہو جاتا یا لشکرِ علی رضی اللہ عنہ شکست کھا جاتا۔

جب لشکر بصرہ کی شکست کے آثار نظر آنے لگے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یا ان کے لشکر کے مُنادی نے ببانگِ دہل پکار کر کہا: جو میدان جنگ سے چلا جائے اُس کا پیچھا نہ کرو، کسی زخمی کو موت کے گھاٹ نہ اُتارو۔ کسی چیز کو غنیمت کی نگاہ سے نہ دیکھو سوائے اس سامان یا اسلحہ کے جو میدان میں ہے یا لشکر کے مقام پر اُٹھا کر لایا جائے۔ اپنے اہل لشکر کو منع کیا کہ کسی کے گھر میں داخل نہ ہوں، صرف یہی نہیں بلکہ اہل بصرہ میں جو اُن کے خلاف برسرِ

---

[1] أنساب الأشراف للبلاذري: 43/2، اس کی سند متصل ہے۔ [2] أعلام الحديث للخطابي: 1611/3.

[3] مصنف بن أبي شيبه: 287،286/15. اس کی سند جید ہے، و فتح الباري: 57/13.

جنگ تھے اُنھیں جا کر کہا کہ تمھاری کوئی چیز اگر ہمارے لشکر میں سے کسی کے پاس ہو تو وہ واپس لے لی جائے۔ یہ سن کر ایک آدمی لشکرِ علی رضی اللہ عنہ کی طرف آیا، یہاں کچھ لشکری ایک ہنڈیا میں گوشت پکا رہے تھے، آنے والے آدمی نے اُن سے وہ ہنڈیا واپس لے لی اور گوشت نیچے گرا دیا، یہ بات اُن کے غضبناک ہونے کی نشانی تھی۔[1]

مقتولین کی تعداد

اس جنگ میں مقتولین کی تعداد کے بارے میں مختلف اندازوں پر مبنی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ مسعودی نے اس اختلاف کی وجہ راویوں کی خواہشات بتائی ہے۔[2] قتادہ کہتے ہیں: جمل کے مقتولین کی تعداد بیس ہزار ہے۔[3] لگتا ہے، اس میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، کیونکہ دونوں لشکروں کی مجموعی تعداد اتنی ہی یا اس سے کچھ کم ہوگی۔

ابومخنف رافضی شیعی نے بھی اپنے میلان کے مطابق بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا ہے، یوں اُس نے ایک غلط کام کیا ہے۔ اس نے اپنے زعم میں یہ بڑا صحیح کام کیا کہ یہ بیان کر دیا کہ صرف اہلِ بصرہ کی تعداد بیس ہزار تھی۔[4] سیف نے مقتولین کی تعداد دس ہزار بیان کی ہے۔ جن میں سے نصف لشکر علی رضی اللہ عنہ سے اور نصف لشکر عائشہ رضی اللہ عنہا سے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق (سیف کا) یہ کہنا ہے: کہتے ہیں کہ اُن کی تعداد پندرہ ہزار تھی، پانچ ہزار اہل کوفہ سے اور دس ہزار اہل بصرہ سے یعنی اُن میں سے نصف پہلے معرکے میں اور باقی آدھے دوسرے مرحلے کی جنگ میں قتل ہوئے۔[5] یہ دونوں روایتیں منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہیں اور اِن میں بھی مبالغہ نظر آتا ہے۔ عمر بن شبہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ مقتولین چھ ہزار سے زائد تھے لیکن یہ روایت انتہائی ضعیف ہے۔[6] یعقوبی

---

[1] مصنف بن أبي شيبة: 287,286/15، اس کی سند جید ہے، و فتح الباري: 57/13. [2] مروج الذهب: 367/2. [3] مروج الذهب: 367/2. [4] تاریخ خليفة بن خياط، ص: 186، اس کی سند مرسل ہے۔
[5] تاريخ الطبري: 542/5-555. [6] تاریخ خليفة بن خياط، ص: 186، اس کی سند منقطع اور وہ قتادہ تک حسن سند کے ساتھ ہے۔

نے تو ان سب کی حدیں پھلانگتے ہوئے مقتولین کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ بتائی ہے۔[1]
مذکورہ تمام قسم کی گنتیاں غلط اور انتہائی مبالغہ آمیز ہیں۔
یہ مبالغہ آرائی کیوں کی گئی؟ اس کے اسباب یہ ہیں:
(ا) وہ اُمّت اسلامیہ، جس کے دل میں صحابہ کی محبت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے جذبات موجزن ہیں، صحابہ کے دشمن سبائیوں اور اُن کے متبعین کی طرف سے اس امت کے مابین اختلافات کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
(ب) بعض شاعروں اور قبائل کے بعض جاہلوں کی طرف سے واقعات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، جس میں اپنے بعض لیڈروں اور شہ سواروں کی بہادری کو شاعری میں ڈھال کر مبالغہ آرائی کا رویہ اختیار کیا گیا، مزید برآں قصہ گوئی کے شوقین اپنی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے مقتولین کو زیادہ تعداد میں پیش کرتے ہیں۔
(ج) سبائیوں اور فسادیوں کے متبعین کے دلوں میں یہ خود اعتمادی پیدا کرنا کہ اُن کی پالیسیاں اور منصوبے کامیابی سے جاری ہیں۔[2]
جنگ جمل کے مقتولین کی حقیقی تعداد کیا تھی؟ وہ درج ذیل اسباب کے باعث بہت کم تھی:
① لڑائی کی مدّت بہت مختصر تھی۔ ابن ابی شیبہ نے صحیح سند[3] کے ساتھ روایت کیا ہے کہ لڑائی ظہر کے بعد شروع ہوئی اور سورج غروب ہونے کے وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا۔
② لڑائی کی نوعیت دفاعی رہی، یعنی ہر فریق صرف اپنا دفاع کر رہا تھا۔
③ دونوں فریق لڑائی سے گریزاں تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کا خون بہانے کی حرمت اور سنگینی سے صحیح طور پر واقف تھے۔

[1] مصنف بن أبی شیبة: 546/7، وفتح الباري: 62/13. [2] الإنصاف، ص: 455. [3] مصنف بن أبي شیبة: 546/7، و فتح الباري: 62/13.

④ اگر یرموک اور قادسیہ کے معرکوں میں مسلمان شہداء کی تعداد دیکھی جائے تو وہ بالترتیب تین ہزار اور ساڑھے آٹھ ہزار شہید تھے۔ اور یہ معرکے کئی روز تک جاری رہے تھے، لہٰذا اُن کے مقابلہ میں جمل کی جنگ کے مقتولین کی تعداد بہت کم ہونی چاہیے۔ اور خصوصاً جبکہ اول الذکر معرکے اپنی شدت کے باعث امتوں کی تاریخ میں فیصلہ کُن معرکے تھے۔

⑤ خلیفہ بن خیاط نے جمل کے مقتولین میں سے جن کے نام محفوظ ہو سکے ہیں اُن کی تعداد تقریباً ایک سو بیان کی ہے۔[1] اگر ہم فرض کر لیں کہ اُن کی تعداد ایک سو نہیں دو سو تھی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن کی تعداد دو سو سے زائد نہیں تھی۔ ڈاکٹر خالد بن محمد الغیث نے اپنے رسالے ''استشهاد عثمان و وقعة الجمل في مرويات سيف بن عمر في تاريخ الطبري، دراسة نقدية'' میں ترجیحاً یہی تعداد بیان کی ہے۔[2]

کیا طلحہ بن عُبید اللہ کا قاتل مروان بن حکم ہے؟

بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ طلحہ بن عُبید اللہ کا قاتل مروان بن حکم ہے[3] لیکن ان روایات کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے مروان بن حکم کی اس تہمت سے بیگناہی ثابت ہو جاتی ہے، ذیل کے اسباب سے یہ یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے:

(ا) ابن کثیر کہتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ جس نے طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرف تیر پھینکا وہ مروان بن حکم ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُنھیں کسی اور نے تیر مارا، میرے نزدیک یہ بات زیادہ صحیح ہے، ہر چند پہلی بات زیادہ مشہور ہے۔ اصل بات اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔[4]

(ب) ابن العربی کا کہنا ہے: لوگ کہتے ہیں کہ مروان نے طلحہ بن عُبید اللہ کو قتل کیا، اللہ عالم الغیب کے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا اور کسی ثقہ راوی نے یہ بات نقل نہیں کی۔[5]

[1] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 187، 190. [2] استشهاد عثمان ووقعة الجمل، ص: 215. [3] الطبقات: 223/3، وتاريخ المدينة: 1170/4، و تاريخ خليفة بن خياط، ص: 185. [4] البداية والنهاية: 248/7. [5] العواصم من القواصم، ص: 157-160.

(ج) محبّ الدین خطیب کہتے ہیں: طلحہ اور مروان کے متعلق خبر پھینکے ہوئے نومولود بچے کی مانند ہے جس کا والد اور سرپرست نامعلوم ہے۔[1]

(د) کہا جاتا ہے کہ مروان نے طلحہ کو اس لیے قتل کیا کہ انھوں نے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ میں معاونت کی تھی۔ یہ تہمت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں کہ کسی بھی صحابی نے قتل عثمان میں شرکت کی تھی۔ لہٰذا طلحہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا سبب خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

(ہ) مروان اور طلحہ جمل کے روز ایک ہی صف میں تھے اور وہ صف لوگوں کے مابین اصلاح کی دعوت دینے والوں کی صف تھی۔[2]

(و) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو مدینہ اور مکہ کا والی بنایا، اگر مذکورہ بات صحیح ہوتی تو معاویہ رضی اللہ عنہ مروان کو مقدس سرزمین میں لوگوں کا امیر مقرر نہ کرتے۔

(ز) صحیح بخاری میں مروان بن حکم کی ایک روایت موجود ہے۔[3] اگر مروان کے بارے میں مذکورہ قتل کی نسبت صحیح ہوتی تو امام بخاری جو کسی راوی کی روایت نہایت احتیاط اور باریک بینی سے قبول کرتے ہیں، ان سے ہرگز روایت نہ کرتے۔ کیونکہ یہ قتل اُن کے عادل راوی ہونے پر باعثِ عیب ہوتا۔ اور ان کی روایت کو رد کرنے کے لیے کافی ہوتا۔[4]

جنگ کے بعد امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا اعلانِ عام

ابھی لوگوں نے جنگ کے ہتھیار نہیں اتارے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے مُنادی نے صدا لگائی: کسی زخمی کو موت سے ہمکنار نہ کرو، میدانِ جنگ چھوڑ کر جانے والے کا پیچھا نہ کرو، کسی گھر میں داخل مت ہو۔ جو شخص ہتھیار رکھ دے وہ امن میں ہے، جس نے اپنا دروازہ بند کرلیا وہ امن میں ہے۔ لشکریوں میں سے کسی کے لیے مال غنیمت نہیں ہے، سوائے اس اسلحے یا سامان کے جو میدان جنگ میں لایا گیا تھا اِس کے علاوہ اُن کے لیے کچھ نہیں۔ مُنادِی نے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی جانب سے یہ پکار بھی لگائی کہ بصرہ کے لشکر

[1] العواصم من القواصم، ص: 157-160. [2] استشهاد عثمان ووقعة الجمل، ص: 202. [3] فتح الباري: 520/2، و استشهاد عثمان، ص: 203. [4] استشهاد عثمان ووقعة الجمل، ص: 202.

والوں میں سے کسی کو ہمارے پاس اپنا کوئی سامان مل جائے تو وہ لے جائے۔[1]

لشکر علی رضی اللہ عنہ میں بعض لوگوں کو یہ گمان تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن کے مابین قیدیوں کو تقسیم کریں گے، انھوں نے یہ بات کی اور لوگوں میں نشر بھی کر دی لیکن فوراً اُن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ اعلان سنائی دیا:

ام ولد کسی کو نہیں ملے گی ورثہ کا مال اللہ کے مقرر کردہ فرائض کے مطابق تقسیم ہوگا، کوئی بھی عورت جس کا خاوند قتل کر دیا گیا ہو، وہ چار ماہ دس دن عدت کے گزارے۔ لوگوں نے جب یہ بات سنی تو بڑے تعجب سے پوچھنے لگے: اے امیر المؤمنین! اُن کا خون بہانا ہمارے لیے حلال تھا تو اُن کی عورتیں ہمارے لیے حلال کیوں نہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اہل قبلہ (مسلمانوں) کے ساتھ یہی سلوک کرنا ہوگا، پھر (انھیں شرمسار کرنے کے لیے) فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اُن کے لشکر کی سربراہ تھیں آؤ اُن کے متعلق قرعہ اندازی کرو۔ یہ سن کر وہ لوگ وہاں سے منتشر ہو گئے اور استغفار پڑھنے لگے۔ اُن پر واضح ہو گیا کہ اُن کی بات اور گمان بڑی واضح غلطی تھی، امیر المؤمنین نے اُن کو راضی کرنے کے لیے بیت المال سے پانچ پانچ سو درہم تقسیم کیے۔[2]

مقتولین کی تلاش اور اُن کے لیے دعائے رحمت

جنگ کے اختتام پر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مقتولین کی تلاش میں نکلے، انھوں نے محمد بن طلحہ (السجاد) کو دیکھا تو فرمایا: إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، یہ تو بڑا صالح نوجوان تھا، پھر غم زدہ ہو کر بیٹھ گئے...... اور مقتولین کے لیے مغفرت اور رحمت کی دُعا کی۔ اُن میں سے متعدد افراد کی خیر و بھلائی کے الفاظ کے ساتھ تعریف کی۔[3] اور پھر

---

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد، ص: 168، و مصنف ابن أبي شيبة: 286/15، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] مصنف ابن أبي شيبة: 286/15، اس کی سند کو ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری: 57/13 میں صحیح کہا ہے۔ [3] مصنف ابن أبي شيبة: 261/15، و المستدرك: 103/3، 104، 375، اس کی سند حسن لغیرہ ہے، وخلافة علي بن أبي طالب، ص: 169.

اپنے گھر واپس گئے۔ اُن کی اہلیہ اور دونوں بیٹیاں، عثمان رضی اللہ عنہ، ان کے قریبی رشتہ داروں اور زبیر، طلحہ رضی اللہ عنہما اور اُن کے قریبی قریشی رشتہ داروں پر رو رہی تھیں۔ حضرت علی نے انھیں مخاطب کیا اور فرمایا: مجھے امید ہے کہ ہم اُن لوگوں میں شمار ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ۝ ﴾

''اور ان کے سینوں میں جو کینہ حسد ہو گا ہم نکال دیں گے، (وہ) تختوں پر آمنے سامنے (بیٹھے) بھائی بھائی ہوں گے۔''[1]

پھر فرمایا: اگر ہم وہ نہیں ہوں گے تو پھر اور کون لوگ ہوں گے؟ وہ یہی بات بار بار دُہراتے رہے (راوی کہتے ہیں) میرا دل چاہا کہ کاش! وہ خاموش ہو جائیں۔[2]

اہل بصرہ کی مبایعت

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ وحدتِ امت، رعایا کے احترام اور عام لوگوں کے ساتھ کریمانہ سلوک کے خواہش مند تھے، ان کے اس سلوک سے اہل بصرہ کے دل بہت متأثر ہوئے اور امیر المؤمنین کی بیعت کرنے کے سلسلے میں بہت اچھا اثر مرتب ہوا۔ جمل والے روز امیر المؤمنین نے قیدیوں کو ایک خاص جگہ پر رکھا، پھر جب فجر کی نماز پڑھی تو موسیٰ بن طلحہ بن عبید اللہ کو بلایا، اُنھیں خوش آمدید کہا اور اپنے قریب بٹھایا، اُن سے اُن کے اور اُن کے بھائیوں کے حال احوال معلوم کیے، پھر کہا: ہم نے آپ کی زمین پر اس لیے قبضہ نہیں کیا کہ ہم اِس کے خواہش مند ہیں، ہم نے زمین کو اس ڈر سے قبضہ میں لے لیا تا کہ اور لوگ اس پر قبضہ نہ کر لیں، پھر انھوں نے غلے کی شکل میں اُس کی پیداوار اُنھیں دے دی اور فرمایا: میرے بھتیجے! جب بھی تمھیں کسی قسم کی کوئی ضرورت ہو میرے پاس آ جانا، اُن

[1] الحجر 15:47. [2] مصنف بن أبي شيبة: 269,268/15، وخلافة علي رضي الله عنه لعبد الحميد، ص: 169.

کے بھائی عمران بن طلحہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا تو ان دونوں نے امیر المؤمنین کی بیعت کرلی، جب قیدیوں نے یہ سارا منظر دیکھا تو وہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اُن کی بیعت کے لیے آگئے، انھوں نے اور بعد ازاں دیگر قبائل نے اپنے اپنے قبیلے کے جھنڈے تلے آکر اُن کی بیعت کی۔[1]

انھوں نے مروان بن حکم کے بارے میں فرمایا: میرے دل میں اُن کے بارے میں مشفقانہ جذبات ہیں، وہ قریش کے سردار نوجوانوں میں سے ہیں۔ مروان نے حسن، حسین اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کو پیغام بھیجا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اُن کے بارے میں بات کریں۔ جب یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم میں آئی تو آپ نے فرمایا وہ امان میں ہیں، جہاں چاہیں جاسکتے ہیں لیکن مروان اس کریمانہ سلوک کے باوجود سیدنا علی کے اطاعت کے لیے آمادہ نہ ہوئے کہ جاکر اُن کی بیعت کرتے۔[2] مروان نے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے نہایت شریفانہ سلوک سے متأثر ہوکر ان کی تعریف کی۔ انھوں نے اُن کے صاحبزادے حسن رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے آپ کے والد سے بڑھ کر کسی کو معزز فاتح نہیں پایا، جب ہم جمل کے روز جنگ کے میدان سے نکل گئے تو اُن کی طرف سے مُنادی نے ندا لگائی کہ کسی واپس چلے جانے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، نہ کسی زخمی کو موت کے گھاٹ اتارا جائے۔[3]

اس طرح اہل بصرہ کی امیر المؤمنین کے حق میں بیعت مکمل ہوئی، اور انھوں نے وہاں اپنے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو والی مقرر کیا، اور زیاد بن ابیہ کو وہاں کے خراج کی ذمہ داری سونپی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں طویل مدت تک قیام فرمانا چاہتے تھے لیکن مالک (الاشتر) کی وجہ سے جلدی روانگی اختیار فرمائی، کیونکہ اشتر والی بننا چاہتا تھا جب اُسے معلوم ہوا کہ ابن

---

[1] الطبقات: 224/3، اس کی سند حسن ہے، و المستدرك: 377,376/3. [2] سنن سعید بن منصور: 337/2، اس کی سند حسن ہے۔ [3] کتاب أهل البغي من الحاوي الكبير، للماوردي، ص: 111، و فتح الباري: 62/13.

عباس رضی اللہ عنہما بصرہ کے والی بنا دیے گئے ہیں تو غضبناک ہوا، اپنی قوم کی طرف چل دیا اور خوب چلت پھرت دکھائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا کہ مبادا وہ شر اور فتنہ پھیلائے، چنانچہ وہ باقی ماندہ لشکر لے کر فوراً روانہ ہوئے اور مالک الاشتر تک پہنچ گئے۔ یہاں اُسے ڈانٹ پلائی کہ تم کیوں چلے آئے۔ پھر ایسا رویہ اختیار فرمایا جیسے اُس کے متعلق اُنھوں نے کوئی بات ہی نہیں سُنی۔ [1]

جنگِ جمل کی تاریخ

مؤرخین نے جمل کے واقعہ کی تاریخ کے تعین میں بہت زیادہ اقوال کی صورت میں اختلاف کیا ہے:

(ا) خلیفہ بن خیاط نے قتادہ کی سند سے روایت کیا ہے کہ دونوں فریق بروز جمعرات پندرہ جُمادی الثانیہ سن چھتیس ہجری کو آمنے سامنے آئے اور جمعہ کے روز یہ سانحہ پیش آیا۔ [2]

(ب) عمر بن شبہ کی روایت ہے کہ یہ واقعہ پندرہ جمادی الثانیہ سن چھتیس ہجری کو پیش آیا۔ [3]

(ج) طبری نے واقدی سے روایت کیا ہے کہ یہ واقعہ بروز جمعرات دس جمادی الثانیہ سن چھتیس ہجری کو رونما ہوا۔ [4]

(د) مسعودی کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ دس جمادی الاولی بروز جمعرات پیش آیا، [5] البتہ تمام اقوال میں راجح ترین بات وہ ہے جو خلیفہ بن خیاط نے قتادہ کی سند سے روایت کی ہے، اس موضوع پر اُنھی کی روایت کو صحیح ترین سمجھا جاتا ہے۔

مسلمان عورتوں کا احترام

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ اُس گھر میں تشریف لائے جہاں اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

[1] فتح الباري: 57/13، وخلافة علي رضی اللہ عنہ لعبد الحميد، ص: 174. [2] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 185,184. [3] فتح الباري: 61/13. [4] استشهاد عثمان، ص: 206، منقول عن تاريخ الطبري. [5] مروج الذهب: 360/2.

تشریف فرما تھیں۔ آپ نے حاضری کی اجازت طلب کی اور سیدہ کو سلام کیا، انھوں نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ بنی خلف کے گھر میں عورتیں مقتولین پر آہ و بُکا کر رہی تھیں، اُن میں خلف کے دو بیٹے عبداللہ اور عثمان بھی تھے، عبداللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر میں تھے۔ جبکہ عثمان لشکرِ علی رضی اللہ عنہ میں شہید ہوئے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو عبداللہ کی بیوی صفیہ نے کہا: اللہ تمھاری اولاد کو اسی طرح یتیم کر دے جس طرح تم نے ہماری اولاد کو یتیم کر دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ اُنھیں کوئی جواب نہ دیا، جب آپ باہر نکلنے لگے تو اس خاتون نے پھر یہی بات دہرائی۔ آپ بدستور خاموش رہے تو ایک آدمی بولا: امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ! آپ اس عورت کی بات پر خاموش ہیں، وہ جو کچھ کہہ رہی ہے آپ چپ چاپ سن رہے ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تم پر رحم کرے، ہمیں تو یہ حکم ہے کہ ہم مشرک عورتوں کی بات پر بھی چپ رہیں تو کیا ہم اِن عورتوں کی بات پر چپ نہ رہیں جو مسلمان ہیں۔ [1]

ابوبکرہ الثقفی کی بصرہ کی امارت سے معذرت

عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ الثقفی امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان کی بیعت کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مریض کہاں ہے؟ ...... یعنی اُن کے والد ...... انھوں نے کہا: امیر المؤمنین وہ تو واقعی بیمار ہیں اور آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ امیر المؤمنین نے فرمایا: چلو تم میرے آگے آگے چلو اور مجھے اُن کے پاس لے جاؤ۔ وہ اُن کے پاس آئے اور اُن کی عیادت کی۔ ابوبکرہ نے اُن سے معذرت کی، اُنھوں نے اُن کی معذرت قبول کر لی، پھر حضرت علی نے اُنھیں بصرہ کی امارت پیش کی، انھوں نے معذوری ظاہر کی اور کہا: آپ کے اہل میں سے کوئی ہو تو لوگ زیادہ سکون محسوس کریں گے۔ پھر انھیں ابن عباس رضی اللہ عنہما

[1] البداية والنهاية: 357/7.

کے تقرر کا مشورہ دیا، لہٰذا انھوں نے ابن عباس کو بصرہ کا والی بنا دیا۔ اُن کے ساتھ زیاد بن ابیہ کو بیت المال اور خراج کا ذمہ دار مقرر فرمایا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ زیاد کی بات ہمیشہ توجہ سے سنتے رہنا۔[1]

عائشہ رضی اللہ عنہا کو مطعون کرنے والوں کے متعلق امیر المؤمنین کا موقف

ایک آدمی نے کہا: امیر المؤمنین! دروازے پر دو آدمی ہیں۔ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عیب جوئی کر رہے ہیں۔ حضرت علی نے قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ حکم دیا کہ وہ اُن دونوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک سو کوڑے لگائیں اور کپڑوں سے پکڑ کر گھسیٹیں۔[2] قعقاع رضی اللہ عنہ نے اس حکم پر عمل کیا۔

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی طرف سے اُم المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا دفاع

محمد بن عریب سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کیا، وہاں عمار رضی اللہ عنہ بھی آ گئے، انھوں نے کہا: یہ کون ہے جو ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ گرامی کی عیب جوئی کرتا ہے؟ پھر اس شخص سے کہا: اے بدترین خلائق! تو مذموم ہے اور حقارت سے دھتکار دیے جانے کے لائق ہے۔ فوراً خاموش ہو جا۔[3] ایک اور روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا: اے بدترین شخص! دفع ہو جا! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین شخصیت کو اذیت دے رہا ہے؟[4]

ایک اور روایت کے مطابق: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کیا گیا تو حضرت عمار نے فرمایا: وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ ہیں۔[5]

---

[1] البداية والنهاية: 257/7. [2] البداية والنهاية: 257/7. [3] فضائل الصحابة: 110/2، اس کی سند ضعیف ہے، وجامع الترمذي، حديث: 3888. [4] سير أعلام النبلاء: 179/2، ذہبی نے حدیث کو حسن کہا ہے۔ [5] سير أعلام النبلاء: 176/2، یہ حدیث حسن ہے۔

صفین کا میدانِ جنگ

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے تو ام المومنین ام حبیبہ بنت ابی سفیان نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اہل خانہ کو پیغام بھیجا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے جن کپڑوں میں شہادت پائی ہے وہ مجھے بھجوا دیجیے! انھوں نے ان کی وہ قمیص جو خون سے لت پت تھی اور وہ بال جو ان کی داڑھی سے نوچ گئے تھے، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو بھجوا دیں، انھوں نے پھر نعمان بن بشیر کو بلوایا اور ان کے ہاتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خون سے رنگیں قمیص اور داڑھی کے نوچے ہوئے بال معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھجوا دیے، وہ یہ قمیص اور ان کا خط لے کر روانہ ہوئے۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جب روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ عثمان رضی اللہ عنہ کی خون آلود قمیص کے علاوہ سیدہ نائلہ رضی اللہ عنہا کی وہ انگلیاں بھی تھیں جو ان کے خاوند حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع کرتے ہوئے کٹ گئی تھیں۔ نائلہ بنت الفرافصہ کلبیہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ وہ کلب قبیلے کی شامی خاتون تھیں۔[2] نعمان رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام پہنچے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ منبر پر رکھ دی۔ اور سیدہ نائلہ کی انگلیاں قمیص میں ٹانک دیں۔ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عام لوگوں کے سامنے ان چیزوں کی نمائش کرتے رہے۔ وہ کبھی یہ چیزیں اوپر اٹھاتے اور کبھی نیچے رکھ دیتے، لوگ ان کے اردگرد رو رہے تھے اور وہ ایک دوسرے کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا انتقام لینے کی ترغیب

---

[1] تاریخ الإسلام للذهبي، عهد الخلفاء الراشدين، ص: 539. [2] تاريخ الدعوة الإسلامية لمحمد جميل، ص: 398.

دے رہے تھے۔[1] شرحبیل بن السمط الکندی آئے، انھوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہمارے خلیفہ تھے، اگر آپ ان کے خون کا بدلہ لے سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ہم آپ سے علیحدگی اختیار کر لیں گے۔[2] شام کے لوگوں نے قسمیں اٹھائیں کہ ہم اپنی عورتوں کے قریب پھٹکیں گے نہ ہی بستر پر سوئیں گے جب تک کہ ہم قاتلین عثمان کا خاتمہ نہ کر دیں یا ہم خود ختم نہ ہو جائیں۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ بھی یہی چاہتے تھے، نعمان بن بشیر نے اہل شام کے سامنے بہت برا منظر پیش کیا، خلیفہ کی شہادت، بلوائیوں کی طرف سے لوگوں کی گردنوں پر لہراتی ہوئی مسلط تلواروں کا منظر، بیت المال کی لوٹ کھسوٹ اور نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں ان باتوں کی وجہ سے لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ان کے دل شدید مغموم اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیک گئیں۔

اس کے بعد کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پہلے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کر دیا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ سید المسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کینہ پرور سازشیوں نے شہید کیا ہو اور اس بدترین جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف عالم اسلام میں قصاص لینے کی آواز نہ اُٹھے۔[4]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے کے اسباب

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں شام کے والی رہے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو وہاں والی بنانے کا ارادہ فرمایا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے شام کا گورنر بننے سے معذرت کر لی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن کی

[1] البداية والنهاية: 539/7، اس کی سند ضعیف ہے۔ [2] الأنساب: 418/4، و تاريخ الدعوة الإسلامية، ص: 398. [3] تاريخ الطبري: 600/5. [4] معاوية بن أبي سفيان للغضبان، ص: 178-183.

جگہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا، وہ شام کے قریب ہی پہنچے تھے کہ واپس آ گئے۔ انھیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فوجی گھوڑوں پر سوار ملے۔ اُن کی قیادت حبیب بن مسلمہ الفہری کر رہے تھے، انھوں نے ان سے کہا: اگر تمھیں عثمان رضی اللہ عنہ نے بھیجا ہے تو خوش آمدید، اور اگر کسی اور نے بھیجا ہے تو واپس چلے جاؤ۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی، ان کی رائے تھی کہ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیں، پھر ہم بیعت کریں گے۔[2] انھوں نے مزید کہا کہ جو قاتلوں کو پناہ دے، ہم اس کی بیعت نہیں کریں گے۔[3] وہ کہتے تھے کہ ہم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت واجب نہیں۔ اگر اس بات پر ہم سے لڑائی کی گئی تو ہم مظلوم ٹھہریں گے، انھوں نے کہا: مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا اور اُن کے قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود ہیں اور غالب پوزیشن میں موجود ہیں، اگر ہم نے بیعت کر لی تو یہ لوگ ہم پر ظلم کریں گے اور خونِ عثمان رضی اللہ عنہ رائیگاں چلا جائے گا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ اُن پر عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے اور ان کے قاتلوں سے قصاص لینے کا مطالبہ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ فرمانِ ربانی ہے:

﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ﴾

''اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق دیا ہے اُسے چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔''[4]

معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا، عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے معاملے پر خطاب کیا۔ انھوں

[1] تاریخ الطبري: 466/5. [2] البداية والنهاية: 129/7. [3] العواصم من القواصم، ص: 162. [4] بنی اسرائیل 17:33.

نے کہا کہ وہ چند گمراہ منافقین کے ہاتھوں شہید ہوئے، انھیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ خون بہانا حرام ہے۔ انھوں نے حرمت والے مہینے اور حرمت والے شہر میں عثمان رضی اللہ عنہ کا خون کر دیا...... حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تقریر سن کر لوگ بھڑک اٹھے، آوازیں بلند ہونے لگیں، ان میں کئی صحابہ کرام بھی تھے، ان میں سے ایک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ آگے بڑھے اُن کا نام مُرّہ بن کعب رضی اللہ عنہ تھا۔ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فتنوں کا ذکر فرمایا جو عنقریب ظاہر ہوں گے، اُسی لمحے ایک آدمی وہاں سے گزرا جو اپنا سر چھپائے ہوئے تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ شخص اس روز ہدایت پر ہوگا، میں نے اٹھ کر انھیں دیکھا تو وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے، میں نے اُن کی طرف چہرہ کیا اور پوچھا: یہ شخصیت؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں![1] ایک اور حدیث بھی ہے، وہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بھیجا...... اس حدیث کی آخری بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''اے عثمان رضی اللہ عنہ! بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں ایک قمیص پہنائے گا، اگر منافق وہ قمیص اتارنے کی کوشش کریں تو مت اُتارنا تا آنکہ مجھ سے آ ملو، یہ بات تین مرتبہ فرمائی۔'' میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: اُم المومنین! آپ سے یہ بات کہاں ہوئی تھی؟ انھوں نے کہا: میں بھول گئی ہوں، مجھے یاد نہیں ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے یہ بات معاویہ رضی اللہ عنہ کو بتائی تو وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے ام المومنین کو خط لکھا کہ یہ مجھے واقعہ لکھ بھیجیں، تو انھوں نے ان کو خط لکھ بھیجا۔[2]

قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ پر حکم الٰہی نافذ کرنے کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی قیادت میں اہل شام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا، ان کی رائے تھی کہ قصاص کا معاملہ، بیعت پر مقدم ہے، اس کا باعث یہ نہیں تھا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 111. [2] مسند أحمد: 86/6، یہ صحیح حدیث ہے۔

شام کی گورنری کا شوق تھا یا وہ ناحق کوئی اور بات چاہتے تھے، انھیں پورا ادراک تھا کہ خلافت کا معاملہ اہل شوریٰ کی باقی چھ شخصیات کے درمیان ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن سے افضل ہیں[1] اور انھیں خوب معلوم تھا کہ مدینہ میں تمام صحابۂ کرام کے اجماع کے ساتھ ان کی سرعام بیعت ہوئی ہے۔...... یقیناً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد صائب نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت خطوط لکھے لیکن انھوں نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تیسرے مہینے، ماہِ صفر تک کئی بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطوط حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچتے رہے۔ آخر کار معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کے ہاتھ ایک صحیفہ ارسال کیا۔ وہ صحیفہ لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قاصد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: شام کی صورت حال کیا ہے؟ اس نے کہا: میں اُن لوگوں کے ہاں سے آیا ہوں جو قصاص کے سوا کچھ نہیں چاہتے وہ سب بدلہ لینے کے خواہش مند ہیں۔ میں ایسے ساٹھ ہزار بوڑھوں کو چھوڑ کر آیا ہوں جو عثمان رضی اللہ عنہ کی خون آلود قمیص دیکھ کر رو رہے ہیں اور وہ قمیص جامع مسجد دمشق کے منبر پر رکھی ہوئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ! میں تیرے حضور خونِ عثمان رضی اللہ عنہ سے براءت کا اظہار کرتا ہوں پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایلچی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں سے واپس چلا گیا۔ اب وہ ان خوارج کے پاس پہنچا جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، یہ لوگ اس کے درپے ہو گئے۔ وہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اِس نے بڑی مشکل سے وہاں سے جان چھڑوائی۔[2]

---

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد علي، ص: 112. [2] البداية والنهاية: 240/7.

اہل شام کے خلاف جنگ کی تیاری

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب موصول ہوا تو آپ نے اہل شام کے خلاف لڑائی کا ارادہ کر لیا۔ انھوں نے مصر میں قیس بن سعد کو لکھا کہ اس لڑائی کے لیے لوگوں کو نکلنے کی تاکید کریں، کوفہ میں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو اور عثمان بن حنیف کو بھی یہی حکم لکھ بھیجا۔ ان حضرات نے لوگوں کو خطاب کیا۔ نکل کھڑے ہونے کی ترغیب دی اور تیار ہونے کے عزم کا اظہار کیا، امیر المومنین مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے وہاں قثم بن عباس کو اپنا جانشین مقرر کیا، ان کا عزم یہ تھا کہ جو لوگ ہم سے متفق ہیں وہ ان مخالفین کے خلاف لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں جو ان کی بیعت کرنے کے لیے تیار نہیں یہ صورت حال دیکھ کر ان کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اُن کی خدمت میں آئے اور کہا: ابا جان! یہ خیال چھوڑ دیجیے، اس میں مسلمانوں کا خون بہنے کا اندیشہ ہے۔ اس طرح اختلاف کی خلیج مزید گہری ہوتی چلی جائے گی لیکن امیر المومنین نے یہ بات نہیں مانی۔

لشکر کو منظّم کیا۔ جھنڈا، محمد بن الحنفیہ کے ہاتھ میں دیا، ابن عباس کو میمنہ اور عمر بن ابی سلمہ کو میسرہ پر مقرر کیا، ایک روایت یہ ہے کہ میسرہ پر عمرو بن سفیان بن عبدالاسد، اور مقدمۃ الجیش پر ابوعبیدہ کے بھتیجے ابولیلیٰ ابن عمر بن الجراح کو مقرر کیا، اور مدینہ میں قثم ابن العباس کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اب مدینہ سے روانگی اور شام کا رخ اختیار کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ اچانک ایک رکاوٹ پیدا ہوگئی[1] اس کی تفصیل، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بصرہ کی طرف خروج اور جنگ جمل کی کارروائی کی شکل میں بیان ہو چکی ہے۔

جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کو معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچنے کا حکم

کہا جاتا ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے لے کر دوسرے سبائی فتنے

[1] البداية والنهاية: 241,240/7.

تک جس کا نام بصرہ یا جنگ جمل ہے، کا دورانیہ پانچ ماہ اکیس دن ہے اور کوفہ میں داخل ہونے تک کا دورانیہ ایک ماہ اور خلافت سے لے کر صفین کے لیے خروج تک کا دورانیہ چھ ماہ ہے۔[1] یہ دورانیہ دو ماہ یا تین ماہ بھی روایت کیا گیا ہے۔[2] امیر المومنین کوفہ میں بروز سوموار بارہ رجب سن چھتیس ہجری کو داخل ہوئے، ان سے عرض کیا گیا: قصر ابیض میں قیام کیجیے! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وہاں قیام کو ناپسند فرماتے تھے، لہٰذا مجھے بھی وہاں قیام کرنا پسند نہیں، انھوں نے کشادہ زمین پر پڑاؤ ڈالا پھر جامع مسجد میں دو رکعت نماز ادا کی، بعد ازاں لوگوں سے خطاب فرمایا، انھیں خیر و بھلائی کی ترغیب دی، شر اور برائی سے منع کیا، اہل کوفہ کی تعریف کی، پھر جریر بن عبداللہ کو بلا بھیجا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے دور سے ہمذان کے والی تھے، اسی طرح اشعث بن قیس کو بھی جو عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے سے آذر بائیجان میں نائب تھے، بلایا اور اُن دونوں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی جگہ پر خلیفہ کے لیے بیعت لیں، پھر میرے پاس آ جائیں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بیعت کی دعوت دینے کا ارادہ کیا تو جریر بن عبداللہ البجلی نے کہا: امیر المومنین! میں اُن کی طرف جاؤں گا، میرا اُن سے تعلقِ خاطر ہے، میں اُن سے آپ کے حق میں بیعت لوں گا، اشتر نے کہا: امیر المومنین انھیں نہ بھیجئے، مجھے خطرہ ہے کہ ان کی خواہش آڑے نہ آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انھیں جانے دو، لہٰذا انھیں بھیج دیا اور ایک خط حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام لکھ کر انھیں مرحمت فرمایا اس میں تحریر کیا کہ مہاجرین و انصار سب ان کی بیعت پر جمع ہیں۔ جمل کے واقعات سے بھی مطلع کیا اور انھیں بیعت میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ جب جریر بن عبداللہ البجلی ان کے پاس پہنچے اور انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خط دیا تو حضرت معاویہ نے عمرو بن العاص اور اہل شام کی بڑی شخصیتوں کو طلب کر لیا۔ ان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے قاتلینِ عثمان کو قتل کرنے تک بیعت سے انکار کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دیں تو ہم بیعت کر لیں گے۔ اگر وہ

[1] مروج الذهب: 360/2. [2] التاريخ الصغير للبخاري: 102/1.

ایسا نہیں کریں گے تو ہم بیعت نہیں کریں گے بلکہ اس وقت تک لڑیں گے جب تک ہمارا آخری آدمی بھی قتل نہ ہو جائے۔

جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ واپس آ گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے اور انھیں اپنے دورہ شام کی سب باتوں سے باخبر کیا، اشتر نے کہا: امیر المومنین رضی اللہ عنہ! کیا میں نے آپ کو منع نہیں کیا تھا کہ جریر رضی اللہ عنہ کو نہ بھیجئے؟ اگر آپ مجھے بھیجتے تو دیکھتے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ جو دروازہ بھی کھولتے میں اُسے بند کر دیتا ہے، جریر نے اشتر سے کہا: اگر تم وہاں ہوتے تو خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر وہ تمھیں قتل کر دیتے۔ اشتر نے کہا: امیر المومنین رضی اللہ عنہ! اگر آپ مجھے بھیجتے تو میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے جواب سے زِچ نہ ہوتا، فوراً اُن کی سوچ کا رخ بدل دیتا اور انھیں لا جواب کر دیتا۔ یہ بات سن کر جریر رضی اللہ عنہ کو بڑا طیش آیا۔ وہ غصے کی حالت میں اُٹھے اور وہاں سے چلے گئے۔ قرقیسیاء میں جا کر قیام کیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو وہ سب کچھ لکھ بھیجا جو یہاں پیش آیا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں خط لکھ کر اپنے پاس بلا لیا۔[1]

اس طرح اشتر نے صحابی جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو جو قرقیسیاء کے والی اور اپنے قبیلہ کے سردار تھے کو مجبور کر دیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جدائی اختیار کریں۔ اور جریر بن عبداللہ البجلی ایسی شان کے صحابی ہیں جو کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی مجھے دیکھا ہمیشہ تبسم فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بارے میں یہ بھی فرمایا تھا: ''تم پر اس دروازے سے وہ آدمی داخل ہو گا جو اہل یمن کا اچھا آدمی ہے اس کا چہرہ ایسا ہے جیسے اُسے فرشتوں نے چھوا ہو۔''[2]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شام کے خلاف جنگ کے لیے تیاری شروع کی، لوگوں کو نکل کھڑے ہونے کے لیے پیغام بھیجے۔[3] بہت بڑا لشکر تیار کیا، جس کا اندازہ مختلف روایات میں مختلف ملتا ہے، مگر یہ ساری روایات ضعیف ہیں۔[4] صرف ایک روایت جس

[1] البداية والنهاية: 265/7. [2] صحيح مسلم، حديث: 2475. [3] الإصابة: 1/123-124، منقول از امام حاکم، حدیث کی سند حسن ہے۔ [4] بعض نے ڈیڑھ لاکھ یا زیادہ کہا، البداية والنهاية: 260/7، ایک لاکھ بیس ہزار المعرفة والتاريخ: 13/3 اس کی سند منقطع ہے اور ایک رائے 90 ہزار کی ہے۔ تاریخ خليفة بن خياط، ص: 193.

کی سند حسن ہے اُس میں بتایا گیا ہے کہ وہ پچاس ہزار افراد کا لشکر لے کر نکلے۔[1]

امیر المومنین کے لشکر کے جمع ہونے کی جگہ مقام نخلیہ تھا۔[2] یہ جگہ کوفہ سے دو میل کے فاصلے پر تھی، عراق کے مختلف صوبوں سے وہاں قبائل جمع ہوئے۔[3] امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر کیا۔ نخلیہ سے زیاد بن النضر الحارثی کو آٹھ ہزار جنگجوؤں کے ساتھ روانہ کیا، شریح بن ھانی کو چار ہزار کے ساتھ روانہ کیا، بعد ازاں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ مدائن (بغداد) کی طرف نکلے، وہاں مزید جنگجوان کے ساتھ آ ملے، وہاں سعد بن مسعود الثقفی کو والی بنایا اور ایک ہراول دستہ تین ہزار کی تعداد میں موصل کی طرف روانہ کیا۔[4] پھر مشرقی فرات کے کنارے پر جزیرہ کے مشہور اور اہم راستے پر چلے اور قرقیسیاء کے قریب پہنچ گئے۔[5] انھیں خبر ملی کہ معاویہ رضی اللہ عنہ ان سے ملاقات کے لیے آئے ہیں اور صفین کے مقام پر ان کی فوج جمع ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ الرقہ کی طرف آگے بڑھے۔[6] مغربی جانب سے فرات عبور کیا اور صفین پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔[7]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قاتلینِ عثمان کی طرف خروج

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان پر حملہ کرنے کے لیے بہت سنجیدہ تھے، وہ مصریوں کے ایک گروہ جس میں ابوعمرو بن بدیل الخزاعی بھی شامل تھے، کے ذریعے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے مصریوں پر احسانات تھے۔ اہل ''خربتا'' میں بھی اُن کے ہم نوا موجود تھے جو خونِ عثمان کے بدلے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سن چھتیس ہجری میں یہ گروہ محمد بن ابی حذیفہ

[1] تاریخ خلیفة، ص: 169، سند حسن ہے۔ [2] کوفہ کے قریب شام کی طرف سے ایک مقام ہے۔ معجم البلدان: 278/5. [3] خلافة علي لعبدالحمید، ص: 188. [4] تاریخ الطبری: 603/5، سند حسن ہے۔ [5] یہ شہر دریائے خابور کے فرات میں گرنے کے مقام پر ہے۔ معجم البلدان: 328/4. [6] الرقہ، آج کے دور میں سوریا کا ایک مشہور شہر ہے جو دریائے فرات کے شرقی جانب ہے۔ معجم البلدان: 153/3. [7] تاریخ الطبری: 604/5.

کے ذریعہ دشمنوں کو شکست سے دو چار کر چکا تھا، مصریوں میں منصوبہ بندی کرنے والے مدبرین، عبدالرحمٰن بن عدیس، کنانہ بن بشیر اور محمد بن حذیفہ جیسی شخصیتیں بھی موجود تھیں، انھیں فلسطین میں پابند رکھا گیا۔[1]

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو عراق کے لشکر کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ان کی طرف بڑھ رہا ہے تو انھوں نے اہل شام میں سے بڑے بڑے مشیروں کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل عراق کو ساتھ لے کر تم پر حملہ آور ہونے والے ہیں، ذوالکلاع الحمیری نے کہا: آپ جو حکم دیں گے ہم اس پر عمل کریں گے۔[2]

اہل شام نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے خونِ عثمان کے مطالبہ اور قتال پر بیعت کی تھی۔[3]

عمرو بن العاص نے لشکر تیار کیا اور جھنڈے گاڑنے کا حکم دیا۔ پھر اور لشکر سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا: بے شک اہل عراق کی اجتماعیت منتشر ہو چکی ہے اُن کی قوّت کمزور ہے، ان کی تلواروں کی دھار کند ہو چکی ہے، مزید یہ کہ اہل بصرہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالف ہو چکے ہیں، ان کے اور اہل کوفہ کے بڑے بڑے سردار جنگِ جمل میں فنا ہو گئے ہیں، اب وہ محض ایک چھوٹا سا گروہ ہیں، اُن میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے تمھارے خلیفہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا ہے، اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ہے، تمھارا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔[4]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایک بڑا لشکر لے کر نکلے، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے سلسلے میں مختلف روایات ہیں اور ان ساری روایات کی سندیں منقطع ہیں، بعینہٖ یہ بھی اُسی قسم کی روایات ہیں جن میں لشکرِ علی رضی اللہ عنہ کی تعداد کا اندازہ کیا گیا ہے۔ ان کا اندازہ ایک لاکھ بیس ہزار[5] اور ستر

---

[1] المحن لأبي العرب التيمي، ص: 124، خلافة علي رضي الله عنه لعبد الحميد، ص: 191. [2] الإصابة: 480/1، وخلافة علي رضي الله عنه لعبد الحميد، ص: 192. [3] أنساب الأشراف: 52/2، اس کی سند منقطع ہے، خلافة علی لعبدالحمید، ص: 192. [4] تاریخ الطبري: 601/5، سند منقطع ہے۔ [5] خلافة علي رضي الله عنه لعبد الحميد، ص: 194، والمعرفة والتاريخ: 313/3.

ہزار جنگجوؤں کا ہے اور بعض روایات میں تو اس تعداد سے بہت زیادہ درج ہے۔ صحیح تعداد ساٹھ ہزار جنگجوؤں کی بتائی گئی ہے، ہر چند اس آخری روایت کی سند منقطع ہے، اس کا راوی صفوان بن عمرو السکسکی ہے، وہ حمصی اور اہل شام میں سے ہے، اُس کی ولادت سن 72 ہجری کی ہے، وہ ثابت اور ثقہ راوی ہے، اس کے سوانح سے یہی کچھ معلوم ہوتا ہے۔[1] اور اس کی طرف سند کی نسبت بھی صحیح ہے۔

لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت کرنے والوں کی ترتیب یہ تھی: عمرو بن العاص اہل شام کے تمام گھوڑ سواروں کے کمانڈر تھے، ضحاک بن قیس تمام پیدل دستوں کے سالار تھے، ذوالکلاع الحمیر ی لشکر کے میمنہ اور حبیب بن مسلمہ میسرہ پر مامور تھے۔ ابو الاعور السلمی مقدمۃ الجیش کے سالار تھے، یہ سب افراد بڑی قیادت میں شامل ہیں، ان قائدین میں سے ہر قائد کے ماتحت ذیلی قائدین مقرر کیے گئے جن کی تقسیم قبائل کے حساب سے کی گئی تھی۔ ساری ترتیب کا تعلق صفین کی طرف روانگی کے وقت سے ہے لیکن جنگ کے دوران بعض قائدین کو تبدیل بھی کیا گیا اور درپیش حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیگر قائدین کو بھی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں، بعض پرانی کتابوں میں قائدین کے ناموں میں فرق کی وجہ بھی یہی ہوسکتی ہے۔[2]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ابو الاعور السلمی کو مقدمۃ الجیش میں روانہ کیا۔ ان کے جانے کا راستہ دمشق کے شمال مشرق کی طرف تھا، جب وہ فرات کی نچلی جانب صفین پہنچے، تو فرات کے ایک گھاٹ پر ایک وسیع میدان میں فوج جمع کی، اس جگہ اس کے علاوہ اور کوئی گھاٹ نہیں تھا۔ ابو الاعور نے اس پر اپنا قبضہ مضبوط رکھا۔[3]

---

[1] سير أعلام النبلاء: 380/6. [2] امتداد العرب في صدر الإسلام لصالح العلى، ص: 73، وخلافة على، ص: 194. [3] وقعه صفين لنصر بن مزاحم، ص: 161,160.

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پانی بند کر دیا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لشکر بھی وہیں پہنچا جہاں معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوج جمع کر رکھی تھی، لہٰذا انھیں اس قدر وسیع جگہ نہ مل سکی جو پورے لشکر کے لیے کافی ہو جاتی، انھوں نے کسی قدر سخت اور دشوار جگہ پر لشکر جمع کیا تھا، وہاں زیادہ تر چٹانیں اور ٹیلے تھے۔[1] اچانک معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کا پانی بھی روک لیا، بعض لوگ تیزی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس دوڑے دوڑے آئے اور اس صورت حال کی شکایت کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشعث بن قیس کو بلا بھیجا، وہ دو ہزار جنگجوؤں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے اور فریقین کے درمیان پہلا معرکہ شروع ہوا جس میں اشعث کو کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے دریا پر غلبہ حاصل کر لیا۔[2] ایک روایت اس لڑائی کے واقعہ کی نفی کرتی ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اشعث بن قیس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: اے معاویہ رضی اللہ عنہ! اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، ذرا غور کرو اگر تم نے اہل عراق کو مار دیا تو ان کے بچوں کا کیا بنے گا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾

''اگر اہل ایمان میں دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔''[3]

معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تم چاہتے کیا ہو؟ انھوں نے کہا: ہمارے اور پانی کے درمیان سے ہٹ جاؤ، انھوں نے ابوالاعور سے کہا آپ بھی ہمارے بھائیوں اور پانی کے درمیان سے ہٹ جائیں۔[4]

پانی پر لڑائی کے ساتھ ماہ ذوالحجہ کے پہلے روز ہی دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا اور اسی محارب نے دونوں فریقوں کے مابین شر اور خرابی کا دروازہ کھول دیا جس کا سلسلہ پورے مہینے تک جاری رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر سے ایک دستہ بھیجتے، اس کا ایک شخص کو

---

[1] خلافة علي لعبدالحميد، ص: 196. [2] مصنف ابن أبي شيبة: 294/15، اس کی سند حسن ہے۔
[3] الحجرات: 49:9. [4] سير أعلام النبلاء: 41/2، و مرويات أبي مخنف، ص: 296.

امیر بناتے تھے، ایک دن میں ایک مرتبہ صبح یا شام لڑائی ہوتی تھی، بعض اوقات دن میں دو مرتبہ بھی ہو جاتی تھی، لشکر علی رضی اللہ عنہ کے دستوں کے امراء جو آگے آگے ہوتے تھے، وہ اشتر، حجر بن عدی، شبث بن ربعی، خالد بن المعمر اور معقل بن یسار رضی اللہ عنہ تھے، لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ میں جو آگے آگے تھے، ان کے نام یہ ہیں: حبیب بن مسلمہ، عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید رضی اللہ عنہ عبید اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما، ابوالاعور السلمی اور شجیل بن السمط۔ فریقین نے پورے لشکر کو لڑائی میں جھونکنے سے اجتناب کیا، اس کا ایک مقصد تو لشکر کو خاتمے سے بچانا اور دوسرا جانبین میں صلح کے امکانات برقرار رکھنا تھا تاکہ اس کے ذریعے معصوم جانوں کا خون نہ ہونے پائے۔[1]

صلح کی کوشش

ابھی محرم الحرام کا مہینہ نہیں آیا تھا کہ دونوں فریقوں نے مسلمانوں کا خون بہنے سے بچانے کے لیے صلح کی کوششیں تیز کر دیں انھوں نے اس مہینے کے لیل و نہار باہمی خط کتابت کے لیے استعمال کیے، لیکن اس دورانیہ...... ماہ محرم...... کی خط کتابت کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں وہ ضعیف سندوں سے بیان ہوئی ہیں۔[2] لیکن یہ مشہور بھی ہیں کہ ان کے ضعیف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

اس مراسلت کی ابتداء کرنے والے خود امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے بشیر بن عمرو الانصاری، سعید بن قیس الھمدانی اور شبث بن ربعی التمیمی کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور ان کو وہی دعوت الی الخیر پیش کی گئی جو پہلے پیش کی تھی یعنی اجتماعیت اور بیعت میں داخل ہونے کی دعوت، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی حسب سابق وہی جواب دیا جو معروف ہے، یعنی قاتلین عثمان کی سپردگی یا ان سے قصاص لینے کا مطالبہ وہ فرماتے تھے

---

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 198,197، والبداية والنهاية: 266/7، وتاريخ الطبري: 614/5. [2] تاريخ الطبري: 613,612/5، و خلافة علي، ص: 199.

کہ پہلے عثمان کے قاتل قتل کیے جائیں، پھر وہ بیعت میں داخل ہوں گے اس معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف پہلے ہی واضح طور پر سامنے آ چکا ہے۔[1] دونوں فریقوں کے معززین صفین کے ایک جانب اپنی فوجیں کھڑی کر چکے تھے، وہ بڑی تعداد میں تھے۔ انھوں نے باہمی صلح کی بہت کوششیں کیں لیکن یہ کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں، ہر فریق اپنی رائے پر ڈٹا رہا۔[2] صحابۂ کرام میں سے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اور ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بھی دونوں فریقوں کے مابین صلح کی کوششیں کیں، سابقہ متذکرہ اسباب کے باعث وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے، چنانچہ ان دونوں شخصیات نے دونوں فریقوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور ان کی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ کبار تابعین میں سے مسروق بن الاجدع آئے انھوں نے بھی وعظ ونصیحت کی انھیں اللہ کا خوف دلایا، اور وہ بھی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔[3]

باہمی مراسلت کے حوالے سے ابو مخنف اور نصر بن مزاحم کی روایات میں جو طویل تفصیلات آئی ہیں، حافظ ابن کثیر نے ان پر تنقید کی ہے وہ کہتے ہیں: ...... اہل سِیَر نے اس مراسلت پر طویل گفتگو کی ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوئی ہے، اس کی صحت قابلِ غور ہے، اس گفتگو میں اصل لپٹی ہوئی بات یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد کی عیب جوئی کی اور فرمایا کہ وہ اسلام میں داخل تو ہوئے لیکن ہمیشہ تردد اور شک میں رہے...... انھوں نے مزید کہا میں یہ نہیں کہتا کہ عثمان مظلوم یا ظالم کی حیثیت سے شہید ہوئے...... میرے خیال میں یہ ساری باتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے نہ ثابت ہیں، نہ صحیح ہیں۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں، میری اس کتاب میں اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھی گئی کتاب میں واضح طور پر اُجاگر کر دیا گیا ہے۔

---

[1] تاریخ الطبري: 613/5، وخلافة علي، ص: 199. [2] تاریخ الطبري: 614/5، وخلافة علي، ص: 199. [3] سیر أعلام النبلاء: 67/4. [4] البدایة والنهایة: 269/7، 270.

گھمسان کی جنگ

جنگ پھر اسی حالت پر لوٹ آئی جو ماہ ذوالحجہ میں مختلف دستوں اور انفرادی مقابلوں کی شکل میں تھی، اس ماہ کا پہلا ہفتہ گزر گیا اور دونوں فریقوں کے مابین جنگی جھڑپیں ستر سے زیادہ ہوئیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نوے سے زیادہ ہوئیں۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر میں اعلان کیا کہ کل بروز بدھ دونوں لشکروں کی باہم عام لڑائی ہو گئی۔ یہ اطلاع معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی مل گئی۔[2]

اس رات فریقین کے سپاہیوں نے اپنے اپنے ہتھیار ٹھیک ٹھاک اور تیز کیے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بڑی تیزی دکھائی۔ انھوں نے ان سپاہیوں کو جن کے ہتھیار خراب یا کُند ہو چکے تھے جدید ہتھیار فراہم کیے اور لوگوں کو ترغیب دی کہ علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے خلاف جنگ میں پوری بہادری کا مظاہرہ کریں۔[3] دونوں لشکروں نے مشاورت بھی کی اور اپنی اپنی قیادتوں کو منظّم بھی کیا۔

لڑائی کا پہلا دن

بدھ کے روز دونوں لشکروں نے اپنی اپنی صفیں تیار کر لیں اور لشکروں کی اس طرح تقسیم کی جیسے بڑے بڑے معرکوں میں قلب، میمنہ، اور میسرہ کی شکل میں کی جاتی ہے۔ لشکر علی رضی اللہ عنہ کی ترتیب یہ تھی۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ قلب پر، عبداللہ بن عباس میسرہ پر، عمار بن یاسر پیادوں پر متعین تھے۔ محمد بن الحنفیۃ جھنڈا اُٹھائے ہوئے تھے۔ ہشام بن عتبہ (المرقال) چھوٹا جھنڈا لیے ہوئے تھے اور اشعث بن قیس میمنہ پر مامور تھے۔

دوسری طرف کے لشکر میں معاویہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار اعظم تھے۔ وہ ایک اونچے ٹیلے پر ایک

[1] الأنباء بتواريخ الخلفاء، ص: 59، وصفين، ص: 202، وشذرات الذهب: 45/1. [2] البداية والنهاية: 273/7. [3] سنن سعيد بن منصور: 240/2، یہ ضعیف حدیث ہے۔ [4] تاریخ خلیفة بن خیّاط، ص: 193، عینی شاہد تک اس کی سند حسن ہے۔

مضبوط لشکر لے کر خود اور زرہیں پہنے بیٹھے ہوئے تھے، عمرو بن العاص شامی فوجیوں کی قیادت کر رہے تھے۔ ذوالکلاع الحمیری میمنہ پر مامور تھے اور مخارق بن الصباح الکلاعی جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔[1]

دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے، کثرتِ تعداد کی وجہ سے حد نگاہ تک اتنے لوگ تھے کہ اُفق نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

بعض ضعیف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر سے خطاب فرمایا: انھوں نے صبر و استقامت، کثرت سے اللہ کا ذکر اور اقدام کرنے کی ترغیب دی۔[2] ان روایات میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن العاص نے اپنے لشکر کے حالات کا جائزہ لیا اور اپنے سپاہیوں کو صفیں سیدھی اور قائم رکھنے کا حکم دیا۔[3] ان روایات کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ ہر قائد اپنے لشکر کو بہادری سے مقابلے کی ترغیب دیتا اور جوش دلاتا ہے اور ہر اس بات کا انتظام کرتا ہے جو انھیں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ آخر کار جنگ چھڑ گئی۔ دونوں لشکر بھڑ گئے، شام تک لڑائی جاری رہی۔ اس میں صرف ادائے نماز کے لیے وقفہ کیا جاتا تھا۔ ہر فریق اپنے خیموں کی طرف جاتا تھا۔ مقتولین کی لاشیں میدان میں پڑی ہوئی تھیں۔ نماز سے واپسی پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے بعض افراد نے ان سے پوچھا: اے امیر المومنین! ہمارے اور دوسرے دونوں کے مقتولین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے تو انھوں نے فرمایا: ہم میں سے ہو یا ان میں سے جسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور دار آخرت کی کامیابی مطلوب ہوگی وہ جنت میں داخل ہوگا۔[4]

ہر فریق نے اپنی پوری توانائی صرف کی لیکن کوئی ایک دوسرے پر غالب نہ آ سکا، نہ کوئی پیٹھ پھیر کر بھاگا تاآنکہ وہ دن ختم ہو گیا، شام کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میدانِ جنگ کا چکر لگایا اور اہل شام کو دیکھتے ہوئے یہ دعا کی:

---

[1] تاریخ خلیفة بن خیّاط، ص: 193. [2] تاریخ الطبري: 622/5، ابو مخنف کی سند ہے۔ [3] الطبقات: 255/4، واقدی کی سند کے ساتھ۔ [4] سنن سعید بن منصور: 344/2، 345، اس کی سند ضعیف ہے۔

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَلَهُمْ»
''اے اللہ! میری اور ان کی بخشش فرما۔'' [1]

دوسرا دن

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جمعرات کے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منہ اندھیرے فجر کی نماز پڑھائی اور حملے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ نے لشکر کے کمانڈروں میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں، عبداللہ بن بدیل الخزاعی کو میمنہ پر اور ان کی جگہ میسرہ پر اشعث بن قیس الکندی کو مقرر فرمایا۔[2] فریقین کے بیچ گھمسان کا رن پڑا۔ یہ گزشتہ روز سے زیادہ شدید تھا، اہل عراق آگے بڑھتے چلے گئے اور انھوں نے اہل شام پر اپنی فوقیت قائم کر دی۔ عبداللہ بن بدیل کے لیے معاویہ رضی اللہ عنہ کے میسرہ کو توڑنا ممکن ہو گیا۔ اُس پر حبیب بن مسلمہ مقرر تھے۔ پھر عبداللہ بن بدیل نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے دستہ (الشھباء) کا رخ کیا، وہ بے نظیر بہادری سے لڑے اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے، تا آنکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں آیا کہ میدانِ جنگ چھوڑ کر چلے جائیں، لیکن بقول شاعر انھوں نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔

انھوں نے شھباء دستے کو جوش دلایا تو اس نے عبداللہ بن بدیل کو شہید کر دیا۔ ان کی جگہ میمنہ کی قیادت اُشتر نے سنبھال لی، اہل شام آپس میں خوب جڑ کر مقابلہ کرنے لگے، ان میں سے بعض نے موت پر بیعت کی اور ایک بار پھر شدت کے ساتھ حملہ آور ہو گئے اور ان کے بڑوں میں متعدد شہید ہو گئے۔ ان میں نمایاں ذوالکلاع، حوشب اور عبیداللہ بن عمر بن الخطاب تھے، شام کے لشکر کا پانسہ پلٹ گیا، وہ آگے بڑھتا چلا گیا عراقی لشکر پیچھے ہٹتا گیا۔ اہل عراق میں بہت سے لوگ شہید ہو گئے، اور بہت سے زخمی ہوئے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو پیچھے ہٹتا دیکھا تو انھوں نے بلند آہنگی سے پکار لگائی۔ وہ اپنے لشکر کو جوش اور غیرت

[1] مصنف بن أبي شيبة: 297/15، اس کی سند ضعیف ہے۔ [2] تاريخ الطبري: 630/5.

دلانے لگے انھوں نے خوب لڑائی کی اُن کی غیرت وحمیت جوش میں آ گئی، انھوں نے اپنے امیر خالد بن المعتمر کی موت پر بیعت کی۔[1]

حالانکہ عمار بن یاسر چورانوے سال کی عمر سے تجاوز کر چکے تھے، پھر بھی وہ پوری مستعدی اور جوش وجذبے سے لڑائی میں شریک رہے، لوگوں کو جوش دلاتے تھے اور ہمتوں کو برانگیختہ کر رہے تھے لیکن وہ غلُو کے مزاج سے کوسوں دور تھے، انھوں نے اپنے قریب ایک آدمی کی صدا سنی، وہ کہہ رہا تھا: اہل شام کافر ہو گئے ہیں تو حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے اُسے منع کیا اور فرمایا: انھوں نے بغاوت کی ہے، ہم ان کے باغیانہ اقدام کی وجہ سے اُن کے خلاف لڑ رہے ہیں، ہمارا اللہ، ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارا قبلہ سب ایک ہیں۔[2]

جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے ہوتے ہوئے اور مد مقابل کو آگے بڑھتے دیکھا تو انھیں جوش دلانے لگے۔ فرمایا کہ تم حق پر ہو۔ شامیوں کے دھوکے میں نہ آؤ۔ پھر فرمایا جو چاہتا ہے کہ جنت کی حوریں اُسے اپنے دامن میں سمیٹ لیں وہ اجر وثواب کے جذبے سے آگے بڑھتا چلا جائے، اُس اللہ کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر وہ لوگ ہمیں مارتے مارتے دور تک بھی دھکیل دیں تب بھی ہمیں یقین ہے کہ ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر ہیں، ہمارے مصلحین برحق ہیں اور ان کے مصلحین گمراہ ہیں۔[3]

پھر آگے بڑھتے رہے، ان کے ہاتھ میں نیزہ تھا جو ان کے بڑھاپے کی وجہ سے لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ ہاشم کے ساتھ آگے بڑھنے کی تاکید کر رہے تھے، اور اللہ کی نعمتوں کا شوق دلا رہے تھے، دیگر ساتھیوں سے بھی یہی کہہ رہے تھے کہ جنت قریب آ رہی ہے، حوریں زیب وزینت اختیار کر رہی ہیں، جو چاہتا ہے کہ حوروں کے دامن میں جا پہنچے وہ آگے بڑھے اور حریف پر ٹوٹ پڑے۔ یہ منظر بڑا ہی پر تاثیر تھا، وہ جلیل القدر صحابی تھے۔ مہاجر تھے، بدری

[1] الإصابة: 454/1، وأنساب الأشراف: 56/2، قتادہ تک یہ روایت حسن سند کے ساتھ مرسل ہے۔
[2] مصنف بن أبي شيبة: 290/15، اس کی سند حسن لغیرہ ہے۔ [3] مجمع الزوائد: 243/7، وخلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 219، اس کی سند حسن ہے۔

تھے، چورانوے سال سے متجاوز تھے۔ ان کے اندر بڑی غیرت اور عزم تھا۔ ان کا یقین کامل تھا اور وہ روحانیت کی بہت اونچی مسند پر فائز تھے، یہ سب عوامل عراقی لشکر کو آگے بڑھنے کی ترغیب دے رہے تھے۔

جمعرات کے روز سورج غروب ہوتے وقت عمار رضی اللہ عنہ نے دودھ کا ایک گھونٹ طلب کیا، پھر فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ دنیا میں تمھارا آخری گھونٹ دودھ کا گھونٹ ہوگا۔[1] پھر وہ آگے بڑھے، ان کے ساتھ علم بردار ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص بھی آگے بڑھتے چلے گئے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ دونوں شہید ہو گئے،[2] اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور ان سے راضی ہو۔

تیروں کی بوچھاڑ کی رات

اُسی رات جنگ میں پھر شدت اور ایسی تیزی آ گئی جو سابقہ دونوں میں نہیں آئی تھی، اہل عراق پورے جوش، حوصلے اور ولولے سے لڑے اور اہل شام کو پیچھے ہٹا دیا، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنفسِ نفیس شدید لڑائی میں حصہ لیا اور موت پر بیعت کی۔[3] کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کے ساتھ مغرب کی نماز، نمازِ خوف کی شکل میں ادا کی۔[4]

امام شافعی کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے ہریر کی رات نماز خوف ادا کی۔[5] عینی شاہد کہتا ہے کہ ہم حریف سے تین دن اور تین راتیں لڑتے رہے نیزے ٹوٹ گئے۔ تیر کمان ختم ہو گئے، پھر ہم نے ایک دوسرے پر تلواریں چلائیں یہ سلسلہ آدھی رات تک جاری رہا، یہاں تک کہ تلواریں درانتیوں کی شکل اختیار کر گئیں، ہم نے

[1] مصنف بن أبي شيبة: 303,302/15، اس کی سند منقطع ہے۔ [2] تاريخ الطبري: 653/5. [3] المستدرك: 402/3، امام ذہبی نے ضعیف کہا ہے، وخلافة علي، ص: 226. [4] السنن الكبرى للبيهقي: 252/3، البانی کا کہنا ہے کہ بیہقی نے اسے صیغہ تمریض کے ساتھ روایت کیا ہے، إرواء الغليل: 42/3. [5] تلخيص الحبير: 78/2، وخلافة علي بن أبي طالب، ص: 227.

ایک دوسرے کو الٹی طرف سے تلواریں مارنی شروع کی تو لڑائی کے شور کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی، پھر ہم ایک دوسرے پر پتھر برسانے لگے، پھر مٹی پھینکنے لگے، پھر ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنے لگے۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن کی صبح ہوگئی، سورج بلند ہو گیا، دھوپ پھیل گئی لیکن جنگ کے غبار کے باعث کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، کیا بڑے اور کیا چھوٹے سب جھنڈے سرنگوں ہو گئے، دونوں طرف کے لشکر والے انتہائی حد تک تھک گئے۔ ہاتھوں میں جان نہ رہی حلق بھی خشک ہو گئے۔[1]

شبِ ہریر اور جمعہ کے روز کی جنگ کے بارے میں ابن کثیر کہتے ہیں: وہ ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنے لگے، دو دو آدمی باہم لڑ رہے تھے، خونریزی جاری تھی، پھر وہ دونوں تھک جاتے تھے، آرام کرنے لگتے تھے پھر باتوں ہی باتوں میں ایک دوسرے پر برسنے لگتے تھے، پھر کھڑے ہو کر جاتے تھے دوبارہ حسب سابق لڑائی شروع کر دیتے تھے، إنا لِلّٰهِ وإنا إليه راجعون، اسی طرح جمعہ کے روز کی صبح ہوگئی، وہ بدستور حالتِ جنگ میں تھے، اشاروں سے فجر کی نماز ادا کر رہے تھے، دن نکل آیا اور اہل عراق نے اہل شام پر غلبہ پا لیا۔[2]

تحکیم کی دعوت

شبِ ہریر کے بعد دونوں لشکروں کی یہ حالت زار ہوگئی کہ وہ مزید لڑائی کے متحمل نہ رہے۔ شبِ ہریر، اشعث بن قیس الکندی نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کیا۔ انھوں نے فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت! تمھارا گزرا ہوا یہ دن خوفناک تھا۔ اس میں عرب فنا ہو گئے، میں نے اپنی زندگی بھر یہ سب کچھ نہیں دیکھا، حاضر و موجود لوگ غیر حاضر لوگوں کو بتا دیں کہ اگر ہم اسی طرح لڑتے رہے تو عرب فنا ہو جائیں گے، حرمتیں غارت ہوں گی۔ اللہ کی قسم! میں یہ بات جنگ کے ڈر سے نہیں کہہ رہا، میں عمر رسیدہ آدمی ہوں، آئندہ کل کے

[1] شذرات الذهب: 45/1، و وقعة صفين، ص: 369. [2] البداية والنهاية: 283/7.

لیے مجھے عورتوں اور بچوں کا ڈر ہے۔ اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے اپنی قوم اور اہل دین کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی ہے، میں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔[1]

اس بات کی خبر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا: رب کعبہ کی قسم! انھوں نے بالکل صحیح کہا ہے، اگر ہم کل پھر جنگ شروع کرتے ہیں تو، رومی ہماری عورتوں اور بچوں کا رخ کریں گے اور اہل فارس کا رخ اہل عراق کی عورتوں اور بچوں کی طرف ہوگا، عقلمند آدمی یہ بات سمجھ سکتا ہے، پھر انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: قرآن کریم کے نسخے نیزوں کے ساتھ باندھ دو۔[2] یہ عراقی روایت ہے، اس میں عمرو بن العاص کا کوئی ذکر نہیں ہے، نہ یہ حیلہ سازی اور دھوکے کا معاملہ ہے۔ یہ دونوں فریقوں کی خواہش تھی اور یہ کوئی غلط بات نہیں تھی کہ معاویہ رضی اللہ عنہ یا عمرو بن العاص نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے امت کو بہت بڑی مصیبت سے نکالنے کی کوشش کی یہ بات درحقیقت ان سبائیوں کے لیے پریشانی کا باعث تھی جو اس فتنے کے شعلے بھڑکا رہے تھے اور انھوں نے گمراہ کن روایات کے ڈھیر لگا دیے ہیں، ان کی نظر میں مسلمانوں کا خون بہانے سے بچانا اور قرآن کو حکم قرار دینے کی بات کرنا حیلہ سازی، جرم اور سازش ہے۔[3] انھوں نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف ان جھوٹی باتوں کی نسبت کی ہے جو صحیح روایات کے منافی ہیں، ان کے خیال کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "انھوں نے قرآن کے نسخے نیزے پر بلند نہیں کیے، نہ وہ کریں گے، قرآن کے اندر جو کچھ ہے وہ اس پر عمل ہی نہیں کرتے، اُنھوں نے قرآن کے نسخے حیلے، دھوکے اور سازش کے طور پر بلند کیے ہیں۔"[4]

قرآن کریم کے نسخے بلند کرنے کے بارے میں سبائیوں نے سب وشتم سے بھی کام لیا: انھوں نے کہا: یہ ایک بدکار عورت کے بیٹے کا مشورہ ہے۔[5] انھوں نے عمرو بن العاص

---

[1] وقعة صفين للمنقري، ص: 479. [2] وقعة صفين للمنقري، ص: 481-484. [3] الدولة الإسلامية في عصر الخلفاء الراشدين، ص: 316. [4] الكامل في التاريخ: 2/386. [5] تاريخ الطبري: 5/662.

کے خلاف پروپیگنڈے کا دائرہ وسیع کر دیا، آپ تاریخ کی کوئی کتاب ایسی نہیں دیکھیں گے جس میں عمرو بن العاص کی عیب جوئی نہ کی گئی ہو اور انھیں اُن من گھڑت روایات کے سبب جو دشمنانِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گھڑ لی ہیں۔ (نعوذ باللہ) دھوکے باز اور مکار کہا ہے اور انھیں طبری اور ابن الاثیر وغیرہ نے نقل کر دیا ہے۔ بہت سے معاصر مؤرخین نے ایسی روایات بغیر تحقیق کے اپنی کتابوں میں شامل کر لی ہیں، مثلاً حسن ابراہیم حسن نے تاریخ الاسلام میں، محمد الخضری بک نے تاریخ الدولۃ الامویۃ میں اور عبدالوھاب النجار نے تاریخ الخلفاء الراشدین وغیرہ میں اصل تاریخی حقائق کی شکل بگاڑنے میں حصہ لیا ہے۔

ابو مخنف کی روایت میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحکیمِ قرآن کو تسلیم کرنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ یہ تجویز اہل شام کی ہے پھر بعد میں خوارج میں سے قُرّاء کے دباؤ پر اسے تسلیم کر لیا۔[1]

اس روایت سے یہ پہلو ظاہر ہوتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کو برا کہا، جبکہ اُس مبارک نسل کے لوگ ان باتوں سے بالا تر تھے، اس روایت کے ساقط ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس میں ابو مخنف حاسد رافضی ہے۔ خالص تحقیقی حوالے سے اس روایت کا کوئی مقام نہیں۔ کچھ اور روایات ہیں جن میں صحابۂ کرام پر خواہشات کی پیروی کی کوئی تہمت نہیں ہے۔ مثلاً امام احمد بن حنبل نے حبیب بن ابی ثابت کی سند سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا: میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے ابو وائل کے پاس گیا، انھوں نے بتایا: ہم صفین میں تھے، جب اہل شام کے لوگ قتل ہونے لگے تو عمرو بن عاص نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: علی رضی اللہ عنہ کی طرف قرآن پاک کا نسخہ بھیجو اور انھیں کتاب اللہ کے حکم ہونے کی طرف دعوت دو، وہ انکار نہیں کریں گے، ایک صاحب قرآن لے کر آئے اور کہا: ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ (اسی سے

[1] تاریخ الطبري: 5/663,662.

فیصلہ لے لیتے ہیں۔)

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ ﴾

''تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں کچھ حصہ ملا ہے، اُن کا کیا حال ہے؟ جب انھیں کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلہ کی طرف آنے سے منہ پھیر لیتا ہے۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جی ہاں! بالکل ٹھیک ہے، قراء نے جو بعد میں خوارج بن گئے، تلواریں اپنے کندھوں پر رکھ کر کہا: امیر المومنین! کیا ہم ان کی طرف نہ جائیں تا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے؟ یہ سن کر سھل بن حنیف انصاری کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: اے لوگو! اپنے گریبان میں جھانکو، ہم حدیبیہ کے روز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ اگر قتال مقصود ہوتا تو ہم ان کے خلاف لڑائی کرتے یہ رسول اللہ ﷺ اور مشرکین کے درمیان صلح کا واقعہ ہے، پھر انھیں بتایا کہ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صلح کی مخالفت کی تھی پھر رسول اکرم ﷺ پر سورۂ فتح نازل ہوئی تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بھی فتح والی بات ہے تو انھوں نے یہ فیصلہ قبول کر لیا اور لوٹ آئے اور لوگ بھی واپس آ گئے۔[2]

سھل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے مسلمان بھائیوں کے درمیان جنگ جاری رکھنے والوں کی رائے کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا: اے لوگو! دین کے معاملے میں اپنے گریبان میں جھانکو۔[3] اور صاف طور پر کہا کہ صلح کے مذاکرات کے سوا کسی اور کی تجویز اختیار کرنا صحیح

---

[1] آل عمران 3:23. [2] مصنف بن أبي شيبة: 336/8، ومسند أحمد مع الفتح الرباني: 483/8.
[3] صحيح البخاري، حديث: 4189.

بات نہیں کیونکہ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ فتنہ ہے، جس کا انجام برا ہوگا۔ جنگ کے ذریعے ہم اپنے مخالف کا ناطقہ بند نہیں کر سکتے بلکہ اس سے اور زیادہ فتنے پھوٹ پڑیں گے۔⟨1⟩

ان صحیح روایات میں فتنہ کی طرف دعوت دینے والوں کی تردید کی گئی ہے، یہ لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والے اور جھوٹی خبریں گھڑنے والے ہیں، وہ خود اشعار کہتے ہیں اور ان عظیم صحابہ و تابعین کی طرف ان کی نسبت کر دیتے ہیں جو صفین میں شریک ہوئے۔ تاکہ ان کے بارے میں یہ ظاہر کریں کہ وہ جنگ کی خاطر بہت جوشیلے ہیں، تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کے متعلق بغض و عناد کا بیج بوئیں اور اپنی طاقت کے مطابق فتنہ جاری رکھنے کا عمل انجام دیں۔⟨2⟩

قاتلینِ عثمان کی سپردگی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں داخل ہونے سے انکار کو ترک کر کے اللہ کی کتاب کو حَکَم بنانے کی دعوت ایک ایسی بہتر صورت حال تھی جو جنگ صفین کے واقعات کا نتیجہ تھی اس میں بہت سے مسلمانوں کو اپنی زندگی کی قربانی دینی پڑی، اور اس سے یہ اجتماعی رائے سامنے آئی کہ لڑائی کی بندش ایک ایسی ضرورت ہے جو امت کی قوت کو دشمن کے بالمقابل محفوظ رکھنے والی اور امت کا سر اونچا کرنے کا سبب ہے اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امت ابھی زندہ ہے اور اس میں اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔⟨3⟩

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ صفین میں لڑائی کو روکنے پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے تحکیم کو قبول کر لیا، اسے فتح سے تعبیر کیا اور واپس کوفہ چلے گئے⟨4⟩ اور تحکیم سے بہت سی امیدیں وابستہ کیں کہ یہ اختلاف کے ازالے، اتحاد امت اور ریاست کو تقویت دینے کا باعث ہوگی اور فتوحات کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔

⟨1⟩ صحیح البخاري، حدیث: 4189. ⟨2⟩ الإنصاف فیما وقع في تاریخ العصر الراشدي من الخلاف، ص: 530. ⟨3⟩ دراسة في تاریخ الخلفاء الأمویین، ص: 38. ⟨4⟩ دراسة في تاریخ الخلفاء الأمویین، ص: 38.

کتاب اِلٰہی کو حکم ماننے کے لیے دونوں فریقوں کی سوچ میں بہت سے عوامل نے کردار ادا کیا، مثلاً:

(ا) مسلمانوں کا خون بہانے سے روکنے اور مزاحمت کو ختم کرنے کی کوششوں میں سے یہ آخری کوشش تھی۔ یہ کوششیں اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کی تھیں جو جمل کے واقعہ کے بعد شروع ہوئیں مگر کامیاب نہ ہوسکیں، البتہ وہ مراسلت جس کا تبادلہ دونوں اطراف سے ہوتا رہا تاکہ دونوں میں سے ہر ایک کا نقطہ نظر معلوم ہو سکے، اس میں کارگر نہ ہوسکی، ان کوششوں میں سے آخری کوشش وہ تھی جو لڑائی کی شدت کے دوران حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کی گئی، انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لڑائی بند کرنے کی خاطر خط لکھا اور اُس میں کہا: میرا خیال ہے کہ اگر ہمیں اور آپ کو معلوم ہوتا کہ لڑائی کے نتیجہ میں معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا تو ہم اس کا ارتکاب نہ کرتے، اگرچہ اس وقت ہماری عقلیں مغلوب ہوگئی تھیں، اب ہمارے لیے اُس اظہار ندامت کے بعد اصلاح اور صلح کرنے کا موقع موجود ہے۔[1]

(ب) مقتولین کی لاشیں گرتی رہیں، بہت زیادہ خون بہہ گیا تاآنکہ بالکل فنا اور معدومیت کا خدشہ محسوس ہونے لگا، اب جنگ کو روکنا ایک ایسا مقصد قرار پایا جو سب کو مطلوب تھا۔

(ج) لڑائی کی طوالت سے سبھی لوگ تنگ تھے اُنھیں اس آواز کا انتظار تھا، جو مصالحت کی طرف بلائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کی اکثریت یہ کہہ رہی تھی کہ جنگ ہمیں کھا گئی ہے، اب ہماری بقاء جنگ ترک کرنے میں ہے۔[2] یہ بات اس رائے کے سراسر خلاف ہے جس میں کہا گیا کہ قرآنِ کریم کے نسخے بلند کرنے کی سوچ عمرو بن العاص کی طرف سے ایک دھوکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کو نیزوں پر بلند کرنے کی

[1] الأخبار الطوال للدينوري، ص: 187، ودراسات في عهد النبوة، ص: 432. [2] وقعه صفين، ص: 482-485، و دراسات في عهد النبوة، ص: 433.

سوچ نئی نہیں تھی اور اس کے موجد عمرو بن العاص نہیں تھے بلکہ جمل کے موقعہ پر بھی قرآن پاک بلند کیا گیا اور اسے بلند کرنے والی شخصیت کعب بن سور، قاضی بصرہ کو تیر مارا گیا تھا جس سے وہ شہید ہو گئے۔

(د) یہ عمل وحی الٰہی کی اُس آواز پر لبیک کہنے کے مترادف ہے جو اصلاح کی دعوت پیش کر رہی تھی:

﴿ فَإِنْ تَنَٰزَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَ الرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴾

''اگر تمھارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔''[1]

اس بات کی تائید حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب ان کے سامنے کتاب اللہ کو حَکَم بنانے کی بات کی گئی تو انھوں نے فرمایا: ''میں اس کا زیادہ حق دار ہوں، ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔''[2]

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی شہادت اور اس کے اثرات ونتائج

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس صحیح اور ثابت حدیث کے معلوم ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تمھیں باغی گروہ قتل کرے گا۔''[3] ان کی شہادت کا صفین کے معرکہ پر اثر ہوا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علم میں یہ حدیث تھی، لہٰذا جدھر عمار جاتے وہ اُن کے ساتھ چل پڑتے تھے۔ خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ صفین میں موجود تھے، وہ پورے طور پر مسلح تھے، جب انھوں نے عمار کی شہادت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو انھوں نے اپنی تلوار سونتی اور اہل شام پر پل پڑے اور اُن کے خلاف خوب لڑائی کی، یہ اس لیے

[1] النسآء 4:59. [2] مصنف بن أبي شيبة: 8/336. [3] صحيح مسلم، حديث: 2916.

کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے خود یہ حدیث سنی تھی کہ عمار رضی اللہ عنہ کو باغی گروہ قتل کرے گا[1] انھوں نے لڑائی جاری رکھی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔[2]

حضرت عمار کی شہادت کے لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ پر بھی اثرات مرتب ہوئے۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی اہل شام کے لشکر میں داخل ہو گئے تو انھوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص، ان کے بیٹے عبداللہ بن عمرو اور ابوالاعور السلمی کو پانی کے گھاٹ پر پانی پیتے ہوئے دیکھا، یہ ایک ہی گھاٹ تھا جہاں سے دونوں فریق پانی لے رہے تھے اور وہاں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی شہادت پر گفتگو بھی کر رہے تھے اور وہاں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اپنے والد سے کہا: ہم نے اس آدمی کو قتل کر دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''اُسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔'' عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے یہی بات معاویہ رضی اللہ عنہ سے کی کہ رسول اللہ ﷺ نے عمار کے بارے میں یہ فرمایا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: چپ رہو۔ تم خواہ مخواہ بے ڈھنگی بات کر رہے ہو کیا ہم نے اسے قتل کیا ہے؟ اسے تو اس آدمی نے قتل کیا ہے جو اسے لے کر آیا ہے۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ کی بات اہل شام کے درمیان جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ایک اور صحیح روایت میں آیا ہے کہ عمرو بن حزم، عمرو بن العاص کے پاس آئے اور کہا: عمار شہید ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''انھیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔'' یہ سنتے ہی عمرو بن العاص گھبرا گئے۔ فوراً معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر کیا ہوا؟ عمرو نے کہا: حضور اکرم ﷺ نے ان سے متعلق یہ حدیث فرمائی ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں کہا: کیا بے ڈھنگی بات کر رہے ہو؟ کیا ہم نے انھیں قتل کیا ہے؟ انھیں تو علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے، وہ انھیں لے کر آئے اور ہمارے نیزوں کے آگے ڈال دیا، انھوں نے کہا کہ ہماری تلواروں کے سامنے ڈال دیا۔[4]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2916. [2] خلافة علي ص: 211، ومجمع الزوائد للهيثمي: 242/7.
[3] مسند أحمد: 206/2، اس کی سند حسن ہے۔ [4] مصنف عبدالرزاق: 240/11، اس کی سند صحیح ہے۔

ایک اور صحیح روایت میں ہے کہ دو آدمی معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے وہ عمار کے سر کے متعلق جھگڑ رہے تھے، ان میں سے ہر ایک کہہ رہا تھا: انھیں میں نے قتل کیا ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: تم دونوں خوش ہو جاؤ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ فرما رہے تھے ''انھیں باغی گروہ قتل کرے گا۔'' معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تمھارا ہم سے کیا مطلب ہے؟ انھوں نے کہا: (ایک مرتبہ) میرے ابا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''جب تک تمھارے والد زندہ ہیں ان کا کہا مانو۔'' میں تمھارے ساتھ ہوں (لیکن) اب میں نہیں لڑوں گا۔''[1]

سابقہ ذکر کی گئی روایات سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ فقیہ صحابی عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما خیر خواہی اور حق بات کہنے پر کتنے جری تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کا لشکر باغی فرقہ ہے کیوں کہ انھوں نے عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے، مختلف مواقع پر انھوں نے تکرار سے یہی بات کی۔ یقیناً اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ حدیث کے باعث عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت نے اہل شام پر اس کا اثر ڈالا۔ البتہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کی نامناسب تاویل کی اور یہ بات صحیح نہیں ہے کہ عمار کے قاتل وہ ہیں جو انھیں میدانِ جنگ میں گھسیٹ لائے۔[2]

عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت نے عمرو بن العاص پر بھی اثر ڈالا یہی وجہ ہے کہ انھون نے جنگ ختم کرنے کے لیے کوشش کی۔[3] اور پھر انھوں نے کہا: مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں آج سے بیس سال پہلے وفات پا جاتا۔[4] صحیح بخاری میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ہم ایک ایک اینٹ اٹھاتے تھے اور عمار رضی اللہ عنہ دو دو اینٹیں اٹھاتے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں دیکھا تو ان کے بدن سے مٹی جھاڑنے لگے پھر فرمایا: ''ہائے عمار رضی اللہ عنہ! ان کو باغی گروہ قتل کرے گا، یہ انھیں جنت کی دعوت دیں گے اور وہ انھیں جہنم کی طرف بلائیں گے'' عمار نے کہا: میں فتنوں سے پناہ مانگتا ہوں۔[5]

---

[1] مسند أحمد: 164/2. [2] خلافة علي لعبد الحميد: 325. [3] معاوية بن أبي سفيان للغضبان، ص: 215. [4] أنساب الأشراف: 170/1، وعمرو بن العاص للغضبان، ص: 603. [5] صحيح البخاري، حديث: 447.

ابن عبدالبر کہتے ہیں: نبی اکرم ﷺ سے تواتر کے ساتھ یہ احادیث بیان ہوئی ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ''عمار رضی اللہ عنہ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔'' یہ غیب کے متعلق خبریں اور ان کی نبوت کی علامات ہیں۔[1]

امام ذہبی اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: اس مضمون کی متعدد احادیث صحابہ سے مروی ہیں، یہ حدیث متواتر ہے۔[2]

باغی گروہ کے بارے میں علمائے کرام کی تشریحات

(ا) امام ابن حجر کہتے ہیں: اس حدیث میں علاماتِ نبوت میں سے ایک علامت کا ذکر ہے اور علی رضی اللہ عنہ و عمار رضی اللہ عنہ کی واضح فضیلت کا بیان ہے۔ اور ان ناصبیوں کی تردید ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ اپنی جنگوں میں حق پر نہیں تھے۔[3] وہ مزید کہتے ہیں: یہ حدیث ان جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحیح نقطۂ نگاہ کو اجاگر کرتی ہے کیونکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے ان کو شہید کیا۔[4]

(ب) امام نووی کہتے ہیں: صفین کے روز صحابہ، عمار کے پیچھے پیچھے تھے، وہ جدھر بھی رخ کرتے انھی کے ساتھ جاتے تھے کیونکہ حدیث کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عادل گروہ میں سے تھے۔[5]

(ج) قاضی ابوبکر بن العربی، فرمانِ الٰہی «وَإِنْ طَائِفَتَانِ» کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بنیادی طور پر مسلمانوں کے مابین لڑائی کے بارے میں ہے اور متاوّلین کے خلاف جنگ سے متعلق اصل بنیاد ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی بات کو قابل اعتماد قرار دیا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی تمام بڑی شخصیات کا میلان بھی اسی طرف ہے اور نبی اکرم ﷺ کے قول ''عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا'' سے بھی یہی مراد ہے۔[6]

---

[1] الاستیعاب: 1140/3. [2] سیر أعلام النبلاء: 421/1. [3] فتح الباري: 646/1. [4] فتح الباري: 92/13. [5] تهذيب الأسماء واللغات: 38/2. [6] أحكام القرآن: 1717/4.

(د) امام ابن تیمیہ: یہ حدیث امامتِ علی کے صحیح ہونے اور ان کی اطاعت واجب ہونے پر دلیل ہے، اور ان کی اطاعت کی طرف دعوت دینے والا جنت کی طرف دعوت دینے والا ہے، اور ان کے خلاف لڑائی کی دعوت دینے والا ہر چند وہ متاوّل ہو، جہنم کی طرف دعوت دینے والا ہے اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے خلاف قتال جائز نہیں تھا، لہٰذا ان کے خلاف لڑنے والے کو چاہے وہ متاوّل ہو یا باغی ہو، خطا کار کہا جائے گا۔ ہمارے اصحاب کے دونوں اقوال میں سے یہ صحیح ترین قول ہے اور وہ یہ کہ علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے والا غلطی پر ہے۔ ہمارے اصحاب میں ائمہ کا یہی مسلک ہے اور اُن ائمہ فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے جنھوں نے متاوّلین باغیوں کے خلاف لڑائی کو صحیح قرار دیا ہے۔[1]

ابن تیمیہ مزید کہتے ہیں: باوجود یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق سے قریب تر ہیں اور باوجود یہ کہ عمار رضی اللہ عنہ کو باغی گروہ نے قتل کیا۔ جیسا کہ نصوص سے ثابت ہے ہم پر لازم ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا، ہم اسے مان لیں اور پورے حق کا اقرار کریں، خواہش کے پیچھے نہ چلیں، بغیر علم کے گفتگو نہ کریں، بلکہ ہمیں علم اور عدل کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور کتاب وسنت کی پیروی کا یہی طریقہ ہے۔ جو شخص پورے حق کو ماننے کی بجائے کچھ حق کو مانے اور کچھ کو نہ مانے، بس یہی بات افتراق واختلاف کی بنیاد ہے۔[2]

(ہ) عبدالعزیز بن باز کہتے ہیں: حدیث عمار کے مطابق، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے صفین کے واقعہ میں عمار کو قتل کیا۔ لہٰذا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی باغی ہیں، لیکن ہم انھیں مجتہد کہیں گے، انھوں نے گمان کیا کہ وہ خونِ عثمان کا مطالبہ کرنے میں صحیح نقطۂ نگاہ پر تھے۔[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ: 4/437. [2] مجموع الفتاوی: 4/449، 450. [3] فتاوی و مقالات متنوّعة: 6/87.

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل پر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کا تبصرہ
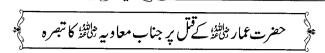
عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے قتل کی تفصیلات

ابو الغادیہ الجھنی عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے بارے میں کہتا ہے۔

صفین والے روز میں شروع میں ایک آدمی کو تلاش کر رہا تھا وہ دو صفوں کے درمیان تھا، ایک شخص نے خالی جگہ دیکھی اور اسی آدمی کے گھٹنے پر تیر مارا، وہ گر پڑا اور اس کا خود کھل گیا میں نے اس کے سر پر زور سے ضرب لگائی تو دیکھا کہ وہ عمار کا سر تھا۔ پھر عمار شہید ہو گئے۔

راوی کہتے ہیں: ابو الغادیہ نے پانی مانگا۔ اسے شیشے کے برتن میں پانی دیا گیا، اس نے پینے سے انکار کیا تو مٹی کے ایک پیالے میں پانی لایا گیا تو وہ پی گیا، ایک آدمی نے کہا: کیا خوب، شیشے کے برتن میں پانی پینے سے پرہیز ہے اور عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے سے گریز نہیں۔[1] عمرو بن عاص کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: عمار کا قاتل اور اس پر ننگی تلوار چلانے والا جہنم میں جائے گا۔[2]

امام ابن کثیر کہتے ہیں: یہ بات معلوم ہے کہ عمار رضی اللہ عنہ، صفین کے روز لشکر علی میں تھے، انھیں اہل شام میں سے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے شہید کیا، اس کے قتل کا ذمہ دار ابو الغادیۃ ہے وہ ضعیف العقل شخص تھا۔[3]

امام ابن حجر کہتے ہیں: صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اس قسم کی جنگوں میں یہ گمان کرنا چاہیے کہ وہ اجتہاد کرنے والے تھے۔ غلطی کرنے والے مجتہد کے لیے بھی ایک اجر ہے، جب کسی ایک عام مجتہد کے لیے ثابت ہے کہ غلطی کرنے کی صورت میں اُس کے لیے ایک اجر ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے تو یہ بالا ولیٰ ثابت ہوتا ہے۔[4]

[1] الطبقات الکبریٰ: 261,260/3، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] السلسلة الصحیحة: 18/5، 19، حدیث: 2008.
[3] البدایة والنهایة: 220/6. [4] الإصابة: 260/7.

شیخ البانی نے امام ابن حجر کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

یہ بات حق ہے لیکن ہر فرد پر اس کا انطباق کرنے میں اشکال ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابو الغادیہ جو حضرت عمار کا قاتل ہے اس کے لیے اجر ہے کیونکہ اس نے انھیں اجتہادی اعتبار سے قتل کیا اور رسول اکرم ﷺ اس کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ ''عمار کا قاتل جہنم میں جائے گا۔'' صحیح بات یوں ہے کہ یہ کہا جائے کہ قاعدہ صحیح ہے مگر جب کوئی قطعی دلیل اس کے برعکس ہو، پھر ٹھیک نہیں ہے، جیسا کہ یہ معاملہ یہاں درپیش ہے۔ اِسے اجتہاد والے قاعدے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا، یہ بات اس امر سے بہتر ہے کہ صحیح حدیث کے ساتھ اس کا تعارض کیا جائے۔[1]

ابن عبدالبر نے ابو الغادیہ الجہنی کا تعارف کراتے ہوئے کہا ہے: اس کے نام میں اختلاف ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کا نام یسار بن سبع ہے، اور اسے یسار بن ازہر بھی کہتے ہیں، بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس کا نام مسلم تھا، شام کے علاقے واسط کا رہنے والا تھا، اس کا شمار شامیوں میں ہوتا ہے، وہ لڑکپن کی عمر میں رسالت مآب ﷺ سے ملا، اُسی سے مروی ہے: اس وقت چھوٹا سا لڑکا تھا جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، اُن دنوں میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چراتا تھا۔''

نبی ﷺ سے اُس کا سماع بھی ثابت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارتے پھرو۔''[2]

وہ عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت محبت کرتا تھا یہی شخص عمار بن یاسر کا قاتل ہے۔ جب اس سے اس قتل کے بارے میں پوچھا جاتا تو بڑی بے پروائی سے اُس کی تفصیل بیان کیا کرتا تھا۔ اہل علم اس کا قصہ پڑھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔[3]

---

[1] السلسلة الصحيحة: 18/5، 19، حديث: 2008. [2] مسند أحمد: 76/4، اس کی سند حسن ہے۔

[3] الاستيعاب في معرفة الأصحاب، حديث: 3089.

جنگ کے دوران اعلیٰ شرافتوں کا مظاہرہ

صفین کا واقعہ، مسلمانوں کے عجیب وغریب واقعات میں سے ہے، یہ واقعہ اس حد تک تعجب انگیز ہے کہ جو شخص اسے پڑھتا ہے اس کا دل اسے تسلیم کرنے پر مائل نہیں ہوتا۔ وہ دونوں فریقوں کے نہایت مہذب اور شریفانہ طریقے دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ میدانِ صفین کا منظر یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک جنگ کے دوران تلوار سونتے کھڑا ہے اور اُسے اپنے موقف کی سچائی پر مکمل ایمان ہے۔ یہ معرکہ اپنے اسباب اپنے ظہور، اپنے طریق جنگ اور اپنے بعد چھوڑے آثار غرضیکہ ہر لحاظ سے یکتائے روزگار تھا۔ اس جنگ کے شرکاء کے دلوں میں اس کے جو اسباب کام کر رہے تھے اُن کا اظہار ان کے بعض بیانات سے ہوتا ہے جو ہم تک تاریخی سرمائے کی صورت میں پہنچے ہیں، وہ سب مسلمان بھائی تھے، اکٹھے پانی کی جگہ پر جاتے تھے، وہاں باہم مل جل کر پانی پیتے تھے، سب کا ہجوم ہو جاتا تھا تو کوئی ایک دوسرے کو تکلیف نہیں پہنچاتا تھا۔[1] جب لڑائی کچھ دیر کے لیے تھم جاتی تھی تو ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ اس جنگ کے شرکاء میں سے ایک صاحب کا کہنا ہے: جب لڑائی رک جاتی تھی تو، ہم میدانِ جنگ سے واپس آ جاتے تھے، پھر ہم ان کے خیمے میں اور وہ ہمارے خیمے میں آ بیٹھتے تھے۔ وہ ہم سے باتیں کرتے تھے اور ہم ان سے باتیں کرتے تھے۔[2]

یوں لگتا تھا جیسے ہم سب ایک ہی قبیلہ کے چشم و چراغ ہیں، ہر شخص اپنا اجتہاد پیش کرتا تھا۔ پھر جب میدانِ جنگ میں جاتے تو پھر ہم ایک ہی قبیلے کے بیٹے ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ بڑی سخت لڑائی ہوتی تھی۔[3]

ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حق پر سمجھتا اور اس مقصد کی خاطر قتل ہو جانے کے

[1] تاريخ الطبري: 610/5. [2] سير أعلام النبلاء: 41/2، و مرويات أبي مخنف، ص: 296. [3] البداية والنهاية: 270/7، و دراسات في عهد النبوة، ص: 423.

لیے تیار رہتا تھا۔ دو آدمی مدمقابل ہو جاتے تو آپس میں لڑتے تھے، ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے، تھک جاتے۔ تو دونوں بیٹھ جاتے تھے، استراحت کرتے تھے، پھر آپس میں بہت سی باتیں ہوتی تھیں، پھر کھڑے ہو جاتے اور پہلے کی طرح لڑنا شروع کر دیتے۔ [1] وہ دونوں ایک ہی دین کے بیٹے تھے، وہ دین دونوں فریقوں کے مابین قدرِ مشترک تھا۔ یہی دین ان سب کو اپنی جان سے زیادہ پیارا تھا۔ نماز کا وقت آتا تو وہ دونوں فریق ادائے نماز کے لیے وقفہ کر لیتے تھے۔ [2] اور جس دن عمار بن یاسر شہید ہوئے، دونوں طرف کے لوگوں نے اُن کی نماز جنازہ ادا کی۔ [3]

ایک عینی شاہد جو صفین میں شریک ہوئے کہتے تھے: ہم نے صفّین میں پڑاؤ ڈالا، کچھ دن لڑائی جاری رہی، دونوں طرف سے بہت سے افراد مارے گئے، گھوڑے بھی شدید زخمی ہوئے، یہ حال دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص کو پیغام بھیجا کہ مقتولین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ رک جایئے، تاکہ سب لوگ اپنے اپنے مقتولین کو دفن کر لیں۔

انھوں نے یہ بات مان لی، پھر سب لوگ آپس میں ایک مل جل گئے، وہ یک جان دو قالب نظر آ رہے تھے، جیسے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سمو دی گئی ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے ایک مقتول کے ساتھ گزرے۔ انھوں نے دیکھا تو رو پڑے اور مقتول کے بارے میں فرمایا: یہ مجتہد تھے، اللہ کے معاملے میں ہم سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔ [4] اس قسم کے مواقع پر بھی وہ آپس میں نھی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ وہاں ایک ٹولہ تھا اس ٹولے کے لوگ قُرّاء کہلاتے تھے، وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اہل شام میں سے اُن کے شاگرد تھے، وہ امیر المومنین

[1] تاریخ الطبری، منقول از دراسات فی عهد النبوية، ص: 424. [2] تاریخ دمشق: 2339/18، دراسات فی عهد النبوة، ص: 424. [3] أنساب الأشراف: 56/6، عتبہ تک اس کی سند حسن ہے، خلافة علی لعبدالحمید، ص: 241. [4] أنساب الأشراف: 56/6، عتبہ تک اس کی سند صحیح ہے، خلافة علی رضی اللہ عنہ لعبدالحمید، ص: 421.

علی رضی اللہ عنہ سے ملے، نہ ہی معاویہ رضی اللہ عنہ سے۔ انھوں نے امیر المومنین سے کہا: ہم آپ کے ساتھ ہوں گے لیکن آپ کے خیموں میں نہیں ہوں گے، ہم علیحدہ قیام کریں گے، آپ کے اور اہل شام کے معاملات دیکھیں گے، ہم جسے بھی دیکھیں گے غلط کام کر رہا ہے یا زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے تو اس پر نظر رکھیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سبحان اللہ! یہی بات تو دین میں تفقہ، اور سنت کے علم کا تقاضا ہے، جو اس پر راضی نہ ہو وہ ظالم اور خائن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا موقف قناعت اور اجتہاد سے پیدا ہوتا ہے، دل کو اسی سچائی پر جما کر لڑائی میں حصہ لینا چاہیے۔[1]

قیدیوں سے حُسنِ سلوک

لڑائی کے دوران صفین میں فریقین نے نہایت شریفانہ اور کریمانہ رویہ اختیار کیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ قیدیوں کے ساتھ بھی اچھے سلوک اور اکرام کا معاملہ کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کا احترام ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی اور تاکید فرمائی ہے کہ جو کھانا میسر ہو اس میں سے بہتر کھانا قیدیوں کو کھلایا جائے۔ غیر مسلموں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا تھا تو مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیوں نہ کیا جاتا؟ تاہم قیدی کو اس جنگ میں اپنے گروہ کی طاقت سمجھا جاتا تھا[2] لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ حریف کے قیدی کو حفاظت سے قید میں رکھنے کا حکم دیتے تھے، اگر وہ بیعت کر لیتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے، انکار کرتا تھا، تو اس کے ہتھیار اور سواری لے لیتے تھے یا یہ چیزیں واپس کر کے اس سے لڑائی نہ کرنے کا حلف لیتے تھے۔ روایت کے مطابق اُسے چار درہم مرحمت فرماتے تھے۔[3] اس عمل کا مقصد باغیوں کو کمزور کرنا تھا۔ صفین کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، قیدی نے کہا: مجھے باندھ کر قتل نہ کیجیے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اللہ رب العالمین

[1] صفین، ص: 115، دراسات فی عهد النبوة، ص: 424. [2] الحاوی الکبیر، کتاب قتال أهل البغی، ص: 134,133. [3] خلافه علی بن أبی طالب لعبدالحمید، ص: 424.

سے ڈرتا ہوں، تمھیں باندھ کر قتل نہیں کروں گا۔ پھر اسے چھوڑ دیا اور فرمایا: کیا تم میں کوئی بھلائی موجود ہے؟ کیا تم بیعت کرو گے؟ [1]

ایک مرتبہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس پندرہ قیدی لائے گئے، وہ زخمی تھے، ان میں سے جو زخموں کی وجہ سے فوت ہو گئے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں غسل دیا، کفن پہنایا، اور ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ [2]

محبّ الدین خطیب اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: انتہائی المناک ہونے کے باوجود یہ ایک مثالی جنگ تھی، انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی جنگ تھی جس میں دونوں طرف سے لڑنے والے اعلیٰ فضائلِ اخلاق کا نمونہ تھے۔

آج غیر مسلم بھی اسلامی قوانین کے آرزومند ہیں

آج 21 ویں صدی میں بھی دنیا کے بہت سے انسان دوست غیر مسلم بھی آرزومند ہیں کہ جنگوں میں انسانی حقوق ملحوظ رکھے جائیں اور اسلامی اخلاق کا اطلاق کیا جائے۔ اگر جمل وصفین جیسی جنگیں نہ ہوتیں تو دنیا کو اسلام کے جنگی قوانین کا علم ہی نہ ہو پاتا۔ یقیناً ہر معاملے میں اللہ کی بے پایاں حکمتیں کارفرما ہیں۔ [3]

مقتولین کی تعداد

مقتولین کی تعداد کے بارے میں علمائے کے اقوال میں اختلاف ہے۔ ابن ابی خیثمہ نے ذکر کیا ہے کہ صفّین میں مقتولین کی تعداد ستر ہزار تک پہنچتی ہے۔ اہل عراق کے پچیس ہزار اور اہل شام کے پینتالیس ہزار جنگجو مارے گئے تھے۔ [4] ابن القیم نے بھی مقتولین کی تعداد ستر ہزار یا اس سے کچھ زیادہ بیان کی ہے۔ [5] اس میں شک نہیں کہ یہ تعداد باریک بینی سے

[1] كتاب الأُم للإمام الشافعي: 4/224,8/256. [2] تاريخ دمشق، تحقيق المنجد: 1/331، خلفة على بن أبى طالب، ص: 243. [3] العواصم من القواصم، ص: 169,168. [4] الأنباء القضاعي ص: 59، منقول از خلافه علي، ص: 246. [5] الصواعق المرسلة: 1/377، یہ بغیر سند کے ہے اور محمد دخیل اللہ کی تحقیق کے ساتھ ہے۔

بیان نہیں کی گئی بلکہ تخمینہ ہی بتایا گیا ہے۔ حقیقی لڑائی تین دن تک جاری رہی، جمعہ کی شام کے علاوہ ہر روز شام کو لڑائی روک دی جاتی تھی، مجموعی طور پر لڑائی تقریباً تیس گھنٹے ہوئی۔ [1] لڑائی بے شک شدید تھی، لیکن اس کی شدت جنگ قادسیہ سے زیادہ نہ تھی جس میں شہداء کی تعداد ساڑھے آٹھ ہزار تھی۔ [2] اس کا مطلب یہ ہوا کہ عقل مقتولین کی اتنی بڑی تعداد کو صحیح نہیں مان سکتی جو مختلف روایات میں بیان کی گئی ہے۔

اپنے اور لشکرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتولوں کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دعا

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگی دورے ختم کرنے کے بعد مقتولین کو تلاش کرتے اور ان کے حالات معلوم کرتے تھے، ایک عینی شاہد کا بیان ہے: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہباء نامی خچر پر بیٹھے ہوئے دیکھا، وہ مقتولین کا جائزہ لے رہے تھے۔ [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتولین کے قریب کھڑے ہو کر دونوں اطراف کے مقتولین کے لیے یہ دعا کرتے رہے: اللہ تعالیٰ تمھاری بخشش فرمائے، اللہ تمھاری بخشش فرمائے۔

یزید بن اصم کہتے ہیں: جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین صلح ہو گئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ باہر نکلے، وہ اپنے مقتولین کے درمیان چل رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ جنت میں ہیں، پھر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتولین کی طرف گئے اور فرمایا: یہ بھی جنت میں ہیں۔ معاملہ میرے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ ہے۔ [4] پھر آپ نے معاویہ اور ان کے مقتولین کے بارے میں فرمایا: وہ مومن ہیں۔ [5] فی الجملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صفین کے موقع پر بھی وہی باتیں کہیں جو جمل کے موقع پر ارشاد فرمائی تھیں۔ [6]

[1] الدولة الأموية، ص: 360-362. [2] تاریخ الطبری: 388/4. [3] خلافة علی رضی اللہ عنہ، لعبدالحمید، ص: 250، تنزیه خال المؤمنین، ص: 168. [4] مصنف ابن أبی شیبة: 303/15، اس کی سند حسن ہے۔
[5] تاریخ دمشق: 329/1-331، خلافة علی رضی اللہ عنہ، ص: 251. [6] خلافة علی رضی اللہ عنہ، لعبدالحمید، ص: 251، تنزیه خال المومنین، ص: 169.

روم کے بادشاہ کو معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتباہ

روم کے بادشاہ نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین پیش آمدہ صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیر نگیں کچھ زمینوں کو اپنے ملک میں شامل کرنے کی کوشش کی۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: روم کے بادشاہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ڈرانے دھمکانے اور ان کے لشکر پر غالب آنے کی کوشش کی۔ جب روم کے بادشاہ نے دیکھا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالمقابل جنگ میں مشغول ہیں تو بڑا لشکر لے کر مسلمانوں کے علاقے کی طرف پیش قدمی کی کوشش کی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے فوراً لکھ بھیجا: اے ملعون! اگر تم باز نہ آئے اور اپنے علاقے کی طرف نہ لوٹے تو میں اپنے چچا زاد کے ساتھ صلح کر کے تمھیں تمھارے وطن سے بھی نکال دوں گا اور تم پر زمین کی وسعت تنگ کر دوں گا۔

روم کا بادشاہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مصالحت کا خط لکھا۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ بہت عظیم شخص تھے اور اپنے دل میں دین کی غیرت رکھتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اہلِ قبور سے رقت انگیز خطاب

جب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ صفین سے واپس روانہ ہوئے تو ایک قبرستان سے گزرے، وہاں انھوں نے دعا کرتے ہوئے کہا: اے ویران گھروں میں رہنے والو! تمھیں سلام ہو، اے بے آباد سناٹے کے مکینو! مومن مردو اور مومن عورتو! مسلمان مردو اور مسلمان عورتو! تم ہم سے پہلے یہاں آ گئے، ہم بھی تمھارے پیچھے آنا ہی چاہتے ہیں، ہم عنقریب تم سے آ ملیں گے، اے اللہ! ہمیں اور انھیں بخش دے، ہم سے اور ان سے درگزر فرما۔ ہر قسم کی تعریف اس

[1] البداية والنهاية: 122/8.

اللہ کے لیے ہے جس نے زمین کو زندہ اور مردہ لوگوں کو جمع کرنے والا بنایا، ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے تمھیں پیدا کیا۔ وہ اسی زمین سے تمھیں دوبارہ اٹھائے گا، اور اسی زمین پر تمھیں میدان حشر میں جمع کر دے گا۔ اسے مبارک ہو جسے آخرت یاد ہے، جو حساب کتاب کے لیے تیاری کرتا ہے اور ضرورت کے مطابق عطا شدہ رزق پر قناعت کرتا ہے۔[1]

قاتلین عثمان کا اصرار جنگ

قاتلینِ عثمان اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ دونوں فریقوں کے مابین جنگ جاری رہے، تا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان فنا ہو جائیں، دونوں فریقوں کی قوّت کمزور پڑ جائے اور وہ کیفر کردار تک پہنچنے سے بچے رہیں۔

جب انھوں نے اہل شام کو دیکھا کہ وہ قرآن پاک کے نسخے بلند کر رہے ہیں تو وہ گھبرا گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مد مقابل کی بات تسلیم کر رہے تھے اور لڑائی روکنے کا حکم دے رہے تھے۔ انھوں نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو ان کے عزم سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن لڑائی رک گئی، اب ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کریں، اس لیے انھوں نے ایک جملہ گھڑ لیا: «اَلْحُکم لِلّٰہ» ''یعنی حکم اللہ کا'' وہ یہی نعرہ لگاتے ہوئے میدان سے نکل گئے اور دونوں فریقوں سے دور محفوظ جگہ پر چلے گئے۔

عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس مرحلہ پر ان لوگوں نے جو کچھ کیا، مؤرخین نے اس پر توجہ مرکوز نہیں کی۔ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ نے جمل کے معرکے میں جو فساد برپا کیا تھا، ویسا ہی فساد انھوں نے لشکرِ علی رضی اللہ عنہ میں موجود ہونے کے باوجود صفین کے موقع پر بھی برپا کیا۔ فریقین کے مابین صلح کی ہر تدبیر ناکام کرنے کی کوشش کی کیونکہ علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان صلح کا مطلب یہ تھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا معاملہ بھی طے کیا جائے، جمل کے موقع پر انھوں نے جو کچھ کرنے کی کوشش کی تھی، کیسے ممکن تھا کہ وہ صفین میں یہ کوشش ترک کر دیتے۔[2]

[1] البيان والتبيين للجاحظ: 148/2، وفرائد الكلام للخلفاء الكرام، ص: 327. [2] أحداث وأحاديث فتنة الهرج، ص: 147.

تحکیم کی اصل حقیقت
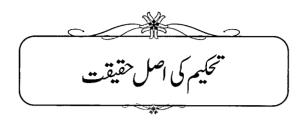
دونوں فریقوں کے مابین، سانحۂ صفّین کے اختتام پر تحکیم کا متفقہ فیصلہ ہوا۔ تحکیم کا مطلب یہ ہے کہ دونوں فریق اپنا اپنا معتمد آدمی منتخب کریں اور انھیں اپنی اپنی طرف سے حکم مقرر کریں، پھر دونوں حکم مل کر مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں کسی فیصلہ پر متفق ہو جائیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اپنا اپنا نمائندہ مقرر کیا، اس سلسلے میں دونوں فریقوں کے مابین ایک دستاویز تحریر کی گئی دونوں جانب کے حکم نمائندوں نے ماہِ رمضان سن 37 ہجری کو دومۃ الجندل میں جمع ہونے کا فیصلہ کیا۔ لشکر علی رضی اللہ عنہ کے کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ ان کا یہ عمل ایسا گناہ ہے جو کفر کو واجب کرتا ہے، اس لیے انھیں اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنی چاہیے۔ انھوں نے خروج کیا۔ یہی لوگ خوارج کہلائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بھیجا انھوں نے ان سے مناظرہ کیا، پھر بذات خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے مناظرہ اور مذاکرات کیے، ان میں سے کچھ لوگ واپس آ گئے، لیکن ایک گروہ انکاری رہا۔ بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے مابین جنگیں ہوئیں۔ یوں ان کا لشکر کمزور ہو گیا۔ یہی صورت حال مسلسل جاری رہی تا آنکہ انھیں دھوکے سے شہید کر دیا گیا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

خلافت راشدہ کی تاریخ میں تحکیم کا قضیہ اہم ترین موضوعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں بہت سے لکھاری گم گشتہ راہ ہو گئے۔ کچھ لوگ اس بارے میں ٹامک ٹوئیاں

مارتے رہے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ضعیف اور من گھڑت روایات پر اعتماد کیا گیا ہے، ان روایات میں سارے قصے کی شکل بگاڑ دی گئی ہے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہا ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) ضعیف العقل اور کمزور رائے والے آدمی تھے۔ ان میں غفلت کا پہلو غالب تھا، یہی وجہ ہے کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انھیں تحکیم کے معاملے میں دھوکا دیا۔ اور انھوں نے عمرو بن العاص کے بارے میں کہا ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) مکار اور دھوکے باز تھے۔ دینِ اسلام سے کینہ وبغض رکھنے والوں نے ساری قابل مذمت صفات ان دونوں عظیم شخصیات کے سر تھوپنے کی کوشش کی ہے جنھیں مسلمانوں نے اس لیے منتخب کیا تھا تاکہ وہ اس بہت بڑے اختلاف پر فیصلہ دیں جو بہت سارے مسلمانوں کے قتل کا موجب بن گیا تھا۔ بہت سے مؤرخین ادباء اور محققین نے دشمنانِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی من گھڑت روایات پر اعتماد کرتے ہوئے ان واقعات کو تاریخی حقائق کا نام دیا ہے اور لوگوں نے بغیر نقد و جرح یہ اس طرح تسلیم کر لی ہیں جیسے یہ سب صحیح ہیں اور ان میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں بھڑکانے والی من گھڑت کہانیاں اس انداز سے پیش کی گئی ہیں کہ لوگ ان کے جھانسے میں آ گئے۔ یہ ساری گفتگو اصل تحکیم کے بارے میں نہیں ہے دیگر ضمنی تفصیلات سے متعلق ہے۔ تحکیم کی بنیاد حق اور سچ ہے اس پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔[1]

میں نے مناسب سمجھا کہ اس بحث کے شروع میں دونوں صحابہ، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سیرت بیان کی جائے۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے قبول اسلام کے بعد اپنی ساری زندگی کی تبلیغ قرآن کی تعلیم، علمِ قراءت دینی تربیت جہاد فی سبیل اللہ، جھگڑوں کے فیصلوں، عدل و انصاف کی فراہمی قضاء اور انتظامی اصلاحات کے ذریعے نظام حکومت پر کنٹرول کرنے میں صرف کر

[1] مرويات أبي مخنف في تاريخ الطبري، ص: 378، وتنزيه خال المؤمنين معاويه رضي الله عنه، ص: 38.

دی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ساری مہمات بہت مشکل ہیں اور علمی اعتبار سے مہارت اور انفرادی اوصاف کی متقاضی ہیں۔ ان سب امور میں ذہانت، مہارت، تقویٰ اور زہد کی اشد ضرورت ہے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ان تمام خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر پورا اعتماد کیا۔[1] کیا اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ جس شخصیت پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم نے اعتماد کیا ہو، ان پر دھوکا دہی جیسے امور کا الزام دیا جائے جیسا کہ قصۂ تحکیم میں روایت کیا گیا ہے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے اہل عراق کے نمائندہ حکم بننے کے لیے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا انتخاب، حالات و واقعات سے بڑی گہری مطابقت رکھتا ہے، کیونکہ اگلا مرحلہ صلح اور وحدت المسلمین کا تھا اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ صلح، امن اور وحدتِ امت کے داعیوں میں سے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ عراقی قبائل کی نظر میں بڑے محبوب اور امانت دار سمجھے جاتے تھے، اور ثقہ کتب یہی بتاتی ہیں کہ انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نے صلح کے مشن کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

خلیفہ، اپنی کتاب ''تاریخ'' میں کہتے ہیں: سَن سینتیس 37 ھ میں دونوں حَکَم یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے عمرو بن العاص اکٹھے ہوئے۔[3] ابن سعد کہتے ہیں: لوگوں نے جنگ کو ناپسند کیا اور صلح کے داعی بن گئے اور مذکورہ دونوں حکم، یعنی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص اپنی ذمہ داری پر مامور ہو گئے۔[4] البتہ شیعی انداز فکر کے لوگوں کو یہ پسند نہیں تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کریں اور اپنے روایتی دشمنوں سے صلح کے لیے راغب ہو جائیں۔ دوسری طرف وہ اس کی ساری ذمہ داری ان کے دشمن خوارج پر ڈالتے تھے، انھی لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تحکیم کا معاملہ قبول کرنے پر زور ڈالا

[1] خلافة علی بن أبی طالب لعبدالحمید، ص: 262. [2] تحقیق مواقف الصحابة فی الفتنة: 227/2.
[3] تاریخ خلیفة، ص: 192,191. [4] الطبقات: 32/3.

اور وہی لوگ تحکیم قبول کرنے پر ان کے خلاف ہو گئے۔[1]

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے متعلق اس گفتگو کا تذکرہ

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تذکرہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور ان کے دور کے بیان سے بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ ان کے دور کی مؤثر شخصیتوں میں سے تھے، حالت یہ ہے کہ جب بھی صفین اور تحکیم سے متعلق گفتگو کی جاتی ہے تو ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو جھوٹ اور افترا پردازی جیسی تہمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اشکالات کا ازالہ کریں جو کہ ان عظیم حضرات کے تذکرے کا بنیادی مقصد ہے۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''لوگ اسلام لائے اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔''[2] ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''العاص کے دونوں بیٹے عمرو اور ہشام مومن ہیں۔''[3] عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ مدینہ میں خوف کا ماحول پیدا ہو گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر کھسک گئے، میں نے سالم کو دیکھا۔ وہ تلوار تھام کر آئے اور مسجد میں بیٹھ گئے۔ میں نے اُنھیں دیکھا تو میں نے بھی ان کی پیروی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، پھر مجھے اور سالم کو دیکھا، بعدازاں آپ نے لوگوں سے فرمایا: ''اے لوگو! خوف کی حالت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں (یعنی مسجد میں) پناہ لو۔ تمھیں ان دونوں مومن مَردوں کی طرح عمل کرنا چاہیے تھا۔''[4]

---

[1] تحقیق مواقف الصحابة: 2/215. [2] سلسلة الأحاديث الصحيحة: 1/238، حديث: 55. [3] الطبقات: 4/191، والسلسلة الصحيحة: 1/240، حديث: 156. [4] مسند أحمد: 1/203، اس کی سند حسن ہے۔

عمرو رضی اللہ عنہ کو دوسروں پر فوقیت

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا: ''جب سے میں نے اور خالد بن الولید نے اسلام قبول کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو ہمارے برابر قرار نہیں دیا۔''[1] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بارے میں گواہی دی کہ وہ قریش کے صالحین میں سے ہیں۔ ابو ملیکہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''عمرو بن العاص قریش کے صالحین میں سے ہیں۔''[2] یہاں سے یہ سبق ملتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی اصلیت خوب پہچانتے تھے اور ان سے ان کی صلاحیت کے مطابق اسلام کے فروغ کے لیے خوب کام لیتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن العاص کو بحرین روانہ کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونگھ آ گئی، جب آنکھ کھلی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ عمرو رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔'' ہم آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ عمرو کس کا نام ہے؟ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر اُونگھ آئی، آنکھ کھلی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ عمرو رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیسری بار پھر اونگھ آ گئی، جب آنکھ کھلی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: ''اللہ عمرو رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔'' ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، عمرو کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمرو بن العاص۔'' ہم نے عرض کیا: اس کا کیا معاملہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اُن کی یاد آ رہی تھی، میں جب بھی اُن سے اللہ کی راہ میں صدقے کے لیے کہتا وہ بہت سارا مال پیش کر دیتے تھے، میں پوچھتا یہ کہاں سے لائے ہو؟ وہ کہتے تھے: اللہ کی بارگاہ سے لایا ہوں۔'' عمرو رضی اللہ عنہ نے بالکل سچ کہا، اللہ تعالیٰ کے ہاں عمرو رضی اللہ عنہ کے لیے خیر کثیر موجود تھی۔

زہیر کہتے ہیں: جب فتنہ کے واقعات رونما ہوئے تو میں نے اپنے دل میں کہا:

[1] دلائل النبوة للبيهقي، باب اسلام عمرو بن العاص: 4/346. [2] جامع الترمذي، كتاب المناقب، باب مناقب عمرو بن العاص، حديث: 3844.

رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کے پیش نظر میں فتنہ میں ان کا ساتھ دوں گا، پھر میں ان سے کبھی جدا نہیں ہوا۔ [1]

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے کارنامے

رسالت مآب ﷺ نے جلندی کے دونوں بیٹوں ''جیفر اور عباذ'' کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ انھوں نے ان کو اسلام کی دعوت پیش کی انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی تصدیق کی، صدقہ دیا اور قوم کے مابین دیگر فیصلوں کے لیے ان کا ساتھ دیا، اور وہ دونوں بھائی ان کے مخالفین کے بالمقابل ان کے مددگار بن گئے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کے ساتھ فلسطین روانہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن کو اختیار دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی تفویض کردہ ذمہ داری کو ادا کریں یا جو دنیا و آخرت کے لیے بہتر ہو، اُسے پیش نظر رکھیں۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھ بھیجا کہ میں اسلام کے تیروں میں سے ایک تیر ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے بعد اس تیر کو پھینکنے والے آپ ہی ہیں اور تیروں کو اپنے پاس جمع رکھنے والے بھی آپ ہی ہیں جو تیر زیادہ شدید اور افضل نظر آئے اُسے دشمن کی طرف پھینکیے۔ [3]

جب وہ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں حکم دیا کہ آپ مدینہ سے چلے جائیں اور لشکر تیار کریں تا کہ لوگ متوجہ ہو کر تیاری میں لگ جائیں، پھر انھیں ایک لشکر سونپ کر شام کی طرف روانہ کیا۔ [4]

یرموک کے معرکہ میں عمرو میمنہ پر تھے، اس جنگ میں ان کی شرکت مسلمانوں کی کامیابی میں مددگار ثابت ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمرو بن العاص شام میں رہے، اور شام میں اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں اُن کی شرکت فعال بنیادوں پر

---

[1] المعجم الكبير: 18/5، والمستدرك: 455/3، امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے کہا: یہ صحیح ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ [2] الطبقات: 262/1، جوامع السيرة لابن حزم، ص: 24-29.
[3] إتمام الوفاء بسيرة الخلفاء، ص: 55. [4] فتوح الشام للبلاذری، ص: 48-51.

تھی۔ انھوں نے شرحبیل بن حسنہ کو ساتھ ملا کر بیسان، طبریہ اور اُجنادین کے علاقے فتح کیے۔[1] انھوں نے غزہ، لُدّ، یُبنٰی عمواس، بیت جبرین، یافا، رفح اور بیت المقدس بھی فتح کیے، مزید برآں مصر کے مشہور شہر بھی فتح کیے۔ عمر بن الخطاب نے، حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ شام کی فتوحات کے بعد تمام لشکر لے کر مصر کا رخ کریں۔ وہ نکل کھڑے ہوئے تا آنکہ عریش تک پہنچے اور اُسے فتح کیا۔ ان کی فتوحات میں الفرما، الفسطاط، بابلیون کا قلعہ، عین شمس، الفیوم، الأشمونین، اُخمیم، البشرود، تنیس دمیاط، تونہ، دقھلہ، الاسکندریہ اور افریقہ کے علاقے برقہ، زویلہ اور طرابلس بھی شامل تھے۔[2]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی قائدانہ صلاحیت کی گواہی دیتے ہوئے کہتے ہیں: ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ کے لیے زمین پر چلتے ہوئے امیر سے کم اور کوئی عہدہ مناسب نہیں۔[3] عہد عثمانی میں وہ خلیفہ کے مقربین میں تھے۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حقیقی شخصیت یہ ہے کہ وہ اصول کے بڑے پکے تھے انھوں نے مدینہ اُس وقت چھوڑا جب ان کے لیے عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کرنا ممکن نہ رہا، وہ ان کی شہادت پر روتے رہے، جب ان کے پاس کوئی منصب نہ تھا تب بھی وہ دور عثمانی میں مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اس لیے گئے تاکہ وہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں باہمی تعاون کر سکیں۔ صرف شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ ہی اس بات کے لیے بہت کافی تھی کہ وہ ان کے سفاک قاتلوں کے خلاف شدید غصے کا اظہار کریں اور یہ ضروری تھا کہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے خون کا بدلہ لینے کے لیے مدینہ کے علاوہ کسی اور جگہ کا انتخاب کیا جائے۔ قاتلوں نے سرِ عام لوگوں کے سامنے خلیفہ کو شہید کیا، پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ عمرو رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر غصے کا اظہار نہ کریں۔ اگر کسی کو اس بات پر شک ہے تو اس کا سہارا وہ جھوٹی روایات ہیں جو عمرو رضی اللہ عنہ کی ایسی تصویریں پیش کرتی ہیں کہ ان کا مقصد حصولِ اقتدار کے سوا کچھ نہ تھا۔[4]

[1] تاریخ الطبری:3/605، الکامل لابن الأثیر:2/498. [2] سِیَر أعلام النبلاء:3/70، القیادۃ العسکریۃ فی عہد الرسول ﷺ، ص:634-942. [3] سِیَر أعلام النبلاء:3/70. [4] عمرو بن العاص للغضبان، ص: 489، 490، 492.

تحکیم کی دستاویز کا متن
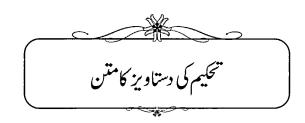
① یہ وہ فیصلہ ہے جس پر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور ان دونوں کے ساتھیوں نے اتفاق کیا ہے اور انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کن ہونے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔

② حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اہل عراق کی طرف سے یہ فیصلہ اُن کے حاضر اور غیر حاضر سب ساتھیوں کی طرف سے ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اہل شام کی طرف سے یہ فیصلہ ان کے حاضر اور غیر حاضر سب ساتھیوں کی طرف سے ہے۔

③ قرآن کریم از ابتدا تا انتہا جو بھی فیصلہ دے ہم سب اس پر قائم رہنے پر راضی ہیں۔ جسے وہ زندہ رکھے ہم اُسے زندہ رکھیں گے جسے وہ مردہ رکھے ہم اُسے مردہ رکھیں گے اس پر ہم نے فیصلہ دے دیا ہے اور اسی پر ہم سب راضی ہیں۔

④ علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی اپنی طرف سے عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ کے نمائندہ ہونے اور فیصلہ دینے پر راضی ہیں اور معاویہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے اپنے نمائندہ ہونے اور فیصلہ دینے پر راضی ہیں۔

⑤ علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن قیس اور عمرو بن العاص سے عہد و پیمان لیا ہے کہ وہ دونوں قرآن ہی کو اپنا امام بنائیں گے اور اُس سے تجاوز نہیں کریں گے، اور جو بات کتاب اللہ میں نہیں پائیں گے اُس بارے میں سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کریں گے اور جان بوجھ کر خلافِ سنت کوئی فیصلہ نہیں کریں گے، نہ شبہات پیدا کرنے

کی خواہش رکھیں گے۔

⑥ عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے، علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں سے یہ عہد بھی لیا کہ وہ دونوں کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جو فیصلہ دیں گے نہ اُسے ختم کریں گے نہ اُس کی خلاف ورزی کریں گے۔

⑦ دونوں جو بھی فیصلہ کریں، اُن دونوں کے خون، اُن کی اولاد، اُن کے اموال، اُن کے متعلقین اور جملہ اہل خانہ محفوظ ہوں گے، کوئی اس پر راضی ہو یا ناراض وہ حق سے تجاوز نہیں کریں گے۔ کتاب اللہ کی روشنی میں وہ جو مبنی پر حق فیصلہ دیں گے اس پر پوری امت اُن دونوں کی مددگار ہوگی۔

⑧ ان دونوں فیصلہ کن افراد میں سے اگر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی وفات پا جائے تو اس کے ساتھیوں میں سے اُس کی جگہ پر کسی عدل و انصاف اور صلاحیت والی شخصیت کو فائز کیا جائے گا اور اس پر بھی وہی عہد و میثاق لازم ہوگا جو پہلے پر لازم تھا۔

⑨ اگر دونوں امیروں میں سے کوئی اس فیصلہ کی مقررہ تاریخ سے پہلے وفات پا جائے، تو ان کا طبقہ ان کی جگہ پر کسی ایسی شخصیت کو ذمہ داری تفویض کر سکتا ہے جن کے عدل و انصاف پر وہ راضی ہوں۔

⑩ یہ فیصلہ دونوں فریقوں کے مابین برابری کی بنیاد پر بات چیت کرنے اور کسی پر اسلحہ نہ اٹھانے کی بنیاد پر ہوگا۔

⑪ اس تحریر میں جس بات کو فیصلہ کہا جا رہا ہے اُسے دونوں امیروں، دونوں فیصلہ کرنے والوں اور دونوں فریقوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سے قریب ترین ہے اور وہی اس کا گواہ ہے، اس کا گواہ ہونا ہی کافی ہے۔ اگر جانبین میں سے کوئی اس کی مخالفت کرے گا اور حد سے بڑھے گا تو پوری امت اس سے بری الذمہ ہے اور ان دونوں کے متعلق اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

⑫ مقرر کردہ وقت تک تمام لوگوں کی جان، مال‘اولاد اور جملہ اہل خانہ محفوظ ہوں گے، ہتھیار رکھ دیے جائیں گے، راستے پر امن ہوں گے، اور دونوں فریقوں میں سے غیر حاضر اس معاملے میں حاضر کی مانند متصور ہوگا۔

⑬ دونوں فیصلہ کرنے والے افراد اہل عراق اور اہل شام کے درمیانی مقام پر اپنا اجلاس بلائیں گے۔

⑭ اس اجلاس میں ایسا کوئی شخص شامل نہیں ہوگا جس کی موجودگی پر دونوں میں سے کسی کو کوئی اعتراض ہو یا اس کی موجودگی پر ان کی رضا مندی شامل نہ ہو۔

⑮ فیصلہ دینے کے لیے طے شدہ اور مقرر وقت ماہ رمضان کا اختتام ہے۔ اگر دونوں فیصلہ کرنے والے جلد فیصلہ دینا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں اور اگر مقررہ وقت کے اختتام تک فیصلہ مؤخر کرلیں تو ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔

⑯ اگر دونوں فیصلہ کرنے والے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق مقرر وقت کے اختتام تک کوئی فیصلہ نہیں دیتے تو دونوں فریقوں کو سابقہ صورتِ حال یعنی جنگ کی طرف لوٹ جانے کی اجازت ہوگی۔

⑰ اس معاملہ میں پوری امت اس عہد و پیمان کی پاسداری کرے گی جو شخص بھی اس معاملے کی مخالفت کرے یا ظلم کا رویہ اختیار کرے یا اسے غلط رخ دینے کی کوشش کرے تو پوری امت متحد ہوکر اس کا مقابلہ کرے گی۔

اس تحریر پر جن گواہوں کے نام لکھے گئے ان کی فہرست یہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹے حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب، الاشعث بن قیس الکندی، اشتر بن الحارث، سعید بن قیس الھمدانی، حارث بن عبدالمطلب کے دونوں بیٹے حصین اور طفیل، ابوسعید بن ربیعہ الانصاری، عبداللہ بن خباب بن الارت، سہل بن حنیف، ابو بشر بن عمر الانصاری، عوف بن الحارث بن

عبدالمطلب، یزید بن عبداللہ الاسلمی، عقبۃ بن عامر الجھنی، رافع بن خدیج الانصاری، عمرو بن الحمق الخزاعی، النعمان بن عجلان الأنصاری، حجر بن عدی الکندی، یزید بن جحیہ الکندی، مالک بن کعب الھمدانی، ربیعہ بن شرحبیل، الحارث بن مالک۔

قصۂ تحکیم کے بارے میں افسانوی روایات

واقعہ تحکیم کے بارے میں بڑی افسانہ طرازی کی گئی ہے۔ بے بنیاد اور من گھڑت روایات کے ذریعے صحابہ کے کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابن العربی نے ان روایات کا بڑا عمدہ رد لکھا ہے۔ ان من گھڑت روایات میں سے سب سے معتبر روایت میں اس قصے کی تفصیلات کچھ اس انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

اہل شام نے جب مصحف بلند کیے اور اہل عراق کو مصالحت کی دعوت دی تو دونوں طرف سے حکم مقرر کیے گئے۔ اہل عراق نے ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ اہل شام نے عمرو بن العاص کو مقرر کیا۔ جب دونوں حکم (فیصلہ کرنے والے) أذرح مقام پر جمع ہوئے، تو وہاں موجود لوگوں میں مغیرہ بن شعبہ بھی آئے ہوئے تھے۔ دونوں حکم حضرات نے عبداللہ بن عمر بن خطاب اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کو بلا بھیجا، معاویہ رضی اللہ عنہ اہل شام کے ساتھ آ گئے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل عراق نے آنے سے انکار کیا۔ اس موقع پر مغیرہ بن شعبہ نے قریش کے کچھ اہل رائے سے پوچھا: تمھاری کیا رائے ہے کہ کیا اس اجلاس میں کوئی نئی بات ہوگی، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دونوں حَکَم کسی اجتماعی نتیجہ پر پہنچ سکیں گے یا افتراق کا شکار ہو جائیں گے؟ انھوں نے کہا: ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مغیرہ نے کہا: میں ان دونوں سے علیحدگی میں ملاقات کر کے اندازہ کر سکتا ہوں۔ پہلے وہ عمرو بن العاص سے جا کر ملے اور کہا: اے ابوعبداللہ: میں آپ سے جو پوچھوں بتایئے! ہم جو اِس فتنہ سے علیحدگی اختیار کیے ہوئے ہیں، آپ کی ہمارے بارے میں کیا رائے ہے؟ قتال کے بعد اب آپ نے جو معاملات اختیار کیے ہوئے ہیں ہم یہ سب کچھ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ہم دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر

ہیں تا آنکہ یہ امت مجتمع ہو جائے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: میں علیحدگی اختیار کرنے والوں کے بارے میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ وہ نیکوکار لوگوں سے پیچھے اور فاجروں سے آگے ہیں۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور چلے گئے، انھوں نے اس سوال کے سوا کچھ نہ پوچھا۔ پھر وہ ابوموسیٰ اشعری (عبداللہ بن قیس) رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور اُن سے بھی یہی سوال کیا، انھوں نے کہا: میں تمھیں اچھی رائے والا سمجھتا ہوں، تم میں مسلمانوں کی کچھ باقیات ہیں۔ مغیرہ اٹھے اور چلے گئے اور اس سوال کے سوا کچھ نہ پوچھا، پھر انھوں نے قریش کے اہل الرائے سے جا کر کہا: میرے خیال میں یہ دونوں حَکَم کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہو سکتے، بعدازاں جب دونوں حَکَم اکٹھے ہوئے اور باہمی مذاکرات شروع ہوئے تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے معاً کہا کہ سب سے پہلے حق پر مبنی فیصلہ یہ کریں کہ کون اہل وفا ہیں؟ اور کون عہد توڑنے والے ہیں۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: اصل بات کیا ہے؟ انھوں نے کہا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام حسب وعدہ وقت مقررہ پر پہنچ گئے ہیں، انھوں نے کہا: جی ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا، یہ بات لکھو تو ابوموسیٰ نے لکھ لی، عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا ہم کسی ایسی شخصیت کا تعین کر دیں جو اس امت کی والی ہو؟ کسی ایسی شخصیت کا نام لیجیے! اگر میرے لیے ممکن ہوا تو میں آپ کا ساتھ دوں گا، اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ پھر انھوں نے معاً کہا: اے ابوموسیٰ: میں معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کا نام پیش کرتا ہوں، یہ سنتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا۔ مجلس برخاست کر کے باہر نکل آئے اور لوگوں کے پاس پہنچ گئے۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: عمرو رضی اللہ عنہ کی مثال اس شخص کی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا﴾

’’اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا، مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔‘‘ [1]

[1] الأعراف 7:175.

ابو موسیٰ چپ ہوئے تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بولے: میں نے ابو موسیٰ کو ایسے شخص کی مانند پایا جن کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾

''جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا، مگر اُنھوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔'' [1]

ایک دوسرے کے بارے میں جو کچھ کہا تمام علاقوں کی طرف لکھ بھیجا۔ [2]

امام زہری خود اس واقعہ میں موجود نہ تھے، لہٰذا یہ روایت مرسل ہے، اور اُن کی مراسیل، جیسا کہ علماء نے قرار دیا ہے کہ تیز چلنے والی ہوا کی مانند ہیں ان سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ [3]

ایک اور روایت جسے ابن عساکر نے اپنی سند کے ساتھ امام زہری سے بیان کیا ہے وہ بھی مرسل ہے، اور اس میں ایک راوی ابوبکر بن ابی سبرۃ ہے، امام احمد بن حنبل نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ حدیثیں گھڑتا تھا [4] اور اس کی سند میں واقدی بھی ہے جو متروک راوی ہے۔ [5] اس مذکورہ روایت کا متن یہ ہے:

''اہل شام نے قرآن پاک کے نسخے اوپر اٹھا کر بلند کیے اور کہا: ہم تمھیں کتاب اللہ اور اس کے مطابق فیصلہ دینے کی دعوت دیتے ہیں، اور یہ بات عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی تدبیر تھی، انھوں نے آپس میں صلح کر لی اور ایک تحریر لکھ لی کہ وہ سال کے شروع میں اُذرح میں ملیں گے۔ اُنھوں نے دو حضرات کو حَکَم بنایا جو لوگوں کے معاملات دیکھیں گے اور پھر ان کے فیصلوں پر رضا مندی دیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ کو اور حضرت

[1] الجمعة 62:5. [2] المصنف: 643/5، مرويات تاريخ الطبري، ص: 406. [3] المراسيل لأبى حاتم، ص: 3، الجرح والتعديل: 246/1. [4] تهذيب التهذيب: 27/12، مرويات تاريخ الطبري، ص: 406. [5] مرويات تاريخ الطبرى، ص: 406.

معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص کو حَکَم بنایا، بعدازاں لوگ منتشر ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اختلاف اور خوف کی ملی جلی فضا میں کوفہ لوٹ آئے، اُن کے ساتھیوں نے تحکیم کو ماننے سے انکار کیا اور کہنے لگے: اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلے گا، اُدھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اُلفت ومحبت اور باہمی اتحاد کے ماحول میں شام لوٹ گئے، بعدازاں دونوں حَکَم ایک سال کے بعد شعبان سن اڑتیس ہجری میں مقامِ اُذرح پر ملے، لوگ بھی اُن کے پاس جمع ہو گئے، اور ان دونوں کے مابین پہلے جو رازدارانہ بات ہوئی تھی، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سب کے سامنے اُس بات کی مخالفت کی، چنانچہ انھوں نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو آگے کیا، وہ بات چیت کے بعد علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں سے دستبردار ہوئے، پھر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنی بات شروع کی، چنانچہ وہ علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت پر ثابت رہے۔ پھر دونوں حَکَم اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے واپس چلے گئے اور اہل شام نے ذی القعدہ سن اڑتیس ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔[1]

ابومخنف کی یہ روایات معلول ہیں، کیونکہ ① ابومخنف لوط بن یحییٰ ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔[2] یہ خبریں دینے والا غالی رافضی ہے۔ ② ابن سعد اُس کے متعلق کہتے ہیں: وہ ضعیف راوی ہے۔[3]

امام بخاری اور ابوحاتم کہتے ہیں: یحییٰ بن سعید القطان اُسے ضعیف قرار دیتے تھے۔[4] عثمان الدارمی نے کہا: وہ ضعیف راوی ہے۔[5] امام نسائی کہتے ہیں وہ ضعیف ہے۔[6]

یہ قصۂ تحکیم کی مشہور روایات ہیں اور کیے گئے دعویٰ کے مطابق ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا باہمی مکالمہ ہے۔

کیا اس جیسی روایات بطور دلیل و حجت پیش کی جا سکتی ہیں؟ خلفائے راشدین یا صحابہ

---

[1] تاريخ دمشق: 53/16. [2] تحقيق مواقف الصحابة: 223/2. [3] مرويات أبي مخنف، ص: 407.
[4] التاريخ الكبير: 267/4، الجرح والتعديل: 138/9. [5] التاريخ للدارمي، ص: 238، تحقيق مواقف الصحابة: 223/2. [6] الضعفاء والمتروكين، ص: 253.

کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کیا ان روایات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور علمی نمونے کی نادر شخصیتوں کا دور ہے۔ ان روایات کے متون میں صرف اضطرابی اختلاف ہی اُن کے ضعیف ہونے کے لیے کافی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس کی سندوں میں بھی ضعف پایا جاتا ہے۔[1]

تحکیم کے فیصلے کی حقیقت

اس میں کوئی شک نہیں کہ اختلاف کی وہ شکل جس کے نتیجہ میں دونوں اطراف کے حَکَم حضرات نے واپس اُمت کی جانب یا اہل شوریٰ کی طرف معاملات لوٹانے کا فیصلہ کیا وہ قاتلینِ عثمان کے حوالے سے علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت کے مدعی تھے نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استحقاقِ خلافت سے انکاری تھے، وہ شام میں تقریباً بیس سال سے والی تھے، لہٰذا لوگوں کی اپنے حق میں اطاعت سے مستفید ہو رہے تھے۔[2]

ابن دِحیہ الکلبی اپنی کتاب ”أعلام النصر المبین فی المفاضلة بین أهل صفّین“ میں کہتے ہیں: ابوبکر محمد بن الطیّب الأشعری الباقلانی نے مناقب الائمہ میں کہا ہے: دونوں حَکَم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہٹانے پر ہرگز متفق نہیں ہوئے...... اگر وہ دونوں اُن کو ہٹانے پر متفق ہو بھی جاتے تو یہ صحیح فیصلہ نہ ہوتا تا آنکہ کتاب وسنت دونوں یا ان دونوں میں سے کوئی ایک ان کی سبکدوشی کو واجب قرار نہ دے، کیونکہ تحکیم کے جس فیصلے پر اتفاق ہوا تھا اُس کا بھی یہی تقاضا تھا کہ دونوں حَکَم واضح طور پر بیان کریں کہ وہ کتاب وسنت کے کس حکم کی رو سے یہ فیصلہ دے رہے ہیں، وہ اس سے پہلو تہی یا تجاوز نہیں کر سکتے تھے، نہ اس میں اپنی خواہش کو دخل دے سکتے تھے۔ اس بات پر دونوں سے پختہ عہد لیا گیا تھا اور یہ کہ اگر وہ کتاب اللہ

[1] مرويات أبي مخنف في تاريخ الطبري، ص: 408. [2] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنة: 134/2.

سے تجاوز کریں گے تو ان کے فیصلہ کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی...... کتاب و سنت اُن کی (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی) امامت، عظمت، صدق و عدل، سبقت فی الدین، مجاہدانہ کارناموں، قرابتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، علم و معرفت اور تحمل و بردباری کی صفات پر گواہ ہیں، اور وہ امامت اور خلافت کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے اہل ہیں۔[1]

مشاورتی اجلاس کا مقام انعقاد

دونوں حَکَم کے اجتماع کے لیے طے شدہ وقت جیسا کہ دستاویز میں ہے کہ 37 ہجری ماہ رمضان تھا، بشرطیکہ کسی طرح کی رکاوٹیں پیش نہ آئیں، اور مقامِ اجلاس قوی روایات کے مطابق عراق اور شام کے درمیان واقع دومۃ الجندل منتخب کیا گیا تھا۔[2] بعض دیگر روایات کے مطابق اَذرح[3] مقام طے ہوا تھا، شاید ان دونوں مقامات کے ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باعث روایات میں اختلاف پیدا ہوا۔ خلیفہ بن خیاط[4] کہتے ہیں:...... اور کچھ لوگ اَذرح مقام کا ذکر کرتے ہیں جو دومۃ الجندل کے قریب ہے، اور کسی قسم کی رکاوٹوں کے بغیر طے شدہ وقت پر اجتماع منعقد ہوا۔[5]

واقعہ تحکیم تمام اسلامی ملکوں کے لیے سبق آموز ہے

اسلامی ممالک کے اختلافات کے خاتمہ کے لیے واقعۂ تحکیم سے یہ استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ممالک کی قیادتوں کو اُن کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے اور دونوں اطراف کے مسلمان عوام اُن پر صحیح طور پر سنجیدگی سے دباؤ ڈالیں اور اُنھیں اسلام کی روشنی میں شرعی تحکیم پر مجبور کریں۔ جانبین میں سے ہر ایک اپنی جانب سے ایک حَکَم پیش کرلے تا کہ اُن کے مابین

[1] أعلام النصر المبين في المفاضلة بين أهل صفين، ص: 177. [2] جزیرۂ عرب کے شمال میں جوف شہر کے مغرب کے واقع ہے۔ [3] شام کے اطراف پر بلقاء کے مضافات میں ایک شہر کا نام۔ [4] تاریخ خلیفۃ، ص: 191، 192. [5] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 276.

پیدا ہونے والے تمام نزاعات کا خاتمہ کیا جا سکے۔ یہاں اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

① مختلف تنازعات کا سبب بننے والے مسائل ومشکلات کے حل کے لیے دونوں طرف کے حَکَم حضرات کے لیے اختیارات کا تعین کیا جائے۔

② تنازعات کے خاتمہ کے لیے جو فیصلے اور حل پیش کیے جائیں ان کا مصدر ومنبع اسلامی شریعت کو قرار دیا جائے۔

③ تنازعات سے متعلقہ فریقین میں سے ہر ایک عہد کرے اور اسلامی ملکوں کی تمام قیادتیں اس بات کا عہد کریں کہ وہ دونوں حَکَم کے متفقہ فیصلوں کو تسلیم کریں گے کیوں کہ اُن فیصلوں کا نفاذ دراصل اسلامی تعلیمات کا نفاذ ہے اور اُن کی خلاف ورزی شرعی طور پر گناہ قرار پائے گی۔

④ جب دونوں حَکَم متفقہ فیصلے اور حل پیش کر دیں اور دونوں فریق انھیں مان لیں۔ تو گویا مسئلے کا فیصلہ ہو گیا۔

⑤ جب طرفین میں سے کوئی ایک یا دونوں حَکَم کے فیصلے ماننے سے انکار کر دیں تو جو فریق خلاف ورزی پر اُتر آئے اُسے باغی قرار دیا جائے، یہ انکار ایک فریق کی طرف سے ہو یا دونوں فریقوں کی طرف سے دیگر ممالک کی اسلامی قوتوں پر شرعاً واجب ہو جاتا ہے کہ وہ عسکری فیصلوں کے ذریعے دونوں پر یہ فیصلہ نافذ کرائے یعنی طاقت کی بنیاد پر تنازعات کا خاتمہ اس انداز سے کیا جائے کہ آئندہ نقصانات اور خطرات سے بچا جا سکے۔

⑥ دونوں جانب کے حَکَم حضرات کو بالاتفاق یہ اختیار ہو کہ وہ ایسے فیصلے بھی صادر کر سکیں جو دیگر اسلامی ممالک کی مُسلّح قوت کو حرکت میں لائیں تاکہ اوپر دی گئی تفصیلات کے مطابق تنازعات حل کیے جا سکیں۔[1]

تنازعات کے حل کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنے سے ایک بڑا فائدہ ہوگا کہ خارجی قوتوں کا مسلمانوں کے تنازعات میں دخل دینے کا یہ جواز ختم ہو جائے گا کہ تنازع کے ایک

[1] الجهاد والقتال فی السياسة الشرعية:3/1665.

فریق نے اُن کو دخل دینے کی دعوت دی ہے اس طرح بیرونی قوتوں کو یہ مواقع میسر نہیں رہیں گے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر سکیں کیونکہ ان سازشوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو اُن تنازعات کی آزمائش سے زیادہ برے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تحکیم کی طرف رجوع کرنے کی حکمتِ عملی سامراجی طاقتوں کے لیے مسلمانوں کی صفوں میں فساد ڈالنے کا راستہ بند کر سکتی ہے۔ شرعی طریقے پر تحکیم کا راستہ اختیار کرنے پر صحابہ کرام کا اجماع ہے، لشکر علی رضی اللہ عنہ اور لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں جانب کے صحابہ کے علاوہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے وہ عظیم صحابہ بھی اس سے متفق ہیں جو فتنہ کے اُس دور میں علیحدہ رہنے کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے۔ [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین جنگوں پر اہل سنت کا موقف

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مابین جو جنگیں وقوع پذیر ہوئیں اُن کے بارے میں اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ اُن کے باہمی اختلافی معاملات پر تبصرے سے گریز کیا جائے طرفین میں سے کسی کی نسبت دشمنی، بغض اور کینہ پروری کے عنوان سے ہرگز کوئی گفتگو نہ کی جائے، صرف اُن کے شایانِ شان بات کی جائے۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اُن سب سے محبت رکھے اُن کے لیے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ان پر رحم فرمائے، ہر مسلمان اُن کے فضائل یاد رکھے اور اُن کے مناقب کا دل سے اعتراف کرے۔ اور جو کچھ اُن کے مابین رونما ہوا، وہ محض اجتہاد کی بنیاد پر تھا، صحیح یا غلط نقطۂ نگاہ دونوں حالتوں میں اُن کے لیے اجر وثواب ہے، البتہ اجتہاد میں صحیح رائے قائم کرنے والے کا ثواب غلطی کرنے والے کے اجر سے دُگنا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے قاتل ومقتول دونوں جنت میں جائیں گے۔ علمائے اہل سنت نے اُن کے اختلافی امور میں زیادہ بات کرنے سے ممانعت فرمائی ہے۔ نصوص کا ذکر

[1] الجهاد والقتال فى السياسة الشرعية: 3/1665.

کرتا ہوں جن میں صحابہ کے مابین لڑائی کے حوالے سے رہنمائی ملتی ہے اور وہ نصوص یہ ہیں۔[1]

① فرمانِ ربانی ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾

''اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کراؤ، پھر ان دونوں گروہوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو تم اس زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو اُن کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو، اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[2]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ جب مومنوں کے درمیان لڑائی کے حالات پیدا ہو جائیں تو اُن کے مابین صلح کرائی جائے، کیونکہ وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور یہ باہمی لڑائی اُنھیں ایمان کی صفت سے خارج نہیں کرتی، جبکہ اس صفت کی مناسبت سے خود اللہ تعالیٰ نے اُن کا نام مومنین رکھا ہے اور اُن کے مابین اصلاح کا حکم دیا ہے۔ اللہ نہ کرے جب بھی مومنوں کے درمیان لڑائی ہو تو وہ ایمان سے خارج نہیں ہوتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جنھوں نے جمل کے واقعہ میں آپس میں لڑائی کی، وہ اپنے رب کی نگاہ میں حقیقی ایمان پر قائم و دائم ہیں، اختلاف رائے کا اُن کے ایمان پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا کیونکہ یہ سب کچھ اجتہاد کی بنیاد پر رونما ہوا۔[3]

② حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کے ایک گروہ میں دین سے نکلنے کی شکل پیدا ہوگی، اُنھیں وہ قتل کرے گا جو زیادہ حق

---

[1] عقیده أهل السنة والجماعة فی الصحابة الكرام: 427/2، تنزيه خال المؤمنين معاوية بن أبی سفیان رضی اللہ عنہ من الظلم والفسق. [2] الحجرات 9:49. [3] العواصم من القواصم، ص: 170,169، وأحكام القرآن: 1717/4.

پر ہو گا۔'' [1]

جس گروہ کی جانب اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ درحقیقت علی رضی اللہ عنہ ومعاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا بیان ہے، دونوں گروہوں کو مسلمان کے عنوان سے موسوم کیا گیا ہے اور اُن دونوں کا تعلق حق سے ہے، یہ حدیث نبوت کی علامات میں سے ایک بہت بڑی نشانی ہے، کہ جو کچھ بھی ہوا، جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق ہوا، اس میں اہل شام اور اہل عراق دونوں کے مسلم ہونے کا حکم بھی ملتا ہے بخلاف رافضی فرقہ اور دیگر جاہل لوگوں کے جو اہل شام کی تکفیر کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی زیادہ برحق تھے۔ اہل سنت والجماعہ کا یہی مسلک ہے اور یہی موقف صحیح ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کیا، ان شاء اللہ وہ اس پر اجر کے مستحق ہیں، لیکن ان کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ امامت وخلافت کے منصب پر فائز تھے، اُن کے لیے دُگنا اجر ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے ثابت ہے: ''جب حاکم اجتہاد کرے اگر وہ صحیح ہو تو دُگنا اجر ملے گا اور اگر غلطی پر ہو تو وہ ایک اجر کا مستحق ہو گا۔'' [2]

3. حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرما رہے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرا یہ بیٹا سیادت کے مقام پر فائز ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے۔'' [3]

اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ گواہی ملتی ہے کہ اہل عراق اور اہل شام دونوں مسلمان ہیں، اور اس حدیث میں واضح طور پر اُن خوارج کی تردید کی گئی ہے جنھوں نے ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں پر اور دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں پر تکفیر کا فتویٰ لگایا، مزید برآں یہ حدیث اُن دونوں فریقوں کے مسلمان

[1] صحيح مسلم، حديث: 1064. [2] صحيح البخاري مع شرحه فتح الباري: 318/12. [3] صحيح البخاري، كتاب الفتن، حديث: 3629.

ہونے پر گواہ بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت سفیان ابن عیینہ فرمایا کرتے تھے کہ اس حدیث میں ''دو مسلمان گروہ'' کے الفاظ مجھے بہت پسند ہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اُنھیں یہ بات اس لیے پسند آئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سب کو مسلمین کے نام سے موسوم فرمایا، اس حدیث کے مصداق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ بن علی ہیں انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد امورِ خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیے۔[1]

ان مذکورہ احادیث میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دونوں کے ساتھیوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی اُمت کا حصہ ٹھہرایا ہے[2] اور یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ حق کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، وہ زمرۂ حق سے خارج نہیں ہوئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی گواہی دی کہ وہ ایمان کی حالت پر جاری و ساری ہیں اور باہمی لڑائی کے باعث ایمان کی حد سے باہر نہیں نکلے۔ وہ فرمانِ الٰہی کے اس عموم میں داخل ہیں:

﴿ وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾

''اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کرا دو۔''[3]

اس آیت کی رُو سے باہمی لڑائی کی وجہ سے وہ دونوں گروہ کافر ہوئے نہ فاسق، بلکہ وہ اجتہاد کر رہے تھے، لہٰذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہل سنت والجماعہ کے فرقہ ناجیہ کا مسلک اختیار کرے اور وہ یہی ہے کہ جو کچھ ہوا اس پر خاموشی اختیار کرے اور اُن کے شایانِ شان گفتگو کرے، اہل سنت کی کتابوں میں یہ صاف شفاف عقیدہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ہمارے عظیم علمائے کرام نے اس موضوع پر نہایت بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ چند

[1] الاعتقاد للإمام البیهقي، ص: 198، فتح الباري: 66/13. [2] صحیح مسلم: 1064، میں ہے کہ میری اُمت میں دو فرقے ہوں گے۔ [3] الحجرات 9:49.

ایک درج ذیل ہیں:

① صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین لڑائی کے بارے میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے خیالات پوچھے گئے تو انھوں نے فرمایا: یہ وہ مقدس خون تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں کو پاک رکھا اب کیا میں اپنی زبان کو آلودہ کرلوں اور پاک نہ رکھوں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال آنکھوں جیسی ہے اور آنکھوں کی دوا یہ ہے کہ اُنھیں چھونے کی کوشش نہ کی جائے۔ (1)

امام بیہقی، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ نہایت قیمتی بات ہے، کیونکہ بے معنی گفتگو سے پرہیز ہی صحیح طرزِ عمل ہے۔'' (2)

② حسن بصری رحمہ اللہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی لڑائی سے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: یہ ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کی اور ہم وہاں نہیں تھے، وہ علم والے تھے اور ہم بے علم ہیں، انھوں نے اجتماعیت اختیار کی ہم نے اُن کی پیروی کی۔ پھر جب انھوں نے آپس میں اختلاف کیا تو ہم اس معاملے پر اپنی زبان بند رکھتے ہیں۔ (3)

③ امام جعفر بن محمد الصادق رحمہ اللہ سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: میں وہی بات کہتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے:

﴿قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝﴾

''اُس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔'' (4)

امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جو کچھ

---

(1) الإنصاف للباقلانی، ص: 69، الطبقات لابن سعد: 394/5. (2) مناقب الشافعی، ص: 136.
(3) الجامع لأحكام القرآن: 333/16. (4) طٰهٰ 52:20، الإنصاف للباقِلّانِی، ص: 69.

ہوا میں اُس کے بارے میں صرف اچھی بات ہی کہہ سکتا ہوں۔''[1]

ابراہیم بن آرز الفقیہ نے کہا: میں احمد بن حنبل کی خدمت میں حاضر تھا اُن سے ایک آدمی نے علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین ہونے والے جھگڑوں کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ان سے کہا گیا: ''اے ابو عبداللہ! یہ سوال کرنے والا شخص بنی ہاشم سے ہے۔'' یہ سن کر وہ متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ آیت پڑھو:

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝﴾

''وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے، اُن کی کمائی اُن کے لیے تھی اور تمھاری کمائی تمھارے لیے، تم سے اُن کے اعمال کے بارے میں کوئی سوال نہیں ہوگا۔''[2]

④ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلافی امور کے بارے میں اہل سنت کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اہل سنت صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافی امور پر خاموش ہیں اُن کا کہنا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں عیب جوئی پر مبنی روایات میں اُن سے زیادتی اور کمی بیشی کی گئی ہے۔

روایات میں تغیر وتبدل سے کام لیا گیا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ وہ صاحبِ عذر ہیں کہ صحیح رائے رکھنے والے مجتہد ہیں یا غلطی کرنے والے مجتہد ہیں۔[3]

⑤ امام ابن کثیر کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو اختلافات رُونما ہوئے اُن میں سے کچھ تو وہ ہیں جو اُن کے عزم وارادہ پر مبنی نہیں ہیں جیسے جمل کا واقعہ، اور کچھ وہ ہیں جو اجتہاد پر مبنی تھے جیسے صفین کا واقعہ، غلطی پر مبنی اجتہاد کو بھی اجر کا مستحق قرار دیا گیا ہے، اور صحیح رائے پر اجتہاد کے لیے تو دُہرا اجر ہے۔[4]

---

[1] مناقب الإمام أحمد للإمام ابن الجوزي، ص: 164. [2] البقرة 2:141. [3] الإنصاف فيما يجب اعتقاده ولا يجوز الجهل به، ص: 67-69. [4] الباعث الحثيث، ص: 182.

⑥ امام ابن حجر فرماتے ہیں: اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کرام کی طرف سے جو کچھ ہوتا رہا اُس پر طعن و تشنیع کی ممانعت ہے، کیونکہ اُن کی یہ باہمی جنگیں اجتہاد کی بنیاد پر تھیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صحیح رائے اختیار کرنے پر دُہرا اجر اور اس سے مختلف رائے پر بھی اکہرا اجر ملنے والا ہے۔[1] اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ شہادت عثمان کے بعد مذکورہ امور پر زبان کھولنے سے اجتناب کیا جائے، اُن کے لیے رحمت کی دعا کی جائے، صحابہ کے فضائل ہمیشہ یاد رکھے جائیں مختلف پہلوؤں سے اُن کی سبقت کا اعتراف کیا جائے، اُن کے محاسن کا تذکرہ عام کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو اور انھیں بھی راضی کر دے۔[2]

غلط اور گمراہ کن کتابوں سے خبردار رہیے

ابن قتیبہ کی جانب منسوب «الإمامة والسياسة» کے زیر عنوان کتاب اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ کی شکل بگاڑنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ عسیلان نے اپنی تالیف «الإمامة والسياسة في ميزان التحقيق العلمي» میں بہت سارے دلائل و براہین پیش کیے ہیں جو اس بات پر دلیل ہیں کہ امام ابن قتیبہ کی طرف اس کتاب کی نسبت کرنا سفید جھوٹ ہے۔

ڈاکٹر علی نفیع العلیانی، اپنی کتاب «عقيدة الإمام ابن قتيبة عن كتاب الإمامة والسياسة» میں لکھتے ہیں: بہت باریک بینی سے یہ کتاب پڑھنے کے بعد میری ترجیحی رائے یہ قرار پائی ہے کہ اس کتاب کا مؤلف کوئی خبیث رافضی ہے، اُس نے یہ کتاب دھوکے سے ابن قتیبہ کی کتابوں میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ اُن کی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ محدثین کرام کے نقطۂ نظر کے حامل ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کا مؤلف مراکش کا کوئی

[1] فتح الباري:34/13. [2] عقيدة أهل السنة:740/2.

رافضی ہو، کیونکہ ابن قتیبہ کی مراکش میں بڑی اچھی شہرت ہے۔[1]

❀ سید محمود شکری الألوسی اپنی تالیف ''مختصر التحفة الإثنا عشرية'' میں کہتے ہیں:
رافضیوں کی حیلہ سازیوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ وہ اہل سنت کی نظر میں معتبر راویانِ حدیث کا نام لیتے ہیں اور جو نام اُن کے نام یا لقب سے ملتا جلتا ہو اُس شیعی کی روایت کی نسبت اُسی معتبر راوی حدیث کی طرف کر دی جاتی ہے اور اہل سنت میں سے جو شخص اس راوی کو نہیں جانتا وہ سمجھتا ہے کہ یہ راوی اہل سنت میں سے ہے تو اُس کی بات کو معتبر گردانتا ہے جیسے امام سُدّی، کیونکہ سُدّی نام کے دو راوی ہیں ایک سُدّی کبیر اور دوسرا سُدّی صغیر، اُن میں سے کبیر اہل سنت کے ثقہ راویوں میں سے ہے اور سُدّی صغیر جھوٹا اور حدیثیں گھڑنے والا پکا رافضی ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن قتیبہ غالی رافضی ہے اور عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ اہل سنت کے ثقہ راویوں میں سے ہیں اور انھوں نے ''المعارف'' نامی کتاب تصنیف کی ہے، جبکہ رافضی نے بھی ایک کتاب لکھی ہے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اپنی کتاب کا نام بھی ''المعارف'' ہی رکھ دیا ہے۔[2] اسی سے یہ ترجیحی رائے بنتی ہے کہ ''الإمامة والسياسة'' ابن قتیبہ رافضی کی تالیف ہے امام ابن قتیبہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں جو ثقہ اور اہل سنت سے ہیں۔ شیعہ مکتب فکر نے ان دونوں کو گڈ مڈ کر دیا ہے، کیونکہ ان کے ناموں میں پوری مشابہت ہے۔[3] واللہ أعلم.

نہج البلاغہ

جن کتابوں نے تاریخِ صحابہ کی شکل بگاڑنے میں اپنا حصہ ڈالا ہے اُن میں سے ایک ''نہج البلاغہ'' بھی ہے، اس کتاب پر اس کی سند اور متن دونوں پہلوؤں سے اعتراض کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب أمیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساڑھے تین صدیوں بعد کسی سند

[1] المعارف، ص: 401. [2] مختصر التحفة الإثناعشرية للآلوسي، ص: 32. [3] عقيدة الإمام ابن قتيبة، ص: 93.

کے بغیر مرتب کی گئی ہے، شیعہ نے اس کی تالیف کی نسبت الشریف الرضی کی طرف کی ہے اور وہ شخص محدثین کی نظر میں اس وقت بھی غیر مقبول ہے جبکہ وہ سند کے ساتھ اپنی بدعت کی حمایت میں روایت بیان کرے اور اگر وہ بغیر سند کے ایسی بات بیان کرے تو پھر ہرگز قابل قبول نہیں جیسا کہ اُس نے اس کتاب میں کیا ہے۔ محدثین کی نظر میں نہج البلاغہ مرتب کرنے والا اصل شخص اُس کا بھائی ہے۔

❁ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہل علم جانتے ہیں کہ اس کتاب کے اکثر خطبے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر افتراء پردازی کے مترادف ہیں، اُس کا غالب حصہ پہلے لکھی گئی کسی اور کتاب میں نہیں ہے، نہ اُس کی کوئی معروف سند ہے۔[1]

❁ امام ابن حجر کا کہنا ہے: الشریف الرضی پر الزام ہے کہ اُس نے کتاب وضع کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو شخص بھی اس کا مطالعہ کرے گا یقیناً جان لے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب اُس کی نسبت جھوٹ پر مبنی ہے اور اس کا اکثر حصہ باطل ہے۔[2]

بہت سارے محققین نے اس موضوع پر بحث وتفتیش کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اس کی نسبت کو صحیح قرار نہیں دیا۔[3]

کتاب الأغانی مؤلفہ أبو الفرج أصفهانی

کتاب الأغانی کو، اُدب، قصے کہانیوں، گیتوں اور راگوں کی کتاب سمجھا جاتا ہے، یہ کتاب علم، تاریخ اور فقہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اہل ادب اور مؤرخین اس کی آواز سے مانوس ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں جو نسلی تعصب، تہمتوں، جھوٹی عیب جوئی اور طعنہ زنی کی جو باتیں ہیں اُن پر خاموشی اختیار کی جائے، عراقی شاعر اور عظیم استاد ولید الأعظمی نے اپنی معرکہ آراء کتاب ''السیف الیمانی فی نحر الأصفهانی صاحب الأغانی'' میں

[1] منهاج السنة: 4/24. [2] لسان المیزان: 4/223. [3] الأدب الإسلامی لنایف معروف، ص: 53.

حقیقتِ حال سے پردہ اُٹھایا ہے، اس کتاب میں موجود جھوٹ، قومیتوں کے تعصب اور کینہ پروری کی باتوں کو واضح کیا گیا ہے۔

تاریخ الیعقوبی (ت290ھ)

اس کے مؤلف کا نام اَحمد بن اَبی یعقوب اِسحاق بن جعفر بن وہب بن واضح العباسی ہے، یہ اہل بغداد میں سے ہے، شیعی اِمامی مؤرخ ہے۔ عباسی دورِ حکومت میں دیوان تحریر کرنے کا کام انجام دیتا تھا۔ اسی وجہ سے اُسے کاتب عباسی کے لقب سے یاد کیا جانے لگا، یعقوبی نے اسلام کی تاریخ شیعہ اِمامیہ کے نقطہ نظر سے پیش کی ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے بیٹوں کے سوا کسی اور کی خلافت نہیں مانتا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وَصی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اُن کے لیے خلیفہ کا لقب استعمال نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ انھوں نے صرف اقتدار سنبھالا۔

پھر اُن میں سے کوئی محترم خلیفہ ایسا نہیں جس پر اُس نے طعنہ زنی نہ کی ہو، اُس نے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔ یہ شخص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے بارے میں بہت بری باتیں کرتا ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ بڑے منفی انداز سے پیش کیا ہے۔ اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وصی تھے اور اُن سے خلافت چھیننے کی سازش کی گئی تھی، تہمت لگانے میں اُس کا انداز اُسی کی قوم کے شیعوں اور رافضیوں جیسا ہے، یا تو وہ پوری روایت اور خبر خود گھڑ لیتے ہیں یا کسی اور خبر اور روایت میں اضافہ کر دیتے ہیں اور یہ اضافہ سیاق وسباق دیکھے بغیر ہوتا ہے یہاں تک کہ اُس کے معنوں میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے، جب وہ اُموی خلفاء کا ذکر کرتا ہے تو اُنھیں بادشاہوں کے الفاظ سے موسوم کرتا ہے اور جب بنوعباس کے خلفاء کا ذکر کرتا ہے تو اُنھیں خلفاء کے لقب سے اور ان کی مملکت کو، مبارک مملکت کے الفاظ سے یاد کرتا ہے یہ کتاب صحیح صورتِ حال سے انحراف کی دستاویز ہے۔ یہ

اسلامی تاریخ کی شکل بگاڑنے والی تحریر ہے، یہ اُن بہت سارے مستشرقین اور مستغربین کا مرجع ہے جو تاریخ اسلامی پر اُنگشت نمائی اور عظیم شخصیتوں کی عیب جوئی اور طعنہ زنی میں معروف ہیں، علمی اعتبار سے یہ بے قدر و قیمت کتاب ہے۔ اس کے پہلے حصے میں مختلف کہانیاں، افسانے، خرافات اور داستان سرائیاں ہیں اور دوسرے حصے میں تعصّباتی پہلو نمایاں ہے۔ منہج تحقیق کے اعتبار سے یہ کتاب دستاویزی ثبوتوں کے قاعدے قانون سے خالی ہے۔

مروج الذهب ومعادن الجوہر از المسعودی (ت:345ھ)

اس کتاب کے مؤلف کا نام اَبوالحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی ہے۔ وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہے کہا جاتا ہے کہ وہ اہل مغرب میں سے ہے لیکن خود مسعودی نے یہ کہا کہ وہ اہل عراق سے ہے پھر وہ مصر چلا گیا اور وہاں قیام کیا۔ اگر بلاد مغرب سے مراد مشرق کے بالمقابل علاقہ ہے تو مصر، مغربی اسلامی بلاد میں سے ہے، پھر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا مسعودی شیعہ ہے، ابن حجر اُس کے بارے میں کہتے ہیں: اس کی کتابیں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ شیعی اور معتزلی تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ وصیت کا سلسلہ آدم علیہ السلام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے جو ایک صدی سے دوسری صدی تک منتقل ہوتا رہا تا آنکہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا پھر اس نے اشارہ دیا ہے کہ بعدازاں لوگوں نے نص اور انتخاب میں اختلاف کیا۔ پھر اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلقہ واقعات حیاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بڑھ کر بہت اہمیت اور اہتمام سے بیان کیے ہیں۔

یہ اُن چند قدیم کتابوں کا تذکرہ ہے جن کی تحریریں معاصر مؤلفین نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔ جیسے طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب ''علی وبنوه'' اور عقاد نے اپنی ''عبقریات'' میں، ان دونوں نے موضوع اور ضعیف روایات کا سہارا لیا ہے اور ان کے تمام تجزیے انھی روایات پر مبنی ہیں، انھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے سنگین

غلطیاں کی ہیں۔ ان دونوں مصنفوں کے علاوہ عبدالوھاب النجار نے اپنی کتاب ''الخلفاء الراشدون'' میں ایسی نصوص نقل کی ہیں جو ''الإمامة والسیاسة'' نامی کتاب میں درج ہیں اور رافضیوں کی روایات میں سے ہیں۔ اسی طرح حسن ابراہیم حسن نے اپنی کتاب ''عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ'' میں من گھڑت رافضی روایات نقل کر دی ہیں اور ان کی بنیاد پر یہ لکھ دیا ہے کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ لالچی اور مداہنت کرنے والے تھے۔ وہ ہمیشہ دنیا کی مصلحت اور مفاد پیش نظر رکھتے تھے[1] اس طرح کچھ اور مؤرخین نے بھی جنھیں محقق ہونے کا زعم ہے، تاریخی روایات سے جو سلوک کیا ہے وہ اہل سنت کے منہج سے ہرگز کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

استشراق اور اسلامی تاریخ

گزشتہ صدی میں یورپ کے مستشرقین سکالرز نے اسلامی ممالک پر سامراجیت مسلط کرنے اور اُن کے خلاف فکری جنگ کے پیش نظر شیعوں کے من گھڑت واقعات اور جھوٹ پر مبنی تحریفات کو اپنی تحریروں میں خوب جگہ دی ہے اور بار بار نشر کیا ہے۔ اور پھر اُن میں مزید اضافہ کر کے مسلمانوں کے خلاف اپنے تعصب اور کینہ پروری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس تناظر میں ایسے ایسے واقعات وضع کر لیے گئے جن کی سِرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ انھوں نے یا تو تاریخی واقعات مسخ کیے ہیں یا اپنے نظریات کی روشنی میں اُن کی غلط تشریحات پیش کی ہیں، بعد ازاں عربی و اسلامی ممالک میں اِنھی مستشرقین کے چیلوں کی بہت بڑی تعداد نے اُن کا منہج اور انداز اپنا لیا۔ ستم بالائے ستم ان مُستشرقین کے اس دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد ان کے چیلوں نے اُنھی کے مشن کو باقاعدہ اختیار کر لیا آج بھی یہ لوگ اپنی تحقیقات اور تجزیوں میں اپنے گُرو مستشرقین ہی کا عَلَم بلند کیے ہوئے ہیں۔ امت مسلمہ کو ان کے اُستادوں سے زیادہ اِنھی شاگردوں نے نقصان پہنچایا ہے۔ ان لوگوں نے روایات کا تقابلی

[1] تاریخ عمرو بن العاص لحسن إبراهیم، ص:207,206.

جائزہ لیا نہ روایات نقل کرتے ہوئے امانت و دیانت کا لحاظ رکھا بلکہ ان روایات میں مختلف رجحانات اور خواہشات کو بھی داخل کر دیا۔ اس طرح صحیح علمی منہج غائب اور پختگی رائے نظر سے اوجھل ہو گئی۔ تحقیق میں نمائشی امور، من گھڑت حواشی، مراجع و مصادر کی ترتیب اور ظاہری کارروائی کی خوب نمائش ہوئی۔ [1]

[1] منهج كتابة التاريخ الإسلامي، ص:502.

فتنۂ خوارج

امام ابن حجر فرماتے ہیں: خوارج سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے تحکیم کا انکار کیا، علی رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ اور اُن کی اولاد سے براءت کا اظہار کیا، ان کے خلاف جنگ کی اوران میں سے غالی لوگوں نے ان کی مطلقاً تکفیر کی۔[1] امام موصوف ایک جگہ اوران کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: خوارج خروج اختیار کرنے والا ایک گروہ ہے، یہ بدعتی لوگ ہیں، انھیں خوارج کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ انھوں نے دین اور بہت اچھے مسلمانوں کے خلاف خروج کیا۔[2]

فی الحقیقت خوارج وہ لوگ ہیں جنھوں نے صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے تحکیم کا فیصلہ قبول کرنے پر اُن کے خلاف خروج کیا۔ ''خوارج'' کے سوا ان کے اور القاب بھی ہیں، مثلاً: الحروریہ[3]، الشراہ[4]، المارقہ، اور المحکمہ[5] وغیرہ۔ وہ ''المارقہ'' کے سوا تمام القاب پر خوش ہوتے ہیں کیونکہ اُنھیں یہ بات پسند نہیں کہ اُن کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ''وہ دین سے اس طرح نکل گئے جیسے شکار سے تیر پار نکل گیا۔''[6]

اہل علم میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو خوارج کی ابتدا کو رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے جوڑتے ہیں اور ذوالخویصرہ کو پہلا خارجی قرار دیتے ہیں کیونکہ اُس نے رسول اکرم ﷺ

---

[1] هدى السارى فى مقدمة فتح البارى، ص:459. [2] فتح البارى:283/2. [3] اس کی وجہ تسمیہ اُن کے پہلی مرتبہ حروراء مقام پر پڑاؤ ڈالنے کی وجہ سے ہے۔ [4] اس کی وجہ تسمیہ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ جنت کے بدلے بیچ دیا۔ [5] اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انھوں نے دونوں طرف کے حَکَم کا انکار کیا اور دعویٰ کیا: لاحکم إلا لِلّٰہ. [6] مقالات الإسلاميين:207/1.

پر اُس سونے کی تقسیم پر اعتراض کیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے بھیجا تھا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے کچھ سونا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جو وہاں کی سرزمین کا نہیں تھا، راوی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے چار آدمیوں میں تقسیم کر دیا، عیینہ بن حصن، اقرع بن حابس، زید الخیل اور چوتھے علقمہ بن علاثہ یا عامر بن طفیل۔ اس موقع پر اُن کے اصحاب میں سے ایک آدمی نے کہا: ہم ان لوگوں سے زیادہ اس سونے کے حق دار ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشِ مبارک تک جب یہ بات پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم مجھے امین نہیں سمجھتے، میں تو آسمان والے کے حضور امین قرار پا چکا ہوں۔ صبح و شام آسمان سے مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔'' راوی کہتے ہیں کہ ایک دھنسی ہوئی آنکھوں، اُبھرے ہوئے گالوں، آگے نکلی ہوئی پیشانی، گھنی داڑھی، منڈے ہوئے سر اور ٹخنوں سے اونچی چادر والا آدمی اُٹھا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈور۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے رسوا شخص! بھلا روئے زمین پر مجھ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ راوی کہتے ہیں: وہ آدمی واپس جانے لگا تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! کیا میں اس کی گردن نہ اُڑا دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، شاید یہ نماز پڑھتا ہو۔'' خالد رضی اللہ عنہ نے کہا: کتنے نمازی ایسے ہیں کہ اُن کی زبان اور دل میں تضاد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھوں۔'' راوی کہتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیٹھ پھیر کر جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''اس کی نسل سے ایسے لوگ نکلیں گے جو قرآن پڑھیں گے اور وہ اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے پار نکل جاتا ہے۔'' راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے انھوں نے فرمایا: ''اگر میں نے ان کو پا لیا تو انھیں قوم ثمود کی طرح قتل کروں گا۔'' [1]

[1] صحيح البخاري، حديث:4351، وصحيح مسلم، حديث:1064.

علماء میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ خوارج کی ابتدا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج سے ہوئی۔ خروج کرنے والوں نے ایک ایسا فتنہ کھڑا کیا جس کے نتیجے میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نہایت دردناک انداز میں شہید کر دیے گئے۔ اسے فتنۂ اولیٰ بھی کہا جاتا ہے۔[1] شرح الطحاویہ کے مؤلف کہتے ہیں کہ خوارج اور شیعہ دونوں فتنہ اولیٰ کی پیداوار ہیں۔[2] امام ابن کثیر نے اُن بلوائیوں کو جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کر کے انھیں شہید کیا ''خوارج'' کا نام دیا ہے، ابن کثیر نے شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کے حالات میں لکھا ہے: خوارج آئے اور بیت المال سے بہت سا مال لوٹ کر لے گئے۔ وہاں بہت سا مال موجود تھا۔[3]

خوارج کی ابتداء کے بارے میں ترجیحی رائے

ذوالخویصرہ التمیمی، شہادتِ عثمان کے مجرم بلوائیوں اور تحکیم کے باعث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کرنے والے گروہ کے مابین ہر چند قوی تعلق نظر آتا ہے، لیکن خوارج کی اصطلاح، اس لفظ کو باریک بینی سے سمجھنے کے بعد تحکیم کے سبب خروج کرنے والوں ہی پر لاگو ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں باقاعدہ ایک گروہ کی شکل سامنے آئی۔ اُن لوگوں کی ایک خاص رائے اور سیاسی نقطۂ نگاہ تھا جس کی بنیاد پر ان کے ایسے فکری اثرات قائم ہوئے جو اس سے پہلے کہیں نہیں تھے۔[4]

خوارج کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

ابوسلمہ اور عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ وہ دونوں، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حروریہ کے بارے میں پوچھا۔ کیا آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

[1] عقيدة أهل السنّة فى الصحابة: 1141/3. [2] شرح العقيدة الطحاوية، ص: 563. [3] البداية والنهاية: 202/7. [4] فرق معاصرة للعواجى: 67/1، وخلافة على لعبدالحميد، ص: 297.

فرمایا تھا: اس امت میں سے ایسے لوگ نکلیں گے جن کی نماز کے سامنے تم اپنی نماز کو کم تر سمجھو گے، وہ قرآن پڑھیں گے، جو اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا، وہ دین سے یوں پار نکلیں گے جیسے شکار سے تیر نکل جاتا ہے، چنانچہ تیرانداز اپنے تیر کا جائزہ لیتا ہے، اس کی اَنی اور لکڑی کو بغور دیکھتا ہے اور پھر اسے سوفار کے متعلق شک ہونے لگتا ہے کہ شاید یہاں خون لگا ہوا ہو۔ [1]

امام بخاری نے یُسَیر بن عمرو کی روایت نقل کی ہے اُنھوں نے کہا: میں نے سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوارج کے بارے میں کوئی بات سنی ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے عراق کی طرف اشارہ کیا تھا اور فرمایا تھا: وہاں سے ایک قوم نکلے گی۔ وہ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دینِ اسلام سے ایسے پار نکلیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔'' [2] ان احادیث میں فرقۂ خوارج کی مذمت بالکل صاف نظر آ رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بارے میں فرمایا کہ دین سے نکل جانے والا ایک گروہ ہے۔ یہ لوگ غیر ضروری طور پر دین کی نسبت سے شدّت پسندی کا مظاہرہ کریں گے اور دین سے اُسی تیزی سے نکل جائیں گے جس تیزی اور جلد بازی سے دین میں داخل ہوئے تھے وہ دین کو مضبوطی سے نہیں تھامیں گے...... ان تینوں احادیث میں سے پہلی حدیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ وہ اہل حق کے خلاف لڑیں گے۔ اہل حق انھیں قتل کریں گے۔ اُن میں ایک آدمی ہوگا جس میں فلاں فلاں صفات ہوں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے عین مطابق یہ ساری باتیں ظہور میں آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ ''قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا'' اس کے کئی معانی ہو سکتے ہیں:

① ایک یہ احتمال ہے کہ اُن کے دل قرآن کا اصل مطلب نہیں سمجھیں گے بلکہ اُس سے غیر

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1067. [2] صحیح البخاری، حدیث: 6934.

متعلق بات مراد لیں گے۔

② اور یہ بھی احتمال ہے کہ اُن کی تلاوت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوگی۔[1]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کا ذکر کیا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہوگی۔ وہ ایک گروہ کی شکل میں ہوگی۔ اُن لوگوں کی ایک خاص نشانی سر منڈانا ہوگا، وہ مخلوقات میں بدترین ہوں گے، اُنھیں وہ لوگ قتل کریں گے جو حق سے قریب تر ہوں گے۔

خوارج کی وہ مذموم خصلتیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسندیدہ مخلوق ہوگی۔ صحیح مسلم میں عبید اللہ بن ابی رافع مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ جب حروریہ نے خروج کیا اس وقت وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، وہ کہنے لگے: اللہ کے سوا ہم کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات تو صحیح ہے لیکن اس کا مقصد باطل ہے۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے اوصاف بیان کیے ہیں میں وہ اوصاف جانتا ہوں، یہ لوگ زبان سے حق کہتے ہیں لیکن مخلوقات میں ناپسندیدہ ترین لوگ ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اُن کی مذمّت کے بیان میں اُن کی قبیح صفات کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے کہ وہ معرفت حق اور ہدایت سے محروم ہیں۔[3] امام مسلم نے اپنی صحیح میں سہل بن حنیف سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک قوم مشرق سے نکلے گی اُن کے سر مُنڈے ہوں گے۔[4] امام نووی کہتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق کے راستے سے باہر نکل جائیں گے۔[5]

وہ مذموم صفات جس کے وہ مرتکب تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں اطلاع

---

[1] فتح الباری: 618/6، یہ بات قاضی عیاض سے شرح النووی میں منقول ہے: 159/7. [2] شرح النووی: 174,173/7. [3] عقیدہ أهل السنّة والجماعة فی الصحابة الکرام: 1184/3. [4] صحیح مسلم، حدیث: 1068. [5] شرح النووی: 175/7.

دے دی کہ اُن میں یہ بُری عادتیں موجود ہیں۔ وہ اہل اسلام کو قتل کرتے اور بتوں کے پجاریوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔[1] شیخین نے اپنی صحیحین میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جس زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سونے کی کچھ مقدار بھیجی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار آدمیوں کے درمیان تقسیم کر دی۔ ایک آدمی آیا، اُس کی داڑھی گھنی، پیشانی اونچی، گال اُبھرے ہوئے اور بال منڈے ہوئے تھے، یہ آدمی کہنے لگا: اے محمد! اللہ سے ڈرو تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں نہیں ڈرتا تو اللہ کا اطاعت گزار اور کون ہوگا؟ میں اللہ کی نظر میں اہل زمین پر اللہ کا امین ہوں اور تم مجھے امین نہیں سمجھتے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر وہ چلا گیا، وہاں ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُسے قتل کرنے کی اجازت مانگی، خیال ہے کہ اجازت مانگنے والے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: اس کی نسل سے ایک قوم ہوگی، وہ لوگ قرآن پڑھیں گے جو اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا، وہ اہل اسلام کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو اپنا بنائیں گے۔ دین سے یوں خارج ہوں گے جیسے شکار سے تیر پار نکلتا ہے، اگر میں نے اُنھیں پالیا تو اُنھیں قوم عاد کی طرح قتل کر دوں گا۔[2]

خارجیوں کی ہدایت کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بے قراری

خوارج نے بہت بڑی تعداد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے صفین سے کوفہ واپسی پر علیحدگی اختیار کر لی، ایک روایت کے مطابق اُن کی تعداد کا اندازہ دس ہزار سے زیادہ لگایا گیا ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق بارہ ہزار خارجی بتائے گئے ہیں۔[3] ایک روایت میں آٹھ ہزار کا ذکر ہے۔[4] بعض دیگر روایات میں اُن کی تعداد چودہ ہزار بتائی گئی ہے۔[5] بیس ہزار کا

[1] عقيدة أهل السنّة والجماعة في الصحابة الكرام: 1184/3. [2] صحيح البخاري، حديث: 7432، وصحيح مسلم، حديث: 1064. [3] تاريخ بغداد: 160/1. [4] البداية والنهاية: 281,280/7، اس کی سند صحیح ہے۔ مجمع الزوائد: 235/6. [5] مصنف عبدالرزاق: 160,157/10، اس کی سند حسن ہے۔

ذکر بھی ملتا ہے،[1] بیس ہزار والی تعداد کی کوئی سند نہیں ہے۔[2] کوفہ پہنچنے سے کئی منزلیں پہلے ہی وہ لشکر علی رضی اللہ عنہ سے علیحدہ ہو گئے، اس افتراق و انتشار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب کو قلق و اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ باقی لشکر امیر المومنین کے ساتھ کوفہ میں داخل ہوا۔ جب امیر المؤمنین کو یہ خبر ملی کہ خوارج اپنی ایک الگ جماعت منظّم کر رہے ہیں، اور انھوں نے ایک نماز کا امیر مقرر کر لیا ہے اور دوسرا قتال کا، اور اعلان کیا ہے کہ بیعت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو گی اور اسی پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عملی طور پر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس صورتِ حال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بہت فکر مند ہوئے اور انھیں واپس مسلمانوں کی اجتماعیت میں لانے کی کوششیں تیز کر دیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اُن کے ساتھ مذاکرات اور مناظرہ کے لیے روانہ کیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے خود یہ واقعہ بیان فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

میں نے یمن کا خوبصورت لباس پہنا، اپنے بال سنوارے اور نصف النہار کو اُن کے پاس جا پہنچا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ انتہائی خوبصورت شخص تھے۔ اُن لوگوں نے کہا: ابن عباس! خوش آمدید! اس کے بعد انھوں نے پوچھا: آپ نے یہ کیسا لباس پہن رکھا ہے؟ میں نے کہا: اس میں عیب کی کیا بات ہے؟ میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بہترین لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے، ایسے ہی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی تھی:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾

”اے نبی! ان سے کہو کہ کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا، جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں (ممنوع کر دیں۔)“[3]

انھوں نے پوچھا: آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟ میں نے کہا: میں تمھارے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجرین اور انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس سے آیا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد،

[1] تاريخ خليفة، ص:192. [2] خلافة علي رضي الله عنه بن أبي طالب لعبدالحميد، ص:303. [3] الأعراف 32:7.

اُن کے داماد کے ہاں سے آیا ہوں، اُن کے سامنے قرآن نازل ہوا، وہ اس کی تفسیر تم لوگوں سے بہتر جانتے ہیں، یہ بتاؤ کہ تم اصحاب رسول ﷺ اور اُن کے ابن عم سے کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے کہا: تین باتیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا ہیں؟ انھوں نے کہا: ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے معاملہ میں آدمیوں کو حَکَم بنایا ہے اور فرمانِ الٰہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حَکَم نہیں ہے، بھلا آدمیوں کا اللہ کے حکم سے کیا تعلق؟ میں نے کہا: اچھا! یہ ایک بات ہے، دوسری بات کیا ہے؟ انھوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کی ہے مگر کسی کو قیدی بنایا نہ مال غنیمت تقسیم کیا، اگر حریف کافر تھے تو اُنھیں قید کرنا جائز تھا اور مومن تھے تو اُن کے خلاف لڑنا ناجائز تھا۔ میں نے کہا: چلیے، اچھا یہ دو باتیں ہوگئیں۔ اب تیسری بات کیا ہے؟ انھوں نے کہا: وہ اپنے آپ کو امیر المومنین کہنے سے پیچھے ہٹ رہے ہیں، اگر وہ امیر المومنین نہیں ہیں تو پھر امیر الکافرین ہیں۔ میں نے پوچھا: کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟ انھوں نے کہا: بس یہی ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سناؤں اور اس کے نبی ﷺ کی سنت بتاؤں تو کیا تم واپس آ جاؤ گے؟ انھوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا: تمھارا یہ کہنا کہ اللہ کے معاملے میں آدمیوں کے حکم اور فیصلے کے کیا معنی؟ میں تمھیں قرآن پڑھ کر سناتا ہوں کہ ایک چوتھائی درہم کی قیمت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم بندوں کو سونپ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ اس میں فیصلہ دو، کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دیکھا ہے؟

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقْتُلُواْ ٱلصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُۥ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ ٱلنَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِۦ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ ﴾

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، احرام کی حالت میں شکار نہ مارو اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا اُسی کے ہم پلہ ایک جانور مویشیوں میں سے نذر کر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے۔“[1]

[1] المآئدة 95:5.

اس آیت میں انسانوں ہی کے حَکَم بننے کا ذکر ہے، میں تمھیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ انسانوں کے درمیان اصلاح افضل ہے یا اُن کا خون بہانا افضل ہے؟ انھوں نے اقرار کیا کہ اصلاح افضل ہے؟ میں نے کہا: لو اور سنو! میاں بیوی کے مابین اختلاف کی صورت میں فرمانِ ربانی ہے:

﴿ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا ﴾

''اگر تم لوگوں کو میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کر دو۔'' [1]

کیا اصلاح کی خاطر انسانوں کا فیصلہ افضل ہے یا خون بہانا؟ انھوں نے کہا: آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نے کہا: تمھارا یہ کہنا کہ انھوں نے لڑائی کی، نہ کسی کو قیدی بنایا، نہ مال غنیمت کی کوئی بات ہوئی، مجھے بتاؤ کیا تم اپنی ماں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو قیدی بناؤ گے؟ تمھارے لیے اُن کے ساتھ یہ معاملہ جائز ہے۔ اُن کو اپنے لیے حلال قرار دو گے تو یہ کفر کا ارتکاب ہوگا اور اگر کہو کہ وہ ہماری ماں نہیں ہیں تو اس صورت میں بھی تم کافر ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اَلنَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ ۖ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ﴾

''بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔'' [2]

پھر میں نے ان سے کہا کہ تم دو گمراہیوں کے بیچ میں پھنسے ہوئے ہو، اُن سے نکلنے کی کوشش کرو۔ انھوں نے کہا: جی ہاں، ٹھیک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: رہا تمھارا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین کا لقب مٹانے پر اپنی رضامندی ظاہر کی ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے روز مشرکین سے صلح کا معاہدہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] النسآء 35:4. [2] الأحزاب 6:33.

علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لکھو: ''یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کی۔'' کفار نے کہا کہ اگر ہم یہ مانتے ہوتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو پھر ہمارا جھگڑا ہی کیا تھا؟ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑائی نہ کرتے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! یہ الفاظ مٹا دو اور لکھو: ''یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی۔'' اللہ کی قسم! رسول اللہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ خیر و بھلائی پر تھے۔'' لیکن اُنھوں نے اپنا نام مٹا دیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل نبوت و رسالت کو مٹانے کے مترادف نہیں تھا۔ انھوں نے کہا: جی ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ چنانچہ ان خوارج میں سے دو ہزار آدمی نے رجوع کیا اور باقی بدستور خروج پر قائم رہے، بعد ازاں انھوں نے اپنی گمراہی کے سبب قتال کیا، اور مہاجرین و انصار نے انھیں قتل کیا۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خوارج کے ساتھ مناظرہ اس حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوا کہ اُن میں سے دو ہزار نے اپنی غلطی تسلیم کی اور اعتراف حق کر لیا۔ اس کے بعد امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ بہ نفس نفیس خوارج کی طرف گئے اور اُن سے گفتگو کی، انھوں نے رجوع کیا اور کوفہ واپس آ گئے، لیکن موافقت کی یہ صورت زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکی کیونکہ خوارج نے یہ سمجھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحکیم سے رجوع کر لیا ہے اور ان کے خیال کے مطابق انھوں نے اپنی غلطی سے توبہ کر لی ہے، وہ اپنا یہ خیال جا بجا پھیلانے لگے۔ اشعث بن قیس الکندی، امیر المومنین کے پاس آئے اور اُنھیں بتایا کہ لوگ یہ چہ مگوئیاں کر رہے ہیں کہ آپ نے ''کفر'' سے رجوع کر لیا ہے۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے روز خطبہ ارشاد فرمایا، اللہ کی حمد و ثناء کے بعد خوارج کو یاد دلایا کہ وہ لوگوں سے علیحدہ موقف اختیار کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے خارجیوں کو نصیحت فرمائی کہ وہ اس صورت حال کو خیر باد کہہ دیں۔[2]

ایک روایت میں ہے: ایک شخص آیا، اُس نے کہا: اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلے گا، پھر دوسرا شخص کھڑا ہوا، اُس نے بھی یہی بات دہرائی، بعد ازاں وہ لوگ مسجد کے کناروں پر

[1] خصائص أمیرالمومنین علی بن أبی طالب للإمام نسائی مع تحقیق أحمد البلوشی، ص: 200، اس کی سند حسن ہے۔ [2] مصنف ابن أبی شیبة: 312/15، 313، وإرواء الغلیل: 119,118/8.

جا کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی تحکیم کا اعلان کرنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُنھیں اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور فرمایا: ہاں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چل سکتا، یہ ایک ایسی حق بات ہے جس کے ذریعے باطل کو لایا جا رہا ہے، تمھارے متعلق میں اللہ کے حکم کا منتظر ہوں۔[1] آپ رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما رہے اور ان لوگوں کو اشارے سے چپ کراتے رہے۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنی دو انگلیاں دونوں کانوں میں ڈال کر یہ آیت پڑھی:

﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ ﴾

''اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس ارشادِ ربانی کو سنتے ہوئے اُنھیں جواب دیا:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ○ ﴾

''صبر کرو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اے نبی آپ کو ہرگز ہلکا نہ پائیں وہ لوگ جو یقین نہیں کرتے۔''[3]

امیرالمومنین نے اس منحرف جماعت کے ساتھ عدل اور دور اندیشی پر مبنی پالیسی اختیار کرتے ہوئے فرمایا: ہم تمھاری خاطر ان تین امور کے پابند رہیں گے۔

1. ہم تمھیں اس مسجد میں ادائے نماز سے نہیں روکیں گے۔
2. اگر تم ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دیے رکھو تو ہم مالِ فے سے تمھارا حصہ نہیں روکیں گے۔
3. اور تمھارے خلاف اُس وقت تک نہیں لڑیں گے جب تک تم خود لڑائی نہ کرو۔[4]

امیرالمومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کے مندرجہ بالا حقوق اس وقت تک کے لیے برقرار رکھے جب تک وہ خلیفہ کے خلاف لڑائی کے لیے کمر بستہ اور مسلمانوں کی اجتماعیت سے

[1] مرویات أبی مخنف فی تاریخ الطبري، ص: 452. [2] الزمر 65:39. [3] الروم 60:30. [4] مصنف ابن أبی شیبة: 328,327/15، والأم للشافعی: 136/4، وتاریخ الطبری: 688/5، میں ضعیف منقطع سند کے ساتھ مروی ہے، البتہ شیخ اَلبانی نے إرواء الغلیل: 118,117/8 میں اس سند کے شواہد اور تابع ذکر کیے ہیں۔

خارج نہ ہوں، مزید یہ کہ وہ اسلامی عقیدے کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مخصوص تصورات کی حفاظت کر سکتے ہیں، خلیفہ اُنھیں اسلام سے خارج نہیں قرار دیں گے بلکہ ان کی طرف سے اختلاف رائے کا حق تسلیم کریں گے بشرطیکہ اس کے نتیجے میں افتراق و انتشار پیدا ہو نہ کوئی ہتھیار اُٹھایا جائے۔[1] امیر المومنین نے خوارج کو جیلوں میں ڈالا نہ اُن پر جاسوس مقرر کیے۔ انھوں نے زور دیا کہ واضح دلیل کے ساتھ اظہار حق کیا جائے، تاکہ لوگ اُن کی ظاہری کیفیت اور آراء سے دھوکا نہ کھائیں۔ اُنھوں نے اپنے مؤذن کو حکم دیا کہ قرآن کے عالم میرے پاس لائے جائیں اور اُن میں کوئی ایسا نہ ہو جس نے قرآن حفظ نہ کیا ہو، بعد ازاں وہ جگہ قرآن کے عالموں سے بھر گئی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مصحف عثمانی منگوایا، اسے دونوں ہاتھوں سے کھولا اور کہنے لگے: اے مصحف! لوگوں کو بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے، لوگوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور وہ کہنے لگے: امیر المومنین! یہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟ یہ تو کاغذ پر روشنائی سے لکھے ہوئے الفاظ ہیں، ہمیں یہ سارا قرآن یاد ہے، آپ کا مقصد کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمھارے یہ ساتھی جنھوں نے خروج کیا ہے، میرے اور اُن کے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ایک مرد اور ایک عورت کے معاملہ میں فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَاۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾

”اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے مابین موافقت کی صورت نکال دے گا۔“[2]

اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون اور اس کی حرمت آیت میں مذکور اس آدمی اور عورت کی حرمت

[1] الوظيفة العقيدية للدولة الإسلامية لحامد عبدالماجد، ص: 47. [2] النسآء 4:35.

سے زیادہ قیمتی ہے۔ ان لوگوں کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مکاتبت میں صرف علی بن أبی طالب لکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ (دلیل دیتے ہوئے) فرماتے ہیں کہ جب قریشیوں کے ساتھ صلح نامہ لکھا گیا ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ سہیل بن عمرو کی موجودگی میں آپ ﷺ نے فرمایا: «بِسْمِ اللّٰهِ الرحمٰن الرحیم» سہیل نے کہا یہ نہ لکھو، پوچھا گیا پھر کیا لکھیں؟ اُس نے کہا لکھو، «باسْمِكَ اللّٰهُمَّ» رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، یہی لکھ لو۔ پھر فرمایا: لکھو! یہ صلح نامہ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے۔ یہ سن کر سہیل نے کہا: اگر میں یہ تسلیم کرتا کہ آپ رسول اللہ ﷺ ہیں تو پھر مخالفت کیوں کرتا۔ پھر میں نے لکھا: یہ وہ صلح نامہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور قریش کے درمیان طے پایا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ﴾

”دراصل تم لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ﷺ میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کا اُمید وار ہو۔“ [1]

جب خوارج کو یقین ہو گیا کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو موسیٰ اشعری کو بطور حَکَم مقرر کرنے کے لیے پرعزم ہیں تو انھوں نے یہ فیصلہ منسوخ کرنے پر اصرار کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا انکار کیا اور اُنھیں بتایا کہ اس طرح کرنا عہد و پیمان توڑنے کے مترادف ہو گا اور ہم یہ معاہدہ طے کر چکے ہیں۔ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ﴾

”اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ

[1] (الأحزاب 21:33) مسند أحمد: 87,86/1، حدیث: 656، احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو، جبکہ تم اللہ کو اپنے اُوپر گواہ بنا چکے ہو۔‘‘ [1]

یہ بات سن کر خوارج نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا اور طے کیا کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کریں گے۔ وہ عبداللہ بن وہب الراسبی کے گھر اکٹھے ہوئے، اُس نے اُن سے فصیح و بلیغ خطاب کیا۔ اُنھیں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت اور جنت کی طرف رغبت دلائی، اُنھیں نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کی ترغیب دی، پھر ان سے کہا: میرے بھائیو! آؤ ہم ان ظالم لوگوں کی بستی سے نکل جائیں۔ کسی پہاڑ کی طرف رخ کرلیں اور ان کے ظالمانہ احکام ماننے سے انکار کردیں، پھر حرقوص بن زہیر کھڑا ہوا۔ وہ حمد و ثناء کے بعد کہنے لگا: اس دنیا کا مال و متاع قلیل اور بے قدر و قیمت ہے اور جلد اس دنیا سے جدائی ہو جائے گی۔ اس کی زیب و زینت اور چمک دمک تمھیں یہاں قیام کی دعوت نہ دے۔ وہ تمھیں حق مانگنے اور ظلم سے انکار کرنے کے عمل سے غافل نہ کردے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝﴾

’’اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔‘‘ [2]

حمزہ بن سنان اسدی نے کہا: اے میری قوم! تمھاری رائے ہی صحیح ہے اور جو کچھ تم کہتے ہو وہی حق ہے، تم اپنا معاملہ اپنوں میں سے کسی کو ذمہ دار بنا کر حل کرو، تمھیں کسی ستون، کسی سہارے اور طاقت کی ضرورت ہے، تم ایک جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ لوگوں نے زید بن حصن الطائی کو بلا بھیجا، وہ اُن کے سرداروں میں سے ایک تھا اُسے امارت پیش کی، لیکن اس نے انکار کردیا، پھر حرقوص بن زہیر کو امارت کی پیش کش کی گئی، اُس نے بھی قبول نہیں کی، اس کے بعد شریح بن ابی اوفی العبسی کو امارت کی دعوت دی گئی۔ اُس نے بھی قبول کرنے سے انکار کیا، پھر عبداللہ بن وہب الراسبی کو یہ پیش کش کی گئی تو اُس نے قبول کرلیا اور کہا: اللہ کی قسم میں نے دنیا کی رغبت کی خاطر یہ عہدہ قبول نہیں کیا نہ میں موت کے ڈر سے سے چھوڑوں گا۔ [3]

---

[1] النحل 16:91. [2] النحل 16:128. [3] البداية والنهاية: 7/312، وتاريخ الطبري: 5/689.

وہ لوگ زید بن حصن الطائی کے گھر بھی جمع ہوئے، اُس نے خطاب کیا اور اُن سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ترغیب دی اور قرآن پاک کی ان آیات کی تلاوت کی:

﴿يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

''اے داود! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں پر حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر، اگر تو نے خواہش کی پیروی کی تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔''[1]

پھر قرآن مجید کی مختلف آیات پڑھنے کے بعد کہا: میں اپنے اہل دعوت اور اہل قبلہ کے خلاف گواہی دیتا ہوں کہ انھوں نے خواہشات کی پیروی کی اور کتاب اللہ کا حکم چھوڑ دیا اور اپنے قول وعمل میں ظلم کا رویہ اپنایا، مومنوں کا حق بنتا ہے کہ اُن کے خلاف جہاد کریں وہاں عبداللہ بن شجرہ السلمی نامی ایک شخص رو پڑا، پھر سب کو خروج کی ترغیب دی اور اپنی گفتگو کے دوران کہا: اُن کے چہروں اور پیشانیوں پر تلواریں مارو یہاں تک کہ رحمٰن ورحیم کی اطاعت کی جائے، اگر تم کامیاب ہو گئے اور تمھاری رائے کے مطابق اللہ کی اطاعت کی جانے لگی تو اللہ تعالیٰ تمھیں فرمانبرداری کا اجر وثواب دے گا اور اگر تم ناکام ہو گئے تو اللہ کی خوشنودی اور جنت کے حصول سے زیادہ افضل چیز اور کیا ہوسکتی ہے۔[2]

اس گفتگو میں شیطان نے اُن سے کیا کیا کہلوایا، ان سب باتوں کا ذکر کرنے کے بعد ابن کثیر کہتے ہیں: یہ لوگ اولادِ آدم میں بہت عجیب وغریب نوعیت کے انسان ہیں، سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کیسے کیسے عجیب انسان ہیں جو اللہ نے مقدر کر دیے، خوارج کے بارے میں اسلاف میں سے بعض نے کیا خوب کہا ہے کہ ان کا تذکرہ اس فرمان خداوندی میں موجود ہے:

[1] صٓ 26:38. [2] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 319.

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ○ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ○ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ○﴾

''اے نبی ﷺ! ان سے کہو، کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی دنیا کی زندگی کی ساری سعی و جہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات ماننے سے انکار کیا اور اُس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا، اس لیے اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم اُنھیں کوئی وزن نہ دیں گے۔''[1]

ان واقعات کو تفصیل سے بیان کرنے سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں ہی کی صفوں میں سے جاہل اور گمراہ بدقسمت لوگوں کی رائے خروج پر مجتمع ہوگئی۔ پھر انھوں نے مدائن کی طرف اکٹھے ہو کر چلنے کا اعلان کیا تا کہ وہاں جا کر قلعہ بند ہو جائیں۔ انھوں نے اہل بصرہ میں اپنے بھائیوں اور اپنے جیسے دوسرے ہم خیال لوگوں کو پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس آ جاؤ۔ زید بن حصن الطائی نے اس موقع پر کہا کہ تم مدائن کو زیرنگیں نہیں لا سکتے کیونکہ وہاں ایک فوج ہے تم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ پوری قوت سے اپنا دفاع کریں گے، ہاں تم اپنے بھائیوں اور ہم رائے لوگوں سے دریائے جوخی کے پل پر جا ملو، اور کوفہ سے جماعت کی شکل میں کبھی نہ نکلنا بلکہ ایک ایک کر کے چپ چاپ نکلو، تا کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ پھر انھوں نے ایک تحریر لکھی اور اہل بصرہ میں اپنے ہم مذہب اور ہم مسلک لوگوں کو بھیجی کہ وہ اس دریا پر پہنچ جائیں، اپنی وحدت کا مظاہرہ کریں اور دیگر لوگوں کے بالمقابل متحد نظر آئیں، پھر وہ ایک ایک کر کے نکلے، تا کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے اور کوئی انھیں خروج سے نہ روک سکے۔ وہ اپنے ماں باپ،

[1] الکہف 18: 103-105.

ماموں اور خالاؤں اور دوسرے قرابت داروں کے درمیان سے اس طرح نکلے کہ اُن جاہل اور کم علم لوگوں کا خیال تھا کہ اُن کا یہ عمل آسمانوں اور زمین کے رب کی خوشنودی کا باعث ہے، انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ عمل انتہائی کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور وہ بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں، ابلیس مردود نے اُن کے لیے ان کا یہ عمل خوشنما بنا دیا، جس نے ہمارے جد امجد آدم علیہ السلام کے خلاف دشمنی کا اعلان کیا تھا، پھر اولادِ آدم کے ساتھ یہ دشمنی مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔

خوارج کی ایک جماعت نے اپنی اولادوں اور بھائی بندوں کو اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کی، انھیں واپس اپنے گھروں کی طرف جانے کو کہا، اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ اُن میں سے کچھ لوگ اپنے بڑوں کے روکنے سے رُک گئے لیکن دیگر لوگ دائیں بائیں کھسک کر خوارج سے جا ملے۔ یوں خسارے کا سودا کر لیا۔ البتہ خوارج کی ایک بڑی جماعت نہروان کے مقام پر جمع ہوئی اور وہاں انھوں نے اپنی قوّت وشوکت کا مظاہرہ کیا۔ [1]

جب دونوں جانب کے حَکَم بغیر رضا مندی جُدا ہو گئے تو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہروان کے مقام پر اکٹھے ہونے والے خوارج کو لکھا کہ دونوں حَکَم کسی رضا مندی کے فیصلے تک پہنچے بغیر جدا ہو گئے ہیں، لہٰذا تم سابقہ صورت حال پر واپس آ جاؤ اور اہل شام کے خلاف لڑائی کے لیے ہمارا ساتھ دو، انھوں نے انکار کر دیا اور کہا: اگر آپ اپنے کفر کا اعتراف کریں اور پھر توبہ کر لیں تو ہم واپس آ جائیں گے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ [2]

ایک روایت کے مطابق انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لکھا: اما بعد: آپ اپنے رب کی خاطر ناراض نہیں ہیں بلکہ اپنے نفس کی خاطر ناراض ہیں، اگر آپ اپنے کفر کا اقرار کریں، اور توبہ کر لیں تو ہم آپ کے اور اپنے مابین معاملات پر غور کر سکتے ہیں، ورنہ ہم نے آپ سے ترکِ تعلق کر لیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت

[1] البداية والنهاية: 7/312، 313. [2] أنساب الأشراف: 2/63، اس کی سند ضعیف ہے، البتہ اس کے شواہد ہیں۔

علی رضی اللہ عنہ اُن کی یہ تحریر پڑھ کر مایوس ہو گئے، انھیں چھوڑ دینے کا ارادہ کیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر شام جانے کا فیصلہ کیا تا کہ اُن کا مقابلہ کیا جا سکے اور مشن کی تکمیل ہو جائے۔ [1]

معرکۂ نہروان 38ھ
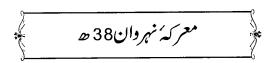
معرکہ کے اسباب

وہ شرائط جو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج سے طے کی تھیں کہ نہ وہ کسی کا خون بہائیں گے‘ نہ کسی پُر امن کو ہراساں کریں گے اور نہ رہزنی کریں گے، اگر وہ ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو پھر جنگ ہو گی۔ چونکہ خوارج اپنے ہر مخالف کو کافر گردانتے تھے اور اُس کے خون اور مال کو جائز سمجھتے تھے، انھوں نے پہلی مرتبہ اسلام میں حرمت والے خون بہائے اور متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے طے شدہ ممنوعہ امور کی خلاف ورزی کی۔ اس خلاف ورزی کے عینی شاہد خود خارجی تھے۔ ایک عینی شاہد نے کہا: میں نہروان والوں کا ساتھی تھا، پھر مجھے اُن کے معاملات پسند نہیں آئے، لیکن میں چپ رہا مبادا مجھے قتل کر دیں، ایک مرتبہ میں اُن کے ایک گروہ کے ساتھ تھا ہم ایک بستی کے پاس آ گئے، ہمارے اور اس بستی کے درمیان ایک نہر تھی، اس دوران ایک آدمی گھبرایا ہوا بستی سے نکلا۔ وہ اپنی چادر گھسیٹ رہا تھا، انھوں نے اس آدمی سے کہا: شاید ہم نے تمھیں خوف زدہ کیا ہے؟ وہ بولا: ہاں! وہ کہنے لگے: ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! یہ سب اُسے جانتے ہیں اور میں نے بھی اُسے پہچان لیا۔ انھوں نے پوچھا: کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابن خباب ہو؟ اس نے کہا: ہاں، انھوں نے پھر پوچھا: کیا تم اپنے والد سے ایک حدیث بیان کرتے ہو جو انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی؟ ابن خباب نے کہا: میں نے

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 319.

اپنے والد سے سُنا وہ کہتے تھے کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ نے ایک فتنہ کا ذکر کیا، پھر فرمایا: ''اس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا، اگر تمھارا اُس فتنے سے واسطہ پڑے تو اللہ کے مقتول بندے بن جانا۔''

ان لوگوں نے ابن خباب اور اُن کی لونڈی کو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑے، راستے میں کھجور کے ایک درخت کے قریب سے گزرے، اُس کا پھل زمین پر گرا ہوا تھا۔ ایک شخص نے اُسے اٹھایا اور اپنے منہ میں ڈال لیا۔ اُن میں سے ایک آدمی نے کہا: یہ ذمی کا پھل ہے، تم نے اپنے لیے اسے کھانا کس طرح صحیح سمجھا؟ یہ سن کر اس نے پھل منہ سے نکال کر باہر پھینک دیا، پھر وہ لوگ راستے میں ایک خنزیر کے پاس سے گزرے، اُن میں سے ایک نے اُس خنزیر پر تلوار ماری اور اُسے ہلاک کر دیا۔ اُن میں سے بعض نے کہا: یہ تو ذمیوں کا خنزیر تھا تم نے اسے کیوں مارا؟ عبداللہ بن خباب نے کہا: کیا میں تمھیں ان سب باتوں سے زیادہ حرمت والی چیز نہ بتاؤں؟ انھوں نے کہا: ضرور بتائیے۔ انھوں نے کہا: وہ میں ہوں، لیکن وہ یہ بات سنتے ہی عبداللہ بن خباب کو نہر کے پاس لے گئے۔ وہاں انھیں شہید کر کے نہر میں پھینک دیا۔ راوی کہتا ہے: میں نے اُن کا خون پانی کی سطح پر اس طرح بہتے دیکھا جیسے وہ جوتے کا تسمہ ہے جو پانی پر تیرتا چلا جا رہا ہے، یعنی پانی میں حل نہیں ہوا، کچھ دیر بعد وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ [1] پھر انھوں نے لونڈی کو بلایا۔ وہ بے چاری حالتِ حمل میں تھی۔ انھوں نے اس کا پیٹ چاک کیا اور اس کا حمل گرا دیا، راوی کہتا ہے: میں نے اب تک ان لوگوں سے زیادہ بُغض وعناد والے لوگ کبھی نہیں دیکھے، تا آنکہ ایک مقام پر مجھے اُن سے الگ ہو جانے کا موقع مل گیا اور میں وہاں سے کِھسک گیا۔ [2]

اس قسم کی قتل وغارت گری نے لوگوں کے دلوں میں اُن کی دہشت بٹھا دی۔ ان کی سب

---

[1] تاریخ بغداد: 1/205، 206. [2] مصنف بن أبی شیبہ: 15/310، اس کی سند صحیح ہے۔

سے زیادہ وحشیانہ حرکت یہ تھی کہ انھوں نے ایک حاملہ عورت کا پیٹ چاک کر ڈالا اور عبداللہ کو اس طرح ذبح کیا جیسے کسی بکرے کو ذبح کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ لوگوں کو قتل کی دھمکیاں دیتے رہے، تا آنکہ اُنھی میں سے بعض نے اُن کے اس عمل پر سخت برہمی ظاہر کی اور کہا: اللہ تمھیں غارت کرے! کیا اسی مقصد کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علیحدگی اختیار کی تھی؟[1]

خوارج سنگین قسم کے منکرات کے مرتکب ہوئے تھے، پھر بھی امیر المومنین نے ان کے خلاف لڑائی کے لیے جلدی نہیں کی، بلکہ انھیں پیغام بھیجا کہ وہ قاتل اُن کے سپرد کریں تا کہ ان پر حد نافذ کی جائے۔ اس کے جواب میں انھوں نے بڑے تکبر اور عناد سے کہا: ہم سب قاتل ہیں۔[2]

وہ لشکر جو امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے محرم سن 38 ھ میں اہل شام کے خلاف تیار کیا تھا، اُسی کو لے کر خوارج کا رخ کیا[3] اور دریائے نہروان کے مغربی کنارے پر فوج اتاری۔ خوارج نہروان کے بالمقابل مشرقی کنارے پر تھے۔[4]

لشکر کو لڑائی کی ترغیب

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کا پورا ادراک تھا کہ جن لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین سے خارج ہو جانے کی نشاندہی فرمائی تھی، وہ یہی خوارج ہیں، لہٰذا ان کی طرف نکلتے وقت وہ اپنے ساتھیوں کو ان کے خلاف قتال کی ترغیب دیتے رہے۔ خوارج کے بارے میں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا امیر المومنین کے پیروکاروں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں پر بہت اثر تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

[1] مجمع الزوائد: 237/6، 238، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] مصنف ابن أبي شيبة: 308/15، 309، اس کی سند بھی صحیح ہے۔ [3] أنساب الأشراف: 63/2، اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے، خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 322. [4] تاريخ بغداد: 205/1، 206.

فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''میری امت میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے، تمھاری قراءتِ قرآن اُن کی قراءت قرآن کے بالمقابل کچھ نہیں ہوگی، نہ تمھاری نماز اُن کی نماز کے ہم پلہ ہوگی، نہ تمھارے روزے اُن کے روزوں کے برابر ہوں گے، وہ قرآن پڑھیں گے اور سمجھیں گے کہ یہ اُن کے حق میں ہے جبکہ وہ اُن کے خلاف ہوگا، ان کی نمازیں اُن کے حلق سے نیچے نہیں اتریں گی، وہ اسلام سے اس طرح پار نکل جائیں گے، جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔''

ان لوگوں میں سے ایک ایسا آدمی بھی ہے جس کے بازو پر اُس کا ہاتھ نہیں ہے، اس کے بازو کے سرے پر پستان کے نپل جیسی ایک چیز ہے اور اُس پر چند سفید بال ہیں۔ تم معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام کے خلاف لڑنے کی بات کرتے ہو اور ان خوارج کو چھوڑ رہے ہو جو پیچھے تمھاری آل اولاد اور تمھارے مال کے بیچ میں رہیں گے، مجھے یقین ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے حرمت والا خون بہایا ہے اور غارت گری کی ہے۔ اللہ کا نام لے کر ان کی طرف چل پڑو۔ [1]

یوں نہروان کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمیں دین سے خارج ہونے والوں کے خلاف قتال کا حکم ملا ہے اور یہ لوگ دین سے خارج ہیں۔ [2]

جنگ سے پہلے خوارج کو نصیحت

خوارج کے بالمقابل لشکر علی نے پوزیشنیں سنبھال لیں، دونوں کے درمیان نہروان کی نہر تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لشکر کو حکم دیا کہ وہ قتال کی ابتداء نہ کریں، تا آنکہ مغربی طرف سے خوارج نہر عبور کر لیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے پاس اپنے ایلچی بھیجے انھیں اللہ کی یاد دلائی اور اپنے موقف سے باز آ جانے کی نصیحت فرمائی، براء بن عازب کو ان کی طرف بھیجا،

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1066. [2] السنة لابن أبی عاصم، مع تحقیق شیخ ألبانی، محقق کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، البتہ اس کی سند ضعیف ہے اور حدیث کے شواہد بھی ہیں۔

وہ تین روز تک خیر و بھلائی کی دعوت دیتے رہے، لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔[1] ان کے ایلچی مسلسل اُن کے پاس آتے رہے، حتی کہ انھوں نے ان کے ایلچی قتل کر دیے اور نہر عبور کر کے آگے آ گئے۔[2] جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ خوارج اس حد تک پہنچ چکے ہیں اور صلح اور جان کی حفاظت کی تمام کوششیں بار آور ثابت نہیں ہو رہیں۔ اور انھوں نے تکبر اور عناد کی بنیاد پر حق کی طرف واپس آنے سے انکار کر دیا ہے اور قتال ہی پر تلے ہوئے ہیں تو امیر المومنین نے اپنے لشکر کو منظّم کرنا اور اُنھیں قتال کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔[3]

انھوں نے دائیں جانب حجر بن عدی، بائیں طرف شبث بن ربعی اور معقل بن قیس الریاحی کو، گھڑ سواری کے لیے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور پیادوں پر اَبو قتادہ انصاری کو کمانڈر مقرر کیا اور اہل مدینہ جو سات سو کی تعداد میں تھے اُن پر قیس بن سعد بن عبادہ کو امیر بنایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو ایوب انصاری کو حکم دیا کہ وہ خوارج کے لیے امان کا جھنڈا بلند رکھیں اور اُنھیں ضمانت دیں کہ جو اس جھنڈے تلے آ جائے گا، وہ امان میں ہوگا اور جو کوفہ اور مدائن لوٹ جائے گا، وہ بھی امان میں ہوگا، ہم تم سے کچھ نہیں چاہتے۔ ہمیں صرف وہ ظالم مطلوب ہیں جنھوں نے ہمارے بھائیوں کو قتل کیا ہے۔ یہ بات سن کر بہت سے لوگ واپس چلے گئے، اُن کی کل تعداد چار ہزار کے قریب تھی، ان میں سے ایک ہزار یا اُن سے بھی کم عبداللہ بن وہب الراسبی کے ساتھ باقی رہ گئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مدمقابل آ گئے۔ لشکر میں اُن کے دائیں زید بن حصن الطائی، بائیں جانب شریح بن اَوفی، گھڑ سوار حمزہ بن سنان اور پیادہ حرقوص بن زہیر السعدی تھا، یہ سب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے اَصحاب کے مقابل لڑائی کے لیے تیار کھڑے تھے۔[4]

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي: 197/8، وخلافة علي لعبدالحميد، ص: 324. [2] مصنف ابن أبي شيبة: 15/325-327. [3] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 324. [4] تاريخ الخلافة الراشدة لمحمد كنعان، ص: 425، والبداية والنهاية سے اختصار۔

گھمسان کا رن

خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آگے گھڑ سوار، اور تیر انداز تھے اور گھڑ سواروں کے پیچھے پیادہ فوج تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب سے کہا: تم اس وقت تک رُکے رہو جب تک وہ ابتدا نہ کریں۔ خوارج یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے: اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں، چلو جنت کو چلو، جنت کو چلو۔ پھر اُنھوں نے اُن گھڑ سواروں پر حملہ کیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آگے آگے تھے، یہ گھڑ سوار دائیں اور دوسرے بائیں طرف چلے گئے۔ پھر اُن کا سامنا تیر اندازوں سے ہوا وہ لشکر علی رضی اللہ عنہ کے چہروں پر تیر برسانے لگے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھڑ سوار دائیں اور بائیں سے مڑتے ہوئے آئے تیروں اور تلواروں سے حملہ آور ہوئے اور خوارج کو زمین پر گراتے چلے گئے، اُن کے اُمراء عبداللہ بن وہب، حرقوص بن زہیر، شریح بن اوفی اور عبداللہ بن سخبرہ السلمی قتل ہو گئے۔ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے خوارج میں سے ایک شخص کو تیر مارا، تیر اُس کی پیٹھ میں پیوست ہو گیا، میں نے اُسے کہا: اے اللہ کے دشمن! تمھیں جہنم کی نوید ہو تو وہ کہنے لگا: تم جان لو گے ہم میں سے کون جہنم میں جانے کا زیادہ حق دار ہے۔[1]

خوارج کی ایک بہت بڑی تعداد اس لڑائی سے دور رہی کیونکہ انھوں نے عبداللہ بن وہب سے ایک ایسا جملہ سنا جس سے اُن کا یقین متزلزل ہو گیا۔ یہ وہ الفاظ تھے کہ جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک خارجی کو تلوار ماری تو وہ کہنے لگا: میں خوش ہوں کہ جنت کی طرف جا رہا ہوں۔ تو عبداللہ بن وہب نے کہا: معلوم نہیں کہ جنت کی طرف جا رہا ہے یا جہنم کی طرف۔[2]

بنی سعد میں سے ایک شخص فروہ بن نوفل الاشجعی نے کہا: میں تو دھوکے سے یہاں آ گیا، مجھے بھی اپنے موقف پر شک ہے، اس نے اپنے کچھ ساتھیوں سمیت خوارج سے علیحدگی اختیار کر لی اور ابوایوب اَنصاری کے پاس چلے گئے۔ پھر لوگ آہستہ آہستہ ان کی صفوں سے

[1] تاریخ الخلافة الراشدة لمحمد کنعان، ص: 425. [2] أخبار الخوارج من الکامل للمبرد، ص: 21، وخلافة علي، ص: 325.

کھسکنے لگے۔ [1]

معرکہ مختصر تھا مگر شدید گھمسان کا معرکہ تھا جو نو صفر 38ھ میں پیش آیا۔ [2] خوارج کی صفوں میں سے بڑی تعداد قتل ہو گئی اور لشکر علی رضی اللہ عنہ میں اس کے برعکس صورتِ حال تھی۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق جو زید بن وہب نے بیان کی ہے، صرف دو آدمی شہید ہوئے۔ [3] ایک اور روایت میں جو سندِ حسن کے ساتھ بیان ہوئی اصحاب علی رضی اللہ عنہ میں سے بارہ یا تیرہ کی تعداد میں شہید ہوئے۔ [4] ایک صحیح روایت کے مطابق ابومجلز [5] کہتے ہیں: لشکر علی رضی اللہ عنہ یعنی مسلمانوں کے لشکر میں سے نو آدمی شہید ہوئے، اگر تم چاہو تو أبوبرزہ سے جا کر پوچھ لو، وہ اس کے گواہ ہیں۔ [6] البتہ خوارج بعض روایات کے مطابق تمام کے تمام مارے گئے۔ [7] تاہم مسعودی کا کہنا ہے کہ ایک تھوڑی سی تعداد ماری گئی جو دس سے زیادہ نہ ہو گی، باقی سب عبرت ناک شکست کے بعد فرار ہو گئے۔ [8]

لشکرِ علی رضی اللہ عنہ پر ذوالثدیہ کے قتل کے اثرات

ذوالثدیہ کی شخصیت کے تعین میں مختلف روایات ملتی ہیں، ان میں کچھ کی سند ضعیف اور بعض روایات کی سند قوی ہے۔ اُحادیث میں ذوالثدیہ کے بارے میں کچھ خصوصیات بیان ہوئی ہیں، یعنی وہ سیاہ پوست تھا۔ [9] ایک روایت کے مطابق وہ حبشی تھا، اُس کے ہاتھ میں نقص تھا اس کا ہاتھ چھوٹا سا تھا، بس کندھے سے کہنی تک تھا، اس کے بازو کے آخر میں پستان کے نپل جیسا نشان تھا، اس پر سفید بال تھے، اس کے بازو میں ہڈی نہیں تھی، اس وجہ سے اس

[1] أخبار الخوارج من الكامل للمبرد، ص:21، وخلافة على لعبدالحميد، ص:325. [2] أنساب الأشراف: 63/3، اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ [3] صحيح مسلم، حديث: 1066. [4] مصنف ابن أبي شيبه: 311/5، تاريخ خليفه، ص: 197، اس کی سند حسن ہے۔ [5] ان کا نام لاحق بن حمید السدوسی البصری ہے جو ثقہ راوی ہیں۔ [6] المعرفة والتاريخ: 315/3، تاريخ بغداد: 182/1. [7] أخبار الخوارج من الكامل للمبرد، ص: 338. [8] خلافة على بن أبي طالب، ص: 329، تاريخ خليفه، ص: 197. [9] مصنف عبدالرزاق: 146/10.

کا بازو لٹر کھڑا تا رہتا تھا۔ عربی کے مختلف الفاظ کا ایک ہی معنی یہ ہے کہ اُس کے ہاتھ میں نقص تھا۔[1] اس کا نام کیا تھا؟ جس نے یہ کہا ہے کہ ذوالثدیہ سے مراد حرقوص بن زہیر السعدی ہے، اس نے غلط کہا ہے[2] کیونکہ حرقوص مشہور شخصیت ہے، اسلامی فتوحات میں اس کا بڑا کردار ہے، بعدازاں اُس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا۔ معرکۂ جمل کے موقع پر اُس نے زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، پھر بھاگ گیا، یہ حرقوص، خوارج کے بڑے لیڈروں میں سے تھا[3] البتہ ایک روایت میں آیا ہے کہ ان کا نام ''س'' سے حرقوس تھا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ اُس کا نام مالک تھا۔ اس کا باپ کون تھا؟ کوئی نہیں جانتا۔ جنگ کے اختتام پر اسے تلاش کیا گیا تو وہ مل گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ أکبر! تمھیں اُس کے باپ کا نام کوئی نہیں بتائے گا۔ لوگ کہنے لگے: ارے دیکھو! دیکھو! یہ مالک ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: یہ کس کا بیٹا ہے؟[4] کوئی اُس کے باپ کا نام نہ بتا سکا۔

ایک روایت میں آیا ہے جسے طبری نے صحیح قرار دیا ہے کہ ذوالثدیہ کا نام نافع ہے۔ ابن ابی شیبہ اور ابوداود نے بھی یہی نام نقل کیا ہے، دونوں کی سند ایک ہے، ایک ہی سند پر مبنی ایک ہی روایت تین مختلف مصادر سے بیان ہوئی ہے۔[5]

خوارج کی طرف سے آئے دن دین میں نئی نئی باتوں کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اکثر آگاہ فرماتے رہتے تھے، اکثر اوقات ذوالثدیہ کا ذکر بھی کرتے تھے، اُس کا نام خوارج کی پہچان بن گیا تھا۔ امیر المومنین اس کے خصائل بھی بتاتے تھے۔ نہروان کے گھمسان کے معرکہ کے اختتام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ ذوالثدیہ کی لاش تلاش کرو، کیونکہ مقتولین میں اُس کی موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ برحق اور صائب الرائے ہیں۔ اس کی تلاش شروع ہوئی۔ آخر کار نہر کے کنارے مقتولین کے تہہ در تہہ ڈھیر کے نیچے

[1] النهاية في غريب الحديث: 13,12/1، وفتح الباري: 295,294/12. [2] الملل والنحل: 115/1.
[3] فتح الباري: 292/12، والإصابة: 139/1. [4] الفتح الرباني على مسند الإمام أحمد: 155/23، اس کی سند حسن ہے والبداية والنهاية: 295,294/7. [5] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص: 334.

اُس کی لاش مل گئی، ذوالثدیہ سب سے نیچے بالکل زمین کے ساتھ لگا ہوا ملا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کہا اور فرمایا: اللہ نے سچ فرمایا ہے، اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح بات پہنچا دی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہاں سجدۂ شکر ادا کیا، لوگوں نے انھیں دیکھا تو اللہ اُکبر کا نعرہ لگایا اور خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ [1]

خوارج سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا سلوک

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ سے پہلے اور بعد خوارج کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کیا۔ جوں ہی معرکہ نہروان ختم ہوا، اپنے لشکر کو حکم دیا کہ پیٹھ پھیر کر واپس جانے والوں کا پیچھا نہ کرو، کسی زخمی کو ہلاک نہ کرو، نہ کسی مقتول کا مُثلہ کرو۔ شقیق بن سلمہ جو ابو وائل کی کنیت سے مشہور ہیں، فقہاء تابعین میں سے ہیں، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگوں میں شریک بھی رہے، وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جمل اور نہروان کے روز کسی کو قید نہیں کیا [2] وہ اہل نہروان کا گرا پڑا سامان کوفہ لے گئے اور اعلان فرماتے رہے: جو شخص اپنا سامان پہچان لے، لے جائے۔ لوگ آ آ کر اپنا سامان لے جاتے رہے۔ اس روایت کی کئی سندیں ہیں۔ [3] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کے مجاہدین میں صرف وہ اسلحہ اور سامان حرب تقسیم کیا جس کے ذریعے خوارج حملہ آور ہوئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کی تکفیر نہیں کی۔ جنگ سے پہلے اُنھیں اجتماعیت کی طرف لوٹ آنے کی نصیحت فرمائی، اور ان میں سے کثیر تعداد واپس بھی آ گئی، انھوں نے اِن لوگوں کو نصیحت کی اور لڑائی کا خوف دلایا۔ ابن قدامہ کہتے ہیں: اُنھوں نے یہ اس لیے کیا کہ اصل مقصد انھیں قتل کرنا نہیں بلکہ اُن کا شر دور کرنا تھا، اگر صرف زبانی بات کہنے پر وہ باز آ جاتے تو یہ قتال کی نسبت بہتر تھا۔ کیونکہ قتال میں تو فریقین کا نقصان تھا۔ اس ساری بات سے یہ واضح ہوا کہ خوارج مسلمانوں ہی کا ایک

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 319,317/15، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] السنن الكبرى للبيهقي: 182/8، اس کی سند صحیح ہے۔ [3] التلخيص الحبير: 47/4.

فرقہ ہے، اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔ [1]

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اُنھیں فاسقین کہتے تھے۔ مصعب بن سعد سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد سے اس آیت کی روشنی میں پوچھا کہ اس میں کن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

﴿ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ○ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ○ ﴾

''اے نبی! ان سے کہو، کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی دنیا کی زندگی میں ساری جدوجہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔'' [2]

میں نے پوچھا: کیا وہ حروریہ ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں، اس سے مراد اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں، یہود نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور نصاریٰ نے جنت کا انکار کیا اور کہا کہ وہاں کوئی کھانا ہوگا، نہ کوئی مشروب۔ لیکن حروریہ اس آیت کے مصداق ہو سکتے ہیں۔

﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفٰسِقِينَ ○ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِيثٰقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ○ ﴾

''اور وہ گمراہی میں اُنھی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، درحقیقت یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔'' [3]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اُن کو فاسقین کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ [4]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے کہ جب اُن سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

---

[1] فتح الباري:301,300/12، ونيل الأوطار: 182/8. [2] الكهف 104,103:18. [3] البقرة 27,26:2.
[4] صحيح البخاري، حديث:4728، وفتح الباري:842/5.

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں میں کجی پیدا کردی۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ لوگ کافر ہیں؟ انھوں نے فرمایا: وہ کفر سے بھاگ کر تو یہاں آئے تھے۔ پوچھا گیا کہ کیا یہ لوگ منافق ہیں انھوں نے فرمایا کہ منافق تو اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: ''یہ لوگوں کا ایک گروہ ہے، انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی تو ہم نے اُن کے خلاف قتال کیا۔'' ایک روایت میں ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آزمائش میں مبتلا ہوئے تو اندھے اور بہرے ہو گئے۔ [2] انھوں نے اپنے لشکر کو اور بعد میں آنے والی امت اسلامیہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ اگر ایسے لوگ امام عادل کی مخالفت کریں تو اُن کے خلاف لڑو، اور اگر ظالم امام کی مخالفت کریں تو اُن کے خلاف مت لڑو، کیونکہ اس صورت میں ان کی بات میں وزن ہے۔ [3]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خوارج کے خلاف قتال اور جمل و صفین کے واقعات میں قتال کا گہرا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمل و صفین کے سانحات میں قتال پر اُنھیں بے حد غم ہوا تھا، البتہ خوارج کے خلاف قتال پر وہ مطمئن تھے۔

امام ابن تیمیہ کہتے ہیں: نص اور اجماع نے دونوں کے مابین فرق کیا ہے کہ خوارج کے خلاف تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نص کے مطابق قتال کیا، اس بارے میں صحابہ کرام میں سے کوئی بھی ان سے اختلاف رائے کرنے والا نہ تھا۔ صفین والے روز جو قتال ہوا، اُس پر اُن کی ناپسندیدگی اور ندامت واضح نظر آ رہی تھی۔ [4]

---

[1] مصنف ابن أبی شیبة: 325,324/15، والاعتصام للشاطبی: 62/1. [2] مصنف عبدالرزاق: 150/10، ومصنف ابن أبی شیبة: 232/15، اس کی سند صحیح ہے۔ [3] مصنف ابن أبی شیبة: 320/15، وفتح الباری: 301/12، طبری نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [4] مجموع الفتاویٰ: 516/28.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری ایام
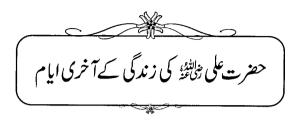
جنگ نہروان کے بعد

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دین سے خارج ہونے والے فرقۂ خوارج کے خلاف قتال اس بات پر بڑی قوی اور واضح دلیل ہے کہ انھوں نے اہل شام کے خلاف جو قتال کیا اس میں وہ بالکل صحیح رائے پر تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اقرب الی الحق تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے: ''مسلمانوں کا ایک فرقہ دین سے نکل جائے گا اسے وہ لوگ قتل کریں گے جو دو گروہوں میں سے حق کے زیادہ قریب ہوں گے''۔[1] اس پر ایک اور دلیل حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی شہادت بھی ہے۔ وہ منصوبہ جو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنایا تھا وہ یہ تھا کہ خوارج کے ساتھ قتال کے بعد فوجوں کا رخ شام کی طرف پھیر دیا جائے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کا مقصود شام کو اپنی خلافت کے زیرِ نگیں لانا اور وحدتِ امت کو ایک ٹھوس حقیقت بنانا تھا اور خوارج کے خلاف آپ کی جنگ کا مقصد یہ تھا کہ داخلی سرحدیں محفوظ ہو جائیں لیکن اکثر ہواؤں کا رخ پھر جاتا ہے۔ جنگ نہروان کے بعد امیر المؤمنین شام کے خلاف لڑائی نہ لڑ سکے اور شہادت کے درجے پر فائز ہو گئے۔[2] خوارج کا خروج امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج کو کمزور کرنے کا باعث بنا، مزید برآں جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیاں، اہل عراق کے جنگ سے اُکتا جانے کا بہت بڑا سبب بن گئیں۔ وہ جنگ سے

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1064. [2] خلافة علی بن أبی طالب لعبدالحمید علی، ص: 345.

نفرت کرنے لگے، خاص طور پر صفین میں اہل شام کے خلاف جنگ بھی عام جنگوں کی طرح نہیں تھی، صفین کا معرکہ پیس دینے والی جنگ ثابت ہوا، بہت سے بچے یتیم ہو گئے، عورتیں بیوہ ہو گئیں اور کوئی مقصد بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اگر صلح اور تحکیم، جسے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اور کثیر صحابۂ کرام نے خوش آمدید کہا تھا، کا معاملہ نہ ہوتا تو عالمِ اسلام پر ایسی زبردست مصیبت ٹوٹ پڑتی جس کے مہلک نتائج کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی طرف دوسری بار روانگی نہ ہو سکی۔ لوگوں کو یہ ناکامی پسند تھی کیونکہ وہ جنگ سے گریزاں تھے، ہر چند وہ خوب جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں۔ [1]

امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مشکلات میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ ایک فرقہ ظاہر ہوا، وہ غُلُوّ کی حد تک ان کی تعظیم کرنے لگا، انھیں الوہیت کے مقام پر فائز کر دیا۔ اس بارے میں ایک رائے یہ سامنے آئی کہ یہ ان خوارج کا ردعمل ہے جو ان سے براءت کا اظہار کرتے اور ان کی تکفیر کرتے ہیں [2] لیکن ان کا مقصد بہت بُرا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ صرف جیش علی رضی اللہ عنہ ہی نہیں تمام مسلمانوں کو کمزور کیا جائے اور مسلمانوں کے دین کی عمارت میں فاسد عقائد داخل کر کے اسے ڈھا دیا جائے۔ [3]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی دانشمندی اور قوت سے ان کا مقابلہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ خوارج کے قتل کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوجی قوت کمزور پڑ گئی، بعد ازاں کچھ اور مشکلات پے در پے پیش آتی چلی گئیں۔ خِرّیت بن راشد کہتے ہیں کہ حارث بن راشد اہواز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقرر کردہ امیر تھا، اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغاوت کر دی، لوگوں کی بہت بڑی تعداد اس کے ساتھ ہو گئی، وہ اپنے علاقے پر چھا گیا اور محصولات بٹورنے لگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معقل بن قیس الریاحی کی سرکردگی میں اس کی سرکوبی کے

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد، ص: 345. [2] نظام الخلافة فی الفكر الإسلامی لمصطفیٰ حلمی، ص: 16,15. [3] خلافة علی بن أبی طالب لعبدالحمید علی، ص: 350.

لیے ایک لشکر روانہ کیا جس نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔[1] اہل اُہواز بگڑ گئے، انھوں نے خراج میں کمی کا مطالبہ کیا، اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بعض مالی اور عسکری مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ امام شعبی سے اس بارے میں مروی ہے: ''جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل نہروان کو قتل کر دیا تو بہت سے لوگ ان کے خلاف ہو گئے، مختلف اطراف میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں، ابن الحضرمی بصرہ پہنچ گیا، اہل اہواز بگڑ گئے اور اہل خراج نے سہل بن حنیف کو فارس سے نکال دیا جو وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے عامل مقرر تھے۔''[2]

دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ طرح طرح کے خفیہ اور اعلانیہ وسائل عمل میں لاتے ہوئے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کمزور کرنے کا سبب بن رہے تھے، امیر المؤمنین کے لشکر کو بہت سی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ حضرت عمرو بن العاص کی سرکردگی میں اپنا لشکر مصر روانہ کیا جو وہاں غالب رہا اور مصر پر قابض ہو گیا۔ متعدد عوامل ان کے مددگار ثابت ہوئے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

- امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خوارج کے ساتھ مصروف جنگ ہونا۔
- مصر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عامل محمد بن ابی بکر، سابق عامل قیس بن سعد بن عبادہ الساعدی الأنصاری جیسے مدبر نہیں تھے۔ وہ چالاکی اور ہوشیاری سے خالی تھے، وہ غیر ضروری طور پر خونِ عثمان کا مطالبہ کرنے والوں سے جنگ میں اُلجھ گئے، انھوں نے سابق عامل کی طرح سیاسی حکمت عملی اختیار نہ کی، لہٰذا شکست کھا گئے۔
- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مصر میں خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کرنے والوں کی ہاں میں ہاں ملائی، یوں انھیں وہاں غلبہ حاصل ہو گیا۔[3]

---

[1] تاریخ الطبری: 6/27-47. [2] تاریخ الطبری: 6/53. [3] مصنف عبدالرزاق، والطبقات لابن سعد: 3/83، وخلافة علی بن أبی طالب لعبدالحمید، ص:351.

❁ مصر امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مرکز سے دور اور شام کے قریب تھا۔ اس جغرافیائی حالت سے بھی جناب امیر معاویہ نے فائدہ اٹھایا۔

❁ مصر جغرافیائی اعتبار سے براستہ سینا شام سے متصل تھا۔

بعدازاں اہل مصر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اضافی قوت سے سرفراز کیا۔ اقتصادی طور پر ان کی مدد کی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جزیرۂ عرب کے شمال، مکہ اور مدینہ اور یمن کی طرف وفود روانہ کیے لیکن یہ وفود اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی واپس کر دیے گئے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی راہیں مسدود کر دی تھیں۔ [1]

معاویہ رضی اللہ عنہ مختلف علاقوں کے والیوں اور اہم شخصیتوں پر مسلسل اثر ڈالتے رہے، چنانچہ ان لوگوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا غلبہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مسائل میں انتشار محسوس کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا:

''میں ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ یہ تم پر غالب آجائیں گے، وہ باطل پر مجتمع ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بھی انتشار کا شکار ہو۔ وہ لوگ اپنے امیر کی اطاعت کرتے ہیں اور تم اپنے امیر کی نافرمانی کرتے ہو، وہ امانت ادا کرتے ہیں اور تم خیانت پر کمر بستہ ہو، میں نے فلاں شخص کو عامل بنایا اس نے غداری کی، مال اٹھایا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا، اے اللہ! میں ان سے ناراض ہوں، وہ مجھ سے ناراض ہیں، میری طرف سے ان پر رحم فرما اور ان سے میری جان چھڑا دے۔'' [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صلح

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ ان حالات و حوادث کا پامردی سے مقابلہ کرتے رہے انھوں نے مصائب پر ہار نہیں مانی، اپنے لشکر کی ہمت بڑھانے کے لیے تمام کوششیں بروئے

[1] تاریخ خلیفۃ، ص: 198، بغیر سند کے۔ [2] التاریخ الصغیر للإمام بخاري: 125/1، اس کی سند منقطع ہے اور اس کے دیگر شواہد موجود ہیں۔

کار لائے۔ علم، دلیل اور فصاحتِ و بلاغت سے کام لیا۔ دلیری اور غیرت کے جذبات جگائے۔ ان کا یہ مشہور خطبہ اس کی بہترین مثال یہ ہے درج ذیل دلائل سے بھرپور اور علم و بصیرت کا بڑا نادر مرقع ہے۔ انھوں نے فرمایا: امابعد: جہاد، جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے خاص دوستوں (اولیاء) کے لیے کھول رکھا ہے۔ تقویٰ کا لباس اللہ کی طرف سے بہت مضبوط اور محفوظ زرہ ہے۔ قابل اعتماد ڈھال ہے جس نے اس سے بے رغبتی کی اور اسے چھوڑ دیا اللہ تعالیٰ اسے ذلت کا لباس پہنا دے گا، اس پر آزمائش چھا جائے گی، وہ ذلت و خواری سے ہم کنار ہوگا، اس کے دل پر پردے تن جائیں گے۔ جہاد کو ضائع کرنے کی وجہ سے اس کا معاملہ حق کی طرف منتقل ہو جائے گا، وہ توہین و تذلیل کا شکار ہوگا اور انصاف سے محروم ہو جائے گا۔

سنو! میں نے تمھیں دن، رات سمجھایا خفیہ اور علانیہ ہر طرح قتال کی دعوت دی، میں نے تم سے کہا کہ ان کی طرف سے لڑائی شروع ہونے سے پہلے تم ان سے لڑو، اللہ کی قسم! جس قوم سے اس کے گھر کے بیچ لڑائی کی جائے وہ ذلیل ہو کر رہتی ہے۔ تم کیسے لوگ ہو؟ تم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سہارے ٹٹولنے شروع کر دیے، تم نے کمزوری کا مظاہرہ کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ چاروں طرف سے لوگ تم پر ٹوٹ پڑے۔ یہ غامد کا بھائی ہے، اس کے گھوڑے انبار میں داخل ہو گئے، حسان بن حسان البکری نے قتل اور غارت گری کا طوفان اٹھا دیا۔ اس نے تمھارے گھوڑے ان کی جگہ سے ہٹا دیے، مجھے یہاں تک اطلاع مل چکی ہے کہ ان کا ایک آدمی ایک مسلمان عورت اور ایک ذمی عورت کے پاس آپہنچا ان کی پازیب، کنگن، ہار اور بالیاں اتار کر چلتا بنا اور وہ رونے پیٹنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں، پھر کیا غضب ہے، وہ حملہ آور پورے کے پورے صحیح سالم بے کھٹکے پُرامن واپس چلے جاتے ہیں نہ انھیں کوئی زخم آتا ہے، نہ کسی کا خون بہتا ہے، اس کے بعد اگر کوئی مسلمان غم و افسوس کے مارے مر جائے تو وہ اسی لائق ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے، کیسی ملال انگیز بات ہے، جو دلوں

کو مردہ کر دیتی ہے کہ دشمن تو اپنے باطل پر مجتمع ہیں اور تم حق کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی انتشار کا شکار ہو، تمھارا بُرا ہو، تم تو ہدف بن گئے، تم پر چاند ماری ہوتی ہے، تم پر تیر برسائے جاتے ہیں، تم پر غارت گری ہوتی ہے مگر تم ان پر حملہ نہیں کر سکتے، تم سے لڑنے والے تیار کھڑے ہیں اور تم اس کے لیے تیار نہیں ہو۔ اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہے اور تم چپ ہو، تم اس پر راضی دکھائی دیتے ہو، میں گرمی کے دنوں میں دشمن کی طرف رخ کرنے کو کہتا ہوں تو تم کہتے ہو، بڑی گرمی ہے ہمیں مہلت دیجیے، بس یہ گرمی نکل جائے پھر ہم دشمن کا رخ کریں گے۔ اگر میں سردی کے دنوں میں دشمن کی طرف رخ کرنے کا کہتا ہوں تو تم کہتے ہو بڑی سردی ہے، ہمیں مہلت دیجیے، بس یہ سردی نکل جائے، یہ ساری باتیں جہاد سے روگردانی کا بہانہ ہیں۔ جب تم سردی اور گرمی سے بھاگتے ہو تو تلوار کا مقابلہ کیسے کرو گے؟ تم تو تلوار سے بھی بھاگو گے۔ اے مردوں جیسی شکل والو! درحقیقت تم مردِ میدان نہیں ہو، اے وہ لوگو! جن کی عقل بچوں والی اور پازیب پہننے والیوں جیسی ہے، کاش! میں نے تمھیں نہ دیکھا ہوتا، نہ میں تمھیں جانتا، تمھیں جاننا بھی میرے لیے موجب ملال ہے۔ تم سے ملنا میرے لیے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت کا نام ہے۔ اللہ تمھیں برباد کرے! تم نے میرا دل چھلنی کر دیا، میرا سینہ غیظ و غضب سے بھر دیا۔ تم مجھے غم کے گھونٹ پلاتے رہے تم نے میری نافرمانی کی تم نے میری رائے کو بے وقعت کر دیا۔ اب قریشی یہ کہنے لگے ہیں کہ ابو طالب کا بیٹا بڑا بہادر ہے لیکن اسے جنگ کا کوئی علم اور تجربہ نہیں۔ خدا لگتی کہو کیا مجھ سے زیادہ کوئی تجربہ رکھتا ہے کہ معاملات سلجھا سکے اور مشقتیں جھیل سکے؟ میں ابھی بیس سال کا بھی نہ تھا کہ ایسے ہی مسائل سے واسطہ پڑا، میں مسائل میں پلا بڑا، اب میں لگ بھگ ساٹھ سال کا ہو چکا ہوں، اصل بات یہ ہے کہ جس کی بات ماننے والا کوئی نہ ہو اس کی رائے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ [1]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام تر کوششوں کے باوجود اپنے لشکر میں انتشار کے باعث

[1] البیان و التبیین للجاحظ، ص: 239,238.

شام کے خلاف جنگ کے ارادے کو عملی شکل نہ دے سکے، لہٰذا امیر المؤمنین سن چالیس ہجری میں مجبور ہو گئے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس بات پر صلح کرلیں کہ عراق میں ان کی حکومت ہو اور شام میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی اور دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کرے گا۔

امام طبری رحمہ اللہ اپنی تاریخ میں کہتے ہیں

سن 40 ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان صلح کے لیے خط کتابت ہوئی پھر مذاکرات ہوئے اور جنگ بندی کا اعلان ہوا، طے پایا کہ عراق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت ہوگی اور شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اور ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے خلاف نہیں لڑے گا۔ [1]

شہادت پانے کی دعا

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصالحت کرلی لیکن ایسا لگتا ہے کہ صلح کا یہ معاملہ جاری نہیں رہ سکا جس سال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بسر بن أبی أرطاۃ کو حجاز اور یمن کی طرف روانہ کیا۔ [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خواہش کے مطابق لشکر تیار نہ کر سکے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ناکامی محسوس کی، زندگی کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور موت کی تمنا کرنے لگے۔ انھوں نے ایک دن خطبہ دیا۔ ارشاد فرمایا:

''اے اللہ! میں ان لوگوں سے اکتا چکا، یہ مجھ سے اکتا گئے، ان سے میری جان چھڑا، راحت کا سامان فرما، ان کی جان بھی چھوٹ جائے۔ اپنی ڈاڑھی مبارک کی طرف اشارہ کیا،

[1] تاریخ الطبری: 56/6. [2] التاریخ الصغیر للإمام البخاری: 41/1، وخلافة علی بن أبی طالب لعبدالحمید، ص: 421.

اس پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: تم میں سے کسی بدبخت کے لیے اب کیا رکاوٹ ہے کہ اسے خون سے تر کر دے۔''[1]

آخری ایام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انتہائی الحاح وزاری سے دعا کی، جندب سے روایت ہے کہ ایک دن لوگوں کا زبردست ہجوم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیارت کے لیے لپک آیا، حتیٰ کہ ان کا پاؤں روند ڈالا تو انھوں نے دعا کی: اے اللہ! میں ان سے تھک چکا، یہ مجھ سے تھک چکے، میں ان سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہوں، یہ بھی مجھے ناپسندیدہ سمجھتے ہیں، اے اللہ! میری ان سے جان چھڑا، راحت کا سامان فرما، انھیں بھی مجھ سے خلاصی مل جائے۔[2]

ایک اور روایت میں ابوصالح کہتے ہیں: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں موجود تھا، انھوں نے مُصحف اپنے سر پر رکھا، میں نے مصحف کے اوراق کو متحرک دیکھا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے ان لوگوں سے جو مانگا، یہ لوگ دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے، اے اللہ! میں ان سے تھک چکا، یہ مجھ سے تھک چکے، میں انھیں پسند نہیں کرتا یہ مجھے ناپسندیدہ سمجھتے ہیں، ان کا سامنا مجھ سے زیادہ بُرے شخص سے کرا دے، مجھے ان سے زیادہ بہتر لوگ عطا کر دے، ان کے دل اس طرح نرم کر دے جس طرح پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔[3]

ایک روایت میں ہے کہ وہ اس دعا کے تین دن بعد شہید کر دیے گئے۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا علم تھا

بعض احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل میں شمار کی جاتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ انھیں شہادت نصیب ہو گی۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ،

[1] مصنف عبدالرزاق: 154/10، اس کی سند صحیح ہے، والطبقات: 4/3، اس کی سند بھی صحیح ہے۔
[2] الآحادو المثانی لابن أبی عاصم: 37/1، اس کی سند صحیح ہے، وخلافة علی بن أبی طالب، ص: 432. [3] سیر أعلام النبلاء: 144/3. [4] المحن لأبی العرب، ص: 99، وخلافة علی لعبدالحمید، ص: 432.

عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ غار حرا کی ایک چٹان پر کھڑے تھے کہ اچانک وہ حرکت میں آ گئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا: ''پُر سکون رہو، تم پر ایک نبی، ایک صدیق اور ایک شہید کھڑے ہیں۔''[1]

اس کے علاوہ اور احادیث بھی ہیں جن میں خاص طور پر ان کا ذکر ہے، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عراق میں شہادت سے سرفراز ہوں گے، اس میں ان پر حملہ آور ہونے کی حالت کا بھی ذکر ہے، ان احادیث سے نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو بات بھی فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں وہ بات بذریعہ وحی بتاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتا دیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سب باتوں کا یقین تھا۔ ابو الاسود الدؤلی کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ میرے پاس عبداللہ بن سلام آئے، میں پا بہ رکاب تھا، انھوں نے مجھ سے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: عراق کا! انھوں نے کہا کہ عراق میں آپ پر تلوار کا وار کیا جا سکتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سن چکا ہوں۔ ابو الأسود کہتے ہیں: مجھے تعجب ہے، ایک جنگجو اور عظیم مجاہد شخصیت جو اپنے بارے میں اس قسم کی بات کہہ رہے ہیں۔[2] انھوں نے یہ حدیث ینبع کے مقام پر خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے بھی بیان کی تھی، پھر اپنی بیماری کی حالت میں بیمار پُرسی کرنے والے بدری صحابی فضالہ انصاری کو بھی یہ حدیث سنائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اپنی اس بیماری میں موت نہیں آئے گی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ مجھے اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک میری ڈاڑھی، میرے سر کے زخم کی وجہ سے خون سے رنگین نہ ہو جائے۔[3] انھوں نے خوارج کو بھی یہ حدیث سنائی اور اپنے اصحاب سے بھی یہی بات کہی۔ امام بیہقی نے یہ تمام احادیث اپنی کتاب ''دلائل النبوۃ'' میں جمع کر

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2417. [2] تاریخ الذهبي، عهد الخلفاء الراشدین، ص: 784. [3] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحمید، ص: 433، اس روایت کی تمام سندیں صحیح ہیں۔

دی ہیں۔ [1]

حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب ''البدایۃ والنھایہ'' میں درج کی ہیں۔ [2]

ان لوگوں نے کہا: آپ ہمیں اپنے قاتل کا نام بتا دیجیے تاکہ ہم اس کی نسل ہی ختم کر ڈالیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں قسم دے کر تمھیں اس بات سے منع کرتا ہوں کہ مبادا میرے قاتل کی بجائے کوئی اور شخص قتل ہو جائے۔ [3]

[1] دلائل النبوۃ: 6/438-441، تحقیق عبدالمعطی قلعجی. [2] البدایۃ والنھایۃ: 7/323-325.
[3] کتاب الشریعۃ للآجری: 4/2105، اس کی سند حسن ہے۔

صلۂ شہید کیا ہے، تب و تاب جاودانہ

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے

نہروان کے معرکے کی وجہ سے خوارج کے دل و دماغ پر بڑی ضرب لگی، ہر آنے والا دن ان کے اَلم و حسرت میں اضافے کا موجب تھا۔ ان میں سے ایک شقی القلب گروہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جان لینے پر متفق ہو چکا تھا، وہ کہتے تھے کہ ہمارے جو بھائی نہروان میں قتل ہوئے ہیں ان کا انتقام لیا جائے، اہل سیر اور مؤرخین کا ایک مشہور روایت کے بیان پر تقریباً اجماع ہے [1] تاہم یہ روایت تنقیدی آراء سے محفوظ نہیں ہے کیونکہ یہ مختلف اور متضاد عناصر پر مشتمل ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ روایت بھی بعض دیگر روایات کی طرح غیر متعلق اضافوں پر مشتمل ہے۔ اس کے تفصیلی مطالعہ کے نتیجے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت خارجیوں کے ہاتھوں ہوئی اور اس کا مقصود یہ تھا کہ نہروان کے معرکہ میں قتل ہو جانے والے خوارج کا انتقام لیا جائے۔

روداد شہادت

سازشی ٹولے کا اجتماع: ابن ملجم اور اس کے ساتھیوں کی داستان یہ ہے کہ ابن ملجم، بُرک بن عبداللہ اور عمرو بن بکر التمیمی ایک جگہ اکٹھے ہوئے، انھوں نے آپس میں بحث کی کہ حکمران اچھے

[1] الطبقات لابن سعد: 35/3، وتاریخ الطبری: 6/58-66، اس کی سند منقطع ہے، والبدایۃ والنہایۃ: 325/7.

نہیں ہیں، پھر انھوں نے اہل نہروان کا ذکر کیا ان کے لیے رحمت کی دعا کی اور کہنے لگے: ان لوگوں کے بعد اب ہمارے زندہ رہنے کا کیا فائدہ؟ ہمارے بھائی لوگوں کو اپنے رب کی عبادت کی دعوت دیتے تھے، اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے سے نہیں ڈرتے تھے، اگر ہم اپنی جان قربان کر دیں، گمراہی کے ائمہ کو قتل کر دیں اور اہلِ وطن کی ان سے جان چھوٹ جائے تو اچھا ہوگا اس طرح ہم اپنے بھائیوں کا انتقام بھی لے لیں گے۔ اس موقع پر ابن ملجم[1] نے کہا: میں علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ بُرک بن عبداللہ نے کہا: معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری میں اٹھاتا ہوں۔ اور عمرو بن بکر نے کہا: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ٹھکانے لگانے کے لیے میں حاضر ہوں۔ انھوں نے پکا معاہدہ کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے مطلوب کو قتل کرے گا یا خود مر جائے گا۔ انھوں نے اپنی تلواریں سنبھالیں اور سترہ رمضان کو ہر شخص اپنے مطلوبہ مقام کی طرف چل دیا۔[2]

قطام بنت شجنہ سے ابنِ ملجم کی ملاقات

ابن ملجم کا تعلق کِندہ قبیلے سے تھا وہ نکل کھڑا ہوا۔ کوفہ میں اپنے کچھ ساتھیوں سے ملا۔ اس نے اپنے دل کی بات ساتھیوں سے چھپائے رکھی، ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ظاہر کر دیں اور وہ اپنا کام مکمل کرنے سے پہلے ہی دھر لیا جائے۔ ایک دن اس نے تیم الرباب کے اپنے ان ساتھیوں کو دیکھا جو معرکۂ نہروان میں تھے اور ان کے دس ساتھی معرکے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ابن ملجم نے اپنے ساتھیوں سے ان مقتولین کا ذکر کیا۔ اُسی دن وہ تیم الرباب کی ایک عورت سے ملا۔ اس کا نام قطام بنت شجنہ تھا۔ اس کا باپ اور بھائی معرکۂ نہروان میں قتل کر دیے گئے تھے۔ وہ انتہائی خوبصورت عورت تھی۔ ابن ملجم نے اسے دیکھا تو دنگ رہ گیا وہ عورت اس کے حواس پر چھا گئی، وہ اس کے پاس جس کام سے آیا تھا وہ بھول ہی گیا۔ اس نے

[1] ابن ملجم مرادالیمانی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ قبیلۂ کندہ کی ایک شاخ ہے۔ [2] تاریخ الطبری: 59/6.

اس عورت سے شادی کی درخواست کی، وہ کہنے لگی: میں تم سے اس وقت تک شادی نہیں کر سکتی جب تک تم میرے دل کی تشفی نہ کر دو۔ اس نے پوچھا تمھارے دل کی تشفی کیسے ہو گی؟ وہ بولی: تین ہزار دینار، ایک غلام، ایک گانے والی لونڈی اور علی رضی اللہ عنہ کا قتل، میری تشفی کا سامان ہے۔ ابن ملجم نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کے لیے میں پہلے ہی تیار ہوں، باقی تمام چیزیں تمھارا مہر ہوں گی۔ وہ کہنے لگی: ہاں اگر تم نے یہ کام کر دکھایا تو یہ میرے اور تمھارے لیے تشفی کا باعث ہو گا اور میرے ساتھ تمھاری زندگی خوش گوار ہو جائے گی۔ اگر تم نے علی رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ کے دربار سے ملنے والا انعام دنیا و مافیھا سے بہتر ہو گا۔ ابن ملجم نے کہا: میرا یہاں آنے کا مقصد ہی یہی ہے، تم نے جو خواہش کی ہے وہ پوری ہو کر رہے گی۔ وہ کہنے لگی: ٹھہرو! میں اس کام کے لیے تمھارا کوئی مددگار ڈھونڈتی ہوں۔ پھر اس نے اپنی قوم تیم الرباب سے ایک آدمی کو بلا بھیجا، اس کا نام وردان تھا۔ وہ آیا تو اس عورت نے اس سے بات کی، اس نے ہامی بھر لی۔ اس معاملے کے بعد ابن ملجم، اُشجع قبیلے کے ایک آدمی شبیب بن بجرہ کے پاس پہنچا اور اس سے کہا: کیا تم دنیا اور آخرت میں کسی اعزاز کے طلبگار ہو؟ اس نے کہا: بتاؤ کیا کام ہے؟ ابن ملجم نے کہا: علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا مقصود ہے۔ وہ بولا: اللہ تمھیں غارت کرے! یہ کیا بک رہے ہو؟ یہ اقدام تمھارے لیے کیسے ممکن ہو گا؟ ابن ملجم نے کہا: میں مسجد میں ان کی گھات میں بیٹھ جاؤں گا، جونہی وہ فجر کی نماز کے لیے آئیں گے، ان کا کام تمام کر دوں گا۔ اگر ہم بچ گئے اور پکڑے نہ گئے تو ہماری تشفی ہو جائے گی، اس طرح ہم ان سے اپنا انتقام لے لیں گے اور اگر ہم دھر لیے گئے اور قتل کر دیے گئے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملنے والا انعام دنیا و مافیھا سے بہتر ہو گا۔ شبیب نے کہا: اللہ تمھیں غارت کرے، اگر علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی اور ہوتا تو میں ایسا کر سکتا تھا۔ تم جانتے ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام کی راہ میں کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں انھیں سبقت فی الاسلام کا رتبہ حاصل ہے، میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ میں ان کے قتل پر راضی نہیں۔ ابن ملجم نے کہا: کیا تمھیں پتہ نہیں کہ انھوں نے نہروان میں اللہ کے

نیک بندے قتل کرا دیے؟ اس نے کہا: ہاں کیوں نہیں؟ ابن ملجم نے کہا: تو آؤ! ہم اپنے بھائیوں کے بدلے انھیں قتل کر دیں۔ وہ مان گیا۔ پھر وہ دونوں مل کر قطام کے پاس پہنچے۔ وہ مسجد میں تھی، اعتکاف میں بیٹھی ہوئی تھی، ان دونوں نے اس سے کہا کہ ہم علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے پر راضی ہیں۔ وہ بولی: جب تم اس کام کے لیے نکلو تب میرے پاس آنا۔

بعدازاں ابن ملجم نے 40 ہجری میں جس جمعہ کی صبح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اس جمعہ کی رات وہ قطام کے پاس گئے، اس نے ان کے لیے ریشمی کپڑا منگوایا، اس سے ان کی دستار بندی کی، پھر ان دونوں نے اپنی اپنی تلواریں تھام لیں، وہاں وردان بھی آ گیا، اب یہ سب اس دروازے کے بالمقابل جا بیٹھے جہاں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد کی طرف تشریف لاتے تھے، جونہی وہ نکلے شبیب نے ان پر حملہ کر دیا لیکن اس کی تلوار دروازے کے کواڑ پر جا لگی، ابن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر پر تلوار ماری۔ وردان گھبرا گیا، اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ اسے اس کے ایک قریبی عزیز نے ریشم کا کپڑا اتارتے ہوئے دیکھ لیا، پوچھا کہ یہ ریشم اور یہ تلوار تمھارے ہاتھ میں کس لیے ہے؟ اس نے صحیح بات بتا دی، تو وہ شخص اپنی تلوار نکال لایا اور اس نے وردان کو قتل کر دیا۔ شبیب نے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا، وہ کندہ قبیلے کی طرف نکل بھاگا۔ لوگوں نے چیخ و پکار کی، حضرموت کے ایک آدمی نے جس کا نام عُوَیمر تھا اس کا پیچھا کیا، شبیب کے ہاتھ میں جو تلوار تھی، وہ عویمر نے چھین لی اور اس پر ٹوٹ پڑا لیکن اس دوران اس کے ساتھی آ گئے۔ عویمر نے اپنی جان بچانے کی خاطر اسے چھوڑ دیا، اس طرح شبیب لوگوں کی بھیڑ سے دور نکل گیا۔ ابن ملجم پکڑا گیا۔ ہمدان کے ایک آدمی نے جس کی کنیت ابوأدماء تھی، ابن ملجم کی تلوار پکڑی اور اس کی ٹانگ پر ماری، ابن ملجم لڑکھڑا کر گر گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے، جعدہ بن ہبیرہ بن ابی وھب نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ بعدازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس آدمی کو میرے پاس لاؤ، اسے لایا گیا تو فرمایا: اے اللہ کے دشمن! کیا میں نے تمھارے ساتھ حسن سلوک نہیں کیا تھا؟ اس نے اعتراف کیا: جی ہاں!

آپ نے اچھا سلوک کیا تھا۔ انھوں نے پوچھا: تم نے یہ اقدام کیوں کیا؟ اس نے کہا: میں نے یہ تلوار چالیس دن تک تیز کی اور اللہ سے دعا کی کہ میں اس کے ذریعے اس کی مخلوق میں سے بدترین (نعوذ باللہ) شخص کو قتل کروں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ تم اسی تلوار سے مارے جاؤ گے اور میرا خیال ہے کہ وہ تمھی ہو جو اللہ کی مخلوق میں سے بدترین شخص ہو۔ [1]

محمد ابن الحنفیہ کا بیان

ابن الحنفیہ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: جس رات حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بڑی مسجد میں حملہ کیا گیا، میں اس رات ان بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں نماز پڑھ رہا تھا جو دروازے کے قریب حالت نماز میں تھے، ان میں سے کوئی قیام میں تھا، کوئی رکوع میں تھا اور کوئی سجدہ کی حالت میں تھا۔ اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ فجر کی نماز کے لیے گھر سے نکلے وہ حسب معمول آواز دیتے آرہے تھے: ''اے لوگو! آؤ نماز کی طرف، آؤ نماز کی طرف۔'' وہ جونہی مسجد کے دروازے کے پاس پہنچے، مجھے روشنی دکھائی دی اس کے بعد میں نے سنا کہ کوئی کہہ رہا تھا: اے علی رضی اللہ عنہ! حکم صرف اللہ کا ہے، تیرا ہے نہ تیرے ساتھیوں کا۔ پھر مجھے ایک تلوار بھی نظر آئی، میں نے ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالی تو علی رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا: یہ آدمی جانے نہ پائے، لوگوں نے ہر طرف سے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ وہ پکڑا گیا، اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، لوگوں کے ساتھ میں بھی آگے بڑھا، میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سنا وہ فرما رہے تھے: جان کے بدلے جان! اگر میں فوت ہو جاؤں تو اسے اسی طرح قتل کر دیا جائے جس طرح اس نے مجھے قتل کیا ہے اور اگر میں زندہ رہا تو یہ معاملہ خود دیکھ لوں گا۔ [2]

بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ سانحہ ہوا تو لوگ گھبرائے ہوئے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، لوگوں نے ابن ملجم کو پکڑ رکھا تھا، اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ بہت رو رہی تھیں، انھوں

[1] تاریخ الطبری: 62/6. [2] تاریخ الطبری: 62/6.

نے روتے ہوئے کہا: اے اللہ کے دشمن! اللہ تمھیں رسوا کرے۔ وہ کہنے لگا: تم کس پر روتی ہو؟ اللہ کی قسم! میں نے یہ تلوار ایک ہزار درہم میں خریدی اور ایک ہزار درہم خرچ کر کے اسے زہر آلود کیا، یہ ضرب جو میں نے ان پر لگائی ہے، اگر پورے شہر کے لوگوں پر بھی لگا تا تو ان میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ بچتا۔﴿1﴾

طبیب کا مشورہ اور امیر المؤمنین کا شوریٰ کی طرف میلان

عبداللہ بن مالک سے روایت ہے کہ جس روز حضرت علی رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے، بہت سارے اطباء جمع ہوئے ان میں سے ایک ماہر طب اُثیر بن عُمر والسکونی نے ایک بکری کا تازہ پھیپھڑا لیا۔ اس میں سے ایک رگ نکالی اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دماغ کے زخم کی جگہ داخل کیا، پھر اس رگ میں پھونک ماری اور باہر نکال لی۔ دیکھا تو اس میں دماغ کی سفیدی بھی لگی ہوئی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ چوٹ دماغ کے اندر دور تک اثر انداز ہوئی ہے۔ طبیب نے کہا کہ اب آپ کا فوت ہونا یقینی ہے۔﴿2﴾ کہا جاتا ہے کہ جندب بن عبداللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور ان سے پوچھا: اے میر المؤمنین! اللہ نہ کرے، اگر آپ فوت ہو جائیں تو کیا ہم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کر سکتے ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہ میں تمھیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں، تم خود زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو۔﴿3﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو وصیت

اُمیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: میں تم دونوں کو تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ کبھی دنیا کے طلبگار نہ بنو، ہر چند دنیا تمھیں چاہتی رہے، نہ ملنے والی چیز کا کبھی غم نہ کرو، حق پر قائم رہو، یتیم پر رحم کرو، لاچار کی مدد کرو، آخرت کے لیے عمل کرو، ظالم کا مقابلہ کرو، مظلوم کے مددگار بنو، جو کچھ اللہ کی کتاب میں ہے اس

﴿1﴾ تاریخ الطبری: 62/6. ﴿2﴾ الاستیعاب: 1128/3. ﴿3﴾ تاریخ الطبری: 62/6.

پر عمل کرو، تم پر اللہ کے بارے میں ملامت کرنے والے کی ملامت اثر انداز نہ ہو، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن الحنفیہ کی طرف دیکھا اور فرمایا: کیا تم نے وہ باتیں یاد کرلی ہیں جو میں نے تمھارے دونوں بھائیوں کو وصیت کی ہیں؟[1] انھوں نے کہا: جی ہاں! پھر فرمایا: میں تمھیں بھی ان سب باتوں کی وصیت کرتا ہوں اور تمھیں ان دونوں بھائیوں کی تکریم و تعظیم کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ ان دونوں کا تم پر عظیم حق ہے۔ ان دونوں کا کہنا ماننا، کبھی نافرمانی نہ کرنا۔

پھر حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ سے فرمایا: میں تم دونوں کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ اپنے اس بھائی سے اچھا سلوک کرنا، بے شک یہ تمھارے باپ کا بیٹا ہے اور تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے والد اس سے محبت کرتے ہیں اور پھر حسن رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: میرے بیٹے! میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ بروقت نماز قائم کرنے، برمحل زکوۃ ادا کرنے اور احسن طریقے سے وضو کرنے کی تاکید کرتا ہوں کیونکہ طہارت کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور مانع زکاۃ کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ تمھیں یہ بھی وصیت کرتا ہوں کہ دوسروں کی غلطی معاف کردو، غصہ پی جاؤ، صلہ رحمی سے کام لو، جہالت کے مقابلے میں بُردباری، دین میں تفقہ، معاملات میں ثابت قدمی، تلاوتِ قرآن میں باقاعدگی اور پڑوسیوں سے حسن سلوک کا طریقہ اختیار کرو، نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو اور فواحش سے دور بھاگو۔[2]

بوقت وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت فرمائی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی وصیت ہے انھوں نے وصیت کی ہے کہ وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ دین حنیف کو دیگر تمام ادیان پر غالب کردیں، ہرچند یہ بات

[1] تاریخ الطبری: 63/6. [2] تاریخ الطبری: 63/6.

مشرکین کو ناپسند ہو، میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور موت سب اس اللہ کے لیے ہیں جو رب العالمین ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں فرمانبردار مسلمانوں میں سے ہوں۔ اے حسن رضی اللہ عنہ! میں تمھیں اور اپنی تمام اولاد اور اہل خانہ کو رب کا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہوں، تمھیں موت نہیں آنی چاہیے مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبردار مسلمان ہو، تم سب مل کر اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لو اور فرقوں میں مت بٹو۔ میں نے سیدنا أبوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: باہمی معاملات میں ایک دوسرے کی اصلاح کرنا، عمومی طور پر نماز اور روزے سے بھی زیادہ فضیلت والا کام ہے، اپنے قریبی رشتہ داروں کو دیکھو ان کے ساتھ صلہ رحمی سے کام لو، اللہ تعالیٰ تمھارا حساب کتاب آسان فرما دے گا، یتیموں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، وہ تمھارے زیر سایہ ضائع نہ ہونے پائیں، اپنے پڑوسیوں کے معاملے میں بھی اللہ سے ڈر کر رہو، ہمسایوں کے بارے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بار بار وصیت فرماتے رہے تا آنکہ ہمیں گمان ہونے لگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ہمارا وارث قرار دیں گے۔ قرآن کے بارے میں بھی اللہ سے ڈرو، تم اس پر عمل کرنے میں دوسروں پر سبقت لے جاؤ، نماز کا بہت دھیان رکھو۔ اللہ کو نہ بھولو، نماز تمھارے دین کا ستون ہے، اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو، زکوۃ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا، زکاۃ اللہ کا غصہ بجھانے والی چیز ہے، اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق اللہ سے ڈرو، تمھارے سامنے ان پر ظلم نہ کیا جائے، اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام کے بارے میں بھی اللہ سے ڈرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں خیر و بھلائی کی وصیت فرمائی ہے، فقراء و مساکین کا خیال رکھو، اپنی معیشت میں انھیں بھی شریک کرو، اپنے زیر دست لوگوں کا خیال رکھو، نماز کا بہت توجہ سے اہتمام کرو، اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کرو، لوگوں سے اچھے لب و لہجے میں بات کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس کا حکم دیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کبھی نہ بھولنا، مبادا اس غفلت کے

نتیجے میں بُرے لوگ تم پر حکمران بن جائیں، پھر تم دعائیں کرو اور تمھاری دعائیں قبول نہ ہوں، قطع تعلقی اور فرقہ واریت سے اجتناب کرو، نیکی اور تقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کے مددگار بنو، گناہ اور زیادتی میں ہرگز تعاون نہ کرو، اللہ سے ڈرتے رہو، وہ سخت سزا دینے والا ہے، اللہ تعالیٰ تمھارے اہل بیت رضی اللہ عنہم کی حفاظت فرمائے اور تمھارے مابین تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کو سدا بہار بنا دے، اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں اور تم سب کے لیے سلامتی اور رحمت کی دعا کرتا ہوں...... اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ صرف ''لا إله إلا الله'' ہی کے الفاظ پڑھ سکے۔ یہی مقدس کلمہ پڑھتے پڑھتے اسلام کے اس عظیم الشان سپوت کی زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا۔ رحمه الله تعالىٰ رحمة واسعة۔ یہ سانحہ سن چالیس ہجری میں رمضان کے مہینہ میں پیش آیا۔[1] ایک روایت کے مطابق وہ اکیس رمضان کی صبح شہادت سے سرفراز ہوئے۔[2] اس روایت کو اس پر محمول کیا گیا ہے کہ اسی تاریخ کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے کیونکہ اس بدبخت ابن ملجم کے حملے اور ضربات کے بعد وہ تین دن تک زندہ رہے۔[3]

قاتل کا مُثلہ کرنے کی ممانعت

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس شخص کو قید رکھو، اگر میں وفات پا جاؤں تو اسے قتل کر دینا اگر میں زندہ رہا تو صرف زخموں کا قصاص ہوگا۔''[4]

ایک اور روایت کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اسے کھلاؤ، پلاؤ اور قید کے دوران حسنِ سلوک سے کام لو، اگر میں صحت مند ہو جاؤں تو میں اپنے خون کا ولی ہوں، چاہوں گا تو اسے معاف کر دوں گا نہیں چاہوں گا تو بدلہ لوں گا۔''[5]

ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے: ''اگر میں وفات پا جاؤں تو جس طرح اس نے مجھے

---

[1] تاريخ الطبري: 64/6. [2] التاريخ الكبير للبخاري: 99/1، اس کی سند صحیح ہے۔ [3] خلافة علي بن أبي طالب لعبدلحميد، ص: 439. [4] فضائل الصحابة: 560/2، اس کی سند صحیح ہے۔ [5] المحن لأبي العرب، ص: 94، وخلافة علي بن أبي طالب، ص: 439.

قتل کیا ٹھیک اسی طرح اسے قتل کر دینا، ہرگز زیادتی نہ کرنا، بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔'' [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو مُثلہ کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عبدالمطلب کی اولاد! تم لوگوں کا خون بہانے میں آگے نہ بڑھ جانا، مبادا تم کہو، امیر المؤمنین کو قتل کیا گیا، امیر المؤمنین کو قتل کیا گیا یہ کہتے کہتے تم سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔ اے حسن رضی اللہ عنہ! دیکھو اگر میں وفات پا جاؤں تو اسے صرف اتنی ہی ضرب لگاؤ جتنی اس نے لگائی ہے، اس کا مُثلہ نہ کیا جائے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مُثلہ سے اجتناب کرو، اگرچہ وہ باؤلے کتے ہی کا ہو۔ [2]

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے اپنے قاتل کے بارے میں ہدایات دینے کے سلسلے میں بہت سی روایات ملتی ہیں، ان میں سے کچھ صحیح ہیں اور کچھ ضعیف ہیں، وہ روایت جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کے بعد اُس شقی کو جلانے کا حکم دیا اس کی سند ضعیف ہے دیگر روایات بس ایک ہی بات بیان کرتی ہیں کہ اگر میں وفات پا جاؤں تو اس شخص کو قتل کر دیا جائے، اس کے علاوہ باقی سب امور سے منع فرمایا۔ یہ روایات ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔ ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے، وہ قابل حجت ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے مرتد قرار دے کر قتل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اپنے صاحبزادوں کو اس بات سے منع فرمایا یوں ابن ملجم کو صرف جان کے بدلے جان کے اصول کے تحت سزا دی گئی۔ [3]

ابن ملجم کے بارے میں امام ذہبی کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل خارجی تھا، افترا پرداز شخص تھا، فتح مصر میں شریک ہوا، اس نے قرآن حکیم اور فقہ کی تعلیم حاصل کی وہ بنی تُدول کا ایک فرد تھا، مصر میں ان کا شہسوار مشہور تھا۔ اس نے معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل سے قرآن

---

[1] الطبقات: 35/3، و تاریخ الإسلام للذهبی: 649/3 [2] تاریخ الطبری: 64/6. [3] منهاج السنة: 245/5، 406,405/7، ومنهج ابن تيميه فى مسألة التكفير، ص: 309.

پڑھا، اس کا شمار عبادت گزاروں میں ہوتا ہے، اسی نے صبیغ التمیمی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یہ سوال پوچھنے بھیجا کہ جو شخص صحیح طور پر قرآن کریم نہ پڑھ سکتا ہو، اس کے لیے کیا حکم ہے؟ اس کے بعد امام ذہبی کہتے ہیں: پھر اسے تقدیر نے آن لیا اور اس نے جو کچھ کیا، وہ سب پر عیاں ہے، خوارج کی نظر میں وہ اُمت کے افضل ترین لوگوں میں سے تھا۔

روافض کی نظر میں ابن ملجم آخرت میں بد بخت ترین بندہ ہے، ہم اہل سنت کی نظر میں وہ جہنم کا حق دار ہے اس کا امکان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگزر کا معاملہ کرے اس کا حکم قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ وطلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ اور قاتلینِ سعید رضی اللہ عنہ بن جبیر وعمار رضی اللہ عنہ وخارجہ رضی اللہ عنہ اور قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ جیسا ہے۔ ہم ان تمام قاتلوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں اللہ کی خوشنودی کی خاطر ان سے بغض رکھتے ہیں اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔[1]

رہا بُرک بن عبداللہ کا معاملہ تو جس رات حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا گیا اسی رات وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ فجر کی نماز کے لیے نکلے تو اس نے تلوار سونت لی پھر ان پر ضرب لگائی جو ان کے سرین پر جا کر لگی جب اسے پکڑا گیا تو کہنے لگا: میرے پاس ایک خبر ہے، وہ آپ کے لیے خوش گوار ہے، اگر میں آپ کو بتاؤں تو کیا میرے لیے مفید ہوسکتی ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں! اس نے کہا: میرے ایک بھائی نے اسی رات حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ایسا ہوسکتا ہے کیونکہ علی رضی اللہ عنہ جب بھی باہر نکلتے ہیں تو ان کے ساتھ کوئی محافظ نہیں ہوتا۔ بعدازاں معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے ہلاک کرنے کا حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ پھر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک طبیب الساعدی کو بلا بھیجا، جب ان کا معائنہ کیا گیا تو طبیب نے کہا: دو میں سے ایک صورت اختیار کی جا سکتی ہے، ایک یہ کہ میں لوہے کا ٹکڑا گرم کر کے زخم والی جگہ پر لگاؤں یا آپ کو ایسا مشروب پلایا جائے جس سے آئندہ اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا، لیکن آپ کا زخم ٹھیک ہو جائے گا، آپ کو جو ضرب لگی ہے وہ زہر آلود

[1] تاریخ الإسلام فی عهد الخلفاء الراشدین، ص: 654.

ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آگ کا معاملہ برداشت کرنا ممکن نہیں، رہا اولاد کے منقطع ہونے کی بات تو یزید اور عبداللہ میری خوشگوار زندگی کے لیے کافی ہیں۔ طبیب نے انھیں مطلوبہ مشروب پلایا، وہ صحت یاب ہو گئے پھر ان کی کوئی اولاد نہ ہوسکی پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی حفاظت اور پہرے کا نظام مزید سخت کرنے کا حکم دے دیا نماز کے وقت، سجدہ کی حالت میں خاص طور پر پولیس کا سپاہی ان کی حفاظت کے لیے کھڑا رہتا تھا۔

اب رہا عمرو بن بکر کا معاملہ تو وہ بھی اسی رات حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی گھات میں بیٹھ گیا لیکن وہ گھر سے باہر ہی نہیں نکلے۔ وہ پیٹ کے درد میں مبتلا تھے، انھوں نے خارجہ بن حذافہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ وہ ان کی پولیس کے سربراہ تھے۔ عامر بن لؤی کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، عَمر و بن بکر نے انھی پر تلوار چلا دی وہ سمجھا کہ یہی عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہیں، اس غلط فہمی میں اس نے خارجہ کو قتل کر دیا، لوگوں نے اسے پکڑ کر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا انھوں نے پوچھا یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ یہ عمرو بن بکر ہے۔ انھوں نے پوچھا: اس نے کسے قتل کیا؟ انھوں نے کہا: خارجہ بن حذافہ کو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عمرو بن بکر سے کہا: تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے مگر اللہ کے ہاں تقدیر میں خارجہ بن خذافہ تھے، پھر اس شخص کو قتل کر دیا گیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت، اُن کی قبر اور اُن کی عمر

خلیفہ بن خیاط کے بیان کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت چار سال نو مہینے اور چھ دن ہے، بعض نے تین دن اور بعض نے چودہ (14) دن لکھا ہے۔[2] ایسا لگتا ہے کہ ان کی مدت خلافت چار سال نو مہینے اور تین دن ہے کیونکہ 35 سن ہجری کے ماہ ذوالحجہ کی اٹھارہ تاریخ کو آپ کی بیعت خلافت کی گئی اور آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت سن چالیس ہجری ماہ رمضان کی اکیس تاریخ کو ہوئی۔[3]

[1] تاریخ البطری: 65/6. [2] تاریخ خلیفہ: 47/1. [3] التاریخ الکبیر للإمام بخاری: 99/1، سند صحیح ہے۔

حسن، حسین اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غسل دیا، تین کپڑوں میں آپ کی تکفین ہوئی جس میں قمیص شامل نہ تھی۔[1] حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ انھوں نے چار تکبیرات پڑھیں[2] اور بغیر سند کی ایک روایت کے مطابق نَو عدد تکبیرات پڑھیں۔[3]

ان کی قبر کی جگہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے امام ابن الجوزی نے اس بارے میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد کہا ہے: اللہ تعالیٰ ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کون سا قول زیادہ صحیح ہے۔[4] اس سلسلے میں جو روایات منقول ہیں، وہ یہ ہیں:

- حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے انھیں جامع مسجد کے نزدیک کھلی جگہ پر نماز فجر کے بعد دفن کر دیا۔ یہ جگہ کِندہ کے ابواب کے قریب ہے وہاں لوگوں نے فجر کی نماز پڑھی پھر ان کے واپس جانے سے پہلے تدفین عمل میں آئی۔[5]
- اس جیسی دوسری روایت میں ہے کہ انھیں کوفہ میں قصرِ امارت کے قریب جامع مسجد کے پاس رات کو دفن کیا گیا۔ ان کی قبر کا مقام عام لوگوں کو معلوم نہیں۔[6]
- ایک روایت میں یہ ذکر ملتا ہے کہ ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے انھیں مدینہ منتقل کر دیا تھا۔[7]
- ایک روایت میں یہ ہے کہ کوفہ سے باہر نجف میں مشہد کے نام سے مشہور جگہ ہے۔ وہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ بعض اہل علم نے اس کا انکار کیا ہے، ان میں کوفہ کے قاضی شریک بن عبداللہ النخعی (وفات 178ھ) اور محمد بن سلیمان الحضرمی (وفات 297ھ) شامل ہیں۔[8]

---

[1] المنتظم: 175/5، والطبقات: 37/3. [2] الطبقات: 65/6. [3] المنتظم: 175/5. [4] المنتظم: 178/5. [5] الطبقات: 38/3، وخلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص:441. [6] المنتظم: 177/5، وتاريخ الإسلام، عهدالخلفاء الراشدين، ص:651. [7] تاريخ بغداد: 137/1. [8] خلافة علي بن أبي طالب لعبدالحميد، ص:441.

اصل حقیقت یہ ہے کہ نجف میں ''مشہد علی رضی اللہ عنہ'' کے نام سے کچھ لوگوں نے خلافت بنوعباس کے دوران ایک مقام کا تعین کیا اور اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کا مقام قرار دے دیا۔ وہ لوگ شیعہ روافض تھے۔ شیعہ نے حسبِ عادت چوتھی صدی ہجری میں یہ کام کیا۔ اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر نہیں ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: نجف میں مشہد کے نام سے جو مقام ہے، اہل علم اس پر متفق ہیں کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کی قبر کا مقام نہیں ہے بلکہ وہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ اہل بیت رضی اللہ عنہم، شیعہ اور دیگر بے شمار مسلمانوں نے کوفہ میں ان کی حکومت اور تین سو سال سے زیادہ کے لیل ونہار بیت جانے کے باوجود کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین سو سال بعد بَنی بُویہ کے دور حکومت میں اس جگہ کو مشہد علی کا نام دیا گیا۔[1]

شہادت کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر بعض علماء نے انسٹھ(59) سال بتائی ہے۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ وہ 65 سال کے تھے۔ بعض مورخوں کی رائے یہ ہے کہ ان کی عمر بوقت شہادت تریسٹھ(63) سال تھی، یہ آخری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

والد گرامی کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا خطبہ

شہادت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے خطبہ دیا۔ انھوں نے فرمایا: گزشتہ کل تم سے ایک عظیم شخصیت جدا ہو گئی ہے، علم و ادراک میں وہ اوّلین و آخرین پر سبقت لے جانے والے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں جھنڈا دے کر روانہ فرماتے تھے کہ وہ فتح حاصل کیے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔[2] انھوں نے کوئی سونا چاندی پیچھے نہیں چھوڑا۔ صرف سات سو(700)

[1] الفتاویٰ: 502/4، ودراسات فی الأھواء والفرق والبدع، ص: 280. [2] تاریخ الطبری: 67/6.

درہم ہیں، یہ انھوں نے اپنے گھر کے خادم کے لیے محفوظ فرمائے تھے۔ [1]

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا تبصرہ

ربیعہ الجرشی سے روایت ہے، ایک آدمی کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوا، سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا: ارے! کیا تم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کر رہے ہو؟ ان کے چار مناقب بہت معروف ہیں، کاش ان میں سے ایک وصف ہی مجھ میں ہوتا۔ انھوں نے حُمر النعم (سرخ اونٹوں) والی حدیث کا ذکر کیا اور فرمان نبوی سنایا کہ ''کل میں جھنڈا اس شخص کے ہاتھ میں دوں گا'' پھر یہ فرمان نبوی سنایا کہ ''تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام کا درجہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنایا کہ ''میں جس کا مولیٰ ہوں، علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے مولیٰ ہیں۔'' [2]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ارشادات

سعد بن عبیدہ راوی ہیں کہ ایک آدمی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا، ان سے عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا، انھوں نے ان کی بے شمار خوبیاں بیان کیں، اس آدمی کے تاثرات دیکھ کر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: شاید تمھیں میری باتیں پسند نہیں آئیں، اس نے کہا: جی ہاں! ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: تمھاری ناک خاک آلود ہو۔ پھر اس آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان کی خوبیاں بیان کیں، پھر کہا شاید تمھیں یہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔ اس نے کہا: جی ہاں! ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمھاری ناک خاک آلود کرے یہاں سے نکل جاؤ۔ [3]

---

[1] فضائل الصحابة: 737/2، اس کی سند صحیح ہے۔ [2] فضائل الصحابة: 798/2، اس کی سند حسن ہے۔ [3] الصحیح المسند من فضائل الصحابة للعدوی، ص: 140.

شہادتِ علی رضی اللہ عنہ کی خبر سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ رو پڑے

جب شہادتِ علی رضی اللہ عنہ کی اطلاع معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملی تو رونے لگے، ان کی بیوی نے کہا: آپ ان کی شہادت پر رو رہے ہیں حالانکہ آپ ان کے خلاف لڑتے رہے؟ انھوں نے کہا: اللہ تمھارا بھلا کرے، تم جانتی ہی نہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے لوگ کتنے بڑے صاحب علم وفضل اور فقیہ سے محروم ہو گئے ہیں۔[1] ان کے بھائی عتبہ نے یہ بات سن لی اور کہا: ''کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل شام آپ کی یہ بات سن لیں۔'' معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''چھوڑو، ایسی باتیں نہ کرو۔''[2]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ضرار الصدائی سے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف و کمالات بیان کرو۔ انھوں نے کہا: امیر المؤمنین مجھے معاف کیجیے۔ انھوں نے اصرار کیا اور فرمایا: تمھیں ان کے اوصاف اور خوبیاں ضرور بیان کرنی ہوں گی۔ انھوں نے کہا: اچھا تو سنیے: حضرت علی رضی اللہ عنہ انتہائی دور اندیش تھے، بہت بہادر انسان تھے، ہمیشہ فیصلہ کن بات کرتے تھے عدل پر مبنی فیصلے دیتے تھے، علم ان کے پہلوؤں سے پھوٹتا تھا، حکمت و دانائی ان کے منہ سے بولتی تھی، دنیا اور اس کی زیب و زینت سے بڑی وحشت محسوس فرماتے تھے، رات کی خاموشی سے بہت مانوس تھے، طویل غور فکر کرنے والے تھے، اللہ کے خوف سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی تھی، معمولی لباس پہنتے تھے، سادہ کھانا پسند فرماتے تھے، وہ ہمارے درمیان ہوتے تو ہم میں سے ایک ہوتے، جب ہم ان سے سوال کرتے تو جواب ضرور مرحمت فرماتے اور کوئی استفسار کرتے تو ضرور جوابی طور پر مطلع کرتے تھے، ہم ان کا قرب حاصل کرنے کے باوجود ان کے رعب کے باعث ان سے بات کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ وہ دین داروں کی بہت عزت کرتے تھے، مساکین کو اپنے قریب بٹھاتے تھے، بڑے سے بڑا طاقتور شخص ان سے ناحق بات نہیں منوا سکتا تھا، کمزور ان کے عدل سے کبھی ناامید نہ

[1] البداية و النهاية: 133/8. [2] الاستيعاب: 1108/3.

ہوتا، میں گواہی دیتا ہوں، میں نے اکثر انھیں دیکھا جب رات کا اندھیرا پھیل جاتا تھا وہ اپنی ڈاڑھی کو پکڑے، سانپ سے ڈسے ہوئے انسان کی طرح انتہائی بے قراری سے بہت غمزدہ انسان کی مانند آنسو بہا رہے ہوتے تھے اور بار بار فرماتے تھے: اے دنیا! چلی جا کسی اور کو جا کر دھوکا دے، دور جا، دور ہو جا، میں نے تجھے ایسی قطعی طلاق دے دی ہے کہ اب رجوع کا کوئی امکان نہیں، آہ! زادِ راہ قلیل ہے، سفر بہت بعید ہے اور راستے وحشت ناک ہیں۔''

یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہا: ''اللہ تعالیٰ ابوالحسن پر اپنی رحمت نازل فرمائے، وہ بالکل ایسے ہی تھے جس طرح تم نے بیان کیا، اچھا اے ضرار! یہ بتاؤ کہ ان کی شہادت پر تمھارے غم کی کیا کیفیت ہے؟ اس نے کہا: ''میرا غم اس شخص جیسا ہے جس کا بچہ اس کی گود میں ہو اور اسے ذبح کر دیا جائے۔''[1]

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کہتے ہیں

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، میں نے انھیں سلام کیا اور بیٹھ گیا، اسی دوران علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو لایا گیا، انھیں ایک گھر میں داخل کر دیا گیا اور پھر دروازہ بند کر دیا گیا، میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اچانک علی رضی اللہ عنہ تیزی سے باہر آئے اور کہا: ''رب کعبہ کی قسم! میرے حق میں فیصلہ ہو گیا۔'' بعد ازاں معاویہ رضی اللہ عنہ تیزی کے ساتھ باہر آئے اور کہا: رب کعبہ کی قسم! مجھے بخش دیا گیا۔''[2]

ابن عساکر نے ابوزرعہ الرازی سے روایت کیا ہے کہ ان سے ایک آدمی نے کہا: میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہوں۔ انھوں نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا: کیونکہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کی۔ ابوزرعہ نے کہا: اللہ تمھیں ہدایت دے، معاویہ کا رب، رب رحیم ہے اور معاویہ کا مدمقابل رَجُل کریم ہے، تمھارا ان دونوں کے بیچ کیا دخل؟[3]

[1] الاستیعاب: 108,107/3. [2] البدایة و النهایة: 133/8. [3] البدایة و النهایة: 133/8.

حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں

حسن بصری سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: اللہ کی قسم علی رضی اللہ عنہ اللہ کے دشمنوں کے خلاف ٹھیک نشانے پر لگنے والا تیر تھے، وہ اس امت کی ربانی شخصیت تھے، وہ فضیلت اور سبقتِ اِلی الاسلام کے درجے پر فائز تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریبی قرابت دار تھے، اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے میں کبھی سست روی کا شکار نہیں ہوئے۔ اللہ کے دین کے معاملے میں ان پر کوئی ملامت نہ تھی، نہ وہ اللہ کے مال میں کوئی ناجائز راستہ اختیار کرتے تھے، قرآنی احکام میں ہمیشہ راہِ عزیمت اختیار کرتے تھے، بس یہ تھے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ![1]

خلافتِ علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی رائے

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں: ایک دن میں اپنے والد کے پاس موجود تھا کہ کرخیوں کا ایک گروہ آیا انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے ادوارِ خلافت کا ذکر کیا، بعدازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت زیرِ بحث آیا تو اس پر طویل گفتگو کی۔ میرے والد نے سر اٹھایا، انھیں دیکھا اور فرمایا: تم لوگوں نے خلافت علی رضی اللہ عنہ پر بڑی باتیں کی ہیں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ خلافت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو زینت بخشی؟ نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کو شرف بخشا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خون سے اَشعث بن قیس کی براءت

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اشعث بن قیس پر علی رضی اللہ عنہ کے خون کی تہمت ہے۔ یعقوبی کہتے ہیں: ابن ملجم نے اشعث بن قیس کے ہاں ایک ماہ قیام کیا، اس دوران وہ اپنی

[1] الاستیعاب: 1110. [2] تاریخ مدینة السلام: 462/1.

تلوار تیز کرتا رہا۔[1] الطبقات میں ابن سعد نے کہا ہے: ابن ملجم نے جس رات کی صبح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، وہ رات اس نے اُشعث بن قیس کے ساتھ اس کی مسجد میں سرگوشیاں کرتے گزاری، جب فجر طلوع ہونے کا وقت قریب ہوا تو اُشعث نے ابن ملجم سے کہا: یہ صبح تمھیں رسوا کرے، اسی دوران ابن ملجم اور شبیب بن بجرہ نے اپنی تلواریں پکڑیں اور اس دروازے کے پاس گھات لگا کر بیٹھ گئے جہاں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گزرنا تھا[2] یہ تمام روایات ضعیف ہیں۔[3]

اشعث پر تہمت لگانے کی کوئی دلیل یا ثبوت کہیں موجود نہیں۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کے بہت مخلص اور وفادار ساتھی شمار ہوتے تھے۔ اہل شام کے خلاف لڑائی میں پیش پیش تھے۔ وہ خوارج کی ابتدا کے زمانے ہی میں ان کے مہلک نظریات سے بیزار ہو گئے تھے۔ یہ بات پہنچائی کہ خوارج کہتے ہیں: ''علی رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی سے توبہ کر لی، تحکیم سے رجوع کر لیا ہے اور نہروان میں ان کے خلاف لڑائی کی ہے۔'' انھوں نے ہمیشہ علی رضی اللہ عنہ سے عقیدت اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے ساتھ اپنے تعلقات استوار رکھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کا نکاح حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ سے کیا اور جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے دلہن کو گھر لانے کا ارادہ کیا تو کندہ قبیلے کے لوگوں نے حسن رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے سے اشعث کے دروازے تک ان کے خیر مقدم کے لیے اپنی چادریں بچھا دیں۔[4] اشعث، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چالیس روز بعد وفات پا گئے، حسین رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔[5] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان میں سے کسی سے یہ منقول نہیں کہ انھوں نے اُشعث پر کوئی ایسی تہمت لگائی ہو، شہادت علی رضی اللہ عنہ خوارج ہی کے ہاتھوں ہوئی کیونکہ وہ معرکۂ نہروان میں اپنے مقتولین کا بدلہ لینے پر تُلے بیٹھے تھے۔[6]

---

[1] تاریخ الیعقوبی: 2/212. [2] الطبقات: 3/36. [3] خلافة علی بن أبی طالب لعبدالحمید، ص: 353. [4] تهذیب الکمال:3/393-394، الطبقات: 6/23. [5] الکامل فی التاریخ:3/444.
[6] دراسة فی تاریخ الخلفاء الأمویین لمحمد بطاینة، ص:52.

گمراہ اور منحرف فرقوں کے مسلمان معاشرے پر خطرناک اثرات

مسلمانوں کی فلاح صرف اس امر پر موقوف ہے کہ وہ اللہ کی آخری کتاب اور ختم الرسل حضرت محمد ﷺ کی قولی و عملی سنت کی اتباع کریں۔ اس راستے سے ہٹ کر جو راہ بھی اختیار کی جائے گی، وہ مسلمانوں کے لیے ذلت اور زوال کا باعث ہوگی۔ دین حنیف کی سیدھی اور سچی راہ پر چلنے کے لیے گمراہ فرقوں سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہیے۔ اگر کسی علاقے میں گمراہ فرقوں کے خیالات پھیل رہے ہوں تو ان کے بڑے منفی اور خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ امن و امان کے مسائل پیدا کرتے ہیں، لوگوں کے عقائد میں شکوک وشبہات کے بیج بوتے ہیں اور اللہ کی زمین میں بگاڑ اور فساد پھیلاتے ہیں۔ خوارج کا یہی حال تھا، وہ دین سے اس طرح خارج ہو چکے تھے جیسے تیر شکار سے پار نکل جاتا ہے۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا۔ ان کی تکفیر کی جبکہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل اور برہان نہیں تھی۔ خواہشات کی پیروی اور شیطان کی اطاعت کے سوا ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ جب ہمارے سامنے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ وہ شہادت علی رضی اللہ عنہ کا صرف سبب ہی نہیں تھے بلکہ خود اس کے ذمہ دار تھے۔ لہٰذا اب امت اسلامیہ پر واجب ہے کہ ان سے بچ کر رہے، ان کے منہج اور طریق کار کی مخالفت کرے، علماء اور داعیانِ دین، اس حوالہ سے اپنی ذمہ داری ادا کریں تاکہ لوگ امن اور چین سے زندگی بسر کرسکیں، سنت کی روشنی چھا جائے، بدعت کی آگ بجھ جائے۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ غلبہ حاصل کرلے، بدعت اور مبتدعین کا خاتمہ ہو جائے ایسے ہی حالات کے نتیجہ میں معاشرے ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکیں گے۔ امت اسلامیہ کی صفوں میں وحدت و اتحاد کا صحیح اور مثالی طریقہ یہی ہے۔ اگر اسلام کی طویل تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریاستیں اور ممالک جنھوں نے سنت کو پیش نظر رکھا جن کا قیام سنت پر ہوا۔ جنھوں نے جہاد قائم کیا، امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کا فرض ادا کیا۔ انھی سے اسلام کو فروغ ملا اور عزت وشوکت حاصل ہوئی۔ انھوں نے وحدت امت کی ذمہ داری

نبھائی، پھر انھوں نے امت میں انتشار پھیلانا شروع کر دیا اور آخر کار وہ مٹ گئیں۔ [1]

مومنین صادقین کے خلاف خوارج کا کینہ و بغض

ابن ملجم کے ان الفاظ سے سچے مسلمانوں کے بارے میں خوارج کے کینۂ و بغض کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اس نے اپنی تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے: ''میں نے اسے ایک ہزار میں خریدا اور ایک ہزار خرچ کر کے اسے زہر آلود کرایا اگر پورے شہر والوں کو اس کی ایک ہی ضرب لگ جائے تو ان میں سے ایک بھی زندہ باقی نہ بچے۔'' [2]

اس کے ان الفاظ سے دلوں میں چھپی ہوئی وہ دشمنی عیاں ہوتی ہے جو خوارج کے دلوں میں تھی اور یہ کینہ و بغض صرف عام مومنوں ہی کے لیے نہ تھا بلکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بن اَبی طالب جیسے جلیل القدر امیر المؤمنین کے لیے بھی تھا جو عظیم مناقب اعلیٰ علمی اور اخلاقی خوبیوں اور دینی وجاہتوں کے حامل تھے، ذرا غور کیجیے کہ باطل فرقے بدبختی کے کس مقام پر ہوتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے اہل ایمان کو قتل کرتے ہیں اور بڑے بڑے بتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ [3]

خلیفہ چہارم امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کی بندگی اور دین حنیف کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جیے اور اسی نصب العین کے لیے مر مٹے۔ ان کی پوری زندگی جہادِ عظیم میں بسر ہوئی، وہ زندگی کی آخری ہچکی تک قرآن اور سنت کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی تلقین و تاکید فرماتے رہے اور اپنے رب کے حضور بہت منور اعمال نامہ لے کر گئے، جب تک افق پر سورج چمکے گا، ان کی عظمت و برگزیدگی کا آفتاب نصف النہار پر رہے گا۔ اس دنیا سے رخصت ہوئے، تاریخ کے صفحات ہمیشہ ان کی سیرت کی درخشندگی کی گواہی دیتے رہیں گے، وہ اپنی مثال آپ تھے، وہ یکتائے روزگار تھے، وہ ہر دم اللہ کی رضا کے طلبگار رہے، اسلام کی فتح و کامرانی کے لیے کوشاں رہے ان کی سب سے بڑی تڑپ اور طلب یہ تھی کہ دنیا میں اللہ کے

[1] سیر الشهداء دروس وعبر لعبدالحمید السحیبانی، ص: 77. [2] تاریخ الطبری: 62/6.
[3] سیر الشهداء دروس و عبر، ص: 78.

احکام غالب آئیں اور ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ ریاست کے تمام افراد کے لیے عدل و انصاف کو یقینی بنا دیا جائے۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے سنہرے دور کا مطالعہ نئی نسل کے عزم و ہمت کو فروغ دینے والا اور ماضی کے حکمت و دانائی سے بھرپور لیل و نہار کی یاد دلانے والا ہے۔ یہ مطالعہ نئی نسل کو یہ رہنمائی دیتا ہے کہ اس امت کے آخر میں آنے والے لوگوں کی اصلاح بھی اسی راستے پر چل کر ہوگی جس پر اوّلین لوگ چلتے رہے۔ آج کے طالب علم کو خلافتِ راشدہ کا عہد سامنے رکھنا چاہیے اور اس کی خصوصیات اور اس کے نظامِ حکومت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کیونکہ یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔

اس کتاب کی تالیف کی تکمیل بروز ہفتہ ایک بجے 17 ربیع الثانی 1424ھ بمطابق 7 جون 2003ء عیسوی کو ہوئی۔ اوّل و آخر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا، میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ میرا یہ عمل قبول فرمائے اور اپنے بندوں کے سینے، اس کتاب سے استفادے کے لیے کھول دے اور اپنے کرم و احسان سے اس میں برکت عطا فرمائے۔

اس کتاب کی تالیف کے اختتام پر میں اللہ تعالیٰ کے حضور خشوع و خضوع اور سپاس گزاری کے جذبے سے سرشار دل کے ساتھ کھڑا ہوں اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ نہیں صرف اللہ کے فضل و کرم ہی پر اعتماد ہے۔ وہی حقیقی مدد دینے والا اور توفیق سے ہمکنار کرنے والا ہے۔ اوّل و آخر اُسی کی تعریف ہے، میں رب ذوالجلال کی بارگاہ میں عرض گزار ہوں کہ وہ میرا یہ عمل خالص اپنی خوشنودی کے لیے قبول فرمائے اور اسے اپنے بندوں کے لیے نفع بخش بنا دے اور مجھے اس پر اجر و ثواب سے نواز دے، اسے میری نیکیوں کے میزان میں شمار کر لے اور میرے ان تمام بھائیوں اور دوستوں کو اجر و ثواب مرحمت فرمائے جنھوں نے اس عاجزانہ کوشش کی تکمیل میں کسی بھی پہلو سے حصہ ڈالا اور جو شخص اس کتاب سے مطلع ہو وہ مجھ بندۂ فقیر کے لیے اللہ کے حضور عفو و درگزر، مغفرت، رحمت اور خوشنودیٔ رب کی دعا

فرمائے چونکہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے اس کی غیر حاضری میں دعا اللہ کے دربار میں قبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ میں اس کتاب کا اختتام اس فرمان باری پر کر رہا ہوں:

﴿رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾

''اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی ہیں اور ایسا نیک عمل کروں جو تجھے پسند آئے اور تو مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں شامل فرمالے۔''[1]

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّاإِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ، وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ»

علی محمد محمد الصَّلَّابی

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ضعیف اور من گھڑت احادیث

① ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات مجھ پر یہ وحی فرمائی کہ وہ مومنوں کے سید، متقین کے امام اور (وضوء کے) روشن مقامات والوں کے قائد ہیں۔''
(یہ حدیث موضوع ہے، السلسلة الضعيفة للألبانی، حدیث نمبر: 353)

② ''سبقت لے جانے والے تین ہیں، موسیٰ علیہ السلام کی طرف سبقت لے جانے والے یوشع بن نون، عیسیٰ علیہ السلام کی طرف صاحب یاسین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف علی رضی اللہ عنہ بن اُبی طالب۔''
(یہ انتہائی ضعیف ہے، السلسلة الضعيفة للألبانی، حدیث نمبر: 385، ضعیف الجامع، حدیث نمبر: 3334)

③ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نیکوکار لوگوں کے امام اور فاجروں کے قاتل ہیں جو ان کی مدد کرے گا، اللہ کی طرف سے منصور ہوگا اور جو ان کو رُسوا کرے گا اللہ اسے رُسوا کر دے گا۔'' (یہ موضوع ہے، السلسلة الضعيفة للألبانی، حدیث نمبر: 357، ضعیف الجامع، حدیث نمبر: 3799)

④ ''خندق کے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمرو بن عَبدوُدّ سے مقابلہ، قیامت تک میری امت کے تمام اعمال سے افضل ہے۔'' (موضوع ہے، السلسلة الضعيفة، حدیث نمبر: 400)

---

[1] النمل 27:19.

⑤ ''اے بارِ الٰہ! تیرے بندے علی رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مصروف کر لیا تھا، اس کے لیے مشرق کو واپس لوٹا دے؟ (اور ایک روایت میں ہے) اے بارِ الٰہ! وہ آپ کی اور آپ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں تھے، ان کے لیے سورج کو لوٹا۔ اسماء کہتی ہیں میں نے آسمان کو دیکھا کہ سورج غروب ہونے کے بعد پھر طلوع ہوا۔'' (یہ موضوع ہے، السلسلة الضعيفة للألباني حدیث نمبر:971)

⑥ ''بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے ان چاروں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور مجھ سے فرمایا ہے کہ وہ بھی ان چاروں سے محبت کرتا ہے، عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کون ہیں؟ (اور ایک روایت میں ہے) ان کے نام بتایئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا، ان میں سے ایک علی رضی اللہ عنہ ہیں اور باقی تین اَبو ذر رضی اللہ عنہ، سلمان رضی اللہ عنہ اور مقداد رضی اللہ عنہ ہیں۔ اللہ نے مجھے ان سے محبت کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ وہ بھی ان سے محبت کرتا ہے (یہ ضعیف ہے، السلسلة الضعيفة للألباني، حدیث نمبر:1549 اور نمبر:3128، ضعیف الجامع:1566، ضعیف سنن الترمذی، حدیث نمبر:771 اور ضعیف سنن ابن ماجہ میں حدیث نمبر:628، ومشکوٰۃ:6249)

⑦ ''میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں، جو علم حاصل کرنا چاہے، وہ ان کے پاس جائے۔'' (موضوع ہے، السلسلة الضعيفة للألباني، حدیث نمبر:2955)

⑧ ''میں اللہ کا بندہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھائی ہوں، میں صدیق اکبر ہوں، میرے بعد اپنے بارے میں یہ بات کوئی کذاب ہی کہے گا، میں نے لوگوں سے سات سال پہلے نماز پڑھنی شروع کی۔'' (یہ حدیث باطل ہے، ضعیف سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:23)

⑨ ''اللہ تعالیٰ علی رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، اے بارِ الٰہ! حق کو علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ چلا، وہ جہاں بھی جائیں حق ان کے ساتھ ساتھ ہو۔'' (انتہائی ضعیف حدیث، ضعیف سنن الترمذی، حدیث نمبر:767، مشکوۃ، حدیث نمبر:6125)

⑩ ''علی رضی اللہ عنہ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں حوض کوثر پر آنے تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔'' (ضعیف ہے، ضعیف الجامع، حدیث نمبر: 3802)

⑪ ''مومنوں کے سردار علی رضی اللہ عنہ ہیں اور منافقین کا سردار مال و متاع ہے۔'' (یہ حدیث ضعیف ہے، ضعیف الجامع، حدیث نمبر: 3805)

⑫ ''جس رات مجھے معراج پر لے جایا گیا، اللہ تعالیٰ نے مجھے بذریعہ وحی علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تین باتوں سے مطلع فرمایا: وہ مسلمانوں کے سردار ہیں، متقین کے دوست ہیں اور (وضوء کے) روشن اعضاء والوں کے قائد ہیں۔'' (موضوع حدیث ہے، السلسلة الضعيفة، حدیث نمبر: 4889)

⑬ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) ''اے انس رضی اللہ عنہ! سید العرب (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ) کو میرے پاس بلا کر لاؤ، اس وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا آپ سید العرب نہیں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں پورے عالم انسانیت یعنی بنی آدم کا سردار ہوں اور علی رضی اللہ عنہ عرب کے سردار ہیں، اے گروہِ انصار! کیا میں تمھیں یہ نہ بتاؤں کہ اگر تم انھیں مضبوطی سے تھام لو تو اس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے انھوں نے کہا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ علی رضی اللہ عنہ ہیں، مجھ سے محبت کی بنیاد پر ان سے محبت کرو اور میرے احترام کے باعث ان کا اکرام و احترام کرو، مجھ سے یہ بات جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی ہے۔ (یہ حدیث موضوع ہے، السلسلة الضعيفة، حدیث: 4890)

⑭ (اے علی رضی اللہ عنہ!) ''میرے بعد جب امت میں اختلاف ہوگا تو آپ سب کچھ کھول کھول کر بتلانا۔'' (موضوع ہے، السلسلة الضعيفة: 4891)

⑮ ''میں خبردار کرنے والا ہوں اور اے علی رضی اللہ عنہ! تم ہادی ہو، میرے بعد لوگ تم سے ہدایت حاصل کریں گے۔'' (موضوع ہے، السلسلة الضعيفة: 4899)

⑯ ''معراج کی رات میں نے عرش پر لکھا ہوا دیکھا: لاالہ إلا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری مخلوقات میں سے میرے محبوب ہیں اور علی رضی اللہ عنہ آپ کی تائید و نصرت کرنے والے ہیں۔'' (یہ حدیث موضوع ہے، السلسلة الضعیفة، حدیث نمبر:4902)

⑰ ''جو شخص آدم علیہ السلام کو ان کے علم کے ساتھ، نوح علیہ السلام کو ان کے فہم و فراست کے ساتھ، ابراہیم علیہ السلام کو ان کی بردباری کے ساتھ، یحییٰ علیہ السلام کو ان کے زُہد اور موسیٰ علیہ السلام کو ان کی سخت گیری کے ساتھ دیکھنا چاہے، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے۔ (یہ حدیث موضوع ہے، السلسلة الضعیفة، حدیث نمبر:4903)

⑱ ''تم عہد شکنی کرنے والوں، ظالموں اور دین سے نکل جانے والوں کے خلاف راستوں میں، نہروں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر قتال کرو گے۔'' (موضوع ہے، السلسلة الضعیفة، حدیث نمبر:907)

⑲ ''یہ آیت ﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ غدیر خم کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔'' (یہ حدیث موضوع ہے، حدیث نمبر:4922)

⑳ ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم کی جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھڑا کیا اور ان کی خاطر ولایت کے لیے پکارا تو جبرائیل یہ آیت لے کر نازل ہوئے: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ (حدیث موضوع ہے، السلسلة الضعیفة، حدیث نمبر:4923)

㉑ ''یہ میرا بھائی ہے، میرا وَصی ہے اور تمھارے مابین میرا خلیفہ ہے، ان کی (یعنی علی رضی اللہ عنہ کی) بات سنو اور ان کی اطاعت کرو۔'' (موضوع حدیث ہے، السلسلة الضعیفة، حدیث نمبر:4932)

㉒ ''میں تمھیں قسم دیتا ہوں، کیا تمھارے بیچ کوئی ایسا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسلمانوں کے درمیان بھائی چارا قائم فرمایا تو اپنے اور علی رضی اللہ عنہ کے مابین بھائی چارے کا اعلان کیا، لوگوں نے کہا: کوئی نہیں۔'' (یہ حدیث موضوع ہے، السلسلة الضعیفة، حدیث نمبر:4949)

㉓ ''ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں اور علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی جوان نہیں۔'' (یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جھوٹی حدیث ہے، منہاج السنۃ: 70/5)

㉔ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنا نیکی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھنے والا اگر کسی برائی کا ارتکاب کرے تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور ان سے بغض رکھنا ایسی برائی ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی نیکی کا کوئی فائدہ نہیں۔'' (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ حدیث جھوٹی اور من گھڑت ہے، منہاج السنۃ: 73/5)

㉕ ''ثقلان سے مراد، کتاب اللہ ہے کہ اس کے ایک طرف اللہ کا ہاتھ ہے اور دوسری سمت میری اولاد ہے، اسے مضبوطی سے تھامے رکھو، کبھی گمراہ نہیں ہوگے، لطیف وخبیر ہستی نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے حتیٰ کہ حوض پر آن ملیں گے، ان کے بارے میں کوتاہی سے کام نہ لو، مبادا ہلاک ہو جاؤ نہ انھیں سکھانے کی کوشش کرو، وہ تم سے زیادہ علم والے ہیں۔'' (یہ حدیث ضعیف ہے، السلسلة الضعيفة، نمبر: 4914)

㉖ ''آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل کرنا جہنم سے نجات کے مترادف ہے، آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پل صراط پر کام آئے گی اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت عذاب سے محفوظ ہونے کے برابر ہے۔'' (یہ حدیث موضوع ہے، السلسلة الضعيفة، حدیث نمبر: 4917)

㉗ ''یہ میرا بھائی ہے، میرا وصی ہے اور میرے بعد میرا خلیفہ ہے اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔'' (یہ حدیث متن اور سند دونوں اعتبار سے باطل ہے، سند میں عبدالغفار بن قاسم ہے، اس کے متعلق امام ذہبی نے کہا ہے کہ وہ رافضی ہے اور ثقہ راوی نہیں ہے) علی بن المدینی کہتے ہیں: یہ شخص حدیثیں گھڑتا تھا، میزان الاعتدال (640/2)

㉘ ''علی رضی اللہ عنہ میرے وصی اور میرے راز دان ہیں اور جن لوگوں کو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں ان میں سب سے بہتر علی رضی اللہ عنہ ہیں وہ میرے وعدے پورے کریں اور میرے دین کے مطابق فیصلہ دیں گے۔'' (ہیثمی نے اس روایت کو مجمع الزوائد (141:9) میں بیان کیا ہے اسے طبرانی

سے منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں ناصح بن عبداللہ راوی متروک الحدیث ہے)

㉙ ''میں حکمت کا گھر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں۔'' (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور أبو نعیم نے ترمذی کے اس قول پر کہ یہ حدیث غریب اور منکر ہے، اس پر خاموشی اختیار کی ہے، یہ حدیث شریک سے روایت کی گئی ہے اور روایت کرنے والوں میں سے ایک شخص بھی ثقہ نہیں ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح (1777/3) ابن الجوزی نے اسے جھوٹ پر مبنی بتایا ہے، الموضوعات (439/1)

㉚ ''اے علی رضی اللہ عنہ! تم اور تمھارا گروہ بس یہی لوگ ہی پوری مخلوقات میں سب سے بہتر ہیں۔'' (اس روایت میں ایک أبو الجارود زیاد بن المنذر الکوفی ہے، حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ رافضی ہے اور یحییٰ بن معین نے اسے جھوٹا بتایا ہے، التقریب: 2101)

㉛ ''مجھے اللہ تعالیٰ نے علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بذریعہ وحی تین باتوں سے مطلع کیا ہے: وہ مومنوں کے سردار ہیں، متقین کے امام ہیں اور وضوء کے باعث روشن اعضاء والوں کے قائد ہیں۔'' (حافظ ابن حجر کہتے ہیں: حاکم نے المناقب میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ وہ انتہائی ضعیف اور منقطع ہے، اتحاف المھرۃ (344/1) امام ذہبی نے جیسا کہ اس حدیث پر انھوں نے تعلیق میں کہا ہے، اسے رد کر دیا ہے (المستدرک: 139/3) اور کہا ہے کہ اس میں راوی عمر بن الحصین العقیلی اور اس کا شیخ یحییٰ بن العلاء دونوں متروک راوی ہیں انھوں نے صراحت سے کہا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ دیکھیے: السلسلة الضعيفه للألباني، حديث: 353)

㉜ ''علی رضی اللہ عنہ! تمھیں مبارک ہو، تم ہمارے مولیٰ (دوست) اور ہر مومن کے مولیٰ ہو۔'' (اس حدیث کے راویوں میں ایک علی بن جدعان ہے، اس کے بارے میں جوزجانی کہتے ہیں: وہ ضعیف راوی ہے۔ (الشجرة فى أحوال الرجال، ص: 194) امام ابن الجوزی، العلل المتناهية فى الأحاديث الواهية (226/1) میں کہتے ہیں: اس حدیث سے

استدلال جائز نہیں۔ اس راوی سے اوپر ابو ہریرہ تک تمام ضعیف ہیں۔ بزّار کہتے ہیں: اہل علم کی جماعت نے اس راوی پر کلام کیا ہے (کشف الأستار:490) اور امام دارقطنی کا کہنا ہے کہ وہ راوی قوی نہیں ہے، (سنن الدارقطنی:1/103)

㉝ ''اللہ تعالیٰ علی رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، بارِالٰہ! حق کو علی کے ساتھ ساتھ چلا، وہ جہاں بھی جائیں، حق ان کے ساتھ ہو۔''

اسے امام حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے (المستدرک: 3/125)۔ اس میں ایک راوی مختار بن نافع التیمی ہے، امام ذہبی نے حاکم کی تعقیب کرتے ہوئے کہا ہے کہ مختار نامی یہ راوی ساقط ہے اور حافظ ابن حجر نے کہا ہے: مختار ضعیف ہے۔ (التقریب:6522)

㉞ ''علی رضی اللہ عنہ دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہیں۔'' (یہ حدیث ضعیف ہے، دیکھیے ضعیف الجامع للألبانی:3801)

㉟ ''علی رضی اللہ عنہ بخشش و مغفرت کا دروازہ ہیں، جو اس دروازے سے داخل ہو گیا وہ محفوظ ہو گیا۔''

یہ حدیث موضوع ہے، اس میں ایک راوی حسین الأشقر ہے امام بخاری نے کہا ہے: وہ قابل غور ہے (التاریخ الکبیر:2/2862) اور کہا ہے کہ وہ منکر حدیثیں بیان کرتا ہے۔ (التاریخ الصغیر:2/319) دیکھیے السلسلة الضعیفة للألبانی:3913۔

㊱ ''علی رضی اللہ عنہ پورے عالم انسانیت میں افضل ہیں جس نے اس امر کا انکار کیا اس نے کفر کیا۔''

یہ حدیث موضوع ہے: حافظ ابن حجر کہتے ہیں اسے ابن عدی نے جن سندوں سے روایت کیا ہے وہ تمام ضعیف ہیں۔ (تسدیدالقوس: 3/89) امام ذہبی کہتے ہیں: یہ حدیث منکر ہے انھوں نے اسے واضح طور پر باطل بھی کہا ہے۔ (میزان الاعتدال:1/521)

ابن الجوزی نے اسے موضوعات میں درج کیا ہے۔ (الموضوعات:1/348)

㊲ ''مجھے معلوم ہے کہ علی رضی اللہ عنہ تمھیں میرے والد سے دوگنا یا تین گنا زیادہ محبوب ہیں۔''

البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔(ضعیف أبی داود، ص:491)

㊳ ''میرے اہل بیت رضی اللہ عنہم کی مثال سفینۂ نوح جیسی ہے کہ جو اس میں سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جو پیچھے رہ گیا غرق ہو گیا۔''

اسے طبرانی نے الکبیر (3/ 37) میں اور ہیثمی (9:168) نے بھی روایت کیا ہے اس کی سند میں عبداللہ بن داھر اور حسن بن أبی جعفر ہے اور ہیثمی کے مطابق یہ دونوں متروک ہیں۔

㊴ ''جو چاہتا ہے کہ میرے جیسی زندگی گزارے، میری موت جیسی موت آئے اور اس جنت الخلد میں اس کا ٹھکانا ہو جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور وہ وہاں درخت اُگائے، وہ علی رضی اللہ عنہ سے دوستی اور محبت کرے۔''

اس حدیث کو حاکم نے صحیح (3/ 128) کہا ہے اور ذہبی نے ان کی تعقیب کرتے ہوئے کہا ہے: اس میں قاسم اور اس کا شیخ یحییٰ بن علی الأسلمی دونوں متروک راوی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے التقریب (7677) میں کہا ہے کہ وہ شیعی ہے اور ضعیف راوی ہے البتہ انھوں نے اس کے نام اُسلمی کی جگہ اسے محاربی لکھا ہے اور عبدالحسین نے المراجعات میں اس روایت سے ناحق فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

㊵ ''میرے اللہ تعالیٰ نے جو بات بھی میرے سینے میں ڈالی، وہ میں نے علی رضی اللہ عنہ کے سینے میں انڈیل دی۔''

یہ موضوع حدیث ہے۔(الموضوعات:1/ 131، أسنی المطالب:1262)

㊶ (اے علی رضی اللہ عنہ) ''تم سے محبت کرنے والا میرا محبّ ہے اور مجھ سے محبت کرنے والا اللہ تعالیٰ کا محبّ ہے اور تم سے بغض رکھنے والا مجھ سے بغض رکھنے والا ہے اور مجھ سے بغض رکھنے والا اللہ تعالیٰ سے بغض رکھنے والا ہے۔''

حافظ ابن حجر کہتے ہیں: اسے ابن عدی نے روایت کیا ہے یہ باطل حدیث ہے۔ (لسان المیزان:2/ 109)

سیرتِ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ

قارئین کرام! ہمیں اپنی عظمت رفتہ کے حصول اور تنزل وادبار کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے کے لیے قرون اولی کی تاریخ کو حرز جاں بنانے کی ضرورت ہے۔ اس دور کی تمام اصلاحات اور مہمات ہمارے دل و دماغ پر نقش ہونی چاہییں۔ اسی مقصد کے پیش نظر دارالسلام نے مختلف زبانوں میں سیرت کے موضوع پر درجنوں کتابیں شائع کی ہیں۔

اب ہم اسی سنہری سلسلے کی ایک اہم کڑی سیرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ شائع کر رہے ہیں۔ ایک ایسی متوازن کتاب کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس میں اہل بیت کا مقام ومرتبہ بھی بیان کیا گیا ہو کیونکہ اہل بیت کی محبت ہمارے ایمان کا بنیادی عنصر ہے۔

زیر نظر کتاب میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مبارک زندگی کی مکمل سوانح اور آپ کی سیرت انتہائی احسن انداز میں بیان کی گئی ہے۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں، تاریخ کے اس نازک دور میں کچھ ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے۔ مشاجرات صحابہ پر لکھنا ایک تنے ہوئے رسے پر چلنے کے مترادف ہے جس میں زبردست توازن کے ساتھ ایک ایک قدم سنبھل کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کتاب کے مایہ ناز مؤلف اس امتحان میں بھی سرخرو ٹھہرے ہیں۔